خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
مارچ 2012
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
کی پیشکش
www.Paksociety.com

مارچ 2012
جلد 39 شمارہ 11
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیرہ

خواتین ڈائجسٹ کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔
موسم ایک بار پھر بدلنے کو ہے۔ بہار کی آمد کے ساتھ ٹنڈ منڈ خالی شاخیں خوش رنگ پھولوں اور ہرے چمکیلے پتوں سے ڈھک جائیں گی۔ وقت کے ساتھ تبدیلی فطرت کا قانون ہی نہیں امید کا پیغام بھی ہے۔ حالات کتنے ہی دل شکن کیوں نہ ہوں، مایوسی کے اندھیرے کتنے ہی گہرے کیوں نہ ہوں، دعا، کوشش، جدوجہد اور محنت ایک نہ ایک دن ضرور بار آور ہوگی اور یہ اندھیرے بکھر جائیں گے۔

نیا ناول،

رفعت ناہید سجاد کا ناول "چراغ آخر شب" اس ماہ اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ سالگرہ نمبر سے نئے ناول کا آغاز ہوگا جو عنیزہ سید لکھیں گی۔
"شب گزیدہ" اور "دل من مسافر من" جیسی ناقابل فراموش تحریریں لکھنے والی عنیزہ سید کا شمار قارئین کی پسندیدہ مصنفین میں ہوتا ہے۔ جو چیز عنیزہ سید کی تحریروں کو منفرد بناتی ہے وہ ان کی فلسفیانہ فکر اور سوچ ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں ایک آفاقی فلسفہ سے روشناس کراتی ہیں۔ یہ فلسفہ ان کے تخلیقی حسن کو متاثر نہیں کرتا بلکہ ان کی تحریر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ وہ ہمارے اردگرد بکھری صداقتوں کو اس خوبصورتی سے قلم بند کرتی ہیں کہ ان کی کہانیوں کے کردار ہم اپنے دل سے قریب محسوس کرتے ہیں۔
توقع کر سکتے ہیں کہ وہ اپنے نئے ناول میں سابقہ تحریروں سے بڑھ کر نظر آئیں گی۔

سالگرہ نمبر سروے،

اپریل 1972ء میں خواتین ڈائجسٹ کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا۔ اپنی نوعیت اور خوبصورتی کے لحاظ سے یہ خواتین کا پہلا پرچہ تھا۔ پہلے شمارے سے ہی خواتین ڈائجسٹ کو بھرپور پذیرائی ملی۔ اور آج جبکہ اس کے اجراء کو چالیس سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ آج بھی یہ قارئین کا پسندیدہ ترین پرچہ ہے۔
اپریل کا شمارہ سالگرہ نمبر ہے۔ سالگرہ نمبر میں آپ کی پسندیدہ مصنفین کی تحریروں کے ساتھ ساتھ قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سروے کے سوال یہ ہیں۔

1- اپریل 2011ء سے مارچ 2012ء کے دوران شائع ہونے والی تحریروں میں سے کن تحریروں نے آپ کو متاثر کیا؟ تحریر کا عنوان۔ مصنفہ کا نام اور پسندیدگی کی وجہ بھی تحریر کریں۔
2- اس دوران شائع ہونے والی تحریروں میں سے اپنا پسندیدہ جملہ یا اقتباس تحریر کیجیے۔

ان سوالوں کے جواب اس طرح بھجوائیں کہ 25 مارچ تک ہمیں موصول ہو جائیں۔ بہترین جوابات پر انعام دیا جائے گا۔

اس شمارے میں،

- آسیہ رزاقی کا مکمل ناول۔ منانے کے لیے،
- فرحت اشتیاق کا مکمل ناول۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو،
- نبیلہ عزیز کا مکمل ناول۔ میں شرمندہ ہوں،
- راحت جبیں کا ناولٹ۔ ساری بھول ہماری تھی،
- صباحت یاسمین، ام ثمامہ، غزالہ خالد، ثمینہ سید اور نعیمہ ناز کے افسانے،
- رفعت ناہید سجاد اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- نیوز اینکر عزیدہ فاروقی سے ملاقات،
- ایف ایم 95 کے آر جے افراز علی نازش سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

پرچا پڑھ کر اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ آپ کے خطوط کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔
پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے، اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔
کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔
ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

قرآن میں (سورہ نور میں) حضرت عائشہؓ کی پاکیزگی کی گواہی

واقعہ افک ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔
"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی ازدواج مطہرات کے درمیان قرعہ ڈالتے اور جس عورت کے نام پر قرعہ نکلتا اس کو سفر میں ساتھ لے جاتے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کے ایک سفر میں قرعہ ڈالا تو اس میں میرا نام نکلا۔ میں رسول اللہ کے ساتھ گئی اور یہ اس وقت کا ذکر ہے جب پردے کا حکم اتر چکا تھا۔ میں اپنے ہودے میں سوار ہوتی اور راہ میں جب اترتی تو بھی اسی ہودے میں رہتی۔
جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاد سے فارغ ہوئے اور لوٹے اور مدینہ سے قریب ہو گئے تو ایک بار آپ نے رات کو کوچ کا حکم دیا۔ جب لوگوں نے کوچ کی خبر کر دی تو میں کھڑی ہوئی اور چلی یہاں تک کہ لشکر سے ایک طرف چلی گئی جب میں اپنے کام سے فارغ ہوئی تو اپنے ہودے کی طرف آئی اور سینے کو چھوا۔ معلوم ہوا کہ میرا اظفار کے نگینوں کا ہار گم ہو گیا ہے۔ (اظفار یمن میں ایک گاؤں کا نام ہے) میں لوٹی اور اس ہار کو ڈھونڈنے لگی۔ اس کے ڈھونڈنے میں مجھے دیر لگی اور وہ لوگ آپہنچے جو میرا ہودا اٹھاتے تھے، انہوں نے ہودہ اٹھایا اور میرے اونٹ پر رکھ دیا، جس پر میں سوار ہوتی تھی اور وہ یہ سمجھے کہ میں اسی ہودے میں ہوں۔
اس وقت عورتیں ہلکی (دبلی) ہوتی تھیں نہ موٹی کیونکہ تھوڑا کھانا کھاتی تھیں اس لیے ان کو ہودے کا بوجھ عادت کے خلاف معلوم نہ ہوا۔ جب انہوں نے اس کو اونٹ پر لادا اور اٹھایا اور میں ایک کم سن لڑکی بھی تھی۔ آخر لوگوں نے اونٹ کو اٹھایا اور چل دیے اور

میں نے اپنا ہار اس وقت پایا جب سارا لشکر چل دیا۔ میں جوان کے ٹھکانے پر آئی تو وہاں نہ کسی کی آواز ہے اور نہ کوئی آواز سننے والا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ جہاں بیٹھی تھی وہیں بیٹھ جاؤں اور میں سمجھی کہ لوگ جب مجھے نہ پائیں گے تو یہیں لوٹ کر آئیں گے تو میں اسی ٹھکانے پر بیٹھی تھی۔ اتنے میں میری آنکھ لگ گئی اور میں سو رہی۔

لشکر کے پیچھے پیچھے (گری پڑی چیز کی خبر رکھنے کے لیے) ایک شخص مقرر تھا۔ جس کو صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہا کرتے تھے' وہ پچھلی رات کو چلا آرہا تھا۔ صبح کے وقت اس جگہ پہنچا جہاں میں پڑی ہوئی تھی۔ دور سے اس کو ایک سوتا شخص معلوم ہوا تو میرے پاس آیا' مجھے پہچان لیا کیونکہ پردے کا حکم اترنے سے پہلے اس نے مجھے دیکھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر اناللہ وانا الیہ راجعون پڑھا تو میری آنکھ کھل گئی اور اس نے مجھے پہچان لیا میں نے اوڑھنی سے اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

اللہ کی قسم اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے اس کی کوئی بات سوائے اناللہ وانا الیہ راجعون کہنے کے سنی۔ پھر اس نے اپنا اونٹ بٹھایا اور اونٹ کے گھٹنے پر اپنا پاؤں میرے چڑھنے کے لیے رکھا۔ میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ اونٹ کو کھینچتا ہوا پیدل چلا۔ یہاں تک کہ ہم لشکر میں پہنچے اور لشکر کے لوگ دوپہر کی سخت گرمی میں اتر چکے تھے تو میرے مقدمہ میں تباہ ہوئے جو لوگ تباہ ہوئے۔ (یعنی جنہوں نے بدگمانی کی) اور قرآن میں جس کے متعلق تولی کبرہ آیا ہے یعنی اس تہمت کا بانی مبانی وہ عبداللہ بن ابی بن سلول (منافق) تھا۔

آخر ہم مدینے میں آئے اور جب میں مدینہ میں پہنچی تو بیمار ہو گئی۔ ایک مہینہ تک بیمار رہی اور لوگوں کا یہ حال تھا کہ بہتان لگانے والوں کی باتوں میں غور کرتے تھے اور مجھے ان کی کسی بات کی کوئی خبر نہ تھی۔ صرف مجھے اس بات سے شک ہوا کہ میں نے اپنی بیماری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ شفقت نہ دیکھی جو پہلے میرے حال پر ہوتی تھی۔ جب میں بیمار ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم صرف اندر آتے اور سلام کرتے پھر فرماتے کہ یہ عورت کیسی ہے؟ پس اس بات سے مجھے شک ہوتا لیکن مجھے اس خرابی کی خبر نہ تھی۔ یہاں تک کہ جب میں بیماری کے جانے کے بعد دبلی ہو گئی تو میں مناصع کی طرف نکلی اور میرے ساتھ مسطح کی ماں بھی نکلی۔ (مناصع مدینہ کے باہر جگہ تھی) اور وہ ہم لوگوں کے گھر (پائخانے بننے سے پہلے) پائخانے تھے پھر دوسری رات کو جاتے تھے اور رات ہی کو چلے آتے۔ یہ ذکر اس وقت کا ہے جب ہمارے گھروں کے نزدیک پائخانے نہیں بنے تھے اور ہم لوگ اگلے عربوں کی طرح (پائخانے کے لیے) جنگل میں جایا کرتے تھے اور گھر کے پاس پائخانے بنانے سے نفرت رکھتے تھے تو میں چلی اور ام مسطح بھی میرے ساتھ تھی اور وہ ابی رہم بن مطلب بن عبد مناف کی بیٹی تھی اور اس کی ماں صخر بن عامر کی بیٹی تھی جو سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خالہ تھی (اس کا نام سلمٰی تھا) اس کے بیٹے کا نام مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مطلب تھا۔

غرض میں اور ام مسطح دونوں جب اپنے کام سے فارغ ہو چکیں تو واپس اپنے گھر کی طرف آرہی تھیں۔ اتنے میں ام مسطح کا پاؤں اپنی چادر میں الجھا اور وہ بولی کہ "مسطح ہلاک ہو۔"

میں نے کہا "تو نے بری بات کہی۔ تو اس شخص کو برا کہتی ہے جو بدر کی لڑائی میں شریک تھا۔"

وہ بولی "اے نادان! تو نے کچھ نہیں سنا کہ مسطح نے کیا کہا؟"

میں نے کہا "اس نے کیا کہا؟"

اس نے مجھ سے بیان کیا جو بہتان والوں نے کہا تھا یہ سن کر میری بیماری زیادہ ہو گئی۔ ایک بیماری اور بڑھی' میں جب اپنے گھر پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اندر تشریف لائے اور سلام کیا اور فرمایا کہ "اب اس عورت کا کیا حال ہے؟" میں نے کہا "آپ مجھے اپنے ماں باپ کے پاس جانے کی اجازت دیتے ہیں؟" اور میرا اس وقت یہ ارادہ تھا کہ میں اپنے ماں باپ کے پاس جا کر اس خبر کی تصدیق کروں گی آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دی اور میں اپنے ماں باپ کے پاس آگئی۔

میں نے اپنی ماں سے کہا "ماں یہ لوگ کیا بک رہے ہیں؟" وہ بولی کہ "بیٹا تو اس کا خیال نہ کر اور اس کو بڑی بات مت سمجھ۔ اللہ کی قسم ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی مرد کے پاس ایک خوبصورت عورت ہو جو اس کو چاہتا ہو اور اس کی سوکنیں بھی ہوں اور سوکنیں اس کے عیب نہ نکالیں۔"

میں نے کہا "سبحان اللہ لوگوں نے تو یہ کہنا شروع کر دیا۔" میں ساری رات روتی رہی صبح تک میرے آنسو نہ ٹھہرے اور نہ نیند آئی۔ صبح کو بھی میں رو رہی تھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی بن ابی طالب اور اسامہ بن زید کو بلایا کیونکہ وحی نہیں اتری تھی اور ان دونوں سے مجھے جدا کرنے (یعنی طلاق دینے) کا مشورہ لیا اور اسامہ بن زید نے تو وہی رائے دی جو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی کے حال کو جانتے تھے اور اس کی عصمت کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس کے ساتھ محبت کو انہوں نے کہا۔ "یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! عائشہ (رضی اللہ عنہا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں اور ہم تو ان کی سوائے بہتری کے اور کوئی بات نہیں جانتے۔"

علی بن ابی طالب نے کہا۔ "اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر تنگی نہیں کی اور عائشہ کے سوا عورتیں بہت ہیں اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم لونڈی سے پوچھیں تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سچ کہہ دے گی۔" (لونڈی سے مراد بریرہ ہے جو عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس رہتی تھی)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو بلایا اور فرمایا "اے بریرہ! تو نے کبھی عائشہ سے ایسی بات دیکھی ہے جس سے تجھے اس کی پاکدامنی پر شک پڑے؟"

بریرہ نے کہا "قسم اس کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچا پیغمبر کر کے بھیجا ہے کہ اگر میں ان کا کوئی کام دیکھتی تو میں عیب بیان کرتی۔ اس سے زیادہ کوئی عیب نہیں ہے کہ عائشہ کم عمر لڑکی ہے گھر کا آٹا چھوڑ کر سو جاتی ہے پھر بکری آتی ہے اور اس کو کھا لیتی ہے۔" (مطلب یہ ہے کہ ان میں کوئی عیب نہیں جس کو آپ پوچھتے ہیں۔ نہ اس کے سوا کوئی عیب ہے جو عیب ہے وہ یہی ہے کہ بھولی بھالی لڑکی ہے اور کم عمری کی وجہ سے گھر کا بندوبست نہیں کر سکتی)

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے کہا کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن ابی سلول سے بدلہ چاہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر فرمایا "اے مسلمان لوگو! اس شخص سے میرا کون بدلہ لے گا جس کی ایذا دینے والی سخت بات میرے گھر والوں کی نسبت مجھ تک پہنچی۔ اللہ کی قسم میں تو اپنے گھر والوں (یعنی عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) کو نیک سمجھتا ہوں اور جس شخص پر یہ تہمت لگاتے ہیں۔ (یعنی صفوان بن معطل) اس کو بھی میں نیک سمجھتا ہوں اور وہ کبھی میرے گھر نہیں گیا۔ مگر میرے ساتھ۔"

یہ سن کر سیدنا سعد بن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ (جو قبیلہ اوس کے سردار تھے) کھڑے ہوئے اور کہنے لگے

"یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بدلہ لیتا ہوں۔ اگر تہمت کرنے والا ہماری قوم اوس میں سے ہو تو ہم اس کی گردن مارتے ہیں اور جو ہمارے خزرج بھائیوں میں سے ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم کیجئے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کریں گے۔" (یعنی اس کی گردن

ماریں گے؟

یہ سن کر سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور وہ قبیلہ خزرج کے سردار تھے اور نیک آدمی تھے، لیکن اس وقت ان کو اپنی قوم کی غیرت آگئی اور کہنے لگے۔

"اے سعد بن معاذ! اللہ کے بقا کی قسم کہ تو ہماری قوم کے شخص کو قتل نہ کر سکے گا۔" یہ سن کر سیدنا اسید بن حضیر جو سیدنا سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی تھے، کھڑے ہوئے اور سیدنا سعد بن عبادہ سے کہنے لگے۔

"تو نے غلط کہا، اللہ کے بقا کی قسم ہم اس کو قتل کریں گے اور تو منافق ہے جب ہی تو منافقوں کی طرف سے لڑتا ہے۔" غرض کہ دونوں قبیلے اوس اور خزرج کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور قریب تھا کہ خونریزی شروع ہو جاتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر کھڑے ہوئے ان کو سمجھا رہے تھے اور ان کا غصہ ٹھنڈا کر رہے تھے، یہاں تک کہ وہ خاموش ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خاموش ہو رہے۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ میں اس دن بھی سارا دن روتی رہی۔ میرے آنسو نہیں تھمتے تھے اور نہ نیند آتی تھی اور میرے باپ نے یہ گمان کیا کہ روتے روتے میرا کلیجہ پھٹ جائے گا، میرے ماں باپ میرے پاس بیٹھے تھے اور میں رو رہی تھی۔

اتنے میں انصار کی ایک عورت نے اجازت مانگی میں نے اس کو اجازت دی، وہ بھی آکر رونے لگی پھر ہم اسی حال میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور سلام کیا اور بیٹھے اور جس روز سے مجھ پر تہمت ہوئی تھی اس روز سے آج تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس نہیں بیٹھے تھے اور ایک مہینہ یونہی گزرا تھا میرے مقدمہ میں کوئی وحی نہیں اتری تھی۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیٹھتے ہی تشہد پڑھا اور فرمایا۔

"امابعد! اے عائشہ، مجھے تمہاری طرف سے ایسی ایسی خبر پہنچی ہے پھر اگر تم پاکدامن ہو تو عنقریب اللہ تعالیٰ تمہاری پاکدامنی بیان کر دے گا اور اگر تو نے گناہ کیا ہے تو توبہ کر اور اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگ۔ اس واسطے کہ بندہ جب گناہ کا اقرار کرتا ہے اور توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخشش دیتا ہے۔"

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بات مکمل کر چکے تو میرے آنسو بالکل بند ہو گئے یہاں تک کہ ایک قطرہ بھی نہ رہا۔ میں نے اپنے والد سے کہا۔

"آپ میری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دیں۔" تو وہ بولے۔

"اللہ کی قسم میں نہیں جانتا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔" (سبحان اللہ ان کے والد تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب تھے۔ گو ان کی بیٹی کا مقدمہ تھا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دم نہ مار سکے۔ باوجودت زمن آواز نیامد کہ منم)

میں نے اپنی ماں سے کہا "تم میری طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جواب دو۔" تو وہ بولی کہ "اللہ کی قسم میں نہیں جانتی کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا جواب دوں۔"

آخر میں نے خود ہی کہا اور میں کمسن لڑکی تھی۔ قرآن بھی مجھ کو بہت یاد نہ تھا۔ میں نے کہا۔ قسم اللہ کی

میں یہ جانتی ہوں تم لوگوں نے اس بات کو یہاں تک سنا کہ تمہارے دل میں جم گئی اور تم نے اس کو سچ سمجھ لیا۔ (اور یہ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے غصہ سے فرمایا ورنہ سچ کسی نے نہیں سمجھا تھا سوائے تہمت کرنے والوں کے) پھر اگر تم سے کہوں کہ میں بے گناہ ہوں اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ میں بے گناہ ہوں تو بھی تم مجھے سچا نہیں سمجھو گے ——

اگر میں (جھوٹ) گناہ کا اقرار کر لوں (جو میں نے نہیں کیا) اور اللہ جانتا ہے۔

—— میں اس سے پاک ہوں تو تم مجھے سچا سمجھو گے اور میں اپنی اور تمہاری مثال سوا اس کے اور کوئی نہیں پاتی جو یوسف علیہ السلام کے والد (یعقوب علیہ السلام) کی تھی اور عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو رنج میں ان کا نام یاد نہ آیا تو یوسف علیہ السلام کے والد کہا جب انہوں نے کہا کہ "اب صبر ہی بہتر ہے اور تمہاری اس گفتگو پر اللہ ہی کی مدد کی ضرورت ہے۔" پھر میں نے کروٹ موڑلی اور میں اپنے بچھونے پر لیٹ رہی۔

اللہ کی قسم میں اس وقت جانتی تھی کہ میں پاک ہوں، اللہ تعالیٰ ضرور میری پاکی ظاہر کرے گا۔ لیکن اللہ کی قسم مجھے یہ گمان نہ تھا کہ میری شان میں قرآن اترے گا جو (قیامت تک) پڑھا جائے گا کیونکہ میری شان خود میرے گمان میں اس لائق نہ تھی کہ اللہ جل جلالہ، عزت اور بزرگی والا میرے مقدمے میں کلام کرے گا اور کلام بھی ایسا کہ جو پڑھا جائے البتہ مجھے یہ امید تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خواب میں کوئی ایسا مضمون دیکھیں گے جس سے اللہ تعالیٰ میری پاکی ظاہر کر دے گا۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی جگہ سے نہیں اٹھے تھے اور نہ گھر والوں میں سے کوئی باہر گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر وحی بھیجی اور قرآن اتارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کی سختی معلوم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ سردی کے دنوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر سے موتی کی طرح پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے۔ اس کلام کی سختی کی وجہ سے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا (اس لیے کہ بڑے شہنشاہ کا کلام تھا) جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت جاتی رہی۔ (یعنی وحی ختم ہو چکی) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہنسنے لگے اور اول آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ سے یہ کلمہ نکالا اور فرمایا۔

"اے عائشہ! خوش ہو جا اللہ تعالیٰ نے تجھے بے گناہ اور پاک فرمایا ہے۔"

میری ماں نے کہا "کہ اٹھ اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کر" (اور شکر کر)

میں نے کہا۔ "اللہ کی قسم میں تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نہ اٹھوں گی اور نہ کسی کی تعریف کروں گی۔ سوائے اللہ تعالیٰ کے کہ اسی نے میری پاکی اتاری۔"

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا کہ "بے شک جو لوگ بہتان گھڑ لائے ہیں۔ وہ تم ہی میں سے ایک گروہ ہیں اس (واقعے) کو اپنے لیے شر (برا) نہ سمجھو بلکہ تمہارے لیے خیر (اچھا) ہی ہے۔" آخر تک دس آیتوں کو اللہ تعالیٰ نے میری پاکی کے لیے اتارا۔

سیدنا ابوبکر صدیق نے جو مسطح کی قریبی رشتہ داری کی وجہ سے اس پر خرچ کیا کرتے تھے یہ کہا کہ "اللہ کی قسم اب میں اس کو کچھ نہ دوں گا جب اس نے عائشہ (رضی اللہ عنہا) کی نسبت ایسا کہا؟" تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری کہ "تم میں سے جو لوگ فضل اور مقدرت والے ہیں وہ اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ وہ کچھ (نہ) دیں گے اپنے رشتہ داروں اور مساکین اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

حبان بن موسیٰ نے کہا کہ عبداللہ بن مبارک نے کہا کہ یہ آیت اللہ کی کتاب میں بڑی امید کی ہے۔ (کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بخشش کا وعدہ کیا)

سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "اللہ کی قسم میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے بخشے۔" پھر مسطح کو جو کچھ دیا کرتے تھے وہ جاری کر دیا اور کہا کہ "میں کبھی بند نہ کروں گا۔"

(صحیح مسلم)

کچھ غیر مزاحیہ خیالات

ابن انشا

مزاح لکھنا اور مزاح کا سمجھنا دونوں ایک طرح کی سائنس یعنی علم دریاؤ ہیں اور دونوں میں باون بکسوئے لگتے ہیں۔ آپ کسی محفل میں کوئی لطیفہ کہیے بعض تو ایسے جلد باز ہیں کہ فوراً ہی اس پر ہنس پڑتے ہیں۔ اگر لطیفہ کہنے والا کوئی افسر یا سیٹھ واقع ہوا ہو تو لطیفے کے ختم ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتے۔ اس کے برعکس کچھ لوگ بیٹھے خضوع و خشوع سے سنتے رہتے ہیں اور آنکھیں جھپکتے رہتے ہیں اور موقع پاکر پاس والے کو کہنی مار کر پوچھتے ہیں "کیوں بھئی اس میں کیا بات تھی ہنسنے کی؟" تیسری قسم ان دونوں کے بین بین ہے۔ یہ لوگ لطیفہ سنتے ہیں۔ اس پر غور کرتے ہیں۔ اس کا تجزیہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد اپنے کو ہنسنے کی اجازت دیتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک روسی مزاح نگار کی یہ حکایت بہت مشہور ہوئی کہ ایک محفل میں میں نے ایک لطیفہ سنایا کہ ڈاکٹر اپنے مطب میں ایک مریض سے پوچھتا ہے کہ تمہارے پاؤں پر پٹی کیوں بندھی ہے۔ مریض کہتا ہے جناب میرے سر میں درد ہے۔ ڈاکٹر پوچھتا ہے کہ سر کے درد کو پاؤں کی پٹی سے کیا تعلق؟ مریض کسی آواز میں جواب دیتا ہے کہ جناب باندھی تو سر پر ہی تھی لیکن کھسک کر نیچے آ گئی۔

سب لوگ اس پر ہاہا کر کے ہنس دیے۔ سوائے ایک شخص کے جو چپ ٹک ٹک دیکھتا رہا۔ آخر کہنے لگا۔

"اس میں ہنسی کی کیا بات ہے؟ کچھ مجھے بھی بتائیے۔"

میں نے لطیفہ دہرایا۔ وہ پھر بھی نہ ہنسا۔ بولا "دہرایے۔" ڈاکٹر نے یہ کہا۔ مریض نے وہ جواب دیا۔ اس میں ہنسی کا کون سا پہلو ہوا؟"

میں نے کہا۔ "پہلو یہ ہوا کہ وہ بھلا آدمی کہتا ہے کہ پٹی سر درد کے لیے سر پر باندھی تھی۔ کھسکتے کھسکتے پاؤں میں آ رہی۔"

وہ شخص قائل تو نہ ہوا لیکن چپ ہو رہا۔

آدھی رات کو اس نے مجھے فون کیا اور کہا "اس وقت سے میں اس لطیفے پر سوچ رہا ہوں۔ اگر اس نے پٹی سر پر باندھی تھی تو پاؤں میں کیسے آ رہی۔" میں نے فون بند کر دیا۔ دوسرے دن وہ پھر میرے پاس آگیا اور بولا۔ "کیا اس مریض کی ایک ٹانگ تھی؟"

میں نے کہا۔ "نہیں تو، دونوں ٹانگیں تھیں۔"

"پھر اگر پٹی کھسکتی تو دونوں پاؤں میں آتی۔ ایک پیر میں کیسے آئی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

قصہ مختصر یہ کہ وہ صاحب غور کرتے رہ گئے۔ اس لطیفے پر ہنس نہیں سکے۔ ایک اور ایسا ہی قصہ ہم نے پڑھا تھا۔ جس میں مثالیں اپنی طرف سے ڈال کر پیش کرتے ہیں۔ بیان کرنے والے صاحب بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں نے دوستوں کی محفل میں لطیفہ سنایا کہ دو ماہرین ارضیات ایک کیفے میں بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔

"آج سے پندرہ ارب سال بعد سورج بالکل ٹھنڈا ہو جائے گا اور اس کے ٹھنڈا ہونے کے بعد زمین پر سے بھی زندگی کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

ایک شخص پاس کی میز پر بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ اس کے کان میں بھنک پڑی تو کھیل روک کر پوچھا۔

"قبلہ آپ کیا فرما رہے تھے؟"

ان صاحب نے کہا۔ "پندرہ ارب سال بعد اس دھرتی سے زندگی کا نام و نشان مٹ جائے گا۔"

اس شخص نے اطمینان کی سانس لی اور کہا۔ "پندرہ ارب سال۔ پھر تو بہت دن پڑے ہیں۔ میں سمجھا آپ نے پندرہ کروڑ سال کہا ہے۔"

اس پر جن کو ہنسنا تھا، وہ تو ہنس دیے لیکن ایک پروفیسر صاحب چپ بیٹھے رہے جیسے کسی غور و فکر میں غلطاں ہوں۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے سر ہلایا اور کہا۔ "ہاں اچھا لطیفہ ہے۔ لطیفے کی شرائط پر پورا اترتا ہے۔"

ہم نے کہا۔ "کیا مطلب؟"

بولے۔ "اگر ہم ارسطو کے قول کو تسلیم کریں تو لطیفہ وہ چیز ہوتی ہے جس میں ہم کسی کی ایسی خامی، کوتاہی یا بے ربطی بیان کریں جس سے کسی کو گزند نہ پہنچے ہو یا کسی کی دل آزاری نہ ہوتی ہو۔ تو یہ لطیفہ اس پر پورا اترتا ہے۔ سورج کا بتدریج ٹھنڈا ہونا ایسے ہی مظاہر میں سے ہے۔"

ہم نے کہا۔ "خوب۔"

"اگر ہم غالب کی بات کو درست مانیں جو کہتے ہیں۔

"بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے۔۔۔ یا

"جز وہم ہستی اشیا مرے آگے۔" تب بھی یہ لطیفہ خوب ہے کیونکہ جب ہر چیز موہوم ہے تو سورج بھی موہوم ہے۔ اس کے ٹھنڈے یا گرم ہونے سے کسی کو کیا مطلب؟"

ہم نے اس نکتے کی داد دی۔ پروفیسر صاحب نے مزید فرمایا۔

"اس لطیفے کو علمائے معاشیات کی کسوٹی پر کسیں تب بھی تسلی بخش قرار پائے۔ کیونکہ انسان کی عمر پندرہ ارب یا پندرہ کروڑ سال کیا۔ پندرہ سو سال بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ان تاش کھیلنے والے صاحب کی سادگی اسی لائق ہے کہ اسے مضحکہ خیز گردانا جائے اور اس پر ہنسا جائے۔"

ہم نے کہا۔ "بہت عمدہ تجزیہ ہے یہ بھی۔" لیکن پروفیسر صاحب نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ ایک حوالہ اقبال کے کلام سے دیا۔ ایک قول سر سید احمد خان کا دہرایا۔ حتیٰ کہ چوہدری خلیق الزماں، رائے صاحب منشی گلاب سنگھ، حافظ شیرازی، سیماب اکبر آبادی اور فضل القادر چوہدری کے اقوال حکمت سے بھی اس لطیفے کو جانچا اور ان سب معیاروں پر پورا پایا تو اس پر ہنسے۔ خوب ہنسے، پیٹ پکڑ کر ہنسے حتیٰ کہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

مزاح نگاروں کے ساتھ اکثر یہ ہوتا ہے کہ کوئی بات بہت لطیف پیرائے میں کہی۔ کسی کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔ کسی کے نیچے سے۔ اسی لیے اب یہ رواج ہو گیا ہے کہ رسالوں اخباروں والے کوئی مزاحیہ مضمون چھاپتے ہیں تو اس کے اوپر لکھ دیتے ہیں۔ طنز و مزاح۔ یعنی یہ مزاحیہ مضمون ہے اس پر ہنسیے ضرور۔ آگے چل کر حاشیے میں تیر کا نشان بنا کر یہ بھی لکھا جایا کرے گا کہ یہاں ہنسیے۔ یہاں مسکرائیے۔ یہاں سنجیدہ رہیے۔ جب سے ہنسنا ہنسانا ایک طبعی کیفیت کے بجائے ضرورت زندگی میں شمار کیا جانے لگا اور انڈسٹری بن گیا ہے۔ تب سے اس قسم کا مزاح عام ہو گیا ہے۔ جو مشینوں سے بنا ہوتا ہے اور تیاری کے کسی مرحلے میں ہاتھ سے نہیں چھوا جاتا۔

یہ خیالات پریشان ہمارے ذہن میں کیوں آئے۔ ایک تو اس لیے کہ لوگ اکثر ہمیں سے ہماری تحریروں کے بچے اور معنی پوچھتے ہیں جن باتوں پر برا نہ ماننا چاہیے ان پر مانتے ہیں اور جن پر ناراض ہونا چاہیے ان پر نہیں ہوتے۔ دوسرے اس لیے کہ آج کل ہم ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔ جس سے ارسطو اور حافظ شیرازی، سر سید احمد خان اور سیماب اکبر آبادی کے اقوال کے حوالوں کے بغیر بھی لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے۔ وہ ہے مشتاق احمد یوسفی کے مضامین ناز۔ کا انبار۔ خاکم بدہن۔ لکھنے والے تو بہت سے ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ لیکن دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا۔

غریدہ فاروقی

شاہین رشید

نیوز کا شعبہ ہمیشہ سے ہی اہم رہا ہے۔ حالات و واقعات سے باخبر رہنا ہر کوئی چاہتا ہے۔۔۔ جس زمانے میں صرف پی ٹی وی کا راج تھا۔ اس وقت شام چھ بجے انگریزی میں اور رات نو بجے اردو میں خبریں ہوا کرتی تھیں۔ بھی دنوں، مہینوں میں کوئی بہت ہی غیر معمولی خبر آجاتی تھی تو بریکنگ نیوز کے طور پر نشریات روک کر نشر کردی جاتی تھی۔ مگر اب ایسا نہیں ہے، اب نیوز کے لیے علیحدہ چینل ہیں اور رہی بریکنگ نیوز تو اب ہر خبر بریکنگ نیوز بن گئی ہے۔

مشہور مقولہ ہے کہ اگر شکل اچھی نہیں ہے تو بات تو اچھی کرنی چاہیے مگر اب یہ مقولہ کچھ یوں غلط ہو گیا ہے کہ شکل تو اچھی ہوتی ہے مگر بات اچھی نہیں ہوتی۔۔۔ نیوز پڑھنے والی خوش شکل اور اسمارٹ لڑکیاں عموماً بری خبروں سے ہی آگاہ کر رہی ہوتی ہیں۔ پاکستان کے حوالے سے تو کم ہی اچھی خبریں آتی ہیں ہاں! دوسرے ممالک کی خبریں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دوسرے ممالک کتنی ترقی کر رہے ہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی بری خبر اور اچھی شکل کی۔ غریدہ فاروقی بھی انہی میں سے ہیں جو اچھی شکل کے ساتھ بری بری خبریں پڑھتی ہیں۔

"کیسی ہیں غریدہ۔۔۔ اور آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟"

"جی! بالکل ٹھیک ٹھاک۔۔۔ اور میرے نام کا مطلب "بلبل" یا چہچہانے والا پرندہ ہے اور میرا خیال ہے کہ انسان کی شخصیت پہ نام کا بہت اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ میں بھی خوش رہتی ہوں۔"

"عموماً" اسکرین پہ نظر آنے والے اپنی عمر سے بھی بڑے نظر آتے ہیں اور جسمانی طور پر بھی صحت مند مگر آپ ان دونوں باتوں کی نفی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں تو حقیقت میں تو آپ اور بھی زیادہ دبلی اور کم عمر نظر آتی ہوں گی۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں حقیقت میں بھی بہت دبلی ہوں اور جو لوگ مجھ سے ملتے ہیں وہ یہی کہتے ہیں کہ آپ اسکرین پہ کچھ بہتر نظر آتی ہیں اور جہاں تک عمر کی بات ہے تو میں کبھی بھی اپنی عمر نہیں چھپاتی میں 1983ء کی پیدائش ہوں اور یہ تو اللہ کی دین ہے کہ میں عمر میں کم نظر آتی ہوں اور یہ بھی اللہ کا کرم ہے مجھ پر کہ میں دبلی پتلی، اسمارٹ ہوں۔ اب آپ بابرہ شریف اور ماہ نور بلوچ کو ہی دیکھ لیں، اپنی عمر سے کافی کم نظر آتی ہیں۔ تو اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کو انجوائے کرنا چاہیے۔"

"آپ کا ویٹ بھی خاصا کم لگتا ہے؟"

"جی! میرا ویٹ 48kg ہے اور مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میرے امی ابو نے بہت اصرار کیا کہ خدا کے لیے اپنا ویٹ تھوڑا بڑھا لو کیونکہ تم تو بالکل بھی کھاتے پیتے گھرانے کی چشم و چراغ نہیں لگتیں۔ اس وقت میرا ویٹ 45kg تھا۔ امی مجھے نیوٹریشنسٹ کے پاس لے گئیں تو انہوں نے کہا کہ ان کا ویٹ اپنی ہائیٹ اور ایج کے مطابق بالکل ٹھیک ہے۔ یہ کوئی تین چار سال پہلے کی بات ہے۔"

"آپ کی طرف آنے سے پہلے، آپ کے فیملی

بیک گراؤنڈ کے بارے میں جاننا چاہوں گی۔"

"جی۔۔۔ کشمیر سے ہمارا تعلق ہے اور رہائش ملتان میں ہے۔ والدین حیات نہیں ہیں۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ تین بہنیں اور دو بھائی میرا نمبر آخری ہے۔ سوائے میرے باقی سب ماشاء اللہ شادی شدہ ہیں۔ میری والدہ ہاؤس وائف تھیں جبکہ میرے والد صاحب "ریاض یونیورسٹی" سعودی عرب میں عربی اور اسلامیات کے پروفیسر تھے اور ان ہی ڈپارٹمنٹ کے وہ انچارج بھی تھے۔ میں 12 اپریل 1983ء کو ریاض میں پیدا ہوئی۔ ابتدائی تعلیم بھی ریاض میں ہی حاصل کی اور جب میں طالبہ تھی تو ہم لوگ پاکستان شفٹ ہو گئے۔"

"عموماً" یورپ اور امریکا میں پیدا ہونے والے پاکستان اس لیے واپس آتے ہیں کہ وہاں کا ماحول گھر والوں کے لیے ساز گار نہیں ہوتا۔ آپ ایک اسلامی ملک سے پاکستان آئیں وجہ؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی، بس والدین نے فیصلہ کر لیا کہ پاکستان جانا ہے اور میری امی چونکہ میری نانی اماں کے بہت قریب تھیں۔ وہ بھی پہلے ریاض میں ہی تھیں، لیکن ان کا وہاں دل نہیں لگا تو وہ پاکستان آ گئیں تو امی نے بھی پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔۔۔ ایک یہی وجہ تھی اور ویسے بھی جہاں قسمت لے جاتی ہے انسان کو جانا پڑتا ہے۔ ہمیں پاکستان آنا تھا، سو آ گئے۔ ملتان میں رہائش ہوئی۔ یہاں کے کانونٹ مشنری اسکول میں داخلہ لیا اور میٹرک کیا۔ پھر انٹر، بیچلر اور ماسٹرز بھی ملتان سے ہی کیا۔ بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی سے ماسٹرز کیا انٹرنیشنل ریلیشنز میں۔"

"ملتان سے کراچی تک کا سفر کیسے کیا؟"

"یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مگر مختصراً بتاتی ہوں۔ انسان رزق کی تلاش میں گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا ہے والد صاحب کا تعلق چونکہ شعبہ تعلیم سے تھا تو ابھی میں ماسٹرز کے پیپرز کی تیاری کر ہی رہی تھی کہ "ہائر ایجوکیشن کمیشن" نے ایک جاب اناؤنس کی جو کہ چھ ماہ کی تھی۔ والد صاحب نے کہا کہ یہاں اپلائی کر دو۔ میں

نے اپلائی کیا اور مجھے جاب مل گئی۔ میں اسلام آباد آگئی اور یہاں سے میری کیریر لائف شروع ہوئی۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن میں ایک پرانے کولیگ سے ملاقات ہو گئی جو کہ مجھ سے سینئر تھے۔ وہ پی ٹی وی میں کام کرتے تھے۔ انہوں نے پی ٹی وی جوائن کرنے کی آفر دی۔ میں نے آڈیشن دیا اور سلیکٹ ہو گئی اور یوں میڈیا کا سفر شروع ہوا۔ میڈیا میں آنے کا میرا بالکل ارادہ نہیں تھا بلکہ سی ایس ایس کے پیپرز دے کر فارن سروس یا یونائیٹڈ نیشن کی جاب کرنے کی خواہش تھی۔ مگر پھر جب میڈیا میں آگئی تو بس ادھر کی ہی ہو گئی۔"

"پی ٹی وی سے جیو.... یہ کیسے ممکن ہوا اور شروع سے ہی آپ نیوز سے وابستہ ہیں؟ ٹریننگ ہوئی؟"

"یہ اس طرح ممکن ہوا کہ پی ٹی وی کے بعد اے ٹی وی سے آفر آئی تو وہاں چلی گئی۔ پھر دنیا ٹی وی لاہور میں لاؤنچ ہوا تو وہاں سے آفر آگئی۔ ابھی مجھے دنیا چینل جوائن کیے پندرہ بیس دن ہی ہوئے تھے کہ جیو سے آفر آگئی اور اب میں جیو میں ہی ہوں۔ میں شروع سے ہی نیوز سے وابستہ ہوں اور جہاں تک ٹریننگ کی بات ہے تو جہاں جہاں گئی' وہاں کے لوگوں سے بہت کچھ سیکھا۔ خاص طور پر "پی ٹی وی" اور "اے ٹی وی" سے بہت سیکھا اور نیوز اینکری کی بنیاد ہی وہاں سے بنی۔ الفاظ کی ادائیگی' اتار چڑھاؤ' تلفظ کی درستی وغیرہ سیکھی اور اب جو کچھ سیکھ رہی ہوں' وہ جیو سے سیکھ رہی ہوں۔ جیو نے میچور کر دیا ہے اس شعبے میں۔"

"میڈیا کی فیلڈ بہت وسیع ہے۔ اداکاری کی طرف یا ماڈلنگ کی طرف یا کسی اور شعبے میں جانے کا سوچا آپ نے؟"

"مجھے بہت آفرز آئیں۔ خاص طور پر ڈراموں میں ایکٹنگ اور ماڈلنگ کی لیکن مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے.... ویسے بھی ماڈلنگ اور ایکٹنگ بہت گلیمرس فیلڈ ہے۔ جبکہ نیوز اینکر کی شخصیت بہت مختلف ہوتی ہے۔ سوبر' ڈیسنٹ' بردبار وغیرہ۔ میری شخصیت ویسے بھی ماڈلنگ والی ہے ہی نہیں اور مجھے اس کام میں اب اتنا مزا آتا ہے کہ میں گلیمرس فیلڈ میں آنے کا سوچتی بھی نہیں ہوں۔"

"پہلی خبر آپ نے لائیو پڑھی تھی یا ریکارڈنگ کروائی تھی؟"

"پہلی خبر میں نے لائیو ہی پڑھی تھی۔ پی ٹی وی پہ بھی سب کچھ لائیو ہوتا تھا۔ اے ٹی وی کی پہلی خبریں میں نے ہی پڑھی تھی۔ پی ٹی وی اور اے ٹی وی دونوں کا سیٹ اپ لائیو کا ہی تھا اور یہ بات ہے 2004ء اور 2005ء کی۔"

"بریکنگ نیوز کا ٹرینڈ پرائیویٹ چینلز نے ہی دیا۔ بریکنگ نیوز کے لیے کوئی خاص ٹریننگ ہوتی ہے کہ خبر کو اس طرح بریک کرنا ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ گزشتہ دو تین سالوں میں یہ ٹرینڈ آیا ہے۔ جب میں نے 2009ء میں جیو جوائن کیا تھا تو بریکنگ نیوز کا اتنا ٹرینڈ نہیں تھا جتنا کہ اب ہو گیا ہے اور اس کے لیے کسی ٹریننگ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہاں جیو میں تو ہر وقت سکھاتے رہتے ہیں کہ فلاں نیوز کو کس طرح بریک کرنا ہے۔ اس خبر کا بیک گراؤنڈ یہ ہے تو سیکھتے سیکھتے بہت کچھ آجاتا ہے اور نیوز کاسٹر خود بھی "نیوز فوکس" ہو جاتا ہے۔"

"اب بریکنگ نیوز کا کوئی معیار نہیں رہا ہے۔ بالکل عام سی خبر کو بھی بریکنگ نیوز بنا دیا جاتا ہے۔ کسی کو چار چھینکیں آگئیں۔ کوئی چلتے چلتے پھسل کر گر گیا۔ بریکنگ نیوز ہو جاتی ہے۔"

"میں آپ کی بات سے اتفاق کرتی ہوں۔ اب تو گدھا یا بھینس بھی نالے میں گر جائے تو بریکنگ نیوز ہو جاتی ہے۔"

"معاف کیجیے گا! پھر ایک ہی سانس میں اتنا گھبرا کے بتاتے ہیں کہ جیسے پتا نہیں کیا طوفان آگیا ہے اور خبر کوئی اتنی خاص نہیں ہوتی۔"

"دیکھیں! بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جو آپ کو ناپسند ہوتی ہیں لیکن آپ کو کرنا پڑتی ہیں مجبوری کے تحت۔ اگر مجھ سے آپ میری ذاتی رائے پوچھیں گی تو

میں اس چیز کے خلاف ہوں کہ ہر خبر بریکنگ نیوز نہیں ہوتی۔ لیکن میں جس ادارے میں کام کرتی ہوں اس ادارے کی پالیسی کے تحت کام کرنا میرا فرض ہے چاہے وہ مجھے صحیح لگ رہا ہو یا غلط۔ وہ میرے کام کا حصہ ہے۔ اور مجھے جب بھی کہیں بات کرنے کا موقع ملتا ہے ذاتی حیثیت سے یا کسی فورم میں تو میں یہی بات کرتی ہوں کہ جتنے بھی ہمارے مینجمنٹ کے لوگ ہیں اور جتنے بھی سینئر لوگ ہیں' وہ ایک جگہ بیٹھیں ایک میٹنگ کریں اور یہ ڈیسائیڈ کریں کہ ہماری کیا پالیسی ہونی چاہیے اور ہر خبر بریکنگ نیوز نہیں ہونی چاہیے۔ اس طرح سوسائٹی میں انتشار اور ڈپریشن پھیلتا ہے۔"

"کوئی بریکنگ نیوز جو آپ کے لیے یادگار ہو گئی ہو؟"

"اگر تھوڑے عرصے پہلے کی بات کروں تو "ریمنڈ ڈیوس" کی رہائی کی خبر میں نے بریک کی تھی اور وہ نیوز واقعی بریکنگ نیوز تھی کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ "ریمنڈ ڈیوس" کو رہا کر دیا جائے گا.... وہ ڈیڑھ گھنٹے کی ٹرانسمیشن تھی۔ مہران بیس پہ حملہ ہوا تھا۔ وہ بھی میں نے بریک کی تھی اور جب "ٹی 20" کرکٹ میں پاکستان چیمپئن بنا تھا تو اس اچھی خبر کو بھی میں نے ہی بریک کیا تھا۔ ہماری بڑی بدقسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں اچھی خبریں کم ہی آتی ہیں۔"

"ایک نیوز کاسٹر کا کیا کام ہوتا ہے؟ آئے' میک اپ کرایا' نیوز پڑھی اور چلے گئے یا کچھ اور بھی ہوتا ہے؟"

"میں اس چیز کے بالکل خلاف ہوں کہ آپ گلیمرس مرد اور خواتین کو اکٹھا کر لیں اور ان کی شکل اور فیشن کی بنیاد پر آپ انہیں اسکرین پہ بٹھا دیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ لوگ اسی چہرے کو دیکھنا چاہتے ہیں جو اچھا دکھائی دیتا ہے.... یہ ایک ضرورت ہے۔ لیکن نیوز اینکر کے لیے خوب صورتی اور گلیمر سے ہٹ کر ذہین ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اس کے پاس نالج ہونی چاہیے کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے۔ اس کے شہر میں' اس کے ملک میں' اس کے خطے میں اور دنیا میں.... اور آج کل تو نیوز اتنی تیزی سے ڈیولپ ہو رہی ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اگر آج کوئی واقعہ ہوا ہے تو کل اس واقعے میں اور ڈیولپمنٹ آجائے گی۔ اس لیے آپ کو یاد ہونا چاہیے کہ کل پرسوں یہ واقعہ اس انداز میں ہوا تھا تاکہ آپ لوگوں کو بتا سکیں۔ ہمارے لوگوں کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ وہ ہر بات کو یاد رکھیں تو ہم ان کی ڈائریکٹری ہوتے ہیں۔ اگر کوئی اس شعبے میں آنا چاہتا ہے تو اس کے پاس ذہانت کا ہونا بہت لازمی ہے۔"

"خبریں پڑھنے کے دوران کوئی حماقت ہوئی یا کوئی خاص واقعہ پیش آیا؟"

"بہت سے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ کبھی سانس نہیں ٹوٹا کیونکہ اس کی اچھی خاصی پریکٹس ہے۔ البتہ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ اسٹوڈیو میں ایک مچھر آگیا۔ وہ بڑا مچھر نہیں تھا بلکہ چھوٹا مچھر تھا اور میں نیوز پڑھ رہی تھی کہ وہ میرے منہ کے اندر آگیا۔ میں آن کیمرہ تھی۔ وہ سیدھا میرے حلق میں گیا۔ مجھے کھانسی آئی اور کھانسی کی وجہ سے خبر بھی ڈسٹرب ہوئی اور پھر بھی مجھے نگلنا پڑا۔ پانی بھی نہیں تھا کیونکہ پانی

رکھنا منع ہوتا ہے' اس لیے کہ وہ گر بھی سکتا ہے اور اس کے گرنے سے ہمارے پاس رکھی ہوئی چیزیں خراب ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔۔۔ خیر اس وقت تو مچھر نگل لیا' مگر بعد میں کافی ابکائیاں آئیں یہ سوچ کر کہ میں نے مچھر نگل لیا ہے۔"

"لوگ تو یقیناً" آپ کو پہچان لیتے ہوں گے۔ کیا کہتے ہیں جب آپ سے ملتے ہیں؟ آپ کی تعریف کرتے ہیں یا اپنے مسائل بتاتے ہیں؟"

"بالکل پہچان لیتے ہیں۔ بہت تعریف کرتے ہیں اور جب تعریف سے دل بھر جاتا ہے تو پھر اپنے مسائل کی طرف بھی آجاتے ہیں۔ تعریف سن کر بہت اچھا لگتا ہے اور ان کے مسائل سن کر افسوس ہوتا ہے ان کی بے بسی پہ۔ لوگ بریکنگ نیوز پہ بھی بات کرتے ہیں اور ہمارا میڈیا کس لائن پہ جارہا ہے' اس پر بھی ضرور بات کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں سب کچھ برا نہیں ہو رہا۔ کچھ اچھا بھی ہو رہا ہے مگر ہم اسے کم دکھاتے ہیں۔ جیو اس لحاظ سے قابل تعریف ہے کہ ہمارے ملک میں جو خوب صورت مقامات ہیں' وہ دکھاتا ہے۔ جو اچھے کام ہو رہے ہیں' ان کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔"

"فیوچر پلان کیا ہیں آپ کے؟"

"میرا پلان ہے کہ ابھی چند سال میں نیوز اینکر ہی رہوں گی۔ ویسے کبھی کبھار میں دیگر پروگرامز بھی کرتی ہوں اور ان شاء اللہ دو تین سالوں کے بعد میں دوسرے پروگرامز میں شفٹ ہونا چاہوں گی' کیونکہ ہر انسان کو آگے بڑھنا چاہیے۔ یہ اس کا حق ہے۔"

"کراچی کا موسم اور انسان کا موڈ کسی وقت بھی خراب ہو سکتا ہے۔ تو جب آپ خراب موڈ کے ساتھ اسٹوڈیو آتی ہیں تو پھر نیوز پڑھنے میں کوئی پرابلم ہوتی ہے؟"

"موڈ بالکل خراب ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم بھی عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں۔ حالات' واقعات معاملات موڈ پر بہت اثر انداز ہوتے ہیں لیکن فرق کہاں پہ آجاتا ہے' جب ہم کیمرے کے سامنے آجاتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے سامنے اس طرح نظر آنا ہوتا ہے کہ لوگوں کو اچھا لگے۔ اگر ہم پریشان چہرے کے ساتھ سامنے آئیں گے تو لوگوں کو اچھا نہیں لگے گا وہ مصرعہ ہے نا کہ "ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ" تو یہی حال ہمارا ہے۔"

"مارننگ شوز کی اینکرز ہوں یا دیگر آرٹسٹ۔ وہ کسی نہ کسی بوتیک کے کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہوتی ہیں' کیونکہ بوتیک کا نام لکھا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کو بھی ایسی سہولت ہے؟"

"نہیں جی! ہمیں ایسی کوئی سہولت نہیں ہے۔ ہمیں کپڑے آفس والے دیتے ہیں۔ ہمارا اپنا ایک فیشن ڈپارٹمنٹ ہے جو ہمیں کپڑے دیتا ہے اور ہمیں وہ ڈریسز دو تین مہینے کے پیریڈ کے لیے دیے جاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو ہمارے اکثر جوڑے repeat نظر آتے ہیں۔۔۔ ہمیں دو تین مہینے کے بعد جوڑے ملتے ہیں۔ ہم اس پر بہت خوش ہیں۔"

"بچپن سے لے کر آج تک آپ مزاج کی کیسی رہی ہیں؟"

"بچپن میں بہت شرارتی تھی۔ عمر کے ساتھ ساتھ شرارتیں بھی کم ہوتی گئیں۔ بچپن میں چہرے پر معصومیت بہت تھی' بلکہ بھولپن کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ اس بھولپن کی وجہ سے میں شرارتی لگتی نہیں تھی اور اس کا میں فائدہ اٹھاتی تھی۔ بچپن میں بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر بہت شرارتیں کیں۔ لوگ مجھ سے ملتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ میں بہت سنجیدہ طبیعت کی مالک ہوں تو ایسا نہیں ہے جہاں میری فیملی ہوتی ہے' میرے اچھے ملنے والے ہوتے ہیں یا میرے اچھے دوستوں کا سرکل ہوتا ہے' وہاں میں بہت انجوائے کرتی ہوں اور مزاج کی ہمیشہ اچھی رہی ہوں۔"

"فضول خرچ ہیں۔۔۔ کن چیزوں پہ زیادہ خرچ کرتی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن اگر کہیں اچھے جوتے نظر آجائیں تو پھر ہاتھ نہیں رکتا اور خرید لیتی ہوں۔ میری فضول

خرچی میرے جوتوں کی حد تک ہی ہے۔ باقی تو خرچ چلتا ہی رہتا ہے۔"

"کچن سے دوستی ہے؟"

"بہت زیادہ دوستی ہے اور یہ لگاؤ تب ہوا جب سر پر پڑی۔ جب تک امی' ابا حیات تھے تب تک اماں زور دیتی تھیں کہ کچھ پکانا سیکھ لو' تمہارا ہی فائدہ ہے مگر اس وقت کہاں یہ نصیحت اچھی لگتی ہے' لیکن جب گھر سے نکلی جاب کے لیے اور دو چار دن باہر کا کھانا کھانا پڑا تو احساس ہوا کہ یہ تو بہت مہنگا پڑے گا۔ تب میں ایسا کرتی تھی کہ امی کو فون کرتی تھی اور ان کی ہدایات پہ کھانا پکاتی جاتی تھی۔ اس طرح سے میں نے کھانا پکانا سیکھا اور ماشاء اللہ میں اب بہت اچھا پکا لیتی ہوں اور مجھے پکانے سے لگاؤ بھی بہت ہو گیا ہے۔ جس دن میں گھر پہ ہوتی ہوں۔ اس دن کچن ہوتا ہے اور گھر کی صفائی ہوتی ہے اور یہ سب کچھ کر کے بہت اچھا لگتا ہے۔"

"والدین آپ کے حیات نہیں۔ کیا ہوا تھا انہیں؟"

"میرے والد صاحب شوگر کے مریض تھے اور ہارٹ کے مریض بھی تھے۔ جبکہ والدہ کو بلڈ پریشر تھا تو بلڈ پریشر کی وجہ سے ان کو "برین ہیمرج" ہو گیا تھا۔ بس دونوں کو ہی جلدی تھی اوپر جانے کی۔"

"زندگی آسودگی میں گزری یا جدوجہد میں؟"

"اللہ کا بہت شکر ہے بہت آسودگی میں زندگی گزری۔ میں جب لوگوں کو دیکھتی ہوں اور ان کی کہانیاں سنتی ہوں کہ وہ کتنی محنت کے بعد مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں تو مجھے احساس ہوتا ہے کہ مجھے تو کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔"

"اور شادی کیوں نہیں کی آپ نے؟"

"شادی کا ڈپارٹمنٹ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور زمین پر ماں باپ کے ہاتھ میں تو ماں باپ تو رہے نہیں۔۔۔ اس لیے سب کچھ اللہ تعالیٰ پہ چھوڑا ہوا ہے۔ جب وہ چاہے گا' شادی بھی ہو جائے گی۔"

"سیاست سے لگاؤ ہے؟ اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"بہت زیادہ لگاؤ ہے اور جو بھی نیوز کی طرف آئے گا' وہ اسی وجہ سے آئے گا کہ اسے سیاست سے لگاؤ ہو گا۔۔۔ تو جس کو جس شعبے سے دلچسپی ہوتی ہے' وہ اسی طرف جاتا ہے۔ سیاست سے مجھے بہت دلچسپی ہے اور میں یہ کہنا چاہوں گی کہ مجھے آپ بہت اچھی لگی ہیں تو"

"اچھا۔۔۔ میں؟ یہ بھی سیاست ہے کیا؟"

(قہقہہ) "نہیں نہیں! یہ سیاست بالکل نہیں ہے۔ چونکہ آپ نے سوال کیا کہ کچھ اور کہنا چاہیں گی تو میں یہ ہی کہنا چاہوں گی کہ آپ بہت فرینڈلی ہیں اور پڑھنے والوں سے' آپ دیکھنے والوں سے میں یہ کہنا چاہوں گی کہ پاکستان بہت اچھا ملک ہے۔ ہماری پہچان ہے اس کے لیے پوزیٹو سوچ رکھیں۔ اب میڈیا کے ذریعے دنیا بہت زیادہ ڈیولپ ہو چکی ہے اس لیے پاکستان کے لیے اچھی باتیں پروموٹ کرلیں۔ اچھا کرنے کی کوشش کریں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے فریدہ فاروقی سے اجازت چاہی' اس شکریہ کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں ٹائم دیا اپنی مصروفیات کے باوجود۔

☆

نادرہ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

سائرہ حیدر۔۔۔ نامعلوم شہر

خواتین ڈائجسٹ ملا۔ زبردست تھا۔ سب سے پہلے فرحت اشتیاق کی تحریر پڑھی۔ کمال کی تھی۔ کہانی بہت خوب صورتی سے چل رہی ہے۔ نگہت عبداللہ کے ناول میں کچھ نیاپن نہیں جھلک رہا ہے۔ افسانے اچھے تھے' البتہ عنیقہ محمد جی نے تو ہمیشہ ہی منفرد اور کمال کا پلاٹ دیا۔ ویل ڈن عنیقہ۔ لڑکی کی سب سے بڑی دولت عزت ہے' آخری لائن ذہن پر چھائی رہی۔ کہانی بھجوانے کا طریقہ بتادیں۔

ج سائرہ! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔
اپنی کہانی ضرور بھجوائیں۔ لفافے پر لکھیں۔
خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی
بذریعہ ارجنٹ میل سروس پوسٹ کردیں۔

سحرش خان بھٹو۔۔۔ میرپور بھٹو لاڑکانہ

فرحت آپی کمال کردیا آپ نے۔ "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بلاشبہ دل کو چھو جانے والی تحریر ہے۔ ہم تو پہلے ہی آپ کے فین ہیں' مگر اس ناول کو لکھ کر تو آپ ہمارے دل کی ملکہ بن گئیں۔ مابدولت بھی رائٹر ہیں اور سندھ کے اک مشہور میگزین میں میری کہانیاں چھپتی ہیں' کیا ہم اپنی کہانی بھجوا سکتے ہیں۔

ج پیاری سحرش! آپ اپنی کہانیاں' ناولٹ ضرور بھجوائیں۔ ہم شائع کریں گے۔ ادارہ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہونے والی تحریروں پر ہم نام یا شہر دیکھ کر شائع نہیں کرتے۔ بس یہ ہے کہ تحریر معیاری ہو۔ یہ خیال دل سے نکال دیں کہ یہاں کسی سے کوئی امتیاز برتا جاتا ہے۔ یا کسی کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے۔
فرحت اشتیاق تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔
اپنی کہانی کے لیے آپ 021-32721666 پر فون کرکے پتا کرلیں۔

ربیعہ۔۔۔ گجرات

ہشتم کلاس میں تھی' جب میں اپنی ایک کلاس فیلو سے ایک رسالہ لے کر آئی تھی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ چلتا رہا۔ امی سے ڈانٹ کھائی' لیکن میں نے پڑھنا نہ چھوڑا تب ایک دن ہماری ایک رشتے دار ہمارے گھر آئیں۔ امی نے ان سے کہا کہ یہ رسالوں کی جان نہیں چھوڑتی وہ محترمہ فرمانے لگیں۔ خالہ ان رسالوں میں غلط بات نہیں ہوتی' بلکہ لڑکیوں کو پڑھنے چاہئیں۔ اس وقت انہوں نے جو مثال امی کو دی تھی' وہ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ ان رسالوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ ان رسالوں کو پڑھنے کے بعد میرا خیال ہے کہ اگر عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا تو گھر تو مرد کا بھی نہیں ہوتا۔ خواہ مرد ہو یا عورت' زندگی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں ہیں جنہیں زندگی اپنی مرضی سے نچاتی ہے۔ ایک بات ٹھیک ہے قربانی زیادہ عورت کو ہی دینی پڑتی ہے۔ اور خسارے بھی اسی کے حصے میں آتے ہیں۔ آپ کے تینوں رسالے مجھے بے حد پسند ہیں' لیکن سب سے زیادہ خواتین پڑھتی ہوں۔ دو' تین ماہ سے خرید نہیں سکی کیونکہ اب میں "ویلی" ہوں۔ یعنی کماتی نہیں ہوں میرے لیے دعا کریں کہ سب سے پہلے خدا میرے بھائی کو ذہنی' جسمانی صحت تندرستی عطا فرمائے۔ مجھے بھی اچھی سی نوکری مل جائے' میں بی ایڈ کرچکی ہوں۔ اب ایم اے کررہی ہوں۔ مجھے رفعت ناہید سجاد کا ناول بے حد پسند ہے۔ اس کے علاوہ محبت خواب سفر' بیلی راجپوتاں۔۔۔ کی ملکہ اور مصحف بھی' میرے پسندیدہ ناول ہیں۔

ج ربیعہ! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں' اللہ تعالیٰ آپ کے بھائی کو کامل صحت عطا فرمائے اور آپ کو زندگی کی ساری خوشیاں نصیب ہوں۔ (آمین)
خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے ممنون ہیں۔

رضوانہ شکیل رائے۔۔۔ لودھراں

سرورق پر غلافی آنکھوں والی ماڈل اور پنک کلر نے چار چاند لگا دیے۔ سفال گر پر آمنہ زریں کا تبصرہ اتنی تفصیلات اور ربط کے ساتھ تھا کہ پڑھ کر مزا آگیا۔ طبیعت خرابی کی بنا پر طویل تبصرہ نہیں کرسکوں گی اس ماہ کی خواتین کے بیک سائیڈ پر بن سلک کی ماڈل گرل کی خوش نما شکل اور اسٹائل نے ذہن پر بڑا خوشگوار تاثر چھوڑا' جسے دیکھ کر دل تو کیا میں بذات خود بلیوں اچھل پڑی کہ اب ہماری نئی جنریشن فیشن کے طور پر ہی سہی اسکارف تو سر پر لے گی۔ بشریٰ جی کوئی الفاظ نہیں مل رہے کہ آپ کی تعریف کے لیے۔ ویل ڈن اچھا ناول لکھنے پر۔

ج رضوانہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ (آمین)
خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

محمل نعیم۔۔۔ کراچی

آپ کے پرچے کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ ناول وغیرہ سے ہٹ کر حدیث مبارک سے بہت سے ذہن کھلتے ہیں۔ سب سے زیادہ اطمینان حدیث کے مستند ہونے پہ ہوتا ہے۔ چاہ کر بھی خواتین پر تنقید نہیں کرسکتی۔ سب سے پہلے احادیث نبوی سے فیض حاصل کیا۔ اس کے بعد دوڑ لگائی۔ راحت جبیں کا ناولٹ ساری بھول ہماری تھی۔ بہت زبردست ناولٹ ہے۔ فرحت اشتیاق کا ناول بہت زبردست ہے۔ اس میں مجھے لیزا کا کردار بہت پسند ہے۔ ایک ادھوری بات زہرہ ممتاز کی زبردست تحریر تھی۔ صوفیہ بشیر کی توبہ بھی اچھی تھی۔ اب بات کرتی ہوں اپنی پسندیدہ رائٹر نگہت عبداللہ ان کے ناول کے بارے میں' میں اتنا کہوں گی' یہ وہ واحد ناول ہے جسے پڑھتے ہوئے میں کبھی بھی بوریت کا شکار نہیں ہوئی۔ اس بار افسانے سارے ہی زبردست تھے' رفعت ناہید صاحبہ چراغ آخری شب میں پاکستان کی تاریخ کو دہرا رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ہم خود ان مسائل کا سامنا کررہے ہیں جو اس وقت کے بڑے بزرگوں نے سہا تھا۔ آپی نایاب جیلانی سے کہیں کہ وہ ہمارے لیے زبردست سا ناول لکھیں۔ نمرہ احمد کہاں غائب ہیں؟ نمرہ کا روبرو کا سلسلہ کس ماہ میں شائع ہوا تھا۔ وہ اور رخسانہ نگار عدنان کا ناول محبت خواب سفر کی آخری قسط منگوانا چاہتی ہوں۔ کیا یہ دونوں شمارے آپ کے پاس ہوں گے۔

ج محمل! رخسانہ نگار عدنان کے ناول محبت خواب سفر کی آخری قسط خواتین کے ڈائجسٹ کے اپریل 2011ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔
نمرہ احمد کا روبرو کا سلسلہ شعاع کے اگست 2009ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ ان شماروں کے لیے آپ 32721666 پر فون کرکے پتا کرلیں۔
آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں۔ آپ 32721666 پر فون کرکے اپنی کہانی کے بارے میں پتا کرلیں۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایس عطاریہ۔۔۔ بھلوال ضلع سرگودھا

خواتین ڈائجسٹ میں تب سے پڑھ رہی ہوں جب اسے سمجھنے کی اتنی سمجھ بوجھ بھی نہ تھی اور آج میں ایم اے اکنامکس کی اسٹوڈنٹس ہوں۔ خواتین آج بھی اتنا ہی اچھا ہے جتنا کل تھا۔ اس کی رائٹرز بہت بہترین ہیں۔ خاص طور پر عمیرہ احمد' نمرہ احمد' فرحت اشتیاق' رخسانہ نگار عدنان اور فائزہ افتخار کے میں نے تقریباً" تمام ناول پڑھے ہوئے ہیں۔ مجھے فرحت اشتیاق کی منظر نگاری بہت پسند ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہمیں کئی ملکوں کی سیر کروادیتی ہیں۔ نمرہ بخاری کے جوادی اور شبلی کہاں گئے۔ ذرا جلدی لے آئیے پلیز۔ اور جناب انیسہ سلیم کا ہمارا کیش ہے ترک رسوم بھی کہیں گم ہوگیا ہے' اسے ڈھونڈ کے لے آئیے پلیز۔ "چراغ آخر شب" ایک بہترین ناول جو تاریخ کی

عکاسی کررہا ہے۔ اس کی تعریف کے لیے لفظ نہیں۔ ایک بات بتانی تو یاد ہی نہیں رہی کہ خواتین کے ٹائٹل بیسٹ ہوتے ہیں۔

ج آپ نے اپنا نام نہیں لکھا۔ نام ضرور لکھیں' یہ تو آپ کی شناخت ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

طاہرہ عظیم۔۔۔ پشاور

آپ کا پرچہ باقاعدہ پچیس سال پہلے جب میں نویں کلاس میں تھی کتابوں میں چھپا چھپا کے پڑھا۔ (اور دل دے بیٹھی پرچے کو) دو سال بعد 88ء میں شادی ہوگئی اور مصیبت میں جان پھنس گئی' پھر کہاں کا پرچہ' کس کا پرچہ۔ میری آپ کے توسط سے سب سے درخواست ہے کہ اپنی بیٹیوں کی سولہ سترہ کی عمر میں ہرگز' ہرگز شادی نہ کریں۔ پہلے انہیں تعلیم دلوائیں اور بیس' بائیس سال کا ہونے دیں' تاکہ انہیں میری طرح زندگی گزارنا نہ پڑے۔

خیر سولہ سال کے بعد سسرال سے الگ ہوئے۔ اس کے بعد سے (سات سال ہوگئے) باقاعدہ شعاع اور خواتین پڑھ رہی ہوں۔ اب تو میری بیٹی جو کہ فرسٹ ایر میں ہے' وہ بھی پڑھتی ہے۔ ویسے پڑھنے کے شوقین میرے میاں صاحب بھی ہیں۔ اردو فلمیں انہیں پسند نہیں ہیں' سو ٹاک شوز کے بعد جو ٹائم ملتا ہے' وہ رسالے پڑھتے ہیں۔ میرے دو اور ان کے چھ رسالے آتے ہیں۔ اپنے بچوں کو بھی ہم نے مطالعے کی طرف لگایا ہوا ہے۔ ویسے پچیس سالوں کی اتنی باتیں ہیں جو آپ سے شیئر کرنی تھیں۔ اگر لکھنے بیٹھوں تو پوری کتاب بن جائے۔ ویسے بہت سی باتیں جو میں سوچتی ہوں کہ لکھوں گی' وہ میری کوئی نہ کوئی بہن اپنے خط میں آپ کو لکھ بھیجتی ہے' مجھے تسلی ہوجاتی ہے کہ چلو میں نہیں اور سہی' لیکن پھر بھی کچھ باتیں میں کرنا چاہتی ہوں۔

1 سب سے پہلے کاغذ کی بات کروں گی' آج کل جس کاغذ کا ٹائٹل آرہا ہے' وہ پندرہ دن بعد کناروں سے اکھڑنا یا پھٹنا شروع ہوجاتا ہے۔

2 پرچے کے ٹائٹل کی طرف آتے ہیں۔ آج کل جو بغیر دوپٹے کی لڑکیاں قمیض شلوار پہنتی ہیں۔ وہ زہر لگتا ہے یا وہ دلہنیں جو مہنگا ترین دوپٹہ پیچھے ڈال کر اپنا آپ نمایاں کرکے بیٹھتی ہیں۔ اگر ماڈل نے دوپٹہ نہیں اوڑھا تو صرف ان کے چہرے والی تصویر لگائیں۔ باقی پورا پرچہ اپنی مثال آپ ہے۔ خواتین اور شعاع تک کوئی رسالہ نہیں پہنچتا' اس لیے صرف ان ہی پر گزارہ ہے۔ سب رائٹرز ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ مجھے سب سے زیادہ رخسانہ نگار پسند ہیں۔ رخسانہ کے علاوہ فرحت اشتیاق اور فائزہ افتخار بھی بہت بہت پسند ہیں۔ ماہا ملک پتا نہیں کہاں گئیں' کچھ ٹی وی کو پیاری ہوگئیں۔

سلسلے سارے ہی بہت پسند ہیں۔ کچھ باتیں جو ہمارے خیال (مطلب میں اور میاں صاحب) میں نامناسب ہیں ان کا تذکرہ کرنا چاہوں گی' سب سے پہلا ایک جملہ جو ہر پرچے میں ایک یا دو جگہ تو ضرور ہی ہوتا ہے اور وہ ہے۔

1 "خدا جھوٹ نہ بلوائے" (نعوذ باللہ) اللہ اپنے بندوں سے جھوٹ نہیں بلواتا' بندہ خود جھوٹ بولتا ہے۔

2 "لعنت ہو مجھ پہ یا اس پہ" اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں لعنت بھیجنے سے منع فرمایا ہے۔

3 "لاحول ولا قوۃ" کا مطلب ہے نہیں ہے کوئی طاقت۔ جبکہ مکمل لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا مطلب ہے نہیں ہے کوئی طاقت سوائے اللہ کے۔ خود دیکھیں کہ آدھے کا مطلب کتنا نامناسب لگتا ہے۔

4 "اللہ کے پچھواڑے" جو کچھ ہے اللہ کے سامنے ہے۔ اللہ کے پیچھے کچھ نہیں ہے۔

5 "صلواتیں سنائیں" "صلواتیں" لفظ صلوۃ سے نکلا ہے۔ یہ بذات خود کوئی لفظ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ پھٹکاریں کا لفظ استعمال کریں۔ [illegible] افسانوں میں مجھے عائشہ فیاض اور عنیقہ محمد بیگ کے افسانے سب سے زیادہ پسند آتے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں سب سے اچھا نمرہ احمد لکھ رہی ہیں' شاباش ویل ڈن۔ نئے رائٹرز کو آپ موقع ضرور دیں' لیکن اتنا بھی نہیں کہ ہم اپنے پیارے رائٹرز کو ڈھونڈتے رہ جائیں۔

ج طاہرہ! پچیس سال کی خاموشی کے بعد آپ نے اپنی رائے کا اظہار کیا' بے حد خوشی ہوئی۔

شادی کے لیے کم عمر ہونا اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ اگر برے لوگوں سے واسطہ پڑ جائے تو بڑی عمر کی لڑکی بھی کیا کرسکتی

ہے۔ دراصل شادی کرنے کے لیے کوشش یہ کرنا چاہیے کہ شریف اور اچھے لوگوں کا انتخاب کیا جائے۔ خصوصاً لڑکا مضبوط اور اپنے پیروں پر کھڑا ہو' تاکہ وہ اپنی بیوی کو تحفظ دے سکے۔ باقی دیگر چیزوں میں قسمت پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔

ٹائٹل کے لیے آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے۔ جن باتوں کی آپ نے نشان دہی کی ہے' ان کا خیال رکھیں گے۔

رفعت زہرہ ہران۔۔۔ تلنبہ خانیوال

ماڈل اچھی لگی۔ سب سے پہلے کرن کرن روشنی پڑھا۔ اس کے بعد مستقل سلسلے پڑھے جو تقریباً سبھی زبردست تھے۔ فرحت اشتیاق کا ناول جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو بہت اچھا جارہا ہے۔ کنیز نبوی میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ فرحان علی قادری کا انٹرویو شائع کریں۔

ج پیاری الف! خواتین کی محفل میں خوش آمدید' آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

طاہرہ۔۔۔ محراب پور

اس بار "جو بچے ہیں سنگ" اور "توبہ" نے لگتا ہے ساری توجہ ساری سوچ لے لی ہے۔ اس لیے تو کچھ بھی پڑھنے کا دل نہیں کررہا۔

سکندر کے بارے میں جانتی تھی کہ وہ غلط نہیں' مگر مریم ایسی ہوگی ماننا مشکل ہے۔ 4 مارچ میرا برتھ ڈے ہے۔ پلیز میرا خط مارچ کے شمارے میں ضرور شائع کریں اور بند من میں فواد خان اور فہد مصطفیٰ کا انٹرویو ضرور دیں۔

ج طاہرہ! سالگرہ مبارک ہو۔ بند من کے لیے آپ کی فرمائش ثامن رشید تک پہنچادی گئی ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

سدرہ سعیدی۔۔۔ تحصیل منکیرہ بھکر

[illegible] ماڈل پیاری لگ رہی تھی۔ آپی آپ ماڈل کا نام [illegible] جگہ پر لکھا کریں۔ باقی تمام [illegible] سہیل وڑائچ کا انٹرویو بہت [illegible] موضوع کی وجہ سے یادگار [illegible] ایک خیالی کردار ہے؟ ایک ادھوری بات بھی اچھا ناول تھا۔ زہرہ ممتاز نے بچوں کو کنٹرول کرنے کا اچھا طریقہ بتایا۔

فرحت اشتیاق کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ فرحت پلیز سکندر کے ساتھ برا مت کرنا آپ کو اللہ ہمیشہ خوش رکھے اور پلیز آپ اپنی نہیں تو اپنے والد صاحب کی تصویر ہی دکھا دیں' کیونکہ آپ نے کہا تھا کہ آپ کے کردار (ہیرو) آپ کے والد صاحب کی کاپی ہیں' خواتین کے لیے ڈھیروں دعائیں۔

ج سدرہ خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ددا آما کا کردار فرضی ہے اور ناول بھی' دراصل اس ناول کے ذریعے مصنفہ نے ان اعتراضات کا جواب دیا' جو اسلام دشمن کرتے ہیں۔

صبیحہ ناز۔۔۔ لاہور

پچھلے ماہ میرے خط سے کچھ سطریں سنسر کی گئی ہیں۔ کیا وہ طوالت کے سبب تھا یا معیار سے گری ہوئی تھیں۔ چراغ آخر شب نے انتہائی خوب صورت موڑ لیا ہے۔ میری ہم نام نے ریشم کی گتھی کو سلجھانے کی اچھی کوشش کی۔ اور اس کہانی کے آخر کی لائنیں کہانی سے کوئی میل کھاتی نظر نہیں آئیں' پھر بھی موضوع زبردست تھا۔ دل اور درد اور دل اور رشتے باتیں بڑی خاص تھیں جو چند صفحوں میں سمیٹ لی گئیں۔ ایسا ہی معاملہ بڑا کے ساتھ ہوا۔ یہ معاملہ اتنا گمبھیر ہے کہ مزاحیہ انداز و انجام کچھ ہضم نہیں ہوا۔ وہ ایک دن قلمی اور غیر فطری سا لگا۔ ایک ادھوری بات نے سوچا کچھ اور لکھا کچھ اور ناولٹ سب اچھے جارہے ہیں' سب سے بہترین جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو ہے اور رہے گا۔

کہانی خط کے ساتھ ہی بھیجی جائے یا الگ پوسٹ کروں۔

ج صبیحہ! آپ اپنی کہانی خط کے ساتھ ہی پوسٹ کردیں۔ طوالت کی بنا پر ہم خطوط مختصر کردیتے ہیں' تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین کے خطوط جگہ پاسکیں۔ اس کالم کا اصل مقصد تو آپ کی رائے جاننا ہے۔

مصنفین تک آپ کا تبصرہ پہنچا رہے ہیں۔

عائشہ قیوم۔۔۔ نامعلوم شہر

جس کہانی کی وجہ سے میں نے قلم اٹھایا۔ وہ صوفیہ بشیر

کی توبہ' اتنا اچھا مکمل ناول جس کو پڑھ کر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ اس نے مجھے ایک مسلمان پیدا کیا۔ اسلام ایک بہت سچا اور سیدھا مذہب ہے اور اسلام میں عورت کا مقام بہت اعلا ہے۔ کچھ باتیں ایسی تھیں جن کی مجھے سمجھ نہیں تھی۔ ان کے بارے میں توبہ پڑھ کر سمجھ آئی۔ صوفیہ جی آپ نے بہت اچھا لکھا۔ یہ واقعی بہت حساس موضوع تھا۔ جس کو صوفیہ جی نے بڑی خوب صورتی سے اپنے لفظوں میں ڈھالا۔ باقی مجھے افسانوں میں ایک دن بہت پسند آیا۔ کیونکہ اس میں PSIR کا ذکر تھا اور میں بھی PSIR سے منسلک ہوں۔

ج عائشہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے خواتین ڈائجسٹ میں خط لکھا' امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں۔

فوزیہ ثمرہٹ ہانیہ عمران۔۔۔ گجرات

سرورق بہت پسند آیا۔ ماڈل کا میک اپ' ڈریس اور جیولری سب کچھ بہت زبردست لگ رہا تھا۔ آپ سے کیا پردہ' انوشے عباسی سے ملاقات' سب ہی کچھ اے ون تھا۔ میں نے آپ سے کڑھی بنانے کی ترکیب شائع کرنے کی فرمائش کی تھی جو دہی اور بیسن !! کر بنائی جاتی ہے پکوڑوں والی' وہ کھٹی نہیں بنتی۔

صوفیہ بشیر کا مکمل ناول رسالے کی جان تھا۔ زوا نا کروبی حقیقت میں کوئی خاتون ہے یا یہ رائٹر صاحبہ کی ذاتی تخلیق ہے۔ وہ اک دن عظمی کی اچھی کاوش تھی۔

ج زوا نا کروبی کا کردار صوفیہ بشیر کی ذاتی تخلیق ہے۔ کڑھی کی ترکیب آئندہ شمارے یعنی اپریل کے پرچے میں دی جائے گی۔

نورین آصف۔۔۔ ڈسکہ

سب سے پہلے عنیقہ محمد کا افسانہ پڑھا۔ ماشاء اللہ کیا کمال کی تحریر تھی۔ عظمی افتخار نے بھی خوب لکھا۔ فرحت اشتیاق کے ناول کے لیے الفاظ کم پڑ جائیں گے۔ فرحت کمال کا لکھ رہی ہیں۔ نگہت عبداللہ نے اس قسط میں اپنے جوہر دکھائے۔ عمیرہ احمد' تنزیلہ ریاض' عنیزہ سید' کنیز نبوی پلیز آپ بھی منظر عام پر آئیں۔

ج نورین! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے شہر کا نام غلط شائع ہوا۔ اس میں تھوڑی سی غلطی آپ کی بھی ہے۔ شہر کا نام اپنے نام کے ساتھ لکھنا چاہیے۔ اگر کسی اور صفحے پر دوسرے سلسلے کے ساتھ لکھا ہو تو مسئلہ ہوتا ہے۔ مصنفین تک آپ کی آواز پہنچا رہے ہیں' اس اضافے کے ساتھ کہ ہم بھی ان مصنفین کے منتظر ہیں۔

آنچل (ای میل)۔۔۔ پیر محل

دو بھائیوں کی شادی اور ڈائجسٹ۔۔۔ مت پوچھیں' کیسے ٹائم نکالا۔ شادی کے ہنگاموں کے بعد رات دو بجے سے چار بجے تک ڈائجسٹ اور میں۔ آپ نے رائے مانگی' سر آنکھوں پر۔۔۔ صوفیہ بشیر نے لکھا' خوب لکھا' عرصے بعد لکھا' یہ البتہ برا کیا۔ زوا نا کروبی' دائم اور حدیقہ۔۔۔ آؤٹ اسٹینڈنگ!!

سکندر اور لیزا۔۔۔ زبردست' زین پر غصہ آیا اور لیزا کے نئے محسوسات پر ہمدردی۔۔۔ پروفیسر عباس اور عبیر کے بعد پروین کے حوالے سے دکھ ہوا۔ میری دنیا کو خوب صورت بنانے کے لیے خواتین ڈائجسٹ کی ٹیم کا تہ دل سے شکریہ۔

ج آنچل! بھائیوں کی شادی کی مبارک باد قبول کریں۔ آپ نے اتنی مصروفیت میں وقت نکال کر میل کی' اس کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کا تبصرہ پہنچا رہے ہیں۔

سلمیٰ عروج۔۔۔ جہلم

بہت عرصے سے سوچ رہی ہوں کہ قلم اٹھاؤں' مگر قلم اٹھانا اگر اتنا ہی آسان ہوتا خاص طور پر چھوٹے بچوں کی ماؤں کے لیے تو شاید وہ ایسے ایسے شاہکار تخلیق کرتیں کہ قارئین کو بار بار آپ کی وساطت سے معروف لکھاریوں سے منتیں کرنے کی ضرورت نہ پڑتی' یہ اللہ کی مصلحت ہے کہ اللہ نے ایسی عظیم لکھاریوں کو مستقبل کے معماروں میں مصروف کر دیا ہے اور ایسا مصروف کیا کہ اگر لکھنے کے لیے قلم اٹھائیں تو کاغذوں پر بچوں کی مصوری ملتی ہے اور اگر قلم ڈھونڈنے نکلیں تو وہ کسی چنی کے پاس ہوتا ہے جو منی کی شکل پر اسٹار دیتی ہوئی پائی جاتی ہے اور اتنی دیر میں لکھاری ماؤں کے لکھنے کے موڈ کا ستیاناس ہو چکا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ذہن کے دریچوں پر اتنی خوب صورت یادیں اور باتیں اتنی زور' زور سے دستک دیتی ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ لفظوں کے ان رنگین پنچھیوں کو پکڑ پکڑ کر کاغذ کے پنجرے میں قید کرتی چلی جاؤں' لیکن ان لمحات میں' میں بچوں میں اتنی مصروف ہوتی ہوں کہ اس سوچ پر عمل درآمد نہیں کر سکتی اور جب کبھی بالکل فارغ ہوتی ہوں تو کسی بھی یاد کی نہ کوئی آہٹ ہوتی ہے' نہ آواز' سو اس بار میں سوچا کہ چلتے پھرتے مصروفیات میں جب بھی یاد کا کوئی پرندہ دل کے آنگن میں اترے اسے کاغذ پر قید کرلوں گی۔ یہ خط مہینوں کی مسلسل پکڑن پکڑائی کا نتیجہ ہے۔

سردیوں کی ٹھٹھرتی شاموں یا گہرے بادلوں کا آنچل اوڑھے اداس دن میں جب کبھی یادوں کی برسات دل کے آنگن میں اترتی ہے تو یاد کا سنہرا رنگ پہلی تصویر شعاع اور خواتین کی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ میرا یہ خط شائع مت کریں' لیکن میں مطمئن ہو جاؤں گی کہ میرا شکریہ میرے محسن تک پہنچ گیا۔

جب یاد کی پہلی تصویر پر نظر ڈالتی ہوں تو مجھے اس میں اپنی بڑی دو باجیاں' باجی جمیلہ اور باجی عابدہ اس کے متعلق گفتگو کرتی نظر آتی ہیں۔ ذہن کے رنگ اتنے کچے ہیں کہ اس میں صرف کسی کہانی کے بارے میں گفتگو یاد ہے جو شعاع یا خواتین کی کسی کہانی کے متعلق ہے۔

البم کا دوسرا صفحہ پلٹتی ہوں' اگلی تصویر اس دور کی ہے جب شعور بیدار ہونے لگا ہے تو اپنے سے بڑی دو بہنوں کو شعاع اور خواتین پڑھتے دیکھتی ہوں۔ ہمارے معاشرے کی اکثر اسد خواتین کی طرح ان کی پالیسی بھی دو رخی ہے خود پڑھتی ہیں اور چھوٹی بہنوں کو دیکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ چھپ چھپا کر خواتین اور شعاع کو پڑھنے کا اتنا مزا آیا کہ اب اطمینان سے پڑھنے میں بھی اتنا نہیں آتا۔

خیر ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے بعد جب بی اے میں پہنچے تو اطمینان سے پڑھنے کی اجازت ملی۔ یہ تو تھیں ساری پرانی [illegible] ہیں۔

اور [illegible] شروع ہوئی ہے [illegible] کی کہانی۔ جو شعور اور گہرائی ان [illegible] اس کے بارے میں اب سوچتی ہوں تو [illegible] کے راستے میں [illegible] ماں [illegible] کی نصیحتوں کے ساتھ ساتھ شعاع' خواتین کا واضح [illegible] کرتا ہے۔

فہم و ادراک اور تجربہ زندگی کے اسباق پڑھاتا ہوا۔ ایک استاد کی طرح قدم بقدم رہنمائی کرتا ہوا اور آج میں اس بات کا اعتراف کرتی ہوں کہ گھر کی تربیت کے ساتھ ساتھ خواتین و شعاع کا بھی اہم حصہ ہے۔ وہ باتیں جو ہمارے گھر والے ہم سے کرتے ہوئے ہچکچائے وہ شعاع اور خواتین نے دوستانہ انداز میں ہم سے کیں اور زمانے کے نشیب و فراز میں سنبھل کے چلنا سکھایا۔ زندگی میں قدم رکھا' شرعی پردہ شروع کیا۔ ٹی وی چھوڑا' گانے اور بے ہودہ باتوں سے اللہ نے بچایا' لیکن خواتین و شعاع پھر بھی ہمارے ہم قدم رہا۔ میں نے اور آصفہ نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم اپنی بیٹیوں کو (ہم دونوں بہنوں کی تین' تین بیٹیاں ہیں اور ہم دونوں بہنوں کی بہت دوستی ہے۔) خواتین اور شعاع ضرور پڑھائیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی آپ سے ایک

سانحۂ ارتحال

بہن دلشاد نسیم کے شوہر خالد محمود قضائے الٰہی سے وفات پا گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

بہن [illegible] کی ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے پرچوں سے دیرینہ وابستگی ہے۔ ان کا دکھ دل سے محسوس کرتے ہوئے ہم برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ انہیں یہ جاں گسل صدمہ سہنے کی ہمت دے۔ انہیں صبر جمیل سے نوازے اور مرحوم خالد محمود کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین [illegible] دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

گزارش ہے کہ کچی عمر کی بچیاں آج کل موبائل اور نیٹ سے بہت متاثر ہیں' رہی سہی کسر میڈیا نے پوری کردی ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ نیٹ اور موبائل کے نقصانات کے بارے میں کہانیوں کو موضوع بنائیں' تاکہ ان بچیوں میں آگہی پیدا ہو' انہیں درست و غلط کا شعور آئے۔ کچھ لوگوں کی تربیت فطرت کرتی ہے اور بہت اچھی کرتی ہے کہ لوگ مثالیں دیتے ہیں۔ اس میں والدین کی نیک نیتی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ کچھ نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جو صدقہ جاریہ بن جاتی ہیں اور ہمیشہ پھل دیتی ہیں۔

قرآن پاک کی رہنمائی اور تعلیم تو اتنا سکون دیتی ہے کہ آپ کو کیا بتاؤں' اندر تک طمانیت بھر جاتی ہے اور ساتھ ساتھ اللہ ایسی تحریروں کو سامنے لا کر رکھ دیتا ہے اور دل کو تسلی دیتا ہے۔

دیکھ لیں سردیوں کی ٹھٹھرتی شاموں میں اس خط کو شروع کیا تھا اور بہار کے کھلکھلاتے رنگ شروع ہوگئے ہیں۔ یہ میری یا آپ کی خوش قسمتی ہے کہ یہ خط ابھی تک محفوظ ہے۔ عفت نے پھول بنا کر اپنی دوست کو گفٹ نہیں کیا یا سارہ نے جہاز بنا کر اڑا نہیں دیا یا پھر کشتی بنا کر پانی میں بہا نہیں دیا اور عائشہ میں ایک اچھی ایڈیٹر کی تمام تر خوبیاں موجود ہیں کہ وہ معیاری سے معیاری تحریر کو منٹوں میں ٹکڑے ٹکڑے کرکے پوچھتی ہے" یہیں ڈال دوں؟" یا پھر اپنے کسی جذبہ انتقام کی تسکین کی خاطر اپنے سارے کلرز لے کر اس پر پھول بوٹیاں بنا کر پوچھتی ہے۔ "کلر کر لوں؟" خط شائع ہونہ ہو پھر بھی جب بھی میرے دل پہ اداس موسموں کے پنچھی اتریں گے تو میں پھر اسی سے سہیلی کی طرح شیئر کروں گی اور دوسری بات یہ کہ شکریہ آپ تک پہنچ گیا بہت شکریہ۔ اللہ نے آپ کو سبب اور وسیلہ بنایا کہ بہت سے لوگ غلط راہوں پہ چلنے سے بچ گئے۔

ج پیاری سلمی! آپ کا خط پڑھ کر پہلا خیال یہ آیا کہ آپ کہانیاں کیوں نہیں لکھتیں۔ مصروفیت کا عذر نہ کیجئے گا۔ جب انسان کسی کام کو کرنے کا ارادہ کرلے تو وقت خود بخود نکل ہی آتا ہے۔ آپ کی تحریر کی روانی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے۔ تو اس صلاحیت سے فائدہ اٹھائیں اور کوئی افسانہ لکھیں۔

تہ دل سے ممنون ہیں کہ آپ نے اتنے اچھے انداز میں سراہا۔ اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ خواتین اور شعاع کا یہ معیار ہمیشہ برقرار رہے۔ (آمین)

مہوش ڈوگر۔۔۔ گوجرانوالہ

افسانوں میں ایڈا بے حد پسند آیا۔ میری آپ سے گزارش ہے کہ کرن کرن روشنی میں پردے سے متعلق احکامات شائع کریں۔ جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو فرحت اشتیاق کا بہت زبردست ناول ہے۔ فرحت جی گھر بیٹھے روم کی سیر کرانے کا بہت شکریہ۔

نمرہ احمد سے مکمل ناول لکھوائیں۔ وہ میری پسندیدہ رائٹر ہیں۔

ج مہوش! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

نمرہ احمد کا ناول اس ماہ شامل اشاعت ہے۔

جس بدعت اور اسراف کے بارے میں آپ نے لکھا ہے۔ اس کے متعلق ـــــ کچھ کہنا ایک نئی بحث کو دعوت دینا ہے۔ درحقیقت ہمارے مذہب میں اس کی کوئی گنجائش نہیں اس کو پھیلانے میں میڈیا کا بھی بڑا حصہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات' آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ اس کے بعد خلفائے راشدین اور صحابہ کرام' تابعین و تبع تابعین کی زندگیاں ہیں۔ ان کی مثال پر عمل کرکے دین و دنیا سنوار سکتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر ہمیں کسی کی اتباع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اگر دین میں اس سے ہٹ کر کوئی نئی بات پیدا کی جائے تو وہ صریحاً "بدعت" ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

رفعت ناہید سجاد

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے۔ جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادیٔ اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر، عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گُنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں، اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کر پاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونیورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کر کے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

۲۹

انتیسویں اور آخری قسط
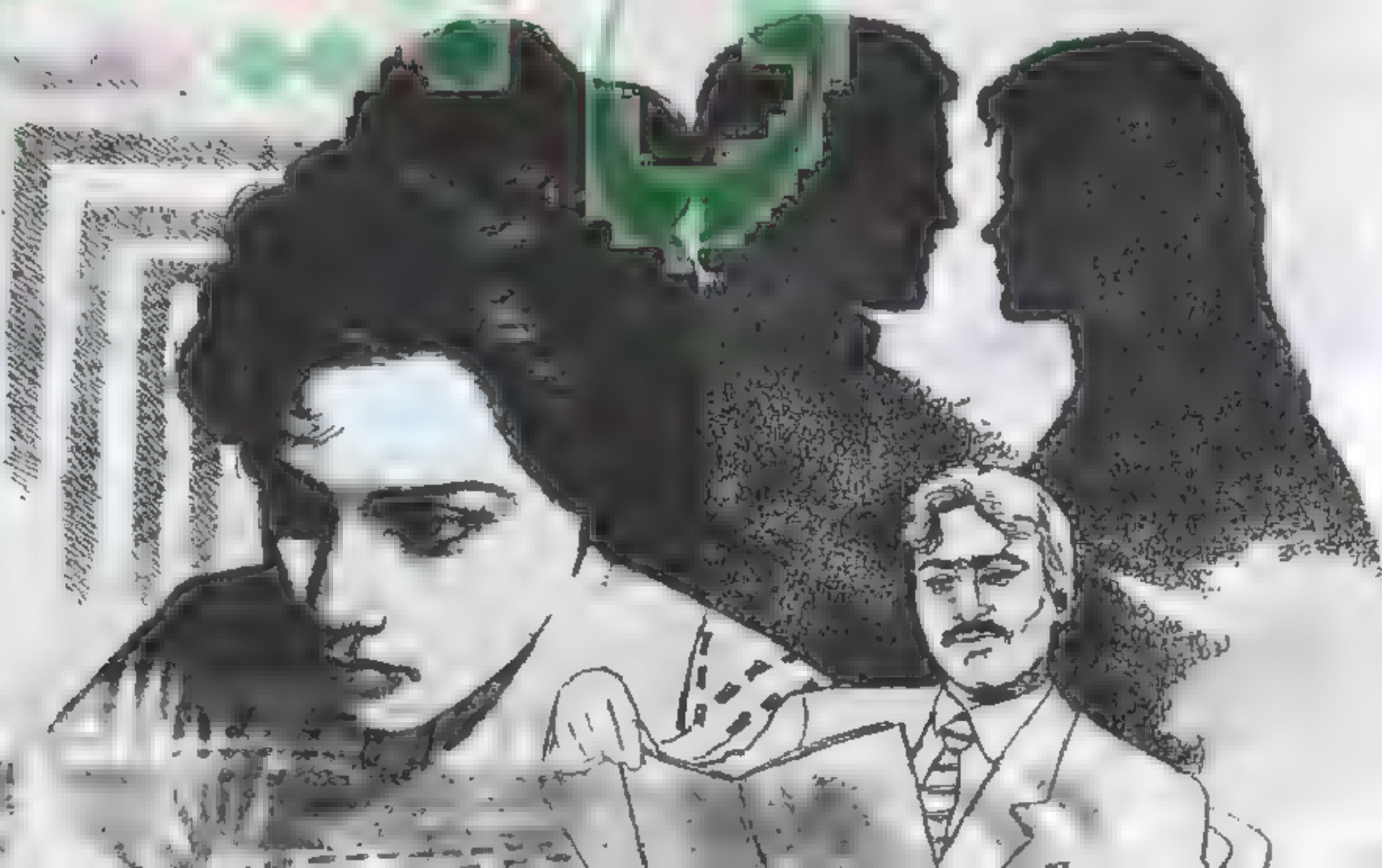
اگر میں کہانی لکھنے بیٹھوں تو اس کا ہیرو کون ہو گا۔ ہیروئن کون ٹھہرے گی۔

"کرداروں کی تقسیم بھی کیا کھپلا ہے۔ آؤ اپنی اپنی کہانی کہیں۔"

حمیرا نے 80F کی سیڑھیوں پر بیٹھے بغیر کسی کو مخاطب کیے پکارا۔

"کوئی این جی او، حقوق نسواں کی تنظیمیں، ہیومن رائٹس، میڈیا، جمہوریت، مارشل لا۔ کوئی ہے جو آئے اور مجھے سمجھائے۔

زندگی کہانی ہے یا کہانیاں ہی زندگی سے نکلتی ہیں؟

ہیرو کون ہوتا ہے، کردار ہیرو ہوتے ہیں یا واقعات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ کبھی کہانی بیان کرنے والا خود کوئی کہانی ہوتا ہے۔

سوال تو یہ بھی ہے۔ واقعات کی ترتیب میں تاریخیں اہم ہوتی ہیں یا تاریخ؟"

(اف۔ تم دونوں اور تمہارے سوالات)

"کبھی خود کو دوہرا کے دیکھا ہے۔ اگر ہم اپنا قصہ بیان کرنے بیٹھ جائیں تو آپ ہر اس خوشی اور غمی سے پھر گزرتے ہیں، جس سے ایک بار گزر آئے تھے۔ پھر ہنستے ہیں، پھر دکھ اٹھاتے ہیں تو سوچ لو اس ری ٹیک کا کچھ فائدہ بھی ہے؟

مجھے تو بیان کے لیے اتنا ہی زمانہ درکار ہے، جتنا دنیا میں انسان گزار آیا ہے۔ میری کہانی لمحوں کا قصہ نہیں۔ اگر اس میں زمانہ قبل از تاریخ بھی شامل کیا جائے۔" رضا نے سکون سے کہا۔ "محتاط اندازے کے مطابق انسان دنیا کو 80 ہزار سال سے برت رہا ہے اور پتا نہیں کس نتیجے پر پہنچا۔ یہ کوئی خاص قابل فخر جگہ تو نہیں۔ دھوکے کی جگہ۔"

"دنیا میرے لیے اہم نہیں۔" حمیرا نے ٹکڑا جوڑا "صرف ساٹھ سال کی کہانی اہم ہے۔ جن کے پچیس سالوں میں میں نے اپنا حصہ ڈالا۔ مگر میں ہیروئن نہیں ہو سکتی۔ میرا کردار تو بہت بودا ہے۔ بے حد ناکارہ۔"

"ہم محدود قسم کے لوگ ہیں۔ واقعات بھی گنے چنے، تجربات بھی گنتی کے۔ جن حادثات سے قومیں ہزار سالوں میں گزرتی ہیں، ہم پون صدی سے کم عرصے میں سب جھیل چکے اور قسمت دیکھو اس بھاگ دوڑ کے باوجود آج بھی ایک دوراہے پہ کھڑے ہیں۔ دائیں بائیں کے سامنے اس کشمکش میں گرفتار کہ دائیں جائیں یا بائیں رخ لیں۔ تیسری دنیا کے بدقسمت ممالک۔ تعلیم میں پیچھے رہ جانے والے، لوڈشیڈنگ سے بے گھر، بے در، پدرم سلطان بود کا ورد کرتے، ٹکے ٹکے میں بک جانے والے۔"

"یہ ٹکا تو بنگلہ دیش کی کرنسی ہے نا" حمیرا نے باآواز بلند پوچھا۔ "یہ محاورہ ہمارے ہاں کہاں سے آگیا؟"

"وہ ہمارے ہاں ہی سے تو اپنے ہاں گئے ہیں۔"

"ان کے جانے کے بعد اب ہم، ہم ہو گئے ہیں؟ یا اب کوئی اور ہم اور وہ ہیں۔ کہیں کوئی خاتمہ بھی ہے یا سفر جاری ہے؟"

"دیکھو لڑکی! زیادہ قنوطی ہونے کی ضرورت نہیں" عثمان نے حمیرا کی مدد کرنا چاہی۔

"انسان کی زندگی میں جتنے لوگ آتے ہیں، وہی اس کے مرکزی کردار ہوتے ہیں اور ان کی گنتی کے لیے کسی کیلکولیٹر کی ضرورت نہیں۔ میرا مطلب ایسے لوگ جو آپ کی زندگی پہ اثر انداز ہوتے ہوں۔ اربوں کی آبادی میں سے اس مختصر تعداد کے لوگوں میں بھی کردار بانٹنا چاہو گی۔ یہ ہیرو ہے، وہ ہیروئن کی سہیلی ہے۔ ایک مسخرہ ہے جس کا جوڑ سہیلی کے ساتھ ملایا جائے گا۔ ادھر ہیرو کوئی کام دھندا کرتا ہے یا سوٹ ڈاٹ کر مفت میں ڈنڈے بجاتا پھرتا ہے۔ آرٹ مووی ہے یا کمرشل۔ ؟ پاپولر ہٹ یا پیچیدہ گنجلک، سوری! میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

د۔۔۔ سہارے مت رہنا۔"

اپنی طرف سے اس نے جیسے بڑی مغرورانہ رکھائی کا مظاہرہ کیا تھا۔

"ہم ایک دوسرے کو کب سے جانتے ہیں۔ یاد نہیں آتا، پہلی دفعہ کب ملے تھے۔"

"قصور یادداشت کا نہیں۔ یہ اصل میں یوم الست کا قصہ ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے پوچھا تھا۔ کیا میں تمہارا رب نہیں۔۔۔"

عبیر نے پلٹ کر عثمان کی طرف دیکھا۔ وہ حمیرا کی مدد سے کیوں ہاتھ اٹھا رہا ہے۔ شاید اس لیے کہ گنتی کے ان ناموں میں ایسے نام بھی آتے ہیں، جن سے وہ نظریں چراتا ہے۔ اس قدر قریب ہونے کے باوجود وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ وہ اس حادثے سے گزر آیا۔۔۔ صحیح سلامت۔

☼ ☼ ☼

ثریا استقامت سے سر اٹھائے، لیکن ڈھلکے ہوئے شانوں کے ساتھ وہیں کھڑی تھی۔

وہ بھی اتنی احمق نہیں رہی تھی کہ معاملے کی تہہ تک نہ پہنچ سکتی۔ وہ نظریں۔ ارادوں تک کا فاصلہ لمحے بھر میں طے کر گزرتی تھی۔ اسے دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ ہاں وہ رضا و رغبت سے دھوکا کھانے پر آمادہ ہو تو اسے روکا بھی نہیں جا سکتا تھا، لیکن اس نے جیسے ان دونوں کو خود سے نمٹنے کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ عبیر کو گمان گزرا وہ منہ نوچتی، ناخنوں سے کھرونچ ڈالتی ایک بے بس لیکن دلیر لڑکی کے بہروپ میں خود کو دیکھ رہی ہے۔ بہروپ بدلنا اس کا مشغلہ ہی نہیں، جنون تھا۔

اس کے شوہر نے حقارت سے اس بپھری لڑکی کی طرف دیکھا۔

پہلے ایک لمحے میں تو وہ اس کو پہچان نہیں سکا تھا۔ اس کی یادداشت میں ایسا کوئی واقعہ نہیں تھا، جس پر وہ اس بے عزتی کا مستحق ٹھہرے آخر کو وہ ایک عزت دار شخص تھا۔ یوں گلی گلی رلتے پھرنے کا اس کا مرتبہ بھی نہیں تھا۔ صرف نئی بیاہی بیوی کو دل آزاری سے بچانے کو اس کے ساتھ گھسٹا چلا آیا تھا۔ گو وہ اندازہ کر سکتا تھا۔ دوسرے کسی لمحے میں اس کے چہرے پہ پہچان کے سائے لرزے۔

اس کا خون آلود چہرہ ثریا کے فوکس میں تھا۔ پہچان کا وہ رنگ ثریا سے چوک نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے تو کبھی کسی نے یوں احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس کا چہرہ آگ کی طرح جھلس رہا تھا، لیکن اس چہرے پہ کسی شرم یا شرمندگی کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ اس کو بیوی کی فکر تھی نہ چہرے پر ناخنوں سے نقش بناتی اس ٹکے کی لڑکی کی کوئی پروا۔ وہ صرف حیرت زدہ تھا۔ ایک کمی کمین جس کا باپ عمر بھر اس کے قدموں میں تھوتنی رگڑتا رہا ہو۔ اس کا ہاتھ اس کے گریبان تک بلند کیسے ہوا۔۔۔؟ جس کو اس نے حقیر کیڑے مکوڑے کی طرح مسل کر پھینک دیا تھا، اس میں یہ اعتماد کہاں سے آگیا۔۔۔؟ وہ اس کو اتنی جرات نہ ہونے دیتا، لیکن اچانک پتا نہیں کس کس سمت سے لوگ نکل کر [illegible] ہوئے ریسپشن کی طرف آنے لگے۔ وہ ایک نامور شخص تھا۔ بے داغ شہرت کا مالک۔ وہ میڈیا اور [illegible] میں احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اسے خوف محسوس ہوا۔ اس ہجوم میں کسی کا فون اس کی پسپائی کی [illegible] شروع کر دے۔۔۔ وہ اپنا تماشا نہیں لگوانا چاہتا تھا۔۔۔ جگ ہنسائی کا سادہ سا مطلب الیکشن ڈوبنا تھا۔ پہلے [illegible] مشکل سے بچایا تھا۔ وہ ٹکٹ سے محروم ہوتے بال بال ہی بچا تھا۔

[illegible] نظر اپنی بیوی کی طرف ڈالی۔ اس کے اندیشے درست نکلے۔۔۔ اس کے ملنے جلنے [illegible] مال کا پیسہ۔۔۔ وہ اپنی گلی میں نہیں تھا، اس لیے شیر نہیں ہو سکا۔ لیکن جاتے جاتے اس کو [illegible] ایک دھکے میں وہ ساری حقارت بھری ہوئی تھی، جو اس قسم کی مخلوق کے لیے اس کے

دل میں تھی۔
"کون ہے یہ لڑکی؟"
ایلومونیم کے دروازوں کے جوڑ آپس میں مل گئے تھے۔ اگر وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا تو یہاں تک سنائی دینا مشکل تھا۔ البتہ شیشوں کے پیچھے تیزی سے بھاگتا' وہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ بغیر پلٹ کر دیکھے 'مڑے یار کے' جان بچا کر بھاگتا۔۔۔ اپنی ہم راہی کو اس کے دشمنوں کے درمیان چھوڑ کر۔۔۔ عبیو کو حیرت سی ہوئی۔ دھڑلے سے ظلم ڈھانے والے' زندہ انسانوں کو کیڑے مکوڑے سمجھنے والے' گرجتے برستے' اپنے پر وقت پڑے تو بزدلی سے دم دبا کر بھاگتے ذرا نہیں ہچکچاتے۔۔۔ اور کیسی عجیب بات ہے' یہ بزدل' ہم پر مسلط ہیں۔ ہم ان سے خوف کھاتے ہیں؟
ثریا کی آواز میں شک نہیں تھا۔ شک برابر والوں پر کیا جاتا ہے۔ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔
"پتا نہیں۔" عبیو نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جتنا مجھے پتا ہے' اتنا ہی تمہیں پتا ہوگا۔"
"مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے۔ اس قسم کے لوگ کہاں کہاں نہیں پھرتے۔ میں کیا جانوں۔۔۔"
"تو پھر اپنے شوہر سے پوچھ لینا' وہ ضرور جانتا ہوگا۔"
ثریا نے اپنی گردن میں ذرا سا خم دیا۔
"میرا شوہر بھی ہر ٹشو پیپر کا رنگ یاد نہیں رکھ سکتا۔ وہ استعمال کرتا ہے اور پھینک دیتا ہے۔"
"میرا تو یہی پوچھ لینا ہم کب پھینکی جا رہی ہو۔"
"تم خوامخواہ جذباتی ہو رہی ہو۔" ثریا نے اپنی آواز دھیمی کرلی تھی۔
"ایسا ہوتا ہی ہے۔ جب یہ لوگ اپنی بیٹیاں دوسروں کے گھر رہن رکھ دیتے ہیں تو ان کو پتا ہوتا ہے' ان کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔۔۔ پیسے کی خاطر یہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔"
"معاف کرنا بی بی۔۔۔ پیسے کی خاطر آپ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں' ہم تو پیٹ کی خاطر کرتے ہیں۔" اکبر نے اس کی طرف تضحیک سے دیکھا۔
"اگر اسے ہوش نہ آیا تو ہم پولیس' کورٹ کچہریوں سے انصاف لینے نہیں جائیں گے' جہاں آپ جیسے باعزت بری ہوتے آئے ہیں۔ میں یہیں کھڑے کھڑے آپ کا سر پھاڑ دوں گا۔۔۔ سستا اور فوری انصاف۔ یاد رکھیے گا' میرا نام اکبر ہے۔"
"انصاف وہ مانگتے ہیں' جو انصاف کرنے کا حق رکھتے ہوں اکبر صاحب! جس نے ظلم کیا تھا' وہ تو آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ جس کی گردن میں فٹ آیا پھندا' اس کا مقدر ہو گا؟"
"آپ جائیں ثریا بی بی!" فاروق نے دو بپھرے لوگوں کے درمیان ٹھنڈے ٹھہرے لہجے میں دخل دیا۔ "ہم اپنے دفتر میں خون خرابا پسند نہیں کرتے اور جو ہوا تو میں آپ کی حفاظت کی ذمے داری بھی نہیں لے سکوں گا۔"
"اوہ!" اس افراتفری میں شاید وہ اس کی نظر سے بچ گیا تھا' پہچان کے کچھ اجنبی مختصر لمحے اس کے چہرے پہ سرسرائے' یقیناً" وہ بہت خوشگوار نہیں تھے۔ کتنی دیر کی بوجھل خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا۔
"تو آپ ہیں۔ آپ ہی ہو سکتے تھے۔"
کسی وجہ کے بغیر اس کے لہجے میں طنز کا گھاؤ تھا۔ فاروق سے پھسلتی اس کی نظر عبیو پہ رکی۔
"تم وہ روایتی لوگ ہو' جو غیر روایتی ہونے کا ڈھونگ رچاتے ہو۔ میں مغرور' بگڑی' امیرزادی سہی' لیکن کم از کم جو نظر آتی ہوں' وہی ہوں۔ تم لوگ مجھے جتاتے رہے ہو کہ دو مختلف معاشی گروپ ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ باقی کا جملہ اس نے حلق میں گھونٹ لیا۔ اکبر نے دیکھا' ظالم کی آنکھ میں آنسو جھلملا رہے تھے۔

"آپ کسی وجہ کے بغیر تلخ ہو رہی ہیں۔" فاروق نے آہستگی سے کہا۔ "اس وقت کٹہرے میں آپ کھڑی ہیں۔ کسی پہ الزام تراشی سے فرد جرم ٹرانسفر نہیں ہو سکتی۔ اس موضوع پر آپ مجھ سے بات کیجیے گا' مگر پھر کسی وقت۔ آپ غالباً" عوام کے قہر سے آگاہ نہیں۔ یہ جو پبلک آہستہ آہستہ اپنا دائرہ تنگ کر رہی ہے' کسی نتیجے پر پہنچ گئی تو اچھا نہیں ہوگا۔"
وہ ہر دھمکی سے ماورا' ہر خوف سے دور' جیسے اچانک بے سہارا سی ہو گئی تھی۔ کیا ہے ان سب میں' جو اس کے اٹھتے قدم ساکت کر دیتے ہیں۔
"اور چاہو تو۔۔۔" فاروق اسی سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔ "پتھر اٹھاؤ۔۔۔ اور اس سنگ زنی میں ہمارا ساتھ دو۔"
"ہمارا۔۔۔" وہ سب ابھی تک "ہم" تھے۔ وہ بھی جو اس کے بہت بعد پہنچا تھا۔ شاید منزل کا ملنا اسی لیے شریک سفر ہونے کی شرط سے جڑا نہیں۔ اس نے پھر خود کو رنجیدہ پایا۔
وہ خاموشی سے پلٹی۔ شیشے کے پارٹیشن کے اس طرف اس نے فضا میں معدوم ہو گئے اپنے شوہر کو کھوجنا چاہا۔ اس کے قدم بوجھ سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔
جیسے وہ پھر فیصلے کے دوراہے پر اٹک گئی تھی۔
وہ کس کا حصہ بنے۔ پتھر مارنے والوں کی صف میں جا کھڑی ہو یا پتھر کھانے میں شامل ہو۔ وہ ہمیشہ دو طرف کی وفاداریوں میں سنگسار ہوتی آئی تھی۔
"میں ہر اس جگہ پہنچی جہاں تم سب کے قدم تھے۔ لیکن میرے سوا تم سب ہمیشہ "ہم" رہے۔ مجھے آج بھی ان آنسوؤں کا پچھتاوا ہے' جو میں نے تم لوگوں کے لیے بہائے اور آج بھی میرا سرمایہ میرے تکیے میں جذب ہو گئے وہی آنسو ہیں۔۔۔
ہم الگ الگ راستوں کے مسافر۔"
وہ ایسے چلی جیسے ٹھہری رہی تو منظر کا حصہ بن جائے گی۔
وہ پہلے بھی کیل کی طرح دیوار میں گڑ جانے سے خوف کھاتی تھی۔ بڑی بڑی تنظیمیں چلا سکتی تھی' اپوائنٹ کر سکتی تھی' افلاطونی باتیں کر سکتی تھی بے تکان۔۔۔ اور کوئی نہیں جانتا۔ شاید سر پہ ضربیں کھانا ہی مسیح کا مقدر ہو۔ اتنی دیر کے لیے تازہ ہوا کا جھونکا اپنے ساتھ یخ بستہ ہوا اور دھند کا مٹیالا بادل لیے اندر آیا۔ جتنا وقت اس نے کھلے شیشوں کے پیچھے فیصلے میں لیا۔۔۔ پھر وہ خود دھند کا حصہ بن گئی۔ معدوم ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"۔۔۔رے بارے میں لوگوں کا فیصلہ بالکل درست ہے۔ ہم محض باتیں کرتے ہیں۔ بے عمل لوگ۔ وہ کیا کہتے ہیں سرِ بازار کے استاد۔ کسی کی غلطی بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ یہ خوبی آپ میں موجود ہے۔ ہم جھگی بھٹی [illegible] سمجھتے ہیں ان لفظوں کی جادوگری سے نظام کو اکھاڑ پھینکیں گے۔ حالانکہ ہم خود اس نظام کا حصہ ہیں۔ ہم تو [illegible] ہونے والی زیادتیوں سے بھی خود کو نکال نہیں سکے۔ کیوں کیا کہتے ہو اکبر صاحب!"
[illegible] ہلیا۔ اور مسکرا دیا۔
[illegible] لوگ کیسی بے سروپا باتیں کر رہے تھے۔ ایک وسیع سبزہ زار جسے سردیوں کی کہر نے جھلسا دیا تھا۔ کے [illegible] بیٹھے۔ اندر گھر سے بھنے مسالوں کی مہک ہوا کے جھونکوں سے باہر آتی تھی۔
[illegible] آزتی روانی کی قسم۔

اب تو کسی گھریلو گھرہاتھوں کا پسا لہسن ادرک بھی ذہنی عیاشی بن گئی تھی۔
ایک زمانہ ہوا اس نے گھر کا پکا کھانا نہیں کھایا تھا۔
اس نے اپنے شہر شہر گھومنے کے تجربوں کے دوران چراگاہیں بھی دیکھی تھیں، قطع برید کیے 'اسٹروٹرف کے سے مصنوعی ہریالی لیے لان بھی، لیکن ایسا اجاڑ' ڈھنڈار باغ اس کی نظر سے نہیں گزرا تھا۔ عجیب و غریب ہیولہ ہیکل درخت اور ان پر لگا عجیب تر پھل۔ وہ درختوں کے ہسٹری جغرافیہ میں بڑی دلچسپی رکھتا تھا۔
آج جب وہ "روداد پاکستان" کی تقریب رونمائی سے اٹھے تو ان کے گروپ نے اسے کھانے پہ مدعو کیا تھا۔ اکبر کچھ بولا کھلایا۔ پتا نہیں جانا چاہیے یا نہیں۔ وہ بہت سارے لوگ تھے۔ اکٹھے گھومتے تھے' اکٹھے بولتے تھے' ایک دم ہنستے اور ایک ساتھ سنجیدہ ہو جاتے۔
ان کا پتا نہیں کتنے برسوں کا ساتھ تھا اور وہ اجنبی تھا۔ باہر سے آیا ہوا۔ یہ الگ بات کہ وہ خود کو وطن اور پردیس میں ایک سا اجنبی محسوس کرتا۔ ایک دفعہ جب اس نے گاؤں چھوڑا تو پھر کسی زمین نے اس کے پاؤں نہیں پکڑے۔
ان کا اصرار بڑھتا گیا۔ اس اصرار میں کہیں خلوص اور گہرائی تھی' صرف اس وجہ سے کہ وہ ان کے دوستوں میں سے ایک کا ساتھی تھا۔ کسی مشترکہ دکھ میں مبتلا اور کسی مشترکہ نفرت کا شکار۔ اس نے نفرت کے خلاف بہت پڑھا تھا۔ وہ جانتا تھا' یہ جذبہ ایسا نہیں کہ اسے پالا جائے' لیکن وہ نفرت کرنے میں خود کو بہت بے بس محسوس کرتا تھا' وہ ان کو پنچ نہیں سکا۔ اس کے ارادوں کے راستے میں قانون آجاتا۔ تھانہ کچہری منہ پھاڑے کھڑی ہوتی۔ لیکن نفرت کرنے سے کوئی قانون نہیں روکتا۔ ایمان کا ادنیٰ درجہ سہی۔ کم از کم وہ ان حکمرانوں کی ڈھال تو نہیں بنا۔
انہوں نے پروین وسایا کو بھی اسی اصرار سے بلایا تھا۔
"تمہیں بہت اچھے اچھے لوگوں سے ملوائیں گے۔"
عبیرہ بی بی کی عزیز ترین دوست اس کا ہاتھ پکڑے اسے للچا رہی تھی۔
"ہماری دادی اماں ہیں۔ آپائی ہیں۔ کریم بی ہیں۔"
پروین جھجک کر بار بار اکبر کی طرف دیکھتی تھی۔ وہ کسی فیصلے تک پہنچے تو وہ بھی اپنی رائے کا اظہار کرے۔
پروین وسایا ایک پراسرار کردار تھی۔ (یہ بھی ہیروئن ہو سکتی ہے۔ ضمیر اکوا چھوٹا آئیڈیا آیا)

✵ ✵ ✵

پراسرار ہونے کے باوجود وہ تنہا نہیں تھی۔ اس جیسے بہت سوں سے پاکستان بھرا ہوا تھا۔ وہ نہ ہوتی تو حقوق انسانی کی ساری تنظیموں کی دال روٹی کہاں سے چلتی۔ سفید فام کس پر گاہا پہاڑ کر چلاتے۔ بریکنگ نیوز سنسان ہو جاتی۔ پاکستان کو برا بھلا کہنے کا موقع بھی ہاتھ سے جاتا رہتا۔
پروین وسایا تاریخ کے پھٹے ہوئے اوراق سے برآمد ہوئی تھی۔ ہاتھ میں جلتی ہوئی موم بتی اٹھائے' راتوں کو اٹھ کر زخمیوں کی خدمت کرتی۔
چھاگل ہاتھ میں پکڑے زخموں سے چور آخری سانسیں لیتے مجاہدوں کو پانی پلاتی۔
کوڑھ زدہ' معاشرے کے دھتکارے' آبادیوں سے دور بسیرا کیے' بے بس لوگوں کا سہارا بنتی۔ چاند بی بی تھی' حملہ آوروں کے دانت کھٹے کرتی۔
وہ قربانی دینے کے لیے پیدا ہوئی تھی اور ہر عہد میں قربانی دیتی آئی تھی۔
لوگ چاروں طرف سے اکٹھے ہونے لگے۔ انہیں نہیں معلوم کیا ہو رہا تھا' وہ خود بھی فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے یہاں کھڑے ہونا مناسب ہے یا چلے جانا چاہیے۔
ہم چونکہ تماش بین قوم ہیں' اس لیے میلہ دیکھنے ضرور کھڑے ہوتے ہیں۔ خواہ دوسروں کو کہنی مار کر کھڑے رہیں۔ "چلو نا۔ کھڑے کیوں ہو؟"
وہ شور شرابا سن کر اس وقت پہنچے' جب اپنے چہرے پہ ناخنوں کی خراشیں لیے ایک عزت دار جا رہا تھا۔ بے عزت ہسٹیریک پراسرار لڑکی بے ہوش پڑی تھی۔ تماشا تو خوب تھا۔
سر سلمان پلٹ کر ان لوگوں کی طرف آئے۔ ان کے کام میں حرج ہونے پر ان سے معافی مانگی۔ مہمان ان کے لیے جس پریشانی کا باعث بنے' اس کے لیے معذرت طلب کی' اور اپنی اپنی سیٹوں اور اپنے اپنے کاموں کی طرف واپس جانے کی ہدایت نما حکم صادر کر کے وہ واپس کچھ دیر کے لیے ان کے پاس رکے۔ ان کے چہرے پہ قدرے ناگواری تھی۔ انہوں نے سرزنش سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔
"انقلاب بعد میں آجائے گا۔ ڈاکٹر کو آنا چاہیے۔"
"جی! فون کیا ہے۔ میں نے' ایسی بات نہیں بس بانیہ ہو گئی تھیں۔"
"اس کا فیصلہ بھی ڈاکٹر ہی کو کرنے دو۔"
وہ واقعی مکمل بے ہوش نہیں تھی۔ وقفوں وقفوں سے آنکھیں کھولتی' ایک خوف زدہ سی چیخ سے پھر نیند جیسی کیفیت میں چلی جاتی۔ سر سلمان کوریڈور میں اپنے کمرے کی طرف مڑ گئے۔ اکبر جائے واردات سے ذرا پیچھے ریسپشن سے ٹیک لگا کر کسی کے نمبر ملانے لگا۔ اس نے سنا وہ کسی کو فوراً پہنچنے کی ہدایت کر رہا تھا۔
پھر اس نے ذرا سا وقفہ دے کر پوچھا۔ "میں اس کے بھائی کو یہاں بلا لوں؟ وہ پاس ہی ہوتا ہے۔"
"بلا لینا چاہیے۔" وہ دونوں اپنے صلاح مشوروں میں مصروف ہو گئے۔
جو لڑکا دروازہ کھول کر حواس باختہ سا اندر آیا' اس کو پہچاننے میں عبیرہ نے زیادہ وقت نہیں لیا۔
وہ پہلے سے بااعتماد اور تجربوں کی بھٹی سے پگھلا ہوا لگ رہا تھا۔ وقت اتنی پٹخنیاں دیتا ہے کہ انسان عمر سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ اسے لگا وہ نسیمہ بی بی اور اس کے خاندان کی سب سے پرانی آشنا ہے۔ نسیمہ بی بی اپنے طبقے کی نمائندہ ہے۔ وہ مر بھی گئی تو کسی نہ کسی نام سے موجود رہے گی۔ ہمارے بہت سے نام ہیں' لیکن ہماری پہچان ایک ہی ہے۔
ظلم سہنے والے' کڑھنے والے' زمانے کی ٹھوکروں میں پڑے' بھوک' غربت' افلاس کے مارے اپنے بچوں کو بلی چڑھائے۔
"یہ جو تم اتنی پیالیاں تھال میں سجا کے دوڑتے ہو گرتی نہیں؟"
جمال بھائی بڑی اپنائیت سے لوگوں کے معاملات میں چھلانگ مار دیا کرتے تھے۔
"آرٹسٹ آدمی ہو؟"
"پہلے شہر میں تھا۔ برکت ٹی اسٹال پر۔ ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے لسی کے دو گلاسوں کے ساتھ نمودار ہوتا تھا۔ اب تو ڈرائیوری کرتا ہوں۔"
[illegible] دفعہ بھی اسے نہیں پہچانا تھا۔ پہچان شناخت اس کا مسئلہ نہیں تھی' اس سے الیکشن لڑتے لوگ [illegible]
[illegible] ہو گیا۔
[illegible] ہے۔ پرچا بھی ہمارے خلاف کٹتا ہے۔ ماں کو قتل کرنے اور بیٹی بیچ دینے پر میرے باپ [illegible] پاگل خانے میں داخل ہو گیا۔ باہر آیا تو پکی کا پاگل ہو چکا تھا۔

اب اس کی بات کا کوئی اعتبار بھی نہیں کرتا۔ ہر روز رپورٹ لکھانے جاتا ہے۔ ہر روز گالیاں کھا کر تھانے سے نکلتا ہے۔ ہم میں سے کسی کو نہیں پہچانتا۔ پنوں بھی آئے تو اس کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔"

اس وقت وہ چمکتی سی ایک بڑی گاڑی میں بیٹھ کر آیا تھا۔ گو گاڑی کا حق ملکیت وہ نہیں رکھتا تھا لیکن کسی کی ملکیت کیسے ہتھیائی جاتی ہے۔ یہ اس نے سیکھ لیا تھا۔

صاحب کو دفتر اور بچوں کو اسکول چھوڑ کر اس سرکاری گاڑی میں بیگم کو اپنے ذاتی کام بھی نمٹانے ہوتے ہیں۔ گاڑی گھماتے پھرنے کے اب اس کو بھی ہنر آگئے تھے۔ وہ شہر بھر میں گھومتا۔ فرصت سے گھر آتا تو کم ہی کسی کو پتا چلتا تھا کہ کار غائب رہی ہے کیونکہ مفت کے مال میں دل بے رحم تو ہوتا ہی ہے اور اگر پکڑے گئے تو... "ٹائر میں ہوا کم لگ رہی تھی جی۔"

پٹرول والے کے ساتھ ساز باز کر کے کم پٹرول میں بڑا بل لینے کا گر بھی اسے آگیا تھا۔ زمانہ عجیب استاد ہے۔ کچھ نہ بھی سکھا سکے تو عیاری کا سبق کتنی آسانی سے سکھا دیتا ہے۔ چہرے پر دیہاتی سادگی اسے مشکوک بھی نہیں ہونے دیتی۔

اس سے قبل کہ وہ مجمع میں کھڑا سوالوں کی بوچھاڑ کرتا۔ اکبر اسے ایک طرف لے گیا۔

پروین کو اچانک اپنے اندر بے پناہ تحفظ کا احساس ہوا۔ وہ کاوچ پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ جن سب سے مایوس ہو چکی تھی۔ وہی اس کے گرد جمع تھے۔ اس کا بھائی بھی آگیا تھا اور صاحب کو بے وقوف بنانے کے قصے مزے لے لے کر سنا رہا تھا۔ امام مسجد شاہ محمد کا بیٹا نزدیک ہی تھا۔

میڈم سوشل ورکر کے گھر سے واپسی پر وہ قدم قدم امام صاحب کی پناہ میں رہی۔ جب تک وہ عورتوں کے ہاسٹل میں شفٹ نہیں ہوئی اور اکبر اس کو یہاں نہیں لے آیا باس کا دفتر نظر آ رہا تھا۔ بیٹا بھی دور نہیں تھا۔ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتی جھلی سی لڑکی بھی اب اس کو اچھی لگنے لگی تھی۔

ورکرز اپنے کاموں کی طرف واپس ہو گئے۔ یہ نہیں کہ انہوں نے چہ میگوئیاں نہ کی ہوں۔ اپنی نشستیں سنبھال کر انہوں نے اپنا اپنا اظہار خیال ضرور فرمایا ہو گا' قیاس آرائیاں بھی کی ہوں گی کیونکہ کسی کی زندگی ہماری تفریح ہوتی ہے۔

مجمع چھٹ گیا وہ دونوں بہن بھائی چور کی گاڑی میں چوری سے نکل گئے تھے۔ حالانکہ اتنا کافی نہیں تھا۔ اس سے زور سے تو چھوٹو نے ان کے گھر پتھر پھینکا تھا۔ لیکن پھر بھی ٹھنڈ پڑ گئی۔

"ہم منتظر ہیں اس وقت کے جب ساری قوم ان لوگوں پر پتھر اٹھائے گی۔" اکبر نے ادھر ادھر دیکھا گویا آغا حشر کے ڈرامے کا آخری منظر تھا۔ پردہ گرنے کا منتظر وہ خاموشی سے کھسک کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ آج دل پہ چھایا برسوں کا ملال کچھ دھندلا یا تھا۔

"عجیب بات ہے۔" وہ جیسے کسی سے مخاطب نہیں ہوئی۔

"کتنی چھوٹی سی ہے یہ دنیا؟ میں مختلف وقتوں میں ان سارے کرداروں سے الگ الگ آگاہ رہی تھی اور مجھے کبھی پتا نہیں چلا یہ سب۔ میں نے پروین کی ماں کی چارپائی پر لاوارث سی پڑی میت دیکھی تھی۔ اس کے سرہانے کھڑی پروین کی چھوٹی بہن دیکھی تھی۔ جس نے اس وقت بھی میرا دل جیسے جکڑ لیا تھا۔ وہ موت جیسی سنگین سچائی سے بالکل واقف نہیں تھی۔ پھر اس کا بھائی دیکھا۔ اس کے والد کو دیکھا جو ہاتھ میں گڑ کی ڈلیاں پکڑے دیوانہ وار اپنی بیٹی کو تلاش کرتا پھرتا ہے۔ وہ خاندان دیکھا جس نے اس خاندان پر ظلم ڈھایا حتیٰ کہ وہ گھر اندر سے دیکھا' جہاں سے یہ کہانی شروع ہوئی۔ ایسے لگتا ہے میرے ہاتھ میں ایک لٹو ہے' جسے میں گھما رہی ہوں۔ سب رنگ

اس میں گڈ مڈ ہو کے ہیں اور تیزی سے میرے سامنے سے گھوم رہے ہیں۔ کبھی سارہ حق گزرتی ہیں۔ کبھی گاؤں کی ... گزرتا ہے۔ کبھی ثریا سامنے آکر ٹھہر جاتی ہے۔ مجھے لگتا ہے پروین میرے وجود کا ایک حصہ ہے۔ شاید ہر عورت دوسرے کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ مخاطب سامنے کھڑا تھا۔ پتا نہیں اس کے سامنے کون کون سے رنگ گزرے ہوں گے۔ جو اتفاق کرتا تھا نہ اختلاف۔

"مجھے ثریا بھی آج بہت عجیب لگی۔ بھٹے دار جاگیردارنی سی اور آخر وہ اپنے اصل کی طرف پلٹ گئی۔ حالانکہ اسے پلٹنا ہی تھا۔

"پتا نہیں اس نے اپنے خلاف اتنی جدوجہد کیوں کی تھی۔"

"یہ تم اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہو۔ وہ تو خود خاصی بے چاری ہے۔ تب بھی جب وہ سیڑھیوں پر شیشے کے سلیپر پھینک کر دوڑی تھی۔ مجھے تو اس وقت بھی لگا' وہ اپنی خواہش کے آگے بس دوڑ لگا رہی ہو۔ تمہیں غریب عورت اور ارب پتی عورت کے دکھ کا اندازہ نہیں۔ وہ دونوں بالکل مختلف ہونے کے باوجود ایک سی آگ میں جلتی ہیں۔ اخلاق' مروت' ظاہر داری' کیا اچھا ہے' کیا برا' گناہ ثواب۔ ان سب کے ان کے اپنے اپنے پیمانے ہیں۔"

"آپ اس سے ایک دفعہ ہی ملے ہیں۔ پہلی اور آخری دفعہ۔ آپ نہیں جانتے وہ ہمیشہ سے کنفیوز تھی۔ کنفیوز آدمی خود تو کبھی سیدھا بھی چلنے لگتا ہے لیکن آس پاس کے لوگوں کو ضرور لپیٹ میں لے لیتا ہے۔"

"میں پھر کہوں گا۔ ایسی انتہائی رائے نہ رکھو۔ حالانکہ مجھے پتا ہے تمہیں رائے بناتے کسی مشورے کی ضرورت ہوتی تو نہیں۔"

"ہم بچپن میں ایک کھیل کھیلتے تھے۔ جس میں نمبر لگے دائرے ایک پنسل سے ایک سیدھی لکیر سے جوڑتے جاتے تھے۔ دل دھک دھک کرتے تھے۔ سب نمبر مکمل ہوں گے تو کون سی تصویر سامنے آئے گی۔ پلنگ پر مردہ پڑی ایک عورت۔ پاس کھڑی سہمی مرگھلی بھوکی بچی تھال پر پیالیوں کا مینار سجائے ارشاد' عورتوں کے حقوق کی جنگ لڑتی سارہ حق' گاؤں کا وہ محل نما گھر جو تالاب سے پرے ہے۔ جب سب دائروں پر پنسل گھماتی ہوں تو دیکھتی ہوں یہ تو پروین وسایا کی شکل بن گئی ہے۔ سوری! میں پروین میں اٹک کر رہ گئی ہوں۔"

عبیر کا خیال تھا چونکہ وہ اس کے ہر خیال کو حماقت سمجھ کر اڑا دیتا ہے۔ اب بھی وہ اس کی کسی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے گا۔ لیکن وہ بالکل سنجیدہ رہا۔

"دنیا ہے ہی چھوٹی سی۔ ہمیں خوامخواہ بڑی لگتی ہے۔ دھوکوں سے بھری ہوئی۔ اتفاقات کے ڈھیر کے ساتھ۔ یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ پروین وسایا کی والدہ کی لاش ہم نے سارہ حق کے سرونٹ کوارٹر میں ایک پرانی چارپائی پر دیکھی تھی اور سارہ حق ٹی وی پر کہہ رہی تھیں۔ "یہ انصاف کی لاش ہے۔ یہ قانون کی لاش ہے۔" انہوں نے یہ نہیں بتایا۔ اس زندہ ہستی کو لاش کی شکل میں ڈھالنے والا کون تھا۔

"سارہ حق کو بہت سے اعزاز حاصل ہیں۔ لاپتا لوگوں کے لیے شور مچانے میں ان کا بڑا مرتبہ ہے۔ کیونکہ ان کی آمدنی پاکستان کی بدنامی میں پوشیدہ ہے۔ اغوا شدہ محصور لڑکیاں ان کی چائے کی پیالی نہیں... وہ ٹی وی پر پوچھ رہی ہیں۔ میں کہتی ہوں' معاف کیجیے گا چیف جسٹس صاحب... ہماری فوج۔ آئی ایس آئی۔" ان کے ہاتھوں سے تازہ خون کے جمے ہوئے لوتھڑے لٹک رہے ہیں۔

"اور جب میں نے کہا تھا' یہ دنیا ہے' یہاں انسان اسی طرح لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں تو تمہیں اچھا نہیں لگا تھا۔"

"میں نے کہا تھا' مجھے اچھا نہیں لگا؟"

"کہنا ضروری تو نہیں ہوتا۔ تم کیا سمجھتی ہو' کہتی نہیں ہو تو کسی کو پتا نہیں چلتا؟ اب اس بری طرح بلش کرنے کی کیا بات ہے بھلا اس میں؟"

عبیر نے چاہا اپنے چہرے پر بکھرے گڈمڈ کرتے رنگوں پر قابو پالے۔ لیکن شاید یہ بھی اس کے اختیار سے باہر ہو گیا تھا۔

ایک طویل معنی خیز خاموشی کے بعد فاروق نے ایک گہرا سانس لیا۔

"ویری یوں ہے؟ ثریا نے غالباً" یہی فقرہ ان ہی معنوں میں استعمال کیا تھا۔ تم جو بھی کہو میں کم از کم اس کی ذہانت کا قائل ہوں۔"

عبیر نے پلٹ کر طویل کوریڈور کی طرف دیکھا۔ "میرا خیال ہے آخری ایکٹ گزر گیا۔ مجھے اپنے کام کی طرف واپس جانا چاہیے۔" پھر وہ نہ رکی نہ پلٹی۔

☼ ☼ ☼

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔" رضا ایسے بولا جیسے شمع اس کے سامنے آگئی تھی۔

"ہیرو ہیروئن' نام نہیں ہوتے' ایک پوری سوچ ہوتی ہے۔ ایک اپروچ ہوتا ہے۔ اب یوں دیکھا جائے تو سارہ حق بھی کوئی نام نہیں۔ وہ کوئی بھی نام ہو سکتا تھا۔ ان کے مفادات پھر بھی مختلف نہ ہوتے۔ یہ ہمارے سیل کے بے اکاؤنٹ ہیں۔ ہماری سوچ کا پتا دیتے ہیں۔ چلو ابھر سارا حق ہی کی مثال لیتے ہیں۔ شہرت' اقتدار' میڈیا پہ ہمہ وقت کی آرزو Ranking Rating پاکستان کے خلاف بک بک' انڈیا یاترا۔

ارے مہ گسارو سویرے سویرے۔

خرابات کے گرد پھیرے پہ پھیرے۔

ہمارا ہر حکمران جب اقتدار میں آئے تو سب سے پہلے چین جاتا ہے۔ اقتدار سے اتر جائے تو انڈیا کی طرف لپکتا ہے۔ جس تیزی سے آپ پاکستان کے خلاف اور ہندوستان کے حق میں تقریریں کرتے ہیں اسی تیزی سے آپ کی دانش وری کا گراف بڑھتا ہے۔"

"یہ ہم اپنے اوپر ٹھپے لگوا کر کیوں خوش ہوتے ہیں؟" محفل میں سے کسی نے سب ٹکا سا اعتراض اٹھایا تھا۔

"جب تک ہم پر made in نہ لکھا جائے ہم قبول نہیں ہوتے۔

حالانکہ ہماری کوئی ایکسپائری (expiry) ڈیٹ بھی نہیں ہے سب کچھ لائف ٹائم ہے۔ لوٹ مار' اقتدار' ایوان' کوئی پوچھ' نہ پکڑ۔" سر عثمان نے کہا۔ "اور حمیرا بی بی! آپ کا ہیرو نعیم ملک بھی ہو سکتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس میں ہیرو والی کافی خوبیاں ہیں۔ اس جیسے بھی یہاں ہزاروں کی تعداد میں پھر رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا نہیں۔ ٹی وی پر تبصرے کرتے' مایوسی پھیلاتے اور معصومیت ہاتھ کھول کر کہتے ہم پر مایوسی پھیلانے کا الزام لگایا جاتا ہے' ہم تو سچ بیان کرتے ہیں۔ انڈیا کے خلاف بات سن کر تڑپ اٹھنے والے۔ آپ انڈیا کا نام کیوں لیتے ہیں؟ تنویر بھی اکیلی نہیں۔ اس جیسی نیم دیوانیاں بہت پھرتی ہیں۔ اپنی شرافت کی مار کھائی۔ حتیٰ کہ ہم اور تم بھی کچھ انوکھے نہیں۔ (لیکن ہم منتظر ہیں انصاف کے۔ ایک دن پھر آئے گا' جب ہم کہیں گے۔ حق چھا گیا۔ باطل ہار گیا اور باطل تو ہے ہی ہارنے کے لیے)"

"کورٹ میں نعیم ملک کیس موجود ہے۔ وہ بڑی سہولت سے تنویر کو اٹھا سکتا تھا۔ قتل کر کے لاش نالے میں پھینک سکتا ہے۔ لیکن تنویر نہایت غیر اہم چیز ہے' وہ اس پر مزید وقت برباد نہیں کر سکتا۔ اس کے ذمے اور بہت سے اہم کام آگئے ہیں۔ چند دن گزر جائیں اور ملک میں بدامنی نہ ہو تو اس کی کارکردگی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اس

لی اپ دہو کی کا انحصار بھی لاشوں کی تعداد پر ہے۔"

دور درخت پر ایک پرندہ پھڑپھڑا کر اڑا۔ کچھ دیر کو سناٹا چھا گیا تھا۔ اکبر اپنی تمام تر جواں ہمتی کے باوجود کپکپا کر رہ گیا۔

اکبر اعظم بن شاہ محمد امام مسجد۔ ہجوم میں ملگین تنہا۔

"افسوس! بس ہم اتنا ہی انتقام لے پائے۔ ابھی ہمارے قرض باقی ہیں۔" جب اکبر' سارہ حق سے مایوس اس کے عظیم الشان گیٹ کے پاس پژمردہ کھڑا تھا۔ ان دنوں کو گزرے زیادہ دن نہیں ہوئے' لیکن صدیاں بیت گئی تھیں۔

"قرض باقی ہے۔" اس نے عزم سے دہرایا۔

☼ ☼ ☼

تنویر ایک مدت بعد گھر سے نکلی تھی۔ ابا جان کی کتاب کا معاملہ نہ ہوتا تو وہ آج بھی نہ نکلتی۔ گزرتا وقت آپ کو کہاں سے کہاں لے جاکر پھینک دیتا ہے۔ اسے جمال نے سختی سے منع کیا تھا۔

"زیادہ دلیری دکھانے کی ضرورت نہیں۔ کچھ بھی ہو گھر سے مت نکلنا۔ تم اسے جتنا بھی جانتی ہو' یہ نہیں جانتیں' وہ کیا کچھ کر سکتا ہے۔"

لمحہ بھر کو اس کے دل میں شدت سے خواہش ابھری' کر گزرے وہ' جو کچھ کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ تو اسے بلی چوہے کے کھیل سے نجات ہو۔ وہ خوف کی شدید گھٹن میں جیتے جیتے تھک گئی تھی۔ آج بھی یہاں بہت لوگ آئیں گے۔ اپنی ماں کے بالکل قریب بیٹھے بھی اس نے خود کو محفوظ محسوس نہیں کیا۔ بچپن کی نادانی کا وقت گزر گیا۔ دانائی اسے چھوتے ہی نکل گئی تھی۔ کیا وہ کبھی اتنی قابل بھی رہی تھی کہ دانش مندوں کی فہرست میں اس کا نام شامل کیا جاسکے۔ اس کو چیزوں کو پہچاننے میں کسی دشواری کا سامنا تھا۔ تازہ پھولوں سے لدا پھندا اسٹیج ہو یا دیواروں سے بارش کی پھوار کی طرح برستی ہلکی موسیقی۔ جیسے ہر سُر ایک ستارہ تھا' ہر پھول ایک مسکراہٹ' لیکن پتا نہیں کس کے لیے؟ وہ دروازے کے راستے اندر ہال میں آنے والے ہر شخص کو خوف زدہ ہو کر تکتی۔ ہر بدلتے سُر کے ساتھ لرز جاتی۔ یہ کیسی آواز تھی؟ یہ کون آیا ہے؟

اسٹیج سجا ہوا تھا۔ طویل میز اور اس کے پیچھے ترتیب سے رکھی کرسیاں۔ مرکزی کرسی اس کے ابا کے حصے میں آئے گی کہ وہی حق دار تھے۔ اس کرسی پر انہیں بیٹھا دیکھنے کی خواہش کے باوجود اس نے ان کو پاتال میں پٹخ دیا تھا۔

"ہم ذاتی مسرت کو اجتماعی دکھ پر ترجیح دیتے ہیں تو ایسے ہی خالی ہاتھ بیٹھے رہ جاتے ہیں' لیکن یہ سبق بھی ہم خالی ہاتھ ہو کر ہی سیکھتے ہیں۔"

کتنی کوشش کی تھی اس نے اپنا گھر آباد رکھنے کی اور اپنے اس گھر کی آبادی کے لیے کس کس کو اجاڑ نہیں دیا۔ اپنا گھر تو پھر بھی نہیں بسا۔ شاید وہ گھر اس کا تھا ہی نہیں۔ وہاں اس کے استعمال کی چیزیں تو تھیں لیکن ملکیت شاید کسی اور کی تھی۔ وہ چند دن اور گزار لیتی تو شاید رضا کو بھی اپنی خوشی کی بھینٹ چڑھا آتی۔ اور وہ اتنا پیارا لڑکا اس کی بالکل اپنی بھی ہو جاتا۔ لاکھ لوگ اسے منع کرتے رہ جاتے۔

محبت بھی کیسی کمینی چیز ہے۔ ساری دنیا سمجھتی ہے۔ وہ قربانیاں دے رہی ہے۔ حالانکہ ہر قربانی اس کی ذاتی ہوتی ہے۔ پھر وہ عجیب عجیب ناموں والے اعزاز وصول کرتی ہے۔ ستی ساوتری' پتی ورتا' یہ لفظ اور [illegible] میں' لیکن بیماری کی طرح یہ بھی ہم نے خود پر مسلط کر لی ہیں۔

"اپنی مسرت کے لیے کتنوں کو قربان گاہ پر لٹکایا۔"

اس نے انگلی کی پوروں پر ان ناموں کی گنتی شروع کی۔ دفعتاً اسے احساس ہوا اس کے ہاتھ میں انگلیوں کی پوریں ناکافی ہیں۔ اس کا گھیراؤ کیے ناخوش لوگوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پتھر ہیں۔ وہ اس کی طرف بڑھے چلے آتے ہیں۔ اس کے ماں باپ، بہن بھائی، دوست احباب، عزیز رشتے دار، جس کو خوش کرنے کے لیے اس نے یہ جتن کیے، خوش تو وہ بھی نہیں ہوا۔ وہ ستی ساوتری کہلائی، نہ پتی ورتا۔ پتا نہیں اسے سونا چاہیے تھا یا پی۔ ساء تو کچھ نہیں۔ کب ختم ہوگی آخر یہ بارش سنگ۔

"ابا نے اپنی کتاب میں کسی بادشاہ کا ذکر کیا تھا۔ جو سروں کے مینار بناتا تھا۔ کیا نام تھا اس کا؟"

اس نے سوچنے کی کوشش کی۔ وہ پچھلے کچھ عرصے سے بھولنے لگی تھی یا شاید اس نے دانستہ خود کو بھول جانے کا عادی بنا لیا تھا۔ اور اس کے ذہن کو اس مشق کی عادت اس قدر پختہ ہوچکی تھی کہ وقفوں وقفوں سے اس کا ذہن کوری سلیٹ کی طرح صاف ہوجاتا (سلیٹ کیا ہوتی ہے۔ اس نے یاد کرنا چاہا) اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ہر بھول جانے والی چیز کو آسانی سے فراموش کردیتی تھی۔ شاید اس لیے اس کو اپنا ذہن الکا پھلکا خالی خالی لگنے لگا تھا۔ جیسے اسٹور میں الابلا ٹھونستے جب وہ دروازے تک بھر جاتا تو کریم بی خود سامان سے نجات حاصل کرکے اس کو پھر خالی خالی کردیتی تھیں۔ نئی الابلا ٹھونسنے کے انتظار میں۔

(دروازہ پھر کھلا تھا۔ اپنے خیالات کی روانی میں بھی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اطمینان کا سانس لیا۔ حمیرا تھی گھبرائی ہوئی شاید دیر ہونے کی وجہ سے) "لوگ سروں کے مینار کیوں بناتے ہیں؟" (وہ واپس اپنے ٹریک پر آئی۔) اس مینار پر چڑھ کر انہیں کون سے ستارے دیکھنے ہیں کون سے چاند چڑھانے ہیں۔ کیا ہے مینار کے اوپر۔ مینار ہے یا اقتدار، صحیح لفظ کیا تھا بھلا؟ (وہ پھر بھول گئی)

"اور قصوروار کون تھا۔ جمال یا نعیم ملک؟ دو آدمی بیک وقت غلط نہیں ہوسکتے۔ مینار پر چڑھا طبقہ من مانا فیصلہ کرتا۔ شاید جمال اس مقدمے کی خاطر نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھتا یا جیل میں پڑا بے قصور سڑتا۔ ابا کی عزت بھی داؤ پر لگی تھی کہ معجزہ کی طرح ایک بزدل، خاموش خوف زدہ شخص اٹھا۔ دھاگے سے کھنچے مٹی کے گھگو گھوڑے نے جس کا ہاتھ اس کے سر پر بھی لرز لرز کر آتا تھا۔ شہادت کے لیے کھڑا ہوا۔ بغیر جھجکے بغیر جھینپے۔

"میرا بیٹا ایک جھوٹا شخص ہے۔ وہ نہ اچھا شہری ہے، نہ اچھا انسان۔ اس کی تربیت میں جو کوتاہی اور خامی رہ گئی اس کا ذمے دار میں خود ہوں۔ لہٰذا میری التجا ہے کہ اس کی سزا مجھ کو سنائی جائے۔"

لیکن لوگ اس حادثے کو بھول گئے۔ میڈیا سیل طاقت ور ہو تو سب حادثے بھلا دیتا ہے۔ ہر روز ایک نیا حادثہ جنم لیتا ہے۔ جو پچھلے واقعہ سے زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بڑے لوگوں کے ہاتھ نیا کھلونا آجاتا ہے۔ پرانا والا کھلونا وہ کریم بی کے اسٹور میں پھینک آتے ہیں۔ اور ایسا کھلونا جو حکومتوں کو لے بیٹھتا ہو، اس کو توڑ پھوڑ کر چکنا چور کردیا جاتا ہے۔ پھر وہ اسے بھی بھول جاتے ہیں۔ سو بھول جانے کی بیماری صرف مجھے ہی نہیں۔" اس نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس کی جذباتی عمر۔۔۔ جس سے رضا کو بہت گلہ تھا۔ سینکڑوں سال آگے نکل آئی تھی۔ ملیحہ کہتی تھی عورت کو تربیت دی جاتی ہے کہ وہ شوہر اور سسرال کی خدمت کرکے ان کے دل جیت لے۔ لیکن وہ ہر کوشش کرکے وکٹری اسٹینڈ پر نہ آئے تو کیا کرے۔ یہاں ان کی تربیت خاموش ہے۔ بس اول آنے کی کوشش میں ہم خود کو ملیا میٹ کر دیتے ہیں۔ یہ کہاں کا ورس ہے کہ اپنی عزت، انا، وقار، بھرم سب داؤ پر لگا کر ان کی رضا حاصل کرو۔

ہم لوگوں سے غیر انسانی توقعات وابستہ کرکے چاہتے ہیں ان کی تکمیل ہو۔

(یہ کون ہے۔ اوہ! اچھا یہ وہ نیا شخص ہے۔ جو آج کل ہر وقت ان لوگوں کے ساتھ نظر آتا ہے۔ لیکن پتا نہیں وہ عبیر سے کیا کہہ رہا ہے۔ کاش وہ عبیر کو سمجھا سکتی۔ سب مایا ہے۔)

ہم لوگوں نے عثمان سے بہت سی توقعات وابستہ کرلی تھیں کہ وہ گھر کا بڑا لڑکا ہے۔ سب ذمے داری اس کی ہے۔ یہ تو ملیحہ کے بقول بڑی خود غرضی کی بات ہوئی کہ ایک شخص بیٹھا ہماری خوشیاں پوری کرتا رہے۔ ہمارے لیے قربانیاں دیتا رہے۔

ہم عجیب دیوانے لوگ ہیں۔ صرف گزری کل کی بات کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا کوئی آنے والی کل نہیں؟ کیا آنے والی کل سے ہم نے اپنی امیدیں توڑلی ہیں اور آج؟ آج کی خوشی پر کس کا حق ہے؟ وہ سب آپس میں مل جل کر کیسے کام کرتے پھر رہے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح متحد ایک گروپ، ایک انجمن، ایک ادارہ۔ کچھ نئے لوگ اس میں آ شامل ہوتے ہیں جیسے وہ اس کم عمری لڑکی اور لمبے بالوں والے! اس مغل شہزادے لڑکے کو نہیں پہچانتی جو ہر کام میں بھاگ بھاگ کر شامل ہے۔

کچھ لوگ نکل جاتے ہیں۔ وہ اب ان سب کے درمیان ثریا کو نہیں دیکھ رہی نہیں وہ ہے کہ نہیں ہے۔ اور خود میں نور عباس بنت عباس رشید زوجہ نعیم ملک۔۔۔ جس کی شناخت کے حوالے این آئی سی میں اسی طرح درج تھے۔ جو اپنے بیان حلفی میں اپنے کسی حوالے سے منحرف نہیں ہوئی۔ وہ اس گروپ میں داخل آکر بھی واپس نہیں آسکی تھی کہ عورت ذات پر آشوب آگہی سے بڑا اور کوئی عذاب نہیں اترا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اماں نے اس کی بے چینی بھانپ کر پوچھا تھا۔

"جی امیں ٹھیک ہوں!" (مجھے میری واپسی پر مبارک دیجیے۔۔۔ اس نے دل میں کہا۔) اس کا لہجہ قابل رشک حد تک پرسکون تھا۔ اجنبیوں کی طرح مہمانوں کے درمیان بیٹھی وہ ہولے ہولے دہرانے لگی۔

"چیچوں چیچوں چاچا گھڑی پہ چوہا ناچا۔ گھڑی نے ایک بجایا۔ چوہا نیچے آیا۔"

وہ شاید آگے جارہی ہے۔ اس نے سوچا۔ وہ خوفناک وقت جو وہ گزار آئی۔ پیچھے رہ جائے گا۔ آج اگر وقت تھم گیا ہے تو کل ضرور حرکت کرے گا۔ اداسی بھرے دن کبھی تو ڈھلیں گے۔

نرسری کی نظم سے وہ قلمی گانوں پہ اتر آئی۔ ابا اپنی تقریر میں کیا کہہ رہے تھے، اس کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔

یہ شخص کون ہے۔ جس کے لیے ابا والہانہ انداز میں اسٹیج سے اترے۔ اسے کیوں لگا، اسے لمحے بھر کی جو جھلک نظر آئی، اس میں ابا کی آنکھیں نم آلود تھیں۔ پھر اس نے اپنا دھیان ہر طرف سے ہٹالیا۔ چوہا نیچے آیا۔

☼ ☼ ☼

حمیرا کو یونیورسٹی سے نکلنے کی جتنی جلدی تھی۔ اس کا گائیڈ اسی ٹھہراؤ اور سکون سے اس کو دانستہ دیر کروائے جا رہا تھا۔ اس کے گرد دشمنوں کا دائرہ تنگ تھا۔ اس کی آج پریزنٹیشن تھی۔ گو وہ کب کی ختم ہوچکی تھی لیکن ان دلوں کو ایک کے بعد دوسرا کام مسلسل یاد آئے جارہا تھا۔ اگر اس کا GPA پھر وہی رہا جو پچھلے سمسٹر میں تھا تو وہ پوزیشن لے جائے گی اور اس کو پوزیشن ہولڈر بننے سے ہر حال میں روکنا تھا۔ یہ طے تھا۔

اس نے چاہا بھی آج کے دن صرف آج کے دن اسے فارغ کردیا جائے لیکن تیوری چڑھا کر اسے جتا دیا گیا تھا۔

"ٹھیک ہے! اپنی absent لگوالیں اور چلی جائیں۔ بہتر ہوگا اپنا سمسٹر ہی فریز کروالیں۔"

"دل پہ مت لو۔" اس کے خیرخواہ کہتے تھے۔ "دشمنوں کے درمیان شام اسی طرح گزاری جاتی ہے۔"

"ہم ابھی تک دشمنوں کے درمیان ہیں؟" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "میرے بزرگ کہتے تھے ہمیں آزادی حاصل کیے (65) سال ہوگئے۔ ہم کب آزاد ہوں گے آخر؟"

وہ ہال میں داخل ہوئی تو بہت لیٹ نہ ہونے کے باوجود وہ خود کو مجرم تصور کررہی تھی۔ کبھی گھنے درختوں کی

چھاؤں تلے سرمئی رنگ کی ٹھنڈی سڑک ہوا کرتی تھی۔ اب وہ درختوں جیسے الزام سے پاک صاف ہو کر دکانوں اور پلازوں میں گھری مال روڈ تھی۔ مدت ہوئی اس کا نام شاہراہ قائداعظم رکھا گیا تھا۔ لیکن لوگوں کی زبان پر یہ نام چڑھ ہی نہیں سکا۔ ہم بھی عجیب لوگ ہیں' کچھ نیا نہیں بنا سکتے تو پرانی چیزوں کے نام بدل کر نیا ٹھپہ لگا دیتے ہیں۔ کچھ عرصے پہلے پیپلز اوپن یونیورسٹی نے علامہ اقبال یونیورسٹی کا روپ ڈھال لیا تھا۔ محترم شخصیتوں پر نام رکھنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ سوال نہیں اٹھتے۔

اسی شاہراہ قائداعظم کے کنارے واقع تین ستاروں والے یا چار ستاروں والے ایک ہوٹل میں سر عباس کے کچھ خوش حال طالب علموں نے ان کی کتاب لانچ کرنے کی تقریب منعقد کی تھی۔ ایک ایسا ایونٹ جس کا انہوں نے برسوں بے صبری سے انتظار کیا تھا۔ وہ اس میں مہمانوں کی طرح شریک ہو یہ ممکن نہیں تھا۔ ہاں مگر آج.....!

اس نے اپنا موبائل اور پرس سیکیورٹی کے حوالے کیا۔ اسکینر (Scanner) سے گزرتے جب وہ استقبالیہ تک پہنچی تو روشنی جیسے یک لخت تیز ہو گئی تھی یا مشینی انداز میں مہمانوں کو وصولتی اور منزل کا اشارہ کرتی استقبالیہ خاتون کا چہرہ غیر معمولی سفید تھا۔ جل بجھ کرتے ایک پہیہ کی شکل میں چلتے روشن ناموں میں آج کے تمام واقعات درج تھے۔

ولیمہ ڈنر..... کسی کی ریٹائرمنٹ کی آفیشل قسم کی گڈ بائی۔ تقریب رونمائی "روداد — پاکستان۔" مصنف عباس رشید۔

وہ بڑی دلچسپی سے اس پہیے کے نیچے ٹھہر گئی۔ کتنی ہی دیر دائرے میں گھومتے وہ اس واقعے کو بار بار گزرتے دیکھتی رہی۔ لفظوں کے گھومتے' چکر کھاتے دائرے۔

سفر جاری ہے۔ سفر جاری رہتا ہے۔

چلتے رہنا ہی سفر کی شرط ٹھہری۔

اچانک اسے احساس ہوا وہ بڑی ہو گئی ہے۔ اسے بڑوں ہی کی طرح چیزوں پر رد عمل ظاہر کرنا چاہیے تھا۔ اس کو بڑھتے رہنا ہے جب تک وہ زندہ ہے کیونکہ وہ فریم میں لگی جون آف آرک نہیں ہے۔

ایک سفر اس سب نے ہی شروع کیا تھا۔ غیر ذمے داری لاابالی پن سے سنجیدگی اور متانت کی طرف۔ بچپن جو گزر گیا۔ ماضی میں شامل ہو کر تاریخ کا حصہ ہوا۔ ہر انفرادی فرد تاریخ نہیں بناتا۔ لیکن اجتماعی افراد کا ہر واقعہ تاریخ بن جاتا ہے۔ جس میں ہر ایک کی ذات کا اپنا اپنا حصہ شامل ہوتا ہے۔ سو یہ بہت بڑی ذمے داری ہے۔

ایک آنے والے عہد میں وہ سب بھی دیواروں میں گڑی کیلوں سے نائلون کے تار کے سہارے لٹک رہے ہوں گے۔ جیسے عہد کی گیلری میں ایسی ہی دھواں دھواں دھندلی تصویریں لٹک رہی ہیں۔ جن کو سر عباس کے سوا کوئی پہچانتا بھی نہیں۔ ہر نام ایک دن گمنام ہو جاتا ہے۔ بستے میں رکھی کاپیوں سے اٹھ کر قبر کے کتبے پر چسپاں ہو جاتا ہے۔ انسان کی زندگی جو کبھی اتنی فعال اور جان دار تھی ایک سنہری فریم کا حصہ بن کر رہ جائے گی۔ پھر کسی اور زمانے میں کسی اور نسل کے لوگ ان تحریروں کے سامنے کھڑے ہو کر سوچیں گے۔ اس نسل نے ہمیں کیا دیا تھا۔

بدعنوانی' چور بازاری' لوٹ مار' کالا دھن۔

وہ ہم سے سوال کریں گے' جب ملک ڈوب رہا تھا' تم اٹھ کر کھڑے کیوں نہیں ہوئے۔ تم نے اپنے حصے کا پتھر اٹھایا؟

تم نے لوگوں کو لوٹ مار کرتے دیکھا اور خاموشی اختیار کی؟ صرف اپنی ذات بچانے کے لیے تم نے قوم داؤ پر لگا دی۔ وہ شاید ہم پر تھو کیں ہم سے سوال کریں۔ مگر شکر ہے تصویریں بولتی نہیں۔ اگر بولتیں تو ان کے پاس کہنے کو

ہوتا بھی کیا۔

"واہ! حمیرا بی بی۔" اس نے ملال سے سوچا۔ "تف ہے تم پر۔ تم سے تو پروین و سایا کا چھوٹا بھائی اچھا تھا۔ اس نے گہرے سکوت میں ایک پتھر اچھالا تو تھا۔ بے شک اس کا نشانہ خطا گیا لیکن اپنا فرض تو نبھا گیا نا۔"

عبیر کہا کرتی تھی۔ "اور جن لوگوں نے ہمیں ابھی ابھی جوائن کیا ہے' ان کی اطلاع کے لیے بتاتے چلیں کہ عبیر میری عزیز از جان دوست ہے۔" اس نے اپنی کہانی خود کو سناتے مقبول اینکرز کا سا انداز اختیار کیا۔

"ہم تصور نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی زندگی میں الگ الگ راستوں کے مسافر بنیں گے۔ جب ہم سب اکٹھے ہوتے تو یہ بھی نہیں بتا سکتے تھے کہ ان میں سے کون سا والا بھائی میرا ہے اور کون سا اس کا۔ لیکن جو چیزیں تصور میں سہانی روح ہوتی ہیں۔ عملی زندگی میں اتنی مشکل نہیں لگتیں۔ یونیورسٹی کالج میں مضامین کا انتخاب ہو یا منیر سے فروٹ چاٹ لینی ہو۔ صدیق صاحب کے کریم رول کھانے ہوں۔ کسی شخص کے بارے میں کوئی منفی رائے بنانی ہو اپنے عزیزوں کا دفاع کرنا ہو۔ ہم میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں۔ ہم میں سے کوئی بات شروع کرتا اور اس کو آدھی چھوڑ دیتا تو دوسرا اس کو اس طرح مکمل کرتا جیسے دو مختلف ذہن نہ ہوں اور کرنل کے بقول "اللہ نظر بد سے بچائے۔ جڑواں لگتی ہیں دونوں۔"

پھر کسی مصلحت کا شکار نہ ہونے والے ہم دونوں۔۔۔ پتا نہیں کب اور کیسے ہوا کہ ان کے خلاف بولنے کے بجائے ہم نے خاموش رہنا سیکھ لیا۔ شاید اس کی ابتدا قیصر کے حادثے سے ہوئی۔ نعیم ملک کے شر سے پھیلی یا ابا پر لگائے گئے پے در پے الزاموں نے نڈھال کر دیا یا یہ سب ہماری بزدلی کے بہانے تھے' خواہشوں کی ادھوری تکمیل سے پتا تب چلتا ہے جب ہم حضرت علی کا قول دوہرا کر اپنا اطمینان کرتے ہیں۔ "میں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔"

سر فیصل کہا کرتے تھے' ان کی نسل جذباتی تھی۔ لیکن یہ کمپیوٹر کی نسل ہے۔ جذباتی ہونا محض ذہنی تفریح ہے۔ شاید انہوں نے اچھا زمانہ دیکھا تھا۔ جس کو ہم آنکھ کھول کر ترستے رہے۔ قومیں نیچے سے اوپر جاتی ہیں' ہمارا سفر الٹے رخ تھا۔ لیکن ہماری نسل نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جسے تاریخ میں درج کر سکیں نہ اچھا۔ نہ برا۔ ہر عہد میں ہر نسل کا علیحدہ نام رہا ہے۔ آزادی کے متوالے تھے۔ پھر مارشل لاء کے نام لیوا آ گئے۔ کچھ جمہوریت کے دلدادہ بھی آئے۔ پھر سکوت طاری ہو گیا۔ مجرمانہ سکوت۔ جو آزادی حاصل کی تھی مٹی میں ملا دی۔ پھر اس آزادی کو بھی بیچ کھایا۔

غور سے دیکھو تو یہ سب ایک ہی لوگ تھے۔ کبھی مارشل لاء کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملاتے۔ کبھی جمہوریت کا حسن بیان کرتے۔ اقتدار کی جنگ میں ایک دوسرے کے گریبان پھاڑتے۔

اب لوگ آنے والی نسل کی طرف امید سے دیکھتے ہیں۔ کیونکہ آس کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

اچانک لوڈشیڈنگ ہوئی۔ کچھ دیر کے لیے ہوٹل تاریکی میں ڈوب گیا۔ استقبالیہ خاتون کلرک کا سفید چہرہ بھی تاریکی میں ماند پڑ گیا۔ سر عباس کے نام کا گھومتا روشن پہیہ رک گیا۔ جتنی دیر میں انتظامیہ جنریٹر چلا کر عارضی روشنی کا بندوبست کرتی' قوم تاریکی میں غرق رہی۔

اس نے دروازہ کھولا۔ اندر داخل ہوئی۔ اور لوگوں میں مل کر ان کا حصہ بن گئی۔

جنریٹر کی گھڑ گھڑ کے ساتھ حمیرا ہال میں داخل ہوئی تھی۔ وہ اپنوں میں سب سے آخری تھی۔

عبیر نے دیکھا' اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بشاش نہیں تھا۔ اس ایم فل نے اس کو تھکا کر چور چور کر دیا تھا۔ اس کو اپنی دوست پر بے حد رحم آیا۔ بے چاری یونیورسٹی کی سیاست بھگتنے کو تنہا رہ گئی تھی۔

"بہت دیر کر دی۔ میں سمجھی' تمہارا ایسر چوالا ماسٹر آنے نہیں دے رہا ہو گا۔"

میرا نے ایک سرسری سی نظر ارد گرد ڈالی' ہال تازہ دم اور خوب روشن تھا۔ چھت سے چپکی ٹریک لائٹ اور منزل بہ منزل جھولتے فانوسوں نے اندر کی زندگی کو حرارت بخش دی تھی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چاروں طرف جیسے جشن کا سماں تھا۔ لوگ اپنے اپنے حصے کے کاموں میں مگن' اپنی ذمے داریاں خوش اسلوبی سے نبھا رہے تھے۔ آج سر عباس کی کتاب سے اس کا مستقبل زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ حالانکہ آج کے دن کا انہوں نے برسوں انتظار کیا تھا۔ سر کی کتاب پٹاری میں بند سانپ کی طرح تھی۔ جب تک ڈلیا پر ڈھکن تھا۔ ان کا گھرانہ محفوظ تھا۔ جانے کب یہ پھنکارتا باہر نکلے اور لوگ لٹھ لے کر پیچھے پڑ جائیں۔ وہ بے چارہ چاہے آپ کو ڈستا بھی نہ ہو۔

"سب پہنچ گئے؟"

"ہاں کب کے۔" عبیر کی آواز میں پھر بچپن کا جوشیلا پن جھلکا جا رہا تھا۔ "پل کی ترتیب رضا عثمان اپنی مرضی سے کرنا چاہتے تھے۔ بیس دفعہ تو میں نے ہی پھولوں کی ترتیب بدلی۔ تم نے دیکھا۔ اعجاز آیا ہے۔"

"اچھا؟" تھوڑی دیر پہلے ہی جو اس نے بڑے ہونے کا ماسک اپنے چہرے پر فٹ کیا تھا۔ نوچ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

"ہیلو اعجاز۔" عبیر نے دیکھا اور پھر بچوں کی طرح چہکنے لگی تھی۔ "حد ہے بھئی۔ کہاں کھو گئے تھے۔ اچانک کہاں سے نمودار ہو گئے ہو؟"

روشن جگمگاتا کمرہ گھومتے سے بند ہی پانی کی لہروں میں ڈولتی کشتی بن گیا تھا۔ صوفی چیمبرز کا مفلوک الحال دفتر میں ڈھل گیا۔ آڈیٹوریم کا تھیٹر "پردیسی" میں تبدیل ہوا۔ جیسے کوئی وی سی آر کے ری وائنڈ بٹن پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا ہو۔ کتنے بہت سے منظر ایک ساتھ گزر گئے۔

اعجاز مسکراتا ہوا ان کے درمیان شامل رہا۔ انہوں نے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ وہ یونیورسٹی والا ولولہ ماند پڑ گیا تھا۔ اور اسی پر کیا منحصر۔ طالب علمی کا دور ختم ہوتے ہی جیسے لوگ ایک عہد سے دوسرے زمانے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ باتوں کا وقت بیت جاتا ہے۔ مستقبل کا خوف آنکھوں میں مستقل ڈیرے ڈال رکھتا ہے۔ ایک مدت بے روزگار رہنے کے بعد اس کو گریڈ چودہ کی ایک سرکاری ملازمت مل سکی تھی۔ انہوں نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا تھا۔ وہ جو پیٹھ پر اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کا وزن لادے پھرتا ہے اس کو اپنی ڈگری سمیت دفن کر کے ان سے ملے۔ سو روزی روٹی کمانے کا مشغلہ ضروری تھا۔

میں نے سوچا۔ میں ہی کیوں زمانے بھر کا بوجھ کندھے پر لادے پھروں۔ سو آج بہت ہلکا پھلکا ہوں۔"

وہ ان کی سن رہا تھا۔ اپنی زندگی کی سنا رہا تھا۔ پرانے دوستوں سے رابطے جوڑنا بہت مشکل نہیں ہوتا' کیونکہ اب کو الف بے سے شروع نہیں کرنا پڑتا۔ وہ بتاتا رہا۔

اس کے علاقے کے ستر اسی فیصد لوگ تعلیم مکمل کر کے بے روزگار پھر رہے ہیں۔ کچھ کو پردیس نگل گیا۔ کچھ فرسٹریشن میں ڈوب گئے۔ کچھ ماں باپ سے طعنے سن سن کر گھروں سے بھاگ گئے۔ ماں باپ سمجھ ہی نہیں رہے' ان کے بچے کسی کام دھندے پر کیوں نہیں لگتے۔ ہر جگہ روزی کا کال پڑا ہوا ہے۔

ہمارا لائی' جگمگاتی روشنیوں تنور کے پھوٹتے چشموں پر جیسے تاریکی مسلط ہو گئی۔ دیواروں سے ابلتی موسیقی الم پرا بن گئی تھی۔

ہم بھی دو قطعی مختلف زندگیاں گزار رہے ہیں۔ ہمارے بڑے یہ سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں کہ ان کے بچے ان جاتے کیوں پھر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے زمانے میں یہ بے پناہ بے روزگاری نہیں دیکھی تھی۔ ان کا ... ہی نہیں کرتا۔" عبیر کا ذہن بھٹک کر چاروں طرف ڈبکیاں لگاتا پھرا۔

رضا عثمان مہمانوں کو خوش آمدید کہنے دروازے سے جڑے کھڑے تھے۔ ہر نئے آنے والے سے وہ بڑی خوش دلی سے اس کا احوال دریافت کرتے دروازے سے کرسیوں تک لاتے۔ ان میں عبیر والی ہٹ دھرمی نہیں تھی۔ وقت اور حالات کے مطابق وہ خود کو سہولت سے بدلتے رہتے تھے۔ بور کا لفظ ان کی لغت میں تھا ہی نہیں۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" اس نے دیکھا جب جب وہ پروٹوکول ڈیوٹی سے فرصت پاتے، تنویر کا احوال پوچھنا نہیں بھولتے تھے۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" اس کی آواز کا ٹھہراؤ اجنبی محسوس ہوتا۔

"نوکریاں حاصل کرنے کے لیے پیسہ چاہیے، پیسہ ہو تو ٹکے ٹکے کی نوکریاں کون مانگتا ہے۔" اعجاز کے لہجے میں آہستہ آہستہ تلخی بھر رہی تھی۔

"یہ زبان کے جھگڑے ہیں۔ ڈومی سائل کے، پاکستان آپ کا ڈومی سائل نہیں۔ جائے پیدائش کے حادثے میں جو زبان اور علاقہ آپ کے نصیب میں آتا ہے۔ وہیں بس آپ روٹی کی تلاش کریں۔ اس زبان کے جھگڑوں میں زندہ انسان لاشیں بنتے ہیں۔

اس زبان کی خاطر جو ٹوٹے بول بھی بول سکتی تھی۔ آپ جان لیتے بھی ہیں، اور دیتے بھی ہیں، پتا نہیں ہم کہاں جا کر رکیں گے۔"

شہریار بطور فوڈ انسپکٹر پانی کی ذمے داری پر کھڑا تھا، وہ بہت اچھا منتظم تھا، تنویر کی شادی پر دیگوں کی تقسیم اس کے ہی حصے میں آئی تھی۔ آج ماضی کی بہت باتیں ہو گئیں بس۔ اس نے اکتاہٹ سے سوچا۔ اب ماضی کو تنویر کی شادی تک لے کر نہیں جایا جاسکتا۔

شفاف پانی کی بوتلیں اور گلاس ہال میں بیٹھے لوگوں کے سامنے حساب سے تقسیم کرتے وہ اکبر اعظم کو لیے ان کے پاس آگیا۔ شہریار عجیب بھلا مانس تھا۔ وہ کبھی اپنے طبقے کی بددماغی اوڑھ نہیں سکا۔ جب بھی ماتحت عملہ بٹ پر ہاتھ مار کر کھٹاک سے سلیوٹ مارتا تو رعونت سے بندوق والے کی طرف دیکھے بغیر سیدھا گزر جانے کے بجائے تعظیماً "کہتا تھا۔

"وعلیکم السلام!"

عثمان کسی کو کرسی پر بٹھا کر فارغ ہوا تو یونہی بے پروائی سے گزرتا عبیر کے پاس ٹھہر گیا۔

"ثریا کو نہیں بلایا تم نے؟"

عبیر لمحے بھر کو سن ہو گئی۔ "بلایا تو تھا لیکن مجھے لگتا نہیں کہ وہ آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی؟ وہ جھلی لڑکی پھر اس کتاب میں سب حد انوالو تھی۔"

"میں نہیں جانتی کیوں۔ سنو عثمان۔" وہ جاتے جاتے پلٹ کر اس کی آواز پر ٹھہر گیا۔

"کیا تمہیں ثریا ابھی تک یاد آتی ہے۔ تمہیں لگتا ہے تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی؟"

"پتا نہیں۔" وہ آہستگی سے بولا۔ "میں نے کی یا خود ہو گئی۔ لیکن یہ ضرور سوچتا ہوں، آج وہ جو کچھ ہے وہ شاید نہ ہوتی اگر اسے مختلف ماحول مل جاتا۔ اس طرح اس کے قتل میں میرا بھی حصہ ہے۔ اب تمہیں حق ہے کہ پوچھو قتل کرتے ہو کہ کرامات کرو ہو۔ پوچھو بھی۔"

اس نے پوچھنے کا انتظار نہیں کیا کیونکہ جمال بھائی کو کوئی ضروری ہدایت دینے ان ہی قدموں پلٹ گیا تھا۔ وہ دکھی ہو گئی۔ کتنی آسانی سے خود کو معتوب ٹھہرا لیتا ہے میرا بھائی، کیونکہ سب سے آسان ٹارگٹ آپ کی اپنی ذات ہے اور نہیں جانتا وہ جھلی لڑکی کیسے اس منحوس کے سامنے چٹان بن کر کھڑی ہو گئی تھی۔

"تمہیں سارہ حق بھی یاد ہیں اعجاز؟" وہ پورے ہال میں گھومتی ایک ایک کے سامنے خوش اخلاقی کی چھ نمبر والی مسکراہٹ بکھیرتی (جس کا اس کو رضا نے حکم دیا تھا) واپس اعجاز کے پاس آکھڑی ہوئی۔

وہ چپ سا ہو گیا۔ پتا نہیں اس پر کیا گزری تھی یا وہ اس لمحہ کہاں کہاں سے نہیں گزر رہا تھا۔

"کیا وہ آئیں گی؟" اس نے غیر متعلق سے لہجے میں سوال کیا تھا۔

"معلوم نہیں، بلایا تو نہیں۔ لیکن وہ ضرور آئیں گی۔ جہاں میڈیا ہو۔ کیمرے ہوں۔ آٹھ دس انٹلکچوئلز ہوں، ایک مائیک لگا ہو جہاں جوہر فشانی کے امکانات بھی ہوں۔ وہ دور رہ نہیں سکتیں۔"

"بڑی عجیب بات ہے۔ سارہ حق اس وقت ایکسپوز ہوتی ہیں، جب انسان ان کے ہاتھوں بری طرح زک اٹھا چکا ہو۔ اس کے بعد ان کے ظاہر ہونے کا فائدہ بھی کوئی نہیں ہوتا۔" وہ کسی شدید تناؤ میں گرفتار جیسے رازداری سے بولا۔

"مجھے حیرت ہے، ایک زمانے میں وہ میرا آئیڈیل تھیں۔ اب شاید کسی اور کی ہوں۔ ایسے لوگ اپنے گرد ہمیشہ جمگھٹا رکھتے ہیں۔

"سارہ حق نے ایک دفعہ مجھ پر شدید طعنہ زنی کی تھی کہ اتنے کرائسز میں جہاں انسانی حقوق تباہ ہو رہے ہیں۔ لوگ بھوک اور فاقہ سے مر رہے ہیں۔ ہم پر ایک مردہ جمہوریت مسلط ہے تو میں ایسی ہشاش بشاش کیسے لگتی ہوں۔ آج میں سوچتی ہوں، دراصل ہماری اس افراتفری میں انہوں نے بھی اپنا بڑا حصہ ڈالا ہے۔ اور ان کے مردہ ضمیر کا جو کونا جاگتا ہے۔ وہ ان کے جلن اور حسد سے جھلسے ہوئے دل کو کوڑے مارتا رہتا ہے۔ ہماری کریم بی کہتی ہیں۔ مرے کو مارے شاہ مدار۔ وہ اتنی غلط کیوں تھیں اعجاز؟"

پھر وہ فاروق کی طرف پلٹ گیا۔ "آپ کو یہاں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔"

"مجھے بھی۔" پھر وہ پچھلے وقتوں اور مشترکہ دوستوں کی باتیں کرتے رہے۔ وہ ان سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی۔ وقفوں وقفوں سے کچھ مانوس کچھ قطعی اجنبی نام اس کی سماعت سے ٹکرائے تھے۔ وہ کہاں ہے ان دنوں؟ فلاں کہاں گیا؟ ڈھمکاں کیا کر رہا ہے؟ جب بہت دنوں بعد لوگ ملتے ہیں اور ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا تو انہیں کچھ تو کہنا ہوتا ہے ناں۔

عبیر چونک کر پلٹی۔ وہ اس سے بہت دور نہیں تھا۔ لیکن اس سے مخاطب بھی نہیں تھا اس نے دیکھا ہی نہیں۔ پتا نہیں اعجاز کب وہاں سے اٹھا اب وہ اکبر کے پاس کھڑا اس کے احوال دریافت کر رہا تھا۔ نسیمہ بی بی۔ سارہ حق..... حقوق نسواں۔ اس کے دکھوں کی کوئی اتھاہ نہیں تھی۔

عبیر نے سر اٹھا کر فاروق کی طرف دیکھا۔ ہال کی مصروفیت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ جوس کے گلاس کانچ کی ٹرے میں لیے جمال بھائی۔ پھولوں کی ایک بار پھر ترتیب بدلتا عثمان۔ کرسیوں کی گنتی کرتا شہریار۔

"سر عباس کی کتاب کی تقریب تھی۔ میرا خیال تھا تم مجھے ضرور انوائٹ کرو گی۔"

"میں نے لسٹ دیکھی اس میں آپ کا نام تھا۔"

"تم نے صرف دیکھا۔ اپنے ہاتھ سے لکھا نہیں۔ افسوس کہ میں تمہاری پی ایچ ڈی سے بھی غیر اہم ہوں؟ میں تمہاری جگہ ہوتا تو انگلی کاٹ کر خون سے تمہارا نام ـــــ سرکنڈے کا قلم ڈبو کر ضرور لکھتا مگر معلوم نہیں سرکنڈے کے قلم کہاں سے ملیں گے۔"

"اچھا چلو اب اتنی بے بس سی شکل تو نہ بناؤ۔"

"ویسے یہ کتاب دو چار دن کا قصہ نہیں۔ دس بیس برس کی کہانی بھی نہیں۔

مجھے افسوس ہے، اس کتاب میں ترقی کی داستانیں تحریر ہونے سے رہ گئیں۔ اس میں پنج سالہ، دس سالہ ترقی بھی شامل نہیں کیونکہ یہ ایک نہایت غیر اہم ادنیٰ سے پاکستانی کی کتاب ہے۔ سرکاری گزٹ نہیں۔ اور ترقی کے میرے اعداد و شمار سرکار کے اعداد و شمار سے میل بھی نہیں کھاتے۔

اس کتاب میں ہیرو ہیروئن بھی نہیں۔ کچھ کردار ہیں اور بے شمار واقعات۔ مگر ان سب میں حیران کن حد تک مماثلت ہے۔

قوموں کی تاریخ گواہ ہے وہ عروج کی ایک حد پر ہی جاتی ہیں۔ پھر ان کا زوال شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا۔ صد شکر کہ پاکستان اپنے عروج پر نہیں پہنچا لیکن گڑھے میں گرنے کی بھی حدیں مقرر ہیں۔ جتنا ہم گر چکے اس سے نیچے اور پستی نہیں ہے۔ اس یقین کی کیا وجہ ہے مجھے نہیں معلوم لیکن ہم جیسے بددیانتوں کی یہ آخری فصل ہے جو پاکستان کاٹ رہا ہے۔ رات ختم ہونے کو آئی۔ ہم رات کے آخری حصے کے ٹمٹماتے چراغ ہیں۔ اب اندھیرے اس قوم کا مقدر نہیں رہیں گے۔ کیونکہ ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

”صبح ہونے میں اب دیر ہی کتنی ہے۔“

یہ ایک اہم دن تھا۔ سر عباس ڈائس پر کھڑے تھے۔ ان کے سامنے لکھے ہوئے کاغذ نہیں تھے۔ حتیٰ کہ ان کی کتاب بھی نہیں تھی۔ وہ سب کی سب ایک کونے میں میز پر قطاروں کی شکل میں اسٹاک کی ہوئی تھیں۔ انہیں حوالوں کے لیے کتاب دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس کتاب کو لکھتے لکھتے انہوں نے نصف عمر بسر کر دی تھی اور ان کو ازبر تھی۔ پروین وسایا کتابوں کی اس میز کے ساتھ جم کر کھڑی تھی۔ کسی زمانے میں اسے کتابوں سے محبت رہی تھی۔ اسے نہیں پتا اس کتاب کے اندر کیا درج تھا۔ لیکن اسے کتاب لکھنے والے سے عجیب و غریب سی عقیدت ہو گئی تھی۔ سو وہ از خود یہ ذمے داری اٹھائے کھڑی تھی۔ مستعد اور چوکس۔ جو کتاب خریدنا چاہے اس سے رجوع کرے۔ دشمنوں کے حساب چکتا کر کے وہ دوستوں کے حساب کی نگہبانی کرنا جان گئی تھی۔

یہ اہم ترین وقت تھا۔ ہال ان کے نئے پرانے طالب علموں سے بھرا ہوا تھا۔ ان سے عقیدت رکھتے، ان سے محبت کرتے۔ شاید ہی کوئی ایسا ہو جس سے ان کا کبھی ربط کا رشتہ رہا ہو اور وہ ہال میں موجود نہ ہو۔ ان کا اپنا خاندان بچوں کی سی خوشی سے سر اٹھائے سرشار انداز میں بیٹھا ایک ٹک ان کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی تقریر جاری تھی۔ کچھ ہوا تھا۔ وہ بولتے بولتے اچانک تھم گئے۔

دروازہ کھلا تھا۔ تقریر کے دوران، تقریب میں اتنی تاخیر سے کون آیا تھا۔ چونکہ مقرر کی نظریں ایک سمت جمی تھیں۔ اوراق ان کی آنکھوں سے جیسے محو ہو گئے تھے۔

ان کی نظروں کے تعاقب میں حاضرین نے اس رخ پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ کون تھا۔ لوگ اسے نہیں پہچانتے تھے لیکن جو بھی تھا اس نے رخنہ ڈال دیا تھا۔

ڈائس پر کہنیاں ٹکیے پروفیسر عباس جیسے اپنی جگہ جم گئے تھے۔ ان کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ چشمے کے باوجود ان کی پہچان سلب ہو رہی تھی۔ یقین، بے یقینی کی کیفیت میں دور سے آتے، میانہ روی سے قدم بڑھاتے ستون کے دوسری طرف نیم خنک اندھیرے میں ایسا کون تھا جس نے ان کو ساکت کر دیا تھا۔

یہ اتنا مانوس کیوں دکھائی دیتا ہے۔ کیا کبھی ہماری خواہشیں ہیولوں کی طرح لرزتی کوئی مجسم شکل بھی اختیار کر سکتی ہیں۔

قریب آئے تو ان کے گمان دھوکا نہیں کھائیں گے۔

”بس اب ختم ہوئی بارش سنگ“

ہر کنکری نشان زدہ تھی اس نے پلٹ کر دیکھا اور عذاب کا حصہ ہو گیا۔

کچھ کرو۔ کچھ کرو۔ (اب کرنے کو بچا ہی کیا ہے)

آنے والا ستون کی آڑ سے نکل کر ہلکی روشنی والے حصے میں چپ چاپ کھڑا تھا۔

وہ ڈائس سے الٹے قدم پلٹے۔ اسٹیج کی سائیڈ پر پچھلی سیڑھیوں تک انہوں نے ہموار قدم اٹھائے۔ پھر جیسے ان کے قدم تیز اور بے ربط ہو گئے۔

اس نے اپنے باپ کی آنکھیں پہلی دفعہ نم آلود ہوتے دیکھی تھیں۔

عبہر پریشانی سے پلٹی۔

اور حیرت سے اپنی جگہ جامد ہو گئی۔ وہ اس کے باس کے گلے کیوں لگے تھے۔ ایسا کیا تھا جو ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو ٹھہر گئے تھے۔

جیسے وہ تاریخ کے دو مختلف حصے تھے۔ دو بازو، بچھڑے اور کٹے ہوئے۔

اس نے پلٹ کر غیر ارادی طور پر فاروق کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک طویل مسکراہٹ تھی۔ پرسکون۔ شانت

وہ بے ساختگی میں اٹھی۔ لیکن اپنے باپ کی طرف لپک کر جانے کے بجائے واپس بیٹھ گئی۔

سفر جاری ہے۔ اس نے آہستگی سے سوچا۔

سفر جاری رہتا ہے۔

سر عباس اپنی کتاب کا آخری باب سنا رہے تھے۔ کیا واقعی یہ آخری باب تھا؟

”اللہ کرے دکھ بھری تاریخ کا بس یہی آخری صفحہ ہو۔“

”شہریار نے پانی میں پاؤں ڈبوتے ہوئے سوچا تھا۔ جیسے سنگلاخ پتھریلی چٹانوں اور پرخطر راستوں سے گزرتے، دوران سیاحت اس نے کتنی دفعہ دیکھا تھا۔ جب آپ ایک موڑ کاٹتے ہیں تو منظر بدل جاتا ہے۔ اچانک نظارے میں کہیں سے ایک دریا داخل ہو جاتا ہے، گھنے بادلوں اور سبزے سے ڈھکی پہاڑیاں خشک چٹانوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔ چٹکیاں بھرتی تیز دھوپ کی جگہ نرم ہوا لے لیتی ہے۔ پھر سفر کی ساری کلفت دھوپ کی طرح ڈھل جاتی ہے۔ مسافر وہیں ڈیرہ جما لیتا ہے۔

کیا یہ منزل تھی یا ابھی منزلیں باقی تھیں۔

ٹخ پانی اس کے پیروں کو بھگوتا اس کے سر کی تپش کو جیسے تھپک تھپک کر ٹھنڈا کر رہا تھا۔ اسے لگا وہ کچھ بے ربط سا سوچ رہا ہے۔

پتا نہیں وہ کتنا چلا تھا۔ کب سے چل رہا تھا۔ جوتوں کے اندر پاؤں میں چھالے بھی شاید وقت کا تعین نہیں کر سکتے تھے۔

اس کی کلائی پر گھڑی بندھی تھی، نہ جیب موبائل کے وجود سے بوجھل تھی۔ وقت اور زمانے کی قید سے رہائی کی صورت تھی کہ وہ گزرتے وقت سے خوف زدہ کرتی چیزوں سے نجات حاصل کر لے۔

اسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ کب سے سفر میں تھا۔

سنگ زمانہ ہیں ہم“

اس نے ——— خود کو دن بھر مختلف مقامات پر تنہا گھومتے پایا تھا۔

یونیورسٹی آڈیٹوریم کے سامنے اینٹوں کی فٹ پاتھ پر

پلیٹ فارم نمبر پانچ پر رینگتی ہوئی ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے

سڑکوں پر بے مقصد سرگشت کرتے۔ بڑے بڑے بل بورڈز پر درج عبارتیں پڑھتے

صرف ایک جملے سے کترا کترا کر بھاگتے۔ وہ جملہ اس نے ادا کرنا تو درکنار، سوچا بھی تو وہ اپنے ذہن اور زبان کو کسی سزا کے لیے معاف نہیں کر سکے گا۔

اس نے نہر سے پاؤں نکالے۔ اور خاموشی سے سفید پتھر کی یادگار پر درج عبارت بلند آواز سے پڑھنے لگا۔

”ہم نے اپنا آج آپ کے کل کے لیے قربان کر دیا۔“

صباحت یاسین

جلترنگ سی ہنسی، مانوس سا انداز، گیارہ سے چند منٹ آگے کا وقت دکھاتی گھڑی کی سوئیاں، کی بورڈ پہ تھرکتی ہشام دانش کی انگلیاں اور جلترنگ سی ہنسی کی جانب متوجہ سماعتیں۔

پشاور صدر کے کینٹ ایریا میں واقع اے سی فلیٹس کے بی تھری میں شب انہی لوازمات کے ساتھ اترا کرتی تھی۔ کبھی کبھار ہشام تمام کام چھوڑ کر اس ہنسی کو سنتا، کبھی کبھار بے توجہی سے اور کبھی تو وہ اسے سن کر بیزار بھی ہو جاتا، مگر وہ کھنکتی سی آواز اور زندگی سے بھرپور ہنسی بنا کسی شعوری کوشش کے ہشام کے امور روزمرہ میں معمولات کی طرح شامل ہو چکی تھی۔ ایسے ہی جیسے ہر شب سونے سے پہلے کسی کتاب کی ورق گردانی کی عادت یا کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے ایک کپ چائے کی روٹین۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑے مگن انداز میں کمپیوٹر پر کام کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایک اچھی سی دھن سے لطف اندوز ہونے کے لیے ہیڈ فون بھی لگا رکھے تھے کہ اچانک موبائل نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

موبائل کی اسکرین تھوڑے تھوڑے وقفے سے جلنے اور بجھنے لگی گویا کسی کی کال آ رہی ہو۔ وہ جی بھر کے بدمزا ہوا، کیونکہ جانتا تھا کہ سرفراز کے سوا کسی کی کال نہ ہو گی۔ کچھ دیر وہ نظر انداز کرتا رہا، مگر جب مسلسل کال آتی رہی تو اس نے جھنجلا کر ہیڈ فون گردن میں اٹکا کر۔ موبائل کی جانب ہاتھ بڑھایا۔

ڈھیٹوں کی طرح مچلتا موبائل اس کے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی خاموش ہو گیا۔

اس نے بے زاری سے فون ٹیبل پہ رکھا اور ہیڈ فون کی جانب ہاتھ بڑھایا، مگر انہیں کانوں پر لگانے کے بجائے وہ چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اچانک اسے کسی کے بے تحاشا ہنسنے کی آواز سنائی دی تھی۔ ہنسی تو چلو سنائی دی ہی، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ اسے لگ رہا تھا، ہنسنے والی بہت قریب موجود ہے۔

"سچ کہو۔" بے ساختہ سی ہنسی کو بہت مشکل سے روک کر اس نسوانی آواز نے سوال کیا۔

ہشام کچھ سوچ کر کرسی سے اٹھا اور ہیڈ فون ٹیبل پر رکھ کر آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ اس کے قدم کمرے کے داخلی دروازے کے بالکل سامنے موجود دیوار میں نصب کھڑکی کی طرف اٹھ رہے تھے جو ادھ کھلی سی تھی۔

"یار! تم نے واقعی اس کو ایسا کہا؟"

آواز سے ہی لگ رہا تھا کہ بڑی مشکل سے ہنسی روک کر پوچھا گیا تھا اور بات مکمل ہوتے ہی ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

ہشام نے کھڑکی کو ذرا سا اور کھولا اور باہر جھانکا۔ اوپر والے پورشن میں عین اس کی کھڑکی کی سیدھ میں موجود کھڑکی پوری طرح کھول کر وہ لڑکی ذرا سی باہر کو جھکی ہوئی تھی۔ باہر اندھیرا تھا، اس لیے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، مگر اس کے کمرے سے آتی روشنی کی وجہ سے اس کا ہیولا اتنا واضح ضرور تھا کہ ایک لمحے کو سر اٹھا کر دیکھنے سے ہی ہشام کو اندازہ ہو گیا کہ اس کے کان کے ساتھ موبائل لگا تھا اور وہ اپنی انگلی پر بالوں کی لٹ کو لپیٹ اور کھول رہی ہے۔

ہشام نے بنا آواز پیدا کیے کھڑکی بند کی اور خواہ مخواہ ہی سوچنے لگا کہ اب شاید وہ فون کے دوسری جانب موجود ہستی کو خاموشی سے سن رہی ہو، اور شاید اس کے چہرے پر ابھی تک جاندار سی مسکراہٹ موجود ہو گی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

ہشام بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا، جب اس کی ماما دودھ کا گلاس لے کر آئیں۔

"آج آپ آ گئی ہیں، آج تو ٹھیک ہونا ہی تھا۔"

اس نے فریش سی آواز میں جواب دیا۔ وہ دودھ کا گلاس اس کے ہاتھ میں پکڑا کر بیڈ پر بیٹھ گئیں۔

"ارے! یہ فالتو تکیہ ادھر کیا کر رہا ہے؟" ہشام کے پہلو میں پڑے تکیے کو دیکھ کر انہوں نے سوال کیا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر ہاتھ آگے بڑھا کر بولیں۔

"لاؤ مجھے دے دو' اسٹور میں رکھ دوں۔"

"ارے نہیں ماما! میں نے خود منگوایا ہے۔"

"خیریت ہے نا بیٹا! گردن میں درد تو نہیں جو تکیہ بدلنا پڑا؟" وہ ایک دم متفکر سی ہو گئیں۔

"نہیں ماما! ایسا کچھ بھی نہیں۔ آپ فکر مت کریں۔" اس نے ماما کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

"کیسے فکر نہ کروں؟ ذرا سے کیا جاؤں' دونوں باپ بیٹا بیمار ہو کر بیٹھ جاتے ہیں' اتنے ننھے ہیں ابھی تک۔" انہوں نے شکوہ کناں لہجے میں کہا۔

"آپ بھی تو نئی نویلی دلہنوں کی طرح آئے روز میکے چلی جاتی ہیں نا۔" ہشام نے انہیں چھیڑا تو ہلکی سی مسکان ان کے لبوں کو چھو گئی۔

"ویسے یہ تکیہ اس لیے منگوایا تھا کہ نیچے سے بہت شور آتا ہے تو کانوں پہ رکھ لیتا ہوں۔"

"نیچے تو خالی ہے' اوپر سے آتا ہو گا۔" ماما نے فوراً درستی کی۔

"جی جی وہی۔" ہشام نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"خاصے تہذیب یافتہ لوگ ہیں' یقیناً" بے دھیانی میں تمہیں ڈسٹرب کیا ہو گا' میں بات کرتی ہوں ان سے۔"

اکلوتے بیٹے کی بے آرامی کا سن کر ہی وہ پریشان ہو گئیں' جبکہ ہشام نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے فوراً" کہا۔

"نہیں' نہیں ماما! اس کی کوئی ضرورت نہیں' اتنی بڑی بات تو نہیں ہے۔"

"شیور؟" ماما نے سوالیہ لہجے میں کہا۔

"جی شیور' ایک روز آواز آئی تھی باتوں کی تو میں نے احتیاطاً" تکیہ ادھر رکھ لیا ہے۔"

اس نے انہیں پوری طرح مطمئن کر دیا۔ جب ہی وہ بولیں۔

"او کے بیٹا! میں اب چلتی ہوں' تم آرام کرو۔"

"جی ماما! گڈ نائٹ۔" ہشام نے سعادت مندی سے کہا۔

"دودھ ضرور پی لینا۔" انہوں نے اٹھتے ہوئے تاکید کی۔

"او کے ماما جی! ڈونٹ یو وری۔"

وہ اٹھ کر جا چکی تھیں۔ ہشام نے ایک نظر دودھ کے گلاس کو دیکھا اور پھر دیوار گیر گھڑی کو۔ گیارہ بجنے ہی والے تھے' پچھلے تین دن سے بخار کی وجہ سے وہ کمپیوٹر کے سامنے نہیں بیٹھ سکا تھا اور ان تینوں دنوں میں اس بے تحاشا ہنسنے والی لڑکی نے اسے کافی بے آرام کیا تھا۔ تین ہی دنوں میں وہ جان گیا کہ اسے گیارہ بجتے ہی اپنی عالیہ نامی دوست سے بے تحاشا باتیں کرنے کی عادت تھی۔ وہ ہر بات پہ پانچ سے دس سیکنڈ ضرور ہنسا کرتی تھی اور اس کی باتیں اتنی وافر مقدار میں ہوتی تھیں کہ ہر روز ایک گھنٹہ کی کال جب منقطع ہوتی تو وہ نہایت مایوس آواز میں کم از کم چھ دفعہ "ہیلو ہیلو" کی گردان ضرور دہراتی۔

ہشام نے دودھ کا گلاس خالی کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ جس آواز کی کانوں تک رسائی ناممکن بنانے کے لیے وہ پچھلے تین دن سے اضافی تکیہ استعمال میں لا رہا تھا' آج اس کی سماعتیں اسی آواز کی منتظر تھیں۔ وہ کچھ دیر کتاب کی ورق گردانی کرتا رہا پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ بلا ارادہ ہی اس کی نظر کبھی کھڑکی کی طرف اٹھ جاتی اور کبھی دیوار پر لٹکتی گھڑی کی طرف۔ کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ تھک کر بیڈ کے کنارے ٹک گیا۔ غیر محسوس انتظار کی جگہ واضح جھنجلاہٹ نے لے لی۔

☼ ☼ ☼

"یار! کیا بات ہے' کوئی مسئلہ ہے؟"

وہ اور سرفراز اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے چلغوزوں کے ساتھ انصاف کر رہے تھے' جب سرفراز نے پریشانی سے پوچھا۔ جواباً" ہشام نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کی اور بولا۔

"تمہارا خیال ہے کوئی مسئلہ ہو گا اور تمہیں بتا نہیں ہو گا' اتنے فاصلے ہیں ہم میں؟"

"ارے نہیں' لیکن آنٹی نے جس انداز میں مجھے بتایا کہ کئی دن سے تم سو نہیں پا رہے تو میں بہت ٹینس ہو گیا۔"

"یار! ماما کا پرابلم صرف یہ ہے کہ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں' اسی لیے وہ ضرورت سے زیادہ کانشس رہتی ہیں۔"

"لیکن شانی! تم ہفتہ ڈیڑھ سے نہیں سوئے تو۔"

"ہفتہ ڈیڑھ نہیں' پانچ یا چھ دن بس۔"

ہشام نے اس کی بات کاٹی اور انگلی اٹھا کر درستی کی۔

"اچھا' ناراض کیوں ہو رہا ہے' بتا نا کیا پرابلم ہے؟" سرفراز نے نرمی سے پوچھا۔

"دماغ نہ کھا' کہا جو ہے' کچھ بھی نہیں۔"

ہشام نے اسے ڈپٹا تو وہ نروٹھے پن سے اپنے موڈی دوست کو بس دیکھ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیا مصیبت ہے یار!"

وہ تنگ آ کر اٹھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو آہستہ آہستہ دبانے لگا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ چار دن میں نے اس کی آواز سنی اور پانچویں دن مجھے اس کے بغیر نیند ہی نہیں آ رہی۔" وہ کوفت زدہ انداز میں سوچے جا رہا تھا۔

اسے لگا' ساڑھے گیارہ بجاتی گھڑی اسے چڑا رہی ہے۔ وہ عموماً" سوا بارہ بجے کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھا کرتا اور اٹھتے ہی بیڈ پر ڈھیر ہو جاتا۔ مگر پچھلے دو' تین دن سے وہ دو ڈھائی بجے سے پہلے سو نہیں پایا اور شاید اسی وجہ سے آج اس کا سر شدید درد کر رہا تھا۔ کچھ دیر وہ بے حس و حرکت بیڈ پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر کچن میں آ گیا۔ اس کا ارادہ کافی بنانے کا تھا۔ وہ غائب دماغی سے ہاتھ چلاتا رہا اور پھر کافی کا مگ لے کر سلیب پر ہی بیٹھ گیا۔

پہلا سپ لینے کے لیے اس نے مگ ہونٹوں کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اس کے کانوں کو آہٹ سی ہوئی اور اس کی غائب دماغی از چھو ہو گئی۔ اس کی تمام تر حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔

آواز بہت دور سے آ رہی تھی۔ وہ بمشکل ہی سن پا رہا تھا' کیونکہ اس دھیمی سی آواز پر کوئی اور آواز حاوی ہو رہی تھی۔ ذرا سا دماغ لڑانے سے ہی اسے احساس ہو گیا کہ یہ لوہے کی زنجیر والے جھولے کی حرکت سے پیدا ہونے والا ہلکا سا شور تھا۔ سامنے والے لان میں موجود اس جھولے کے لیے اس نے کئی دفعہ بچوں کو لڑتے جھگڑتے دیکھا تھا۔

یہ جھولا اسی بلاک کے سامنے والے گراؤنڈ لان میں انتہائی بائیں جانب تھا' یعنی اس کے کچن کی سیدھ میں نہیں بلکہ اس سے بھی چند قدم آگے بائیں جانب۔

اس نے پھرتی سے ہاتھ چلاتے ہوئے کافی کا ایک اور مگ تیار کیا اور تیزی سے لان کی طرف قدم بڑھائے۔ وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ اس کا سر کل یا پرسوں کیوں نہ درد کیا' یا پھر یہ کہ اس کے کمرے کی ایک اور کھڑکی کیوں نہ تھی' جو سامنے والے لان میں کھلا کرتی۔

☼ ☼ ☼

وہ بڑی ترنگ میں چلتا ہوا جا رہا تھا' مگر فلیٹ کے داخلی دروازے کے سامنے موجود راہداری سے گزر کر لان تک آنے کے دوران اس کے قدموں کی رفتار بے ساختہ دھیمی پڑ گئی۔ لان میں داخل ہوتے ہی سردی کی ایک تیز لہر اسے اپنے رگ و پے میں سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

اس کی آنکھیں بڑی حیرت سے اس لڑکی کو تکے جا رہی تھیں' جو بہت مگن انداز میں جھولے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھی تھی۔ دسمبر کی اس ٹھٹھرتی رات میں یقیناً" کچھ دیر پہلے تک لان میں اس کے سوا کوئی ذی روح موجود نہ تھا اور اب ہشام ہاتھ میں کافی کے مگ لیے' اس کی پشت پر چند قدم کے فاصلے پر موجود تھا۔

خاموش اندھیری شب کے سناٹے میں جھولے کی

حرکت کرتی زنجیر کی آواز بڑی نمایاں تھی' جبکہ وہ لڑکی اب خاموش تھی' شاید وہ دوسری جانب ابھرنے والی آواز سن رہی تھی۔ اس نے لانگ جرسی پہن رکھی تھی۔ جس کی ٹوپی اس کے سر کو اس طرح ڈھکے ہوئے تھی کہ وہ سردی سے بھی پوری طرح محفوظ تھی اور اس کی وضع قطع بھی واضح نہیں ہو رہی تھی۔

"ہاں ہاں پوری بات سمجھ میں آگئی' ڈونٹ وری۔"

وہ اتنی اچانک بول پڑی کہ ہشام اس کی طرف متوجہ ہونے کے باوجود ذرا سا چونک گیا اور اس کے قدم وہیں کے وہیں تھم گئے۔

"ٹھیک ہے تا وہی بات کر والوں گی۔ ریٹس تو اچھے ہیں' بٹ نیٹ ورک اتنا فضول کہ سگنل آ ہی نہیں رہے تھے۔"

وہ بیزاری سے کہہ رہی تھی اور ہشام فوراً" اس کی لان میں موجودگی کی وجہ سمجھ گیا۔

یہ ایئر فورس کے آفیسرز کا رہائشی علاقہ تھا۔ ایک ہی احاطے میں تین' تین منزلوں کے چار بلاک موجود تھے۔ ہر بلاک کے سامنے ایک چھوٹا سا خوب صورت لان تھا۔ اس ننھی سی کالونی کے دو گیٹ تھے' دونوں پر چوبیس گھنٹے باوردی چوکیدار موجود رہتے۔

یہ پشاور کینٹ کا محفوظ ایریا تھا' مگر پھر بھی ہشام نے اس خاتون کے جذبۂ گفتگو کو داد دی' جس کے سبب وہ بلا خوف و خطر یہاں موجود تھی۔

"کتنی فضول ہو تم' فوراً" میاں صاحب کے نیٹ ورک پہ ٹرانسفر کرالی سم' بچپن کی سہیلی کا ذرا خیال نہیں کیا' جس کا تم سے بات کیے بنا گزارا ہی نہیں۔"

وہ روٹھے پن سے کہہ رہی تھی۔

"گزارا ہو تو رہا تھا پچھلے تین دن سے۔" ہشام نے شرارت سے سوچا۔ "وہ تین دن اپنے گھر سے دور تھوڑا ہی تھی' بہن بھائیوں کے درمیان تھی' سمجھی؟؟"

غالباً" اس کی دوست نے بھی ہشام والا شکوہ ہی کیا تھا۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"ہاں امی ٹھیک ہیں۔ کہہ رہی تھیں عالیہ میکے آئے تو کہنا مجھ سے بھی مل کے جائے۔ ہیلو۔۔۔ ہیلو۔"

کال کٹ گئی تھی اور حسب معمول اس کی ہیلو ہیلو کی گردان شروع ہو چکی تھی۔ ہشام نے ایک بار پھر ہاتھ میں موجود کافی کے دونوں مگ دیکھے جن سے اب بھاپ نہیں اڑ رہی تھی۔

"اف۔۔۔!" بے حد خراب موڈ سے کہتے ہوئے وہ جھولے سے اٹھی اور جھولے سے چند قدم آگے موجود بینچ کی طرف بڑھ گئی۔

اس نے بینچ پہ اپنا موبائل رکھا اور دایاں پاؤں بینچ پہ رکھ کر ذرا سی جھک گئی۔ ہشام محویت سے اس کی حرکات و سکنات دیکھتے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

وہ اب جو گرز پہن رہی تھی' جو اس نے شاید جھولے پر بیٹھنے سے قبل اتار کر یہاں رکھے تھے۔

دوسرے پاؤں کا جوگر ہاتھ میں لیتے ہوئے اسے اپنی پشت پہ کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ فوراً" پیچھے کی طرف مڑی۔ ہشام اس کے بالکل سامنے تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ ایک قدم پیچھے ہٹی' ہوئی بینچ کے بالکل ساتھ لگ گئی۔ ہشام بھی اس کے اچانک مڑنے پر سٹپٹا سا گیا۔ مگر پھر اسے فوراً" احساس ہوا کہ وہ ڈر گئی ہے' جب ہی وہ کافی کا مگ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے متبسم لہجے میں بولا۔

"کافی۔"

"کیوں؟"

اس نے ایک نظر ہشام کو دیکھا اور ایک نظر کافی کو اور پھر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اس لیے کہ۔۔۔ ٹھنڈ ہے۔" اسے حقیقتاً" اس یک لفظی سوال کا کوئی اور جواب نہ سوجھا تھا۔

"مجھے نہیں لگ رہی۔" اس نے بات ختم کرنے کے انداز میں کہا اور پاؤں بینچ پر رکھ کر جھک کر جوگر پہننے لگی۔

"نہیں لگ رہی تو بھی پی لیں' کیونکہ یہ اب گرم نہیں رہی ہے۔"

ہشام نے شگفتہ سے لہجے میں کہتے ہوئے مگ کو بینچ اس کے پاؤں سے ذرا فاصلے پر رکھ دیا۔

"مجھے نہیں پینی۔" اس نے غصے سے کہا اور تسمہ بند کیے بنا ہی پاؤں زمین پر رکھ لیا۔

"بٹ وائے؟" (لیکن کیوں؟)

ہشام نے حیرت سے سوال کیا۔ اس نے غصے سے بھرپور نگاہ سامنے کھڑے شخص پہ ڈالی جو پڑھا لکھا بھی لگ رہا تھا' معقول بھی اور مہذب بھی' مگر نہ جانے کیوں اسے کافی پلانے پہ مصر تھا' بلکہ کافی نہ پینے کی وجہ بھی جاننا چاہتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اسے سخت سست کہتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ہشام چند لمحے اس کی پشت کو گھورتا رہا' پھر کافی کا مگ اٹھانے کے لیے بینچ کی طرف مڑا۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی وہ یقیناً" موبائل اسکرین تھی۔ وہ فوراً" سے پیشتر پیچھے مڑا' مگر ویران' سنسان لان اس کا منہ چڑا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہیلو۔" اس نے بند آنکھوں کے ساتھ ہی موبائل کان سے لگا لیا۔

"جی کون؟" خاصے شائستہ لہجے میں پوچھا گیا۔ نسوانی آواز سنتے ہی اس کی ساری نیند اڑنچھو ہو گئی' فوراً" بولا۔

"آپ کون؟"

"وہی جس کا آپ نے فون اٹھایا ہے۔" خاصے [illegible] انداز میں کہا گیا۔ یہ فقرہ ہشام کے لبوں پہ [illegible] سا تبسم چھوڑ گیا۔

"میں کسی کا پی اے نہیں جو اوروں کے فون اٹھاتا پھروں۔ صرف اپنا فون اٹھاتا ہوں میں۔"

"یہ فون کس کا ہے؟" ایک ایک لفظ چبا کر پوچھا گیا۔

"ایک بہت معیاری کمپنی کا ہے محترمہ! آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" ہشام بہت دلچسپی سے اسے چڑا رہا تھا۔

"یہ فون آپ کا نہیں ہے نا؟" اس کی بے تکی بات کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور رسان سے پوچھا تھا۔

"آف کورس ناٹ! ایم ناٹ اے میٹل میٹریل۔" (میں یقیناً" دھات کا نہیں بنا ہوں۔) ہشام کا غیر سنجیدہ جواب ایک بار پھر اسے تپا گیا۔

"دیکھیے! آپ جو کوئی بھی ہیں۔"

"آپ مجھے جناب ہشام دانش کہہ کر مخاطب کر سکتی ہیں۔"

ہشام نے اس کی بات کاٹ کر آفر کی تو وہ جیسے پھٹ پڑی۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں صاحب جناب کی حد تک عزت دوں گی تو بھول ہے تمہاری۔ تم وہی ہو نا کافی والے؟ خوامخواہ سر پر چڑھنے کے شوقین۔"

"گویا میں آپ کی یادداشت میں محفوظ رہ گیا ہوں؟" ہشام نے اس کی چڑچڑاہٹ سے جی بھر کے مزا لیتے ہوئے کہا۔

"مائی فٹ!" مجھے صرف اتنا بتاؤ میرا موبائل کب واپس کرو گے؟" اب کی بار اس نے بھی کسی قسم کا لحاظ نہ رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

"ایک شرط پہ آپ کو آپ کا عزیز از جان موبائل واپس کروں گا۔"

"وہ کیا؟"

"اگر آپ مجھے اپنا اچھا سا نام بتا دیں مس۔۔۔ غانیہ!"

"اتنے فری مت ہوں آپ کہ میرا نام پوچھیں۔" وہ اس کی فرمائش سنتے ہی آگ بگولہ ہو گئی اور اس کی زبان چلنے لگی' مگر جوں ہی اس کا ذہن ہشام کی بات کو پوری طرح سمجھا' اس کی تیز گام کی سی رفتار سے چلتی زبان کو بریک لگ گئی۔

وہ زیر لب کا کونا دانتوں تلے دبائے مسکراہٹ روکنے کی کوشش میں تھا۔ غانیہ نے لائن کاٹ کر موبائل بیڈ پر پٹخ دیا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

چند ہی لمحوں بعد اسے میسج ٹون سنائی دی۔ اس

نے بے دلی سے موبائل اٹھایا۔ اس کے اپنے نمبر سے میسج آیا تھا۔
"غانیہ! موبائل کہاں بھیجوں؟"
"میری طرف سے تحفہ رکھ لو۔"
اس نے میسج بھی دانت پیستے ہوئے ٹائپ کیا۔ کچھ ہی دیر میں ہشام کا نیا پیغام اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔
"کم آن یار! آئی واز جسٹ جوکنگ۔ (میں مذاق کر رہا تھا) ورنہ تمہیں تنگ نہیں کرنا چاہتا۔"
"اسی بینچ پہ رکھ دو۔" اس نے مختصر سا میسج اسے بھیج دیا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بنا اپنی ممانی کو ان کا موبائل واپس کرنے چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

گھٹنوں تک ٹانگیں کمبل میں کیے وہ بیڈ پہ نوٹس بکھرائے بیٹھی تھی، جب اسے ایک ایس ایم ایس موصول ہوا۔
"کیسی ہو؟"
اتنا دوستانہ طرز تخاطب ہی اسے تاؤ دلانے کے لیے کافی تھا۔ سونے پہ سہاگہ بھیجنے والے کا نام جلی حروف کی مدد سے اس موبائل میں محفوظ تھا اور یہ کارنامہ یقیناً "موصوف" نے اپنے ہاتھوں سے سرانجام دیا تھا۔
"کیا کر رہی ہو؟"
ابھی موبائل اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ اگلا پیغام آن موجود ہوا۔ اس نے دونوں کو ایک ساتھ ڈیلیٹ کر کے موبائل سائیڈ پہ رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہشام کا ایک نیا میسج اس کے سامنے تھا۔
"میرے میسج پڑھ پڑھ کے ڈیلیٹ کر رہی ہو نا؟"
اس نے تصدیق چاہی تھی، غانیہ مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

جوں ہی عالیہ کی کال کٹی، ہشام کا میسج آن موجود ہوا۔ بنا پڑھے ہی وہ جانتی تھی کہ "گڈ نائٹ" لکھا ہو گا۔ پچھلے چند دنوں سے یہ اس کا معمول بن گیا تھا۔ جوں ہی عالیہ کی کال کٹتی، وہ ایک ایس ایم ایس بھیج دیتا، مگر آج غانیہ کو غصہ آگیا، جب ہی اس نے جواب لکھا۔
"تم گڈ نائٹ نہ کہو تو بھی میری نائٹ گڈ ہی ہو گی۔"
فوراً ہی ہشام کا جواب آیا، مگر اس نے اس کی بات کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا، بلکہ یہ لکھا تھا۔
"ایک تو تم بولتی یوں ہو کہ لگتا ہے اوپری منزل میں نہیں، بلکہ میرے ہی کمرے کی کھڑکی میں کھڑے ہو کر بات کر رہی ہو۔"
اور غانیہ ایک سیکنڈ میں سمجھ گئی کہ یہ وہی موصوف ہیں، جن کی والدہ نے شکایت کی تھی کہ آپ کے یہاں سے آنے والا شور میرے بیٹے کی نیند متاثر کرتا ہے۔
اس نے ذرا سا سر باہر نکال کر دیکھا۔ اس کے کمرے کی سیدھ میں موجود کمرے کی کھڑکی سے چھن کر آتی روشنی اس بات کی عکاس تھی کہ وہ ابھی تک سویا نہیں۔
ٹوں... ٹوں... میسج ٹون بجنے پر وہ واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گئی اور میسج پڑھنے لگی۔
"ویسے اٹس اوکے۔ مجھے اب اس کی عادت ہو گئی ہے۔"
"اچھا جی۔" اس کا میسج پڑھتے ہی غانیہ نے زیر لب کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"غانیہ آپی!"
ہشام اور سرفراز لان میں بینچ پہ بیٹھے سنگترے چھیل کر کھا رہے تھے، جب انہیں اپنے عقب میں کسی بچے کی آواز سنائی دی، جو اونچی آواز میں غانیہ کو پکارتا ہوا ان کے پاس سے گزرا تھا۔ وہ دونوں ہی اس سمت متوجہ ہوئے، جس طرف بچے کا رخ تھا۔ بچہ ذرا سے فاصلے پہ موجود ایک اور بینچ کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔

وہ اس زاویے سے بینچ پہ بیٹھی غانیہ کے سامنے کھڑا تھا کہ غانیہ کا چہرہ ہشام کو نہیں دکھ رہا تھا۔ صرف اس کا پاؤں اور ذرا سی پنڈلی نظر آرہی تھی، کیونکہ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھنے کی وجہ سے اس کی بائیں ٹانگ ذرا ترچھی سی ہو کر اسے دکھائی دے رہی تھی۔
"آپ کل زین سے ہار گئی تھیں؟"
بچہ بے یقینی سے لہجے میں غانیہ سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا تھا، اس لیے بری طرح ہانپ رہا تھا۔
"ہاں ہار گئی تھی۔" غانیہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
ہشام نے ذرا دائیں بائیں ہو کر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔
"آپی!"
وہ ناراضی سے کہتا ہوا چند لمحے اسے دیکھتا رہا، پھر مایوس سا ہو کر غانیہ کے ساتھ بینچ پہ بیٹھ گیا تھا۔ غانیہ کی ہار نے اسے مایوس کیا یا زین کی جیت نے بدمزا، بہرحال اس کے چہرے پر افسردگی سی طاری ہو گئی تھی، لیکن اس کی طرف متوجہ ہی کون تھا۔
سرفراز دوبارہ سنگتروں کے ساتھ مصروف ہو چکا تھا اور ہشام بنا پلک جھپکے غانیہ کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے بے بی پنک کلر کا سوٹ پہن رکھا تھا، سوٹ کا ہم رنگ سویٹر اور جوگرز بھی پہن رکھے تھے۔ دوپٹے کو اس نے اچھی طرح چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا اور اب وہ اس بچے کی طرف ذرا سا رخ موڑے اس سے باتیں کر رہی تھی۔
اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ اس کی گفتگو ایک بھنبھناہٹ کی صورت میں ہشام کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ سرفراز نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ بچے کی آمد نے اچانک جس جانب اس کی توجہ مبذول کروائی تھی، وہ ابھی تک بڑی محویت سے ادھر ہی تک رہا تھا۔ اس نے ذرا سا کھنکار کر ہشام کو متوجہ کرنا چاہا۔ ہشام کھسیانا سا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا، جبکہ سرفراز نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

☆ ☆ ☆

جوں ہی سرفراز گاڑی پارک کر کے لان کی طرف بڑھا، اسے ہشام وہیں اپنی مخصوص بینچ پہ ساکت و صامت سا بیٹھا نظر آیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اس کی جانب آیا، تاکہ اس کے پتھر کے بن جانے کی وجہ جان سکے۔ اس کی نظروں کے تعاقب میں نگاہیں دوڑاتے ہوئے بے اختیار ہی ایک شریر سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ مچل گئی، کیونکہ ہشام بڑی فرصت سے غانیہ کو فوکس کیے ہوئے تھا۔
"ہشام!" وہ اس کی پشت پہ جا کھڑا ہوا تھا۔
"ہوں... ہاں..." وہ گڑبڑا سا گیا، پھر سرفراز کو دیکھتے ہی بولا۔ "تم؟"
"جی حضور میں... اور میں سوچ رہا تھا اچھا ہی ہوا جو آنٹی کو تمہاری پسند کے متعلق بتاتے ہوئے مجھ سے ایک بھول ہو گئی۔" وہ شگفتہ سے لہجے میں کہہ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔
"کیسی بھول؟"
"یہ کہ میں نے "غانیہ جیسی" نہیں کہا تھا۔"
لفظ جیسی کو اس نے زور دے کر بولا تھا اور یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے چہرے کے گرد شہادت کی انگلی گھمائی، گویا وہ سابقہ روز کے کس کر لپیٹے گئے اس کے دوپٹے پر چوٹ کر رہا تھا، کیونکہ آج وہ سرخ شرٹ اور نیلی جینز میں ملبوس بیڈمنٹن کھیل رہی تھی۔ ہشام جزبز سا ہو کر رہ گیا۔
"میں نے تو "صرف غانیہ" کہا تھا۔" اب کی بار اس نے صرف پہ خاصا زور دیا تھا۔ ہشام ٹھکانے لگ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

سرفراز کو گئے ہوئے کچھ ہی دیر گزری تھی، جب وہ اسے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ ہشام نے بڑی مشکل سے خود کو اس پہ نظریں جمائے رکھنے سے روکا اور گردن موڑ کر مخالف سمت میں دیکھنے لگا۔
"سنیں!" وہ یقیناً اسی سے مخاطب تھی۔

"جی۔" ہشام نے حتی المقدور اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی سعی کی۔
"یہ آپ کے دوست کیا کرتے ہیں؟"
"سرفراز؟"
اس کے سوال پہ ہشام نے بے یقینی سے سرفراز کا نام زیر لب بڑبڑایا' جو یقینا" اس سے کم صورت تھا۔ اس کے جیسا ہینڈسم اور گڈ لکنگ بھی نہیں تھا' مگر غانیہ کا منظور نظر بن بیٹھا تھا۔ ہشام کے لیے وہاں مزید رکنا دوبھر ہو گیا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا' غانیہ کے پہلو سے گزر کر بی بلاک کی طرف جاتی راہداری میں غائب ہو گیا۔ غانیہ حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

"بات ہوئی؟" سرفراز نے بے دلی سے پلیٹ میں چمچہ ہلاتے ہشام کو بغور دیکھا اور مختصر ترین الفاظ میں قصہ دریافت کیا۔
"ہوں۔" وہ چاہنے کے باوجود اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔
"کیا بنا؟" اس نے ابرو اچکا کر مشتاق لہجے میں پوچھا۔
"وہ تمہیں پسند کرتی ہے۔" ہشام کی آواز کسی گہرے کنویں سے برآمد ہوئی تھی۔ دلجمعی سے چکن منچورین پر ہاتھ صاف کرتے سرفراز کو اچھو لگ گیا۔

☆ ☆ ☆

"ان جیسے لوگوں کی پرابلم پتا ہے کیا ہے؟ یہ ہمیشہ گردن سیدھی رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اوپر' نیچے' دائیں' بائیں۔۔۔ گردن موڑنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ جب ہی حقیقت حال سے بے خبر رہتے ہیں۔"
وہ ہاتھ ہلا کر تیز تیز بولتے ہوئے خود ہی سوال' خود ہی جواب کر رہی تھی۔ ہشام ہکا بکا سا بینچ پہ بیٹھا تھا' جبکہ سرفراز پرسکون انداز میں ہاتھ میں پکڑے میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔
"کتنی آسانی سے آپ دوسروں کی پسند ناپسند کے متعلق رائے قائم کر لیتے ہیں؟ اتنے ماہر ہوتے نا آپ اس فن میں' تو آج منہ لٹکائے نہ بیٹھے ہوتے۔" وہ سانس لینے کو رکی۔
اس کی آخری بات نے ہشام کو ذرا سا چونکایا' مگر جب اس نے غانیہ کے چہرے کے تاثرات جاننے چاہے تو ننھی سی ناک پہ دھرے بے تحاشا غصے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔
"ویل بائے دا وے' باتوں باتوں میں بات نکلی تو زین نے کہا' آئی ایم شیور یہ بھائی ایئر فورس میں نہیں ہیں تو مجھے بھی دعوا تھا کہ میں نے ان صاحب کو یونیفارم میں دیکھا ہے' سو آپ سے پوچھ لیا۔"
وہ سرفراز کی طرف اشارہ کر کے اس کی بابت ہونے والی بات کی وضاحت کر رہی تھی۔ ہشام خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔
"لیکن غلطی کی' آپ نے تو ایک نقطے سے کہانی ہی بنا لی۔"
اس نے چند لمحوں کا توقف دیا اور پھر مزید گویا ہوئی۔
"خیر! اچھا ہوا' کم سے کم یہ اندازہ تو ہو گیا نا کہ مستقبل میں کیسی زندگی میری منتظر ہے۔"
بات مکمل کر کے وہ رکی نہیں تھی۔
"سرفراز! وہ میری بے عزتی کر کے گئی ہے نا!" ہشام نے کھوئی کھوئی آواز میں پوچھا۔
"ابے گھامڑ!" سرفراز نے سر پکڑ لیا۔ "وہ ہاں کر کے گئی ہے بے وقوف!"
"ہاں؟" ہشام نے بے یقینی کی کیفیت میں زیر لب دہرایا۔
"جی مسٹر عقل کل' ہاں۔" سرفراز نے ایک ایک لفظ پہ زور دے کر کہا تھا۔
"اوہ مائی گاڈ!" اس نے ٹھنڈی سانس خارج کر کے نیلے مہربان آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ آسودگی نے اس کے وجود کا احاطہ کر لیا۔
"کوئی حال نہیں۔" سرفراز بڑبڑا کے رہ گیا۔

☆

اُمِ ثمامہ

نفیس کرسٹل کے پھول دار گلاس کانچ کی چمکتی پلیٹیں اسٹیل کے چمچ اور کانٹے وہ دھیرے دھیرے ایک ایک چیز کو دھو کر احتیاط سے خشک ہونے کے لیے ٹیبل پر رکھ رہی تھی۔ اسے پتا تھا کہ کانچ کے برتن اور دل اگر ایک بار ٹوٹ جائیں تو بمشکل جڑتے ہیں اور اگر جڑ بھی جائیں تو ان میں دراڑ ضرور آجاتی ہے۔

"شہزادی بیٹا! میں بیکری سے تازہ کیک پیٹیز بسکٹ اور سموسے وغیرہ لے آئی ہوں۔ توبہ اللہ کی پناہ! باہر تو اس قدر گرم ہوا چل رہی ہے کہ بندہ بھن ہی جائے۔ میں ذرا دم لے لوں، پھر یہ سب سامان برتنوں میں رکھ دوں گی۔ اب تم نہا کر جلدی سے تیار ہو جاؤ، کل سے صفائی ستھرائی میں ایلی ہلکان ہو رہی ہے میری بچی!"

آمنہ بی نے دروازے میں سے داخل ہوتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ اور ان کی آواز ہی تو تھی جو سارا دن گھر کے سکوت کا تالا توڑنے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔

لان کا گلابی سوٹ پہنے جب شہزادی صحن میں کھڑی بال سکھا رہی تھی تو اس کی نظر بیری کے درخت پر پڑی۔ وہ اس کے بچپن سے آنگن کے بیچوں بیچ ایسے ہی سر نہوڑائے کھڑا تھا۔ جب بیری پر پھل پک جاتا تو محلے کے شریر لڑکے چھوٹے چھوٹے پتھر آنگن میں مارتے۔ اماں سارا پکا پھل اتار کر بچوں میں تقسیم کر دیتیں۔ گرمیوں کی آگ برساتی دوپہروں میں ان پتھروں کی آمد اماں کو غصے میں مبتلا کر دیتی تھی۔

"آپا! گھر میں بیری ہے تو پتھر تو آئیں گے ہی۔" آمنہ بی معنی خیز نظروں سے شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہتیں تو اماں جی کا سارا غصہ ہوا ہو جاتا۔ بھری بیری کو دیکھ کر منٹوں میں رفوچکر ہو جاتا۔

"آگئی میری بچی! اللہ نصیب اچھے کرے۔" آمنہ بی کچن میں سے نکلیں تو بیری کے پاس کھڑی سوچوں میں گم شہزادی پر نظر پڑی۔ "اب تو مہمانوں کے آنے کا وقت ہونے والا ہے مگر حرام ہے کوئی اب تک آکر پھٹکا ہو۔ فائدہ ایسے بہن بھائیوں کا۔ سچ کہتے ہیں، خون سفید ہو گیا ہے آج کل۔" آمنہ بی حسب عادت پھر سے شروع ہو گئی تھیں۔ ستر کے قریب عمر تھی مگر اب بھی کافی چاق و چوبند تھیں۔

بیری کے پیڑ کی طرح شہزادی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں آمنہ بی کو دیکھا تھا۔ اماں بتاتی تھیں کہ ان کی دور پرے کی رشتے دار تھیں۔ جوانی میں بیوہ ہو گئی تھیں۔ اولاد کوئی تھی نہیں۔ سسرال والوں نے بیٹے کے بعد تعلق توڑ لیا۔ ماں باپ کے مرتے ہی بھائیوں نے بھی منہ پھیر لیا تو اماں انہیں اپنے ساتھ لے آئیں اور پھر جب سے وہ یہیں موجود تھیں۔ دوبارہ شادی کے لیے اماں نے بہت زور دیا مگر مان کر نہ دیں۔

"پہلے کے لوگ، پہلے کے زمانے۔" شہزادی نے گیلا تولیہ تار پر ٹانگتے ہوئے حسرت سے سوچا۔ ایک تھیں ہاجرہ آپا، اس کی سگی ماں جائی ان کے بیٹے کے ایف ایس سی کے پیپرز تھے اور انہیں منے کو گود میں بٹھا کر امتحان کی تیاری کروانی تھی۔ اس لیے وہ نہیں

نہیں۔ حسن بھائی کی کوئی میٹنگ تھی۔ انمار کے اسکول میں فنکشن تھا، ارم بھابھی کو وہاں جانا تھا۔ ... بھائی کا سیزن چل رہا تھا اور پھر انہوں نے فون پر کہا تھا۔

"شہزادی تم اب کون سا کم عمر لڑکی ہو۔ خود اچھے برے کی پہچان رکھتی ہو۔ اگر معاملہ آگے بڑھا تو پھر ملاں گا۔"

وہ جس کالج میں لیکچرار تھی، وہاں کی ایک کولیگ کے توسط سے رشتہ آرہا تھا۔ لڑکا دیکھنے میں ٹھیک تھا۔ تعلیم اور نوکری بھی اچھی تھی اور پھر وقت کے بے رحم کوڑے نے شہزادی کے کس بل بھی نکال دیے تھے۔ اسے پتا تھا، وہ سر میں اگنے والے کسی سفید بال کو کب تک کاٹ کر دنیا سے چھپاتی رہے گی۔

دروازے پر ہوتی دستک اسے ماضی سے حال میں لے آئی تھی۔

اچھے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ لڑکے کی اماں، تائی اور

چھوٹی بہن آئی تھیں۔ وہ سامان سے بھری ٹرے لے کر ڈرائنگ روم میں چلی آئی اور پھر دھیرے دھیرے اپنی جاب اور پسند ناپسند کا بتانے لگی۔ انہوں نے ذوق و شوق سے میز پر سجے لوازمات سے انصاف کیا۔ شہزادی نے اپنے ہاتھوں سے بنے شاہی کبابوں کی پلیٹ خاتون کے آگے کی۔

"آنٹی! اب ہونے والی بھابھی جان کو بلوالیں تاکہ ان سے بھی مل لیا جائے۔"

سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی نے بڑی ادا سے شہزادی کی طرف دیکھتے ہوئے لہک کر کہا۔ آمنہ بی اور شہزادی کی نظریں ایک لمحے کو ملیں اور جب انہیں حقیقت کا علم ہوا کہ آنٹی ہی وہ لڑکی ہے، جسے وہ دیکھنے آئے ہیں تو "توبہ توبہ" کرتے رخصت ہو گئیں کیونکہ ان کا بیٹا تو خوب صورت، جوان اور کماؤ پوت تھا۔ کالج کی کولیگ نے رشتے کی بابت بتاتے وقت شاید اس کی عمر چھپالی تھی۔

رات کو آنگن میں بچھے تخت پر بیٹھی شہزادی کو لگا کہ جس وقت کو وہ اماں ابا کے لاڈ پیار، اپنی جوانی، اعلا تعلیم کی وجہ سے اپنی مٹھی میں قید سمجھتی تھی۔ وہ اب ریت کی طرح اس کے ہاتھ سے پھسل چکا ہے۔

☆ ☆ ☆

"شہزادی کے ابا! خیرن بوا ایک بہت اچھا رشتہ لے کر آئی ہیں۔ خیر سے پوری بارہ جماعتیں پاس کرلی ہیں اس نے۔۔۔ تم کہو تو میں بات آگے بڑھاؤں۔۔۔؟" اماں نے پاندان سے چھالیہ نکال کر کترتے ہوئے تخت پر بیٹھے ابا سے پوچھا۔

شہزادی اپنے نام کی طرح اسم بامسمیٰ تو نہیں تھی مگر جوانی کا حسن تو گدھی پر بھی آ ہی جاتا ہے۔ ہاں! مگر ناز نخرے شہزادیوں والے ہی تھے اور کیوں نہ ہوتے، اماں ابا، دو عدد بڑے بھائیوں اور ایک عدد بڑی بہن کی لاڈلی اور چہیتی تھی۔ گھر بھر میں شہزادی کی بات کو حرف آخر سمجھا جاتا تھا۔

سب سے بڑی ہاجرہ آپا جو اس سے پندرہ سال بڑی تھیں اور اماں ابا نے میٹرک کے بعد ہی ان کا بیاہ رچا دیا تھا۔ اب تین بچوں کی اماں تھیں۔ ان کے بعد حسن بھائی جو بینک میں اچھی پوسٹ پر تھے اور چار سال پہلے اماں نے اپنے رشتے کے بھائی کی بیٹی ارم سے ان کا بیاہ بھی کردیا تھا۔ اس وقت ان کے دو بچے تھے، بڑا بیٹا عمار اور پھر بیٹی انہار۔ پھر حسین بھائی جو فی الحال کنوارے تھے اور ابا کے ساتھ کپڑے کی دکان پر ہی کام کرتے تھے۔ ابا کی جامع کلاتھ میں اچھی چلتی ہوئی کپڑے کی دکان تھی۔

اماں کی کفایت شعاری اور سلیقہ مندی کے سبب گھر کا حساب کتاب احسن طریقے سے چل رہا تھا۔ تین کمروں کا ذاتی مکان تھا۔ گھر کا آنگن بے حد کشادہ تھا۔ صحن کی کیاریوں میں لگے موسم بہار کے مسکراتے رنگ برنگے پھول، سردیوں کی ٹھنڈی میٹھی دھوپ، گرمیوں کی چاندنی راتوں کی ٹھنڈی ہوا اور رِکن مِن رِکن مِن برستی برسات۔ شہزادی کو آنگن میں اترنے والا ہر موسم بہت اچھا لگتا۔ برسات کے دنوں میں جب چھاجوں چھاج مینہہ برستا تو بڑے سے آنگن میں شہزادی اور ہیری دونوں جی بھر کے بھیگتے اور پھر آمنہ بی کے ہاتھوں کے پکوڑے، املی کی چٹنی اور بیسن کا حلوہ روز و شب بے حد حسین تھے یا پھر شہزادی کو لگتے تھے۔

آمنہ بی کے ذریعے جب رشتے والی خبر شہزادی تک پہنچی تو اس نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔

"ابا! میں نے کہہ دیا ہے مجھے پوری سولہ جماعتیں پڑھنی ہے اور پھر نوکری بھی کرنی ہے۔ اگر اب اماں نے گھر میں شادی کا ذکر کیا تو میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔"

اس نے بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر کے ابا کو دھمکی دی اور بس ابا نے پل میں فیصلہ سنا دیا کہ

"شہزادی سولہ جماعتیں پاس کرے گی۔۔۔ کچھ عرصہ نوکری کرکے اپنا شوق پورا کرے گی، پھر اس کی شادی کی جائے گی۔"

اماں اور آمنہ بی نے اپنا سر پیٹ لیا۔ ہاجرہ آپا نے ابا کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ ارم بھابھی کا نند کے اس طویل قیام کے پروگرام کی وجہ سے موڈ خراب رہنے لگا اور رہ گئے بھائی۔۔۔ تو انہوں نے کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا۔

وقت دھیرے دھیرے سرما کی دھوپ کی طرح زندگی کی دیوار سے سرکنے لگا۔ شہزادی نے یونیورسٹی جوائن کرلی تھی۔ ماسٹرز کے آخری سال میں تھی کہ اس کے لیے ایک اچھا رشتہ آیا۔ اماں نے دبے لفظوں میں پھر ذکر چھیڑا۔ اب کے بار بھابھی اور اماں بھی آپا کے ساتھ تھیں۔

ابا نے بھی کچھ سوچ کر شہزادی کی تعلیم مکمل ہونے اور اس کے نوکری کا شوق پورا کرنے کے عرصے کی مہلت کی شرط پر بات آگے بڑھانے کا عندیہ دے دیا۔ وہ لوگ آئے۔ انہیں شہزادی بے حد پسند آئی۔ اماں اور ابا والے بھی ان کے گھر ہو آئے۔ انہیں گھر گھرانا اور لڑکا سب ٹھیک لگا۔ آتے ہوئے وہ لڑکے کی تصویر ساتھ لیتے آئے اور جب وہ تصویر شہزادی نے دیکھی تو رو رو کر خود کو ہلکان کرلیا۔ کہ وہ اس کالے کلوٹے سے بالکل شادی نہیں کرے گی۔"

"نہ بیٹی! رب سوہنے کی بنائی شکل میں عیب نہیں ڈالتے۔" آمنہ بی نے رسان سے سمجھایا۔

"مگر آمنہ بی! بندہ کم از کم ایسا تو ہو کہ ساتھ چلتا اچھا لگے۔" وہ منہ بسور کر بولی، حالانکہ لڑکے کا رنگ ہلکا سانولا تھا۔ ابا ایک بار پھر اپنی لاڈلی بیٹی کے آنسوؤں میں بہہ گئے اور رشتے سے انکار کردیا گیا۔

شہزادی کی طرف سے امید ختم ہوئی تو اماں نے ...ے رشتے کی بات چلادی۔ ابا کے دوست کی بیٹی ...ور پھر مریم بیاہ کر اس گھر میں آگئی۔ اماں ابا نے اپنا ...ین کے لیے خالی کردیا اور خود برآمدے میں ...اس لیے کیونکہ دوسرے کمرے میں شہزادی کا ...ور اسے بے دخل کرنے کی جرات کون کر سکتا

شہزادی کی تعلیم مکمل ہوئے دو سال ہو گئے تھے اور ... کالج میں بطور لیکچرار ملازمت بھی کرلی تھی۔ اماں اب لاڈلی بیٹی کی فکر میں بیمار رہنے لگی تھیں کیونکہ ایک تو خاندان میں کوئی اس کے جوڑ کا اتنا پڑھا لکھا لڑکا نہیں تھا اور پھر اس کی عمر بھی پچیس کی حد میں داخل ہوگئی تھی۔ اب رشتے آنے کم ہوگئے تھے۔ کوئی آ بھی جاتا تو شہزادی کے نخرے آسمانوں پر ہوتے۔ کسی کی ناک موٹی تھی۔ کسی کے کان بڑے تھے۔ کوئی پڑھا لکھا ہونے کے باوجود پڑھا لکھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے پاس انکار کے سو جواز تھے۔

ادھر شہزادی کو تیس کا سال لگا، ادھر اماں اس کی شادی کی خواہش دل میں لیے منوں مٹی تلے جا سوئیں۔ حسین کے یہاں بھی دو بیٹیوں انعم اور ماہم کا اضافہ ہوگیا تھا اور ارم بھابھی تیسری بار امید سے تھیں۔ اماں کے بعد ابا بہت کمزور اور اکیلے ہوگئے تھے۔

کالج سے آنے کے بعد وہ ابا کے پاس بیٹھ جاتی کیونکہ گھر کے کاموں سے وہ فارغ تھی۔ اس نے اپنی تنخواہ میں سے ایک کل وقتی ملازمہ رکھی ہوئی تھی جو گھر بھر کا سارا کام کرتی تھی اس لیے بھابیاں بھی اس سے خوش رہتی تھیں اور پھر وہ وقتاً فوقتاً بچوں کے لیے بھی شاپنگ کرتی رہتی تھی۔

"جلیل میاں! اب شہزادی بیٹی کی اتنی عمر ہوگئی ہے۔ ہمیں تو فکر کھائے جاتی ہے۔ آپ کب تک سر پر بیٹھے رہو گے۔ آپ کے بے جا لاڈ نے آج یہ دن دکھائے ہیں۔"

آمنہ بی کی آواز صحن میں لگی پھولوں کی کیاریاں صاف کرتی شہزادی کے کانوں سے ٹکرائی۔ چھٹی کے دن وہ ان کو اپنے ہاتھوں سے گوڈی کرتی، سوکھے پتے الگ کرتی، پانی دیتی۔ ان کیاریوں میں اسے اپنی ماں کا لمس محسوس ہوتا تھا۔

"ہاں آمنہ بی! کہہ تو تم بالکل ٹھیک رہی ہو۔ اب ہمیں پچھتاوا ہوتا ہے کہ اگر ہم وقت پر یہ کام کر لیتے تو آج وہ بھی اپنے گھر میں ہنسی خوشی بسی ہوتی اور ہم اس کی طرف سے اس قدر پریشان نہ ہوتے۔"

ابا کی پرسوچ آواز بھی ہاتھ دھوتی شہزادی کی سماعتوں سے ٹکرائی۔ وہ ہاتھ پونچھ کر ابا اور آمنہ بی کے پاس ہی

بیٹھ گئی۔

"پیارے ابا اور اچھی آمنہ بی! آپ لوگ کیوں میری شادی کے غم میں گھلے جارہے ہیں۔ میں اپنی موجودہ زندگی سے بے حد مطمئن ہوں۔ اپنا کماتی ہوں۔ آپ کی اور آمنہ بی کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ گھر میں پیارے بچے ہیں۔ بہن بھائی ہیں۔ سب کچھ ہے۔ بھئی! میں تو مزے میں ہوں۔" اس نے ننھی انعم کو گود میں اٹھا کر پیار کرتے ہوئے ابا اور آمنہ بی کو تسلی دی۔

☼ ☼ ☼

"شہزادی بٹیا! ہوش کرو۔ جو رب کی رضا۔" آمنہ بی روتے ہوئے اس کے گال تھپتھپا رہی تھیں۔ دو دن پہلے ابا کو تسلی دیتے ہوئے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ ابا کی دعائیں اور ساتھ اس قدر مختصر ہوگا۔ وہ ابھی کالج پہنچی ہی تھی کہ حسن بھائی کا فون آگیا۔

"ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور وہ ہم سب کو چھوڑ کر چلے گئے۔"

چند ہی سالوں میں ارم بھابھی کو یہ غم ستانے لگا تھا کہ ایک کمرے میں اب ان کا گزارا نہیں ہوتا۔ بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اب وہ کسی اچھے علاقے میں رہ کر اپنا لائف اسٹائل بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ حسین بھائی کو بھی یکدم اپنی دکان اور بچیوں کا اسکول یہاں سے بہت دور لگنے لگا تھا۔

"شہزادی! کل کچھ لوگ عزہ کا رشتہ دیکھنے آئے تھے۔ مجھے تو بے حد پسند آئے۔ اب اگلے جمعہ تم سب میرے ساتھ چلنا۔ میں تو انٹر کے امتحانوں کے بعد اس کی منگنی کردوں گی۔ بھئی! تمہاری مثال میرے سامنے ہے۔ دیر ہوتے ہوتے بہت دیر ہوجاتی ہے۔"

"ہاں! یاد آیا۔ تیرے بھائی صاحب کہہ رہے تھے کہ حسن اور حسین گھر بیچ رہے ہیں۔ اچھا ہے! میرے حصے کی رقم تیرے بھائی صاحب کاروبار میں لگالیں گے کچھ ہاتھ کی تنگی کم ہوجائے گی۔"

آج وہ آمنہ بی کے بوڑھے کاندھے سے لگ کر بہت دیر تک روتی رہی تھی۔ اماں ابا کے چلے جانے کے بعد صحیح معنوں میں شہزادی کو اکیلے پن کا احساس ہونے لگا تھا۔ اسے اپنے گھر کے وسیع آنگن سے بیری کے پیڑ سے، اماں کی لگائی کیاریوں سے، تخت پر دھرے ابا کے لمس سے بے حد محبت تھی وہ کسی طور اس سب کو بیچنا نہیں چاہتی تھی۔ پھر اس نے بینک سے کچھ قرضہ لیا۔ کچھ اماں کا اس کے لیے رکھا زیور بیچا اور بہن بھائیوں کو ان کا حصہ دے دیا اور خود آمنہ بی کے ساتھ رہنے لگی۔

چند دنوں میں دونوں بھائی شہر کے اچھے علاقوں میں شفٹ ہوگئے۔ کسی نے جھوٹے منہ بھی اسے ساتھ چلنے کو نہیں کہا۔ ان کے خیال کے مطابق "شہزادی خود مختار ہے کوئی ننھی بچی بھی نہیں اور پھر آمنہ بی ہیں ناں۔ حصے میں جتنے پیسے ملے۔ ان میں کچھ ملا کر بس اتنا ہی گھر مل سکا کہ ہم لوگ بمشکل پورے آئے اور پھر دو اور بندوں کو ایڈجسٹ کرنا۔"

اور شہزادی تو خود بھی اپنا آبائی گھر چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی تھی۔ بہن بھائیوں نے کبھی اس کی اور بوڑھی آمنہ بی کی خیریت پوچھنے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ہاں، اس وقت آتے تھے، جب آپا کے میاں کا ہاتھ تنگ ہوتا۔

"ارے شہزادی! تُو تو میرا سیکا ہے۔ تم ہی اماں ہو اور ابا بھی۔ اور اب تیرے بھائی صاحب کیا کہیں سے لے ملے گئی اور خالی ہاتھ لوٹ آئی؟"

شہزادی چپ چاپ پرس میں سے مطلوبہ رقم نکال کر ان کو تھمادیتی۔

کبھی کبھی ارم، حسین بھائی اور عمار آتے۔ تھوڑی دیر کی رسمی گفتگو اور کھانے پینے کے بعد عمار لاڈ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیتا۔

"پھوپھو! میرے کالج کی فائنل پکنک ہے۔ پاکستان ٹور پر جانا ہے۔ ماما بابا پیسے دے نہیں رہے۔ کہتے ہیں افورڈ نہیں کرسکتے۔ اور مجھے کتنا شوق ہے سارا پاکستان دیکھنے کا۔" وہ حسرت سے کہتا۔ وہ تڑپ جاتی

اور جاتے جاتے اس کی مٹھی میں مطلوبہ رقم تھما کر اس کے چہرے پر چھائی حسرت کو خوشی میں بدل دیتی۔ کبھی حسن بھائی آتے۔

"شہزادی! تمہیں تو پتا ہے کہ مریم کے یہاں ولادت آپریشن کے ذریعے ہوتی ہے اور آج کل شہر کے حالات کی وجہ سے دکان کی کمائی بالکل نہیں ہو رہی تم فی الحال پیسے دے دو۔ میں جیسے ہی عید یا شادیوں کا سیزن لگا لوٹا دوں گا۔"

وہ اس کی ضرورت بھی پوری کردیتی حالانکہ جانتی تھی کہ عید کے بعد شادیوں کا سیزن بھی گزر جائے گا مگر رقم کی واپسی نہیں ہوگی۔

"بیٹی! اب تو اماں باوا بھی خواہش دل میں لیے اگلے جہاں سدھارے گئے۔ میں بوڑھی جان میرا بھی کیا بھروسہ "اب تو چراغ سحری ہیں اب بجھے کہ تب بجھے۔"

وہ کالج سے واپس آئی ہی تھی اور منہ ہاتھ دھو کر پنکھے کے نیچے بیٹھی باہر کی گرمی کا اثر زائل کر رہی تھی کہ آمنہ بی نے **سکنجبین** کا گلاس ہاتھ میں دیتے ہوئے کل والی بات چھیڑ دی۔

"مگر آمنہ بی! تعلیم بھی واجبی ہے اور پھر قد تو دیکھیں .... اوپر سے پہلے سے شادی شدہ بھی۔" شہزادی کے لہجے میں صدیوں کی تھکن تھی۔

"بیٹی! مرد اپنی شکل قد کاٹھ اور تعلیم سے نہیں اپنی شرافت محبت اور کمائی سے پرکھا جاتا ہے۔ ماشاءاللہ اظہر میاں کا بہت اچھا کاروبار ہے۔ عمر بھی تم سے کوئی آٹھ دس سال زیادہ ہے۔ بیوی کے مرنے کے بعد اکیلے رہ گئے ہیں۔ بچہ بھی کوئی نہیں۔ ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہیں۔ اماں بابا کے بعد سسرال کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں ملنے گئی تھی نہایت ہی نرم طبیعت کے معلوم ہوتے ہیں۔ اور پھر اب اس عمر میں تو ایسے ہی رشتے آئیں گے۔" آمنہ بی کے لہجے میں دکھ اور تاسف چھلک رہا تھا۔

کل سے آمنہ بی کو بے حد تیز بخار تھا۔ اس نے آج کالج کی چھٹی کرلی تھی۔ رات بھر وہ آمنہ بی کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتی رہی تھی۔ رات کی سیاہی کی طرح کا سیاہ خیال اسے ہولا رہا تھا کہ اگر آمنہ بی کو کچھ ہوگیا تو۔ رات بھر کی جاگی شہزادی کی لمحہ بھر کے لیے آنکھ لگی ہی تھی کہ آنگن میں دو تین پتھر گرنے کی آواز سے آنکھ کھل گئی۔

اس نے باہر جاکر دیکھنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اب وہ یہ جان گئی تھی کہ بوڑھی بیری پر پتھر مارنے والے گلی کے شریر بچے ہی تھے۔

"پانی پانی۔" آمنہ بی نے کراہتے ہوئے آواز دی۔

پانی کا خالی گلاس واپس لے جاتے ہوئے شہزادی بیری کے پاس ہی رک گئی۔

"آمنہ بی کی طبیعت کچھ بہتر ہو تو میں انہیں کہہ دوں گی کہ اظہر صاحب کو کھانے پر مدعو کرلیں تاکہ نکاح کی تاریخ مقرر کی جاسکے۔"

اس نے بوڑھی بیری کے گرد گرے پتھر اٹھاتے ہوئے سوچا۔ شہزادی کی مٹھی میں دبے چند پتھر اس کے فیصلے پر مطمئن اور مسرور نظر آرہے تھے۔

☼

غزالہ خالد

"ہاں بھئی آج اتوار بازار سے کیا کیا شاپنگ کرلی ہماری بیگم صاحبہ نے؟"

آخر رات کے کھانے سے فارغ ہو کے احسن نے نادیہ سے پوچھ ہی لیا اور نادیہ جو کب سے اس سوال کی منتظر تھی، برا سا منہ بنا کے بولی۔

"کچھ خاص نہیں لیا۔ سب ایسی ہی بے کار سی چیزیں مل رہی تھیں۔"

"میں تو تم سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ تم بڑے بڑے شاپنگ سینٹرز میں جانے کی عادی ہو، تمہیں بھلا وہاں کیا پسند آئے گا مگر تمہیں ہی شوق ہو رہا تھا کہ پانچ نمبر میں لگنے والے اتوار بازار میں ضرور جانا ہے۔" احسن نے اسے جتایا تو نادیہ کو برا لگا۔

"آج اتفاق سے کچھ نہیں ملا ورنہ تو آس پاس رہنے والی میری دوستوں نے تعریفیں بہت کی تھیں بلکہ اپنے خریدے ہوئے جو سوٹ مجھے دکھائے تھے وہ بھی مجھے بہت اچھے لگے تھے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں جاؤں گی تو کچھ ملے گا ہی نہیں۔"

"دراصل تم خواتین کو ہمیشہ دوسروں کی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ اپنی دوستوں کے سوٹ بھی اسی لیے پسند آرہے ہوں گے۔" احسن نے حقیقت بتائی اور پھر پوچھا۔

"بہرحال کچھ تو لیا ہوگا۔ اب یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ تم بازار گئیں اور خالی ہاتھ واپس آگئیں۔"

"نہیں۔ وہ ایک سوٹ خریدا تو تھا۔" نادیہ نے ذرا مری مری آواز میں بتایا۔

"تھا کیا مطلب؟ اب کہاں گیا؟"

"نہیں نہیں میرا مطلب ہے، خریدا تو ہے لیکن جب گھر آکے دیکھا تو بس ایویں سا لگا۔" نادیہ کی بات سن کر احسن چوکنا ہو گیا۔

"کتنے پیسے خرچ کر آئیں؟ سچ سچ بتاؤ کتنے کا سوٹ لے ڈالا۔"

"زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، صرف ساڑھے چار سو کا سوٹ ہے۔" نادیہ نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"بات صرف ساڑھے چار سو کی نہیں ہے بات اسراف کی ہے تم ہزار کا سوٹ بھی لاتی ہو اور تمہیں پسند ہوتا ہے تو میں تمہیں کچھ نہیں کہتا لیکن فضول میں اگر ساڑھے چار سو بھی خرچ کیے تو غصہ تو آئے گا ناں۔"

"وہ احسن دراصل مغرب کا وقت ہو رہا تھا ناں تو مجھے کلر کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔ وہاں بازار میں روشنی کا انتظام بھی ناقص تھا۔ سچ کہہ رہی ہوں۔ وہاں اتنا پیارا انگلش کلر لگ رہا تھا۔ دیکھ کے بالکل کالے انگوروں کے رنگ کا خیال آرہا تھا، اس لیے لے لیا۔ گھر آکے دیکھا تو چیختا چلاتا جامنی رنگ نکلا۔ اب اس میں میرا کیا قصور۔" نادیہ نے معصومیت دکھائی لیکن احسن کا غصہ کم نہیں ہوا۔

"اسی لیے کہتے ہیں ایک روپے کی بھی چیز لو تو اچھی طرح دیکھ بھال کے خریدو، پیسے کوئی درختوں پہ تو نہیں لگتے محنت سے کمائے جاتے ہیں۔"

"ارے جناب! اگر آپ محنت سے کماتے ہیں تو ہم بھی کوئی ایسے فضول خرچ نہیں ہیں۔ آپ دیکھیے گا بس میں نے سوچ لیا ہے۔" نادیہ نے احسن کو اطمینان دلایا۔

"کیا سوچ لیا ہے؟" احسن نے پوچھا تو نادیہ فخریہ بولی۔

"اس سوٹ کو "اے پی کے" والے خانے میں ڈال دوں گی۔"

"اے پی کے؟" احسن نے تعجب سے دہرایا۔ "یہ کیا ہوتا ہے بھلا؟" تو نادیہ بولی۔ "اے پی کے" دراصل میرا بنایا ہوا ایک کوڈ ورڈ ہے اور اس کا مطلب ہے "آگے پاس کرو" مجھے جو سوٹ پسند نہیں ہوتا یا جو کپڑا آؤٹ آف فیشن ہو جاتا ہے وہ میں اے پی کے والے خانے میں رکھ دیتی ہوں اور جب کسی کو کوئی تحفہ دینے کا موقع آتا ہے تو پیک کرکے دے دیتی ہوں اس طرح تحفہ بھی ہو جاتا ہے اور پیسے بھی بچ جاتے ہیں اور رہا جامنی سوٹ تو اس سوٹ کی باری تو بس اگلے ہفتے ہی آجائے گی۔"

"وہ کیسے؟" احسن نے جاننا چاہا۔
"وہ تمہاری بڑی بھابھی گئی ہوئی ہیں ناں اپنے بھائی کے ساتھ حج پر وہ اگلے ہفتے واپس آرہی ہیں اور ان کے آنے کے بعد ان کے ہاں حج مبارک کی بڑی تقریب ہوگی بس اس میں ہی سوٹ انہیں تھا دوں گی۔" نادیہ نے خوشی خوشی سوٹ کا مصرف بتایا تو احسن حیران رہ گیا۔

"نادیہ! بہت بری بات ہے ہمارا مذہب ہمیں سکھاتا ہے کہ ہم جو اپنے لیے پسند کریں وہی اپنے مسلمان بھائی بہن کے لیے بھی پسند کریں اور تمہیں جو سوٹ ناپسند ہے وہ تم بھابھی کو دے دوگی' وہ بھی حج کا تحفہ!" لیکن وہ نادیہ ہی کیا جو سمجھ جائے۔

"دیکھو احسن! میں ایسے کلرز نہیں پہنتی لیکن بھابھی جی چوائس کا تو تمہیں پتا ہے' وہ تو ہمیشہ ہی ایسے الٹے سیدھے کلرز پہنے نظر آتی ہیں اور کپڑے بھی ہمیشہ سستے سستے ہی خریدتی ہیں۔ ضروری تو نہیں کہ جو مجھے ناپسند ہو' انہیں بھی پسند نہ آئے! انہیں یہ ضرور پسند آجائے گا مجھے معلوم ہے۔"

نادیہ نے تیز جامنی رنگ کے جارجٹ کے سوٹ کو بیڈ پر پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔ ابھی احسن سوٹ کو صحیح طور پر دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ حسن اور محسن کلر مارکر لے کر ایک دوسرے سے جھگڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

"امی! دیکھیں یہ میرا اورنج مارکر نہیں دے رہا۔"
"نہیں یہ میرا مارکر ہے۔ تمہارا مارکر تو ختم ہوگیا تھا میں اپنا مارکر تمہیں نہیں دوں گا۔"

دونوں بچے مارکر ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش میں بیڈ پر ہی گتھم گتھا ہوگئے۔ احسن نے بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر دونوں کو علیحدہ کیا اور سمجھا بجھا کر کمرے سے بھگادیا لیکن نادیہ نے دیکھا تو سوٹ پر مارکر سے ایک ننھی سی لائن لگ چکی تھی۔

"لو دیکھیں! بدتمیزوں نے نئے سوٹ پر لائن ڈال دی۔ اب اسے دھونا پڑے گا۔"

"کہاں ہے لائن دکھاؤ ذرا' مجھے تو نظر نہیں آرہی۔" احسن نے لائن ڈھونڈنا چاہی تو نادیہ نے اسے لائن دکھائی۔

"یہ دیکھیں ناں' ادھر یہاں جہاں کپڑے کا نام اور نمبر لکھے ہوئے ہیں' اس کے پاس ہی تو اورنج کلر کی لکیر نظر آرہی ہے۔"

"اوہو! تم بھی بے وقوف ہی ہو' یہ تو نمبروں پر لائن آئی ہے' نظر بھی نہیں آرہی' تم خواہ مخواہ سوٹ کو دھونے مت بیٹھ جانا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کپڑے کا سارا رنگ ہی نکل جائے اور سوٹ کسی کو دینے کے قابل بھی نہ رہے۔ ویسے بھی نمبروں والا حصہ تو نکال کے ہی سوٹ سلتا ہے اور یہ تو اتنی ہلکی سی ہے کہ نظر بھی نہیں آرہی' بس اب اسے تہہ کرکے رکھ دو۔"

نادیہ نے سوٹ تہہ کرکے الماری میں رکھا۔ اور اگلے ہفتے حج مبارک کی تقریب میں اپنا سوئس وائل کا ساڑھے تین ہزار کا سوٹ پہن کر شرکت کی اور اتوار بازار والا سوٹ اچھے سے گفٹ پیپر میں پیک کرکے اپنی جٹھانی شگفتہ کو دے دیا اور بڑے دن تک اپنی کفایت شعاری اور سمجھ داری پر اپنے آپ کو شاباش دیتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"اف امی! کتنی تھکن ہوگئی ہوگی ناں آپ کو۔" شگفتہ کی بڑی بیٹی سارہ نے لاڈ سے ماں کے کندھے دباتے ہوئے کہا تو شگفتہ ہنس دی۔

"ہاں بیٹا! تھکن تو ہوگئی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ حج کا فریضہ ادا ہوگیا اور آتے ہی تم لوگوں نے یہ تقریب رکھ کر مجھے اور تھکادیا۔"

"لیکن امی! ذرا سوچیں۔ روز روز آپ کے حج کی مبارک باد کے لیے لوگ آتے تو ہم ان کے چائے پانی' کھانے کا انتظام کرکرکے آدھے ہی رہ جاتے۔ اب اچھا ہے ناں ایک ہی دن سب کو نبٹادیا۔ اب کل آرام سے دیر تک سوئیے گا۔" چھوٹی والی ثنا نے کہا تو شگفتہ اٹھتے ہوئے بولیں۔

"ہاں کہتی تو تم ٹھیک ہو' بس اب میں سونے جارہی

ہوں۔"

"ارے ارے ابھی نہیں۔ ابھی تو ہم آپ کے لیے آئے ہوئے گفٹ کھول رہے ہیں' تھوڑی دیر اور بیٹھ جائیں ناں۔"

دونوں لڑکیوں نے ایک ساتھ روکا تو شگفتہ بھی تحفے دیکھنے کے شوق میں بیٹھ گئیں۔ شگفتہ کے شوہر ریحان اور بیٹا احمد بھی ادھر ہی آگئے۔ تحفے کھلتے گئے اور ساتھ ساتھ تبصرے بھی ہوتے رہے۔ آخر نادیہ کے دیے ہوئے تحفے کی باری بھی آگئی۔

"اف اتنا برا جامنی رنگ۔ یہ تو آنکھوں میں چبھ رہا ہے۔" سارہ چیخی تو ثنا بولی۔

"اور کپڑا بھی تو دیکھو چار آنے والی جارجٹ پرانے زمانے والی' یہ تو اب کوئی پہنتا بھی نہیں ہے۔" شگفتہ نے غصے سے سوٹ ہاتھ میں لے کر دیکھا اور ریحان کے سامنے پھینک دیا۔

"ذرا دیکھنا تو یہ سوٹ کسی کو دینے کے قابل ہے۔ نادیہ خود تو اتنے مہنگے اور نفیس کپڑے پہنتی ہے اور مجھے یہ دیا ہے۔"

ریحان ہنس دیا۔ "ارے بھئی تحفہ تحفہ ہوتا ہے چاہے دو پیسے کی چیز ہی کیوں نہ ہو۔ اچھا بھلا تو سوٹ ہے بس رنگ ذرا گہرا ہے۔"

"نہیں ابو! تحفے سے ہی تو آدمی کا پتا چلتا ہے کہ وہ آپ کو کیا سمجھتا ہے۔ جس کے دل میں آپ کے لیے جتنی عزت اور محبت ہوگی' وہ آپ کو اس کے تحفے سے پتا چل جائے گی۔" ثنا نے باپ کو سمجھایا تو شگفتہ نے اس میں اضافہ کیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ ہم سے کم حیثیت ہوتے ہیں' وہ بے چارے ہمیں اپنی گنجائش کے حساب سے تحفے دیتے ہیں۔ ہاں ان کے تحفے اگر دو پیسے کے بھی ہوں تو ہمیں جان و دل سے قبول ہیں کیونکہ وہ خود بھی ویسے ہی کپڑے پہنتے اور ایسی ہی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ یہ تھوڑا ہی کہ خود تو پہنو اعلا سے اعلا اور جب کسی کو تحفہ دینے کا وقت آئے تو اسے گھٹیا اور ریجیکٹڈ چیزیں اٹھا کر دے دو۔ ایسے لوگ صرف ان لوگوں کو ہی قیمتی اور اچھے تحفے دیتے ہیں جن سے انہیں کوئی مطلب ہوتا ہے۔"

"جی اور ہمیں یہ بھی پتا ہے کہ احسن چاچو کوئی غریب نہیں ہیں۔ ماشاء اللہ اچھا بھلا کمارہے ہیں۔ خوش حال ہیں۔ ہماری امی کو ایک اچھا سا سوٹ نہیں دے سکتے تھے۔" سارہ کا غم کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔

"اور میں نے ابھی بھی انہیں زم زم' کھجوریں' ٹوپی' تسبیح اور جاء نمازوں کے ساتھ حسن' محسن کے لیے چاکلیٹ اور کھلونے تک دیے ہیں۔" شگفتہ کو اپنا دیا ہوا یاد آنا شروع ہوگیا تھا۔

"اوہو امی! چھوڑیں بھی اب اس بات کو' آپ نے دیا ہے تو دینے کے بعد اسے یاد کیوں کررہی ہیں۔ ویسے بھی تحفے دینے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے۔" احمد نے ماں کا غصہ کم کرنا چاہا۔

"بس بس! مجھے زیادہ سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے' سب جانتی ہوں میں کہ تحفے دینے سے آپس میں محبت بڑھتی ہے لیکن ذرا تحفہ بھی تو دیکھو' ایسے تحفے محبت بڑھانے کے نہیں بلکہ نفرت بڑھانے کے کام آتے ہیں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ کچھ دیتی ہی نہیں۔ خالی ہار مٹھائی لے کر آجاتی' ہمیں خیال بھی نہ آتا' نہ دل برے ہوتے۔ ابھی بھی بہت سے رشتے دار ہار' مٹھائی یا بوکے لے کر ہی آئے تھے' ضروری تھا کہ یہ سڑا بسا جوڑا چمکیلے ریپر میں لپیٹ کر مجھے دیا جاتا۔ بالکل ایسے جیسے شوگر کوٹڈ کونین۔"

شگفتہ نے بیٹے کو ہی جھڑک دیا تو ریحان کو پھر مداخلت کرنا پڑی۔

"ارے بیگم! اب چھوڑو ان سب فضول کی باتوں کو۔ ابھی حج جیسا فریضہ انجام دے کر آئی ہو کیوں خوامخواہ غصہ اور غیبت کرکے اپنا ثواب ضائع کررہی ہو؟ درگزر سے کام لو اچھا چلو کل ہی میرے ساتھ بازار چل کر بہت اچھا سا جوڑا خرید لینا۔"

"لو میرے پاس جوڑوں کی کمی ہے کیا اللہ کا شکر ہے کہ ایک سے ایک کپڑا موجود ہے' بس ذرا لوگوں کی

ذہنیت پر غصہ آگیا تھا خود تو پہنیں ایک سے ایک چیز اور دوسروں کو دینے کے لیے اپنی ناپسندیدہ اور گھٹیا چیز توبہ توبہ۔" شگفتہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھتے ہوئے بولیں۔

"اچھا امی! آپ جا کر آرام کریں میں اور ثنا سب چیزیں سمیٹ لیں گے۔" سارہ نے ماں کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں سب جوڑے سمیٹ کے بڑے سوٹ کیس میں ڈال دو جب سلوانے ہوں گے نکال لیں گے لیکن اس جامنی والے کو اس میں مت رکھنا اسے میری الماری میں سامنے ہی رکھ دینا۔ کسی کو لینے دینے میں کام آجائے گا۔" شگفتہ نے بیٹیوں کو ہدایات دی ہی تھیں کہ ثنا کو کچھ یاد آیا۔

"امی لینے دینے کی بات پہ یاد آیا کہ نانی کے گھر کے سامنے جو رضوی صاحب رہتے ہیں ناں۔ کل ان کے بیٹے کا ولیمہ ہے وہ کارڈ دے کر گئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ امی جب تک واپس آجائیں گی۔ تم لوگ ضرور آنا۔"

"ارے! ان سے تو ہمارا سالوں پرانا میل جول ہے کہاں ہو رہا ہے ولیمہ؟ کس ہال میں ہے؟" شگفتہ جاتے جاتے رک گئیں۔

نہیں امی ہال میں نہیں ہے۔ گھر کے سامنے ہی ٹینٹ لگا کر کر رہے ہیں۔"

"چلو پھر تو تم لوگ بھی چلنا۔ اچھا ہے نانی کے گھر بھی ملنا ہو جائے گا اور ہاں اب اس سوٹ کو باہر ہی رکھ لو۔ کل احمد سے اچھا سا گفٹ پیپر منگوا لینا۔ یہ ہی سوٹ دے دیں گے۔"

شگفتہ کی بات سن کر ریحان اور احمد ہکا بکا رہ گئے۔

"ہیں ہیں! یہ کیا کہہ رہی ہو بیگم! ابھی تو تم اس سوٹ کو گھٹیا ترین کہہ رہی تھیں۔ تحائف کی اہمیت پر لیکچر دے رہی تھیں۔ اب کیا ہو گیا بھئی؟"

"بس آپ نہیں بولیں۔ یہ خواتین کا ڈپارٹمنٹ ہے کہ کس کو کیا دینا ہے کیا نہیں دینا۔ رضوی صاحب میرے میکے کے پرانے جاننے والے ہیں وہی جو امی کے گھر کے سامنے رہتے ہیں اور سنا ہے کہ گھر چھوڑ کر بھی جانے والے ہیں پھر ہمارا ان سے کیا لینا دینا رہ جائے گا۔ میں تو اپنے بچوں کی شادیوں میں ان کو بلاؤں گی بھی نہیں۔ ویسے بھی گھر میں ہی تو ولیمہ کر رہے ہیں، کون سا عالیشان ڈنر دے رہے ہیں۔ ان کے ہاں دینے کے لیے تو یہ سوٹ بہترین رہے گا۔ چلو لڑکیو! سب سمیٹ کے رکھو۔ میں جا رہی ہوں۔"

شگفتہ کہتے کہتے مڑیں اور سب کو حیران پریشان چھوڑ کر مزے سے چل دیں۔

☆ ☆ ☆

"ایک ہفتہ گزر گیا شادی کو مگر گھر ہے کہ کسی طرح سمٹنے میں نہیں آرہا۔"

مسز رضوی نے اپنی الماری میں کپڑے جماتے ہوئے بڑی دلہن کو مخاطب کیا۔ بڑی دلہن جو ساس کو کپڑے تہہ کر کے دے رہی تھیں۔ ان سے پوری طرح متفق تھیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں اماں! آخر شادی کا گھر ہے۔ سمٹتے سمٹتے ہی سمٹے گا۔ ماشاء اللہ مہمان داری بھی تو کتنی ہوئی ہے۔ اتنے دن پہلے سے مہمان آگئے تھے۔ گھر میں سونے کو بھی جگہ نہیں ہوتی تھی لیکن اللہ کا شکر ہے کہ سب کام ٹھیک ٹھیک ہو گیا۔ کسی کو شکایت کا موقع نہیں ملا۔" بات کرتے کرتے انہوں نے آخری کپڑا بھی ساس کو تھما دیا۔

"چلو بھئی۔ میری الماری تو ترتیب میں آگئی۔ اب یہ چھوٹی دلہن پتا نہیں کہاں رہ گئیں۔ ان سے کہہ دو کپڑے مجھے لادیں تو وہ بھی میں الماری میں رکھ کے فارغ ہو جاؤں پھر میں دو گھڑی آرام کروں گی۔"

مسز رضوی نے بہو سے کہا تو وہ پوچھ بیٹھیں۔

"کیسے کپڑے اماں! دلہن آپ کو کون سے کپڑے دے رہی ہے؟ اس کے تو سارے کپڑے ابھی نئے ہیں۔"

ابھی وہ جواب کی منتظر ہی تھیں کہ چھوٹی دلہن ہاتھ میں کچھ کپڑے اٹھائے اندر آگئیں۔ مسز رضوی نے انہیں دیکھا تو بولیں۔

"چلو چھوٹی دلہن خود ہی آگئیں۔" پھر بڑی دلہن کو دیکھ کے بولیں۔

"ارے ادھر ادھر سے آئے ہوئے بے کار کے جوڑے ہیں چھوٹی دلہن کل ذکر کر رہی تھیں کہ میں تو نہیں سلواؤں گی تو میں نے کہا مجھے دے دینا۔ لینے دینے میں ہی کام آجائیں گے۔"

"اچھا ذرا دکھانا تو کون سے کپڑے ہیں؟" بڑی دلہن نے دلچسپی دکھائی تو چھوٹی دلہن نے چار پانچ سوٹ ان کے سامنے ڈال دیے۔

"دیکھیں بھابھی! یہ گلابی والا جو ہے بالکل ایسا ہی نیلے رنگ کا میرے جہیز میں بھی ہے۔ یہ کتھئی رنگ مجھے پسند نہیں۔ یہ سفید والا اماں منع کر رہی ہیں کہ مت سلوانا نئی دلہن سفید رنگ پہنتی اچھی نہیں لگتی۔ کالا رنگ پہننے سے ہماری امی منع کرتی ہیں۔ پیلا رنگ مجھ پہ اتنا اچھا لگتا ہے کہ مجھے نظر لگ جاتی ہے۔ جب پیلا پہنا تب بیمار پڑی اس لیے یہ بھی نہیں سلواؤں گی اور رہا یہ جامنی والا۔۔۔ تو اس کا تو کپڑا ہی بابا آدم کے زمانے کا ہے۔ یہ اب کون پہنتا ہے اور رنگ اتنا تیز ہے کہ آنکھوں میں گھسا جا رہا ہے۔"

"ہائے سچ! یہ جامنی والا تو بہت ہی برا لگ رہا ہے یہ بھی کوئی شادی میں دینے کا جوڑا ہے۔ آخر یہ دیا کس نے تھا؟" بڑی دلہن نے حیرت سے پوچھا تو مسز رضوی شروع ہو گئیں۔

"ارے یہ سامنے جو آپا جان رہتی ہیں یہ ان کی بیٹی شگفتہ نے دیا تھا۔ موا کپڑا تو دیکھو! جیسے کتے کا کفن۔" ان کے کتے کا کفن کہنے پر دونوں بہوؤں کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"ارے تم ہنس رہی ہو میرا تو جب سے دل جلا جا رہا ہے۔ یہ تمہارے سسر صاحب کو شوق اٹھا تھا کہ شگفتہ کو شادی میں ضرور بلانا ہے۔ بھلا بتاؤ! اتنی دور کے جان پہچان والوں کو بھی کوئی بلاتا ہے۔ آپا جان سامنے رہتی ہیں۔ محلے داری ہے۔ بس ان کو بلا لیتے لیکن رضوی صاحب کو بھی تڑپ ہو رہی تھی کہ شگو کو تو میں ضرور بلاؤں گا پرانی یادیں آرہی تھیں کہ "آتی سی تھی جب ہمارے گھر آتی تھی مجھے ماما پکارتی تھی' آج بھی ملتی ہے تو بہت عزت کرتی ہے۔ اسے تو میں خود کارڈ دے کر آؤں گا گئے بھی تھے خود کارڈ دینے' اس وقت تو وہ ملی نہیں حج کرنے گئی ہوئی تھی لیکن ولیمہ میں آگئی بلکہ آلیا گئی پورے ٹبر کو لے کر آئی تھی۔ خوب کھا ٹھونس کے سب گئے اور یہ ردی کپڑا تحفے میں دے دیا اور میں سو فیصد کہتی ہوں' خریدا یہ بھی نہیں ہو گا۔ کہیں سے مفت ہاتھ آگیا ہو گا' جو ہمیں بھیڑ دیا ہے۔"

"بس اماں! آج کل لوگوں کا یہی حال ہے۔ دیتے وقت سب کی جان نکلتی ہے اور لیتے وقت دوسروں سے اچھے سے اچھے کی امید رکھتے ہیں۔" بڑی دلہن نے کپڑے ایک طرف ڈالتے ہوئے ٹھنڈی سانس بھری سامنے سے ان کا دس سالہ بیٹا ٹیپو کمرے میں داخل ہوا۔

"امی! یاد ہے ناں آج میرا قرآن ختم ہو رہا ہے۔ آپ نے دادو کو بتایا۔"

"ہائے صبح سے گڑبڑ میں یاد ہی نہیں رہا۔ اماں! نصیبن خالہ کہہ رہی تھیں کہ آج جمعہ کا مبارک دن ہے۔ آج ہی وہ ٹیپو کا قرآن ختم کروا دیں گی۔"

بڑی دلہن نے جلدی سے وضاحت کی تو مسز رضوی نے چٹاچٹ پوتے کی بلائیں لے ڈالیں۔

"ہائے میرا چاند سا بیٹا! ادھر آ میرے پاس میں صدقے جاؤں۔" پھر بہو سے بولیں۔ "بڑی دلہن! یہ تو مجھے پتا تھا کہ اس کا آخری سپارہ تھوڑا سا رہ گیا ہے۔ لیکن تم تو کہہ رہی تھیں کہ دھوم دھام سے آمین کی رسم کرو گی پھر یہ اچانک ختم قرآن؟"

"نہیں اماں! بات دراصل یہ ہے کہ آپ تو جانتی ہیں کہ نصیبن خالہ کے بیٹے کو دواؤں کی کمپنی میں میڈیکل ریپ کی ملازمت مل گئی ہے۔ اب وہ چاہتا ہے کہ اس کی ماں ایک دن بھی کہیں پڑھانے نہ جائیں بلکہ گھر میں بیٹھ کر آرام کریں۔ باقی کے سارے گھر تو وہ پہلے ہی چھوڑ چکی ہیں صرف ٹیپو کی وجہ سے آرہی تھیں کہ آخری سپارہ ہے پورا کروا کے ہی چھوڑوں۔ میں نے بھی سوچا کہ چلو اچھا ہے نصیبن

خالہ کو آج ہی فارغ کردیں گے' پھر ہم اپنی سہولت کے حساب سے ختم قرآن کی تقریب کریں گے۔ اس میں کہاں نصیبن خالہ کی آؤ بھگت کرتے پھریں گے۔ رسم آمین میں تو آپ ہی اسے دعائے ختم القرآن پڑھوادیجیے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" مسز رضوی بہو کی بات پر خوش ہوگئیں۔

"لیکن نصیبن کو کچھ دینا دلانا بھی تو ہوگا کہ نہیں۔ اس سے بھی آج ہی فارغ ہو جاؤ۔"

"ہاں اماں! یہی سوچ رہی ہوں کہ کیا دوں؟ آپ ہی کچھ مشورہ دیں۔" بڑی دلہن نے ان سے رائے مانگی ہی تھی کہ چھوٹی دلہن بول پڑیں۔

"ارے بھابھی! پرسوں جو بڑے گھر والے دو ڈبے مٹھائی کے لائے تھے اس میں سے چن چن کر گلاب جامن' برفی' چم چم' تو کھالی گئی ہیں' باقی چیزیں کوئی کھاتا ہی نہیں۔ اب آپ ایسا کریں کہ دونوں ڈبوں کی مٹھائی ایک میں کرلیں۔ ایک کلو کے قریب تو ہو ہی جائے گی' وہ نصیبن خالہ کو دے دیں۔"

"اور جوڑا یہ رہا۔" مسز رضوی نے جامنی رنگ کا جوڑا ہاتھ میں اٹھایا۔

"جوڑا یہ والا دے دو' لو ایک منٹ میں مسئلہ حل ہوگیا۔ دیکھا ساتھ رہنے میں یہ فائدہ ہوتا ہے' کئی مسئلے چٹکی بجاتے حل ہو جاتے ہیں۔"

"لیکن اماں یہ تو..." بڑی بہو کو کچھ کا کفن یاد آگیا۔ "نصیبن خالہ تو زیادہ تر سفید کپڑے پہنتی ہیں۔" انہوں نے سفید رنگ کے جوڑے کو ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو مسز رضوی نے پھرتی سے سفید جوڑا جھپٹ کر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"ائے یہ تو میں سلواؤں گی' اپنے پوتے کی آمین میں پہنوں گی۔ سفید رنگ پہن کر دیکھ بھی میرا چہرہ نورانی لگنے لگتا ہے۔ نورانی چہرہ لے کر اپنے بچے کو ختم القرآن کی دعا پڑھاؤں گی۔" مسز رضوی نے چشم تصور میں اپنے آپ کو پاکیزگی اور نور کا پیکر بنا دیکھا۔ دونوں بہوؤں نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکراہٹ چھپائی۔

"لیکن اماں! اتنا تیز جامنی رنگ نصیبن خالہ پہ کیا اچھا لگے گا' ویسے بھی اتنا کالا رنگ ہے ان کا' اسی لیے تو ہلکے ہلکے رنگوں کے کپڑے پہنتی ہیں۔"

"ائے تو ہم ان کے لیے دے بھی نہیں رہے' تین تین جوان بیٹیاں ہیں۔ بیٹا بھی برسر روزگار ہوگیا ہے۔ کسی کی بھی جہیز بری کے لیے اٹھا کے رکھ دیں گی۔"

"ہاں' وہ تو ٹھیک ہے لیکن اگر اسی لیے دینا ہے تو یہ گلابی والا پیارا ہے' یہ دے دیں۔" بڑی دلہن نے ایک بار پھر ہمت کا مظاہرہ کیا۔

"ائے دلہن! جیسے رنگ ویسا جوڑا۔ اب تم یہ بھی تو دیکھو کہ دے کس کو رہی ہو۔ اس بے چاری نصیبن کے لیے تو یہ بھی اچھا ہی ہے۔ ان بے چاروں نے تو ایسا کبھی خواب میں بھی نہیں خریدا ہوگا اور ہاں اگر یہ گلابی والا تمہیں اتنا ہی پسند ہے تو تم لے لو۔ سلوا کے آمین میں پہن لینا۔"

"ہاں بھابھی! یہ ٹھیک ہے' یہ آپ سلوالیں۔ آمین والے دن میں اپنا ایسا ہی نیلا سوٹ پہن لوں گی اور آپ یہ گلابی پہن لینا' اچھا لگے گا۔"

ابھی کیونکہ شادی کو ایک ہی ہفتہ گزرا تھا' اس لیے دیورانی نے جٹھانی سے بہناپا جتاتے ہوئے کہا تو بڑی دلہن اس خلاف توقع بات سے خوش ہوگئیں۔ بیٹھے بٹھائے نیا جوڑا ہاتھ آگیا' وہ بھی اپنی پسند کا۔ اب انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جامنی جوڑا نصیبن خالہ کو دینا اچھا لگے گا یا برا' سو وہ جامنی جوڑا چمکیلی تھیلی میں ڈال کے نصیبن خالہ کو دینے پر خوشی خوشی تیار ہوگئیں۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم اماں! آگئیں آپ۔" جمیلہ نے نصیبن خالہ کے ہاتھ سے تھیلا لیا اور شکیلہ دوڑ کر ان کے لیے پانی لے آئی۔

"ہاں بیٹا! آگئی لاؤ بھئی پانی دو۔" نصیبن خالہ نے شکیلہ سے پانی لیا اور ٹھہر ٹھہر کر پینے لگیں۔

"اماں! ٹیپو کا قرآن ختم ہوگیا ناں' بس اب تو آپ فارغ ہوگئیں۔ اب آرام سے گھر میں بیٹھیے گا۔" عقیلہ باورچی خانے سے باہر آتے ہوئے بولی تو نصیبن خالہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"ہاں بیٹا! فارغ ہوئی میں' بس اب تو اللہ خیر سے تم لوگوں کے فرض سے فارغ کرے لیکن کچھ عجیب سا احساس ہو رہا ہے۔ شاید لوگ جب ساری عمر کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوتے ہیں تو انہیں ایسا ہی لگتا ہوگا۔"

"کیوں اماں! عجیب سا کیوں لگ رہا ہے' یہ تو خوشی کا موقع ہے کہ اللہ نے آپ کے بیٹے کو اس قابل کردیا کہ اب آپ کو گھر گھر جاکر بچوں کو پڑھانے سے نجات ملی۔"

"نہیں بیٹا! ایسا نہ کہو' قرآن پڑھانا بھی باعث اجر ہے۔ کیا خبر اللہ تعالیٰ اسی کے وسیلے میرے گناہ معاف فرمادے۔ میں تو خوش نصیب ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کی برکت سے پیسا بھی دیا۔ بس اللہ کا کرم ہے کہ اس نے میرے سراج کو کمانے کے لائق کردیا۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ بہت ترقی دے۔" نصیبن خالہ آبدیدہ سی ہوگئیں تو جمیلہ ان کا دھیان بٹانے کو جلدی سے بولی۔

"ارے اماں! چھوڑیں' یہ بتائیں اس تھیلے میں کیا ہے؟"

"ٹیپو کے گھر سے کچھ ملا ہوگا۔ آج اس کا قرآن ختم ہوا ہے ناں۔" عقیلہ نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! مٹھائی اور جوڑا ہے۔ مٹھائی کا ڈبا باہر نکال دو۔ کہیں جوڑے پہ دھبے نہ لگ جائیں۔" نصیبن خالہ نے جمیلہ کو تاکید کی۔

"ہائے مٹھائی! اماں آج تو میرا مٹھائی کھانے کا بڑا دل چاہ رہا تھا۔" چھوٹی شکیلہ نے جھٹ مٹھائی کا ڈبا نکال کے کھول لیا اور حیران رہ گئی۔

"ارے! اس میں تو بس بیسن کے لڈو' سوکھی امرتیاں' باسی جلیبیاں' سخت بالوشاہی' پتھریلا سوہن حلوہ اور ایک سل کے بٹے جیسا میسو پاک پڑا لڑھک

رہا ہے۔ نہ برفی نہ گلاب جامن نہ چم چم نہ قلاقند۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں ہے۔"

"نہیں چاند! ایسا نہیں کہتے جو مل جائے صبر شکر کرکے کھالیتے ہیں۔" تصبین خالہ نے سمجھایا تو شکیلہ نے ایک لڈو اٹھا کر کھانا شروع کردیا۔ "اچھا اماں! جوڑا تو دکھائیں' جوڑا کیسا دیا ہے؟" تصبین خالہ نے تھیلی میں سے جوڑا نکال کے دکھایا۔

"یہ دیکھو' یہ جوڑا دیا ہے۔"

ہائے اماں! یہ جوڑا آپ پہنیں گی؟" عقیلہ حیران ہوئی۔

"کیوں میں کیوں پہنوں گی۔ ٹیپو کی دادی نے ہمیشہ میرا خیال کیا ہے۔ ابھی بھی انہیں پتا تھا کہ جمیلہ کی شادی ہونے والی ہے۔ اس لیے ایسا جوڑا دیا ہے' جو میں اس کے جہیز میں رکھ سکوں۔ میرے پہننے کے لیے تھوڑی دیا ہے۔" تصبین خالہ نے اسے سمجھایا۔

"اچھا! لیکن جمیلہ باجی تو اس میں کھو جائیں گی' پتا ہی نہیں چلے گا کہ جوڑا کہاں ختم ہورہا ہے اور جمیلہ باجی کہاں سے شروع ہورہی ہیں۔" شکیلہ نے لڈو کھاتے کھاتے جمیلہ کے پکے رنگ کا مذاق اڑایا۔

"ہوں خبردار! جو بڑی بہن کا مذاق اڑایا' دیکھو! موٹر سائیکل کی آواز آرہی ہے شاید سراج آگیا۔ جاؤ دروازہ کھولو جاکر۔" شکیلہ نے بھاگ کر دروازہ کھولا تو سراج موٹر سائیکل کھڑی کرکے ماں کے پاس چلا گیا۔

"السلام علیکم اماں!"

"وعلیکم السلام بیٹا جیتے رہو' خوش رہو' اللہ بہت ترقی دے۔" تصبین خالہ نے اسے ڈھیروں دعائیں دے دیں۔ "آج تو میرا بیٹا جلدی گھر آگیا۔"

"ہاں اماں! آج زیادہ وزٹ نہیں تھے۔ ایک دو جگہ ہی جانا تھا۔ اس لیے جلدی فارغ ہوگیا' آپ بتائیں! آج سے تو آپ بھی فارغ ہوگئیں ناں یا ابھی اور جانا پڑے گا؟"

"نہیں سراج! آج اماں نے ٹیپو کا بھی قرآن ختم کروادیا۔ اب اماں فارغ ہی فارغ ہیں لیکن کچھ اداس سی ہیں۔" جمیلہ نے بھائی کو بتایا۔

"وہ کیوں؟" سراج نے سوال کیا۔

"ارے نہیں بیٹا! بس ویسے ہی۔۔۔ اتنے سالوں سے روزانہ جانے کی عادت تھی۔ اس لیے ذرا عجیب سا لگ رہا ہے۔"

تصبین خالہ نے اپنی اداسی کی وجہ بتائی' پھر سراج سے بولیں۔

"بیٹا! تم کب سے کہہ رہے ہو کہ تمہارے منیجر صاحب کی بیگم کا اپنڈکس کا آپریشن ہوا ہے' انہیں دیکھنے چلیں گے' پورا ہفتہ گزر گیا۔ روز تم دیر سے گھر آرہے تھے۔ آج جلدی آگئے ہو تو اچھا موقع ہے۔ چلو انہیں دیکھ آتے ہیں۔ مریض کی عیادت ثواب کا کام بھی ہے' اب تو وہ ہسپتال سے گھر آگئی ہوں گی۔"

"ہاں اماں! ویسے تو اپنڈکس کے آپریشن والوں کی دوسرے ہی دن چھٹی ہوجاتی ہے لیکن ان کا کیس ذرا پیچیدہ تھا' میرا خیال ہے کل ہی گھر گئی ہیں' پورا ہفتہ ہسپتال میں ہی رہیں۔"

"بس تو پھر چلو ان کے گھر ہی چلو اچھا ہے' آج اس کام سے بھی نمٹ جائیں۔"

"اماں! سوچ لیں مہینے کا آخر چل رہا ہے۔ ان کے گھر جائیں گی تو کچھ نہ کچھ لے کر بھی جانا ہوگا' آخر سراج کے باس ہیں۔" جمیلہ نے یاد دلاتے ہوئے کہا تو شکیلہ ناک چڑھا کر بولی۔

"یہ مٹھائی تو کسی کام کی نہیں' ورنہ یہی لے جاتیں۔"

"ارے مٹھائی تو پہلے ہی اتنی مہنگی تھی۔ اب تو چینی کی قیمت آسمان سے باتیں کررہی ہے' اب تو مٹھائی پتا نہیں کیا کلو ملے گی' ہیں سراج؟" بات کرتے کرتے انہوں نے سراج سے پوچھا۔

"ہاں! کسی اچھی دکان کی مٹھائی یا کیک پانچ سو سے کم میں نہیں آئے گا اور پھولوں کا گلدستہ بھی تو لے کے جاتے ہیں' وہ بھی کم از کم تین سو کا تو آئے گا ہی۔" عقیلہ نے مزید ڈرایا تو شکیلہ بولی۔

"یعنی کل ملا کے ہوئے سات سو۔ اتنے میں تو اچھا سا سوٹ آجائے۔" شکیلہ کی بات سن کر تصبین خالہ کے دماغ میں ایک نیا آئیڈیا آگیا' خوش ہوکر بولیں۔

"ارے ایسا کیوں نہ کریں کہ یہ جامنی جوڑا منیجر صاحب کی بیگم کو دے دیں۔ سراج بتا رہا تھا کہ ان کے بڑے خوب صورت گورے گورے بچے ہیں۔ یقیناً" بیگم بھی گوری چٹی ہی ہوں گی' ان پر تو یہ رنگ اچھا بھی لگے گا۔ چل بھئی جمیلہ! اس کو اچھی طرح سے پھولوں والے کاغذ میں لپیٹ دے۔ راستے سے ہم پھولوں کا گلدستہ بھی خرید لیں گے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔"

"اماں! سوچ لیں پیسے والے لوگ ہیں' پتا نہیں انہیں یہ کپڑا پسند بھی آئے یا نہیں۔" عقیلہ نے انہیں ایک بار پھر سوچنے کی مہلت دی۔

"ارے کپڑے میں کیا برائی ہے۔ اچھا بھلا جارجٹ کا کپڑا ہے۔ آج کل ایسے ہی تو کپڑے چل رہے ہیں' سب ماڈرن عورتیں رنگ برنگی پٹیاں لگوا کر ڈھیلے ڈھالے چوغے پہنے پھر رہی ہیں۔ وہ بھی سلوا کر پہن لیں گی' چلو بھئی سراج! اب اٹھ جاؤ' جلدی سے ہو آئیں۔" تصبین خالہ کو بڑی جلدی تھی۔

"اماں! رک جائیں بھائی کو چائے تو پینے دیں۔ منہ ہاتھ تو دھولے ابھی تو آیا ہے۔" جمیلہ نے انہیں روکا لیکن وہ بولیں۔

"ارے اچھا بھلا صاف ستھرا تیار تو ہے' کا ہے کا منہ ہاتھ دھونا اور چائے وہیں پی لے گا۔ آخر وہ چائے تو پلائیں گے ہی ناں۔"

"اماں! پہلے میں احسن صاحب کو فون کرکے اجازت تو لے لوں' آج کل لوگ بغیر بتائے آنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔" جب تک سراج نے فون کرکے احسن صاحب کو اپنے آنے کا بتایا' جمیلہ نے جھٹ پٹ خوب صورت گفٹ پیپر میں جوڑا پیک کردیا اور تصبین خالہ چادر اوڑھ کر جوڑا ہاتھ میں تھامے احسن صاحب کی بیگم سے ملنے کو تیار ہوگئیں۔

☆ ☆ ☆

"نادیہ! اب تم آرام کرو' لیٹ جاؤ بہت دیر سے بیٹھی ہو۔ ڈاکٹر نے تمہیں زیادہ دیر بیٹھنے سے منع کیا تھا۔" احسن نے نادیہ کا تکیہ سیدھا کرکے اسے لیٹنے میں مدد دی۔

"ہاں! لیکن کیا کروں۔ صبح سے مہمان ہی اتنے آرہے ہیں' امی اور آپا وغیرہ گئے تو شگفتہ بھابھی اور ریحان بھائی آگئے۔ وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ وہ لڑکا سراج اور اس کی والدہ ملنے آگئے' اب مہمانوں کی وجہ سے بیٹھنا تو پڑتا ہی ہے ناں۔" نادیہ نے تھکے تھکے لہجے میں کہا تو احسن پھر بولا۔

"ہاں بھئی! ابھی عیادت کے لیے آنے والے بھی وبال بن جاتے ہیں۔ مریض کے آرام کا خیال کیے بغیر گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں۔ مریض تو ان کے آنے سے سکون تو کیا پاتا ہے۔ الٹا بے آرامی سے تکلیف میں اضافہ ہی ہوجاتا ہے۔"

"ہاں جیسے شگفتہ بھابھی تین گھنٹے بیٹھ کے گئی ہیں۔ کسی طرح جانے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ بس بیٹھی بے کار کی اِدھر اُدھر کی ہانکتی رہیں۔"

"ہاں بھئی! آج تو مجھے بھی احساس ہوا کہ آئی تھیں تو بچوں کے لیے کچھ بنا کے ہی چلی جاتیں۔ حالانکہ ان کے سامنے میں نے تمہاری امی کی طبیعت خراب ہونے کا ذکر بھی کیا تھا کہ آنٹی کی شوگر اچانک ہائی ہوگئی۔ اس لیے وہ گھر چلی گئیں' لیکن پھر بھی مجال ہے' جو کسی کام کا جھوٹے منہ بھی پوچھا ہو۔"

آج تو احسن نے بھی عورتوں کی طرح شکایت کردی۔ احسن کی بات سن کر نادیہ کو مزید کچھ جتانے کا موقع مل گیا۔

"ارے' آپ کچھ پکا کے رکھنے کی بات کررہے ہیں' دیکھا نہیں تھا وہ تو خالی ہاتھ ہی چلی آئیں۔ پتا بھی ہے کہ میری اتنی طبیعت خراب ہوئی۔ اپنڈکس پھٹ گیا تھا' مرتے مرتے بچی ہوں لیکن ہسپتال آئیں تب بھی خالی ہاتھ لٹکائے چلی آئیں' میں سمجھی کہ شاید جب گھر آئیں تو کچھ لے کے آئیں گی لیکن نہیں بھئی' نہ کوئی پھل نہ مٹھائی پھولوں کا ایک بوکے تک لانے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ان سے اچھی تو وہ غیر عورت' سراج کی والدہ ہی رہیں۔ اتنی محبت سے ملیں' بوکے بھی لائیں

اور ایک گفٹ بھی دے کر گئی ہیں۔"

"اچھا گفٹ بھی دیا ہے۔" احسن نے پوچھا تو نادیہ نے پیچھے رکھی میز کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں' وہ دیکھیں' اُدھر میز پر ڈبا رکھا ہے۔ ذرا کھول کے تو دیکھیں' کیا دیا ہے۔" نادیہ نے اشتیاق ظاہر کیا تو احسن نے پھول اور ریپر اتار کے ڈبا کھول لیا۔

"ارے' یہ تو بالکل ویسا ہی سوٹ ہے' جیسا تم پانچ نمبر کے اتوار بازار سے لائی تھیں۔" احسن نے نادیہ کو سوٹ دکھاتے ہوئے کہا۔

"دکھائیں دکھائیں' ہائے اللہ! سچ مچ یہ تو بالکل ویسا کا ویسا ہے۔" نادیہ جوش میں اٹھ کے بیٹھ گئی۔

"سراج کی اماں بتا تو رہی تھیں کہ ان کا گھر پانچ نمبر کے گراؤنڈ کے پاس ہی ہے۔ میرا خیال ہے' وہیں کے اتوار بازار سے خریداری بھی کرتی ہوں گی۔ ویسے بھی بے چاری غریب سی ہی لگ رہی تھیں۔"

نادیہ اندازے لگا رہی تھی جبکہ احسن سوٹ کا کپڑا پورا پھیلائے اسے غور سے دیکھنے میں مصروف تھا' پھر اچانک احسن نے زور زور سے ہنسنا شروع کر دیا۔

"ارے کیا ہو گیا' میں نے آپ کو کون سا لطیفہ سنا دیا' جو یوں ہنس رہے ہیں۔"

"ارے بیگم! پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔" احسن نے بدستور ہنستے ہنستے کہا تو نادیہ جھنجلا گئی۔

"بتائیں ناں' آخر کس بات پہ اتنا ہنس رہے ہیں۔"

"نادیہ! یہ سوٹ نہیں بلکہ پیر تسمہ پا ہے' تمہاری جان نہیں چھوڑے گا۔"

"کیا مطلب! کیا پیر تسمہ پا؟ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"نادیہ! یہ وہی سوٹ ہے' جو تم اتوار بازار سے لائی تھیں۔" احسن نے بتایا۔

"وہی کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ کو کیا پتا۔"

"یہ دیکھو! یہ کپڑے کے نام اور نمبروں کے پاس حسن محسن کی ڈالی گئی اورنج کلر کی لکیر اپنی جگہ پر موجود ہے۔" احسن نے اسے اورنج کلر کی لکیر دکھائی تو نادیہ حیران رہ گئی۔

"ہاں! سچ مچ صحیح کہہ رہے ہیں آپ' لیکن یہ سراج کی امی تک پہنچا کیسے؟"

"تو! شگفتہ بھابھی نے بھی اے۔پی۔ کے یعنی "آگے پاس کر دیا۔" ہو گا سراج کی امی ان کی کوئی جان پہچان والی ہوں گی۔"

"نہیں بھئی۔ ایسا نہیں ہو سکتا اگر شگفتہ بھابھی اور سراج کی امی الگ الگ آئی ہوتیں تو میں بھی یہی سمجھتی' لیکن آپ بھول رہے ہیں کہ آج جب سراج اپنی والدہ کے ساتھ آیا تو شگفتہ بھابھی یہیں بیٹھی تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی تھیں۔ میں نے ہی دونوں کا تعارف کروایا تھا۔"

"ہاں' کہتی تو تم ٹھیک ہو۔ بہرحال ایک بات تو طے ہوئی' مجھے یقین ہو گیا کہ اے پی کے یعنی آگے پاس کرو والا خانہ صرف تمہاری الماری میں ہی نہیں ہے' بلکہ ہر عورت کی الماری میں ہوتا ہے۔ جب ہی تو یہ سوٹ پتا نہیں کہاں کہاں سے گھومتا گھماتا تم تک پہنچ گیا۔ البتہ حیرت کی بات یہ ہے کہ بڑی جلدی پہنچ گیا۔" احسن ہنسا تو نادیہ کو غصہ آ گیا۔

"شگفتہ بھابھی سے میں پوچھوں گی تو ضرور کہ میں نے آپ کو جو سوٹ تحفے میں دیا تھا' آپ نے اس کا کیا کیا؟ سلوا لیا یا ابھی ان سلا ہی رکھا ہے؟"

"ہاں! جیسا کہ تمہارے پوچھنے پر وہ تمہیں اصل بات بتا ہی دیں گی۔ ارے وہ شگفتہ بھابھی ہیں۔ انہوں نے کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلیں۔ وہ کبھی بھی اصل بات نہیں بتائیں گی۔"

"ہاں! صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ بتائیں گی تو وہ کبھی نہیں' لیکن مجھے تو افسوس ہو رہا ہے نا' میں نے تو انہیں تحفہ دیا تھا اور انہوں نے قدر ہی نہیں کی۔ چلیں' اب اسے اٹھا کر میری الماری میں نیچے والے خانے والے میں ڈال دیں۔ اس میں ایک مردانہ جوڑا پہلے سے پڑا ہے۔ سعدیہ کی دیورانی کی شادی کی سالگرہ اگلے مہینے میں ہو گی۔ سنا ہے وہ لوگ دھوم دھام سے منائیں گے۔ جب تک میری طبیعت بھی ٹھیک ہو جائے گی' اسی جوڑے کو مردانہ جوڑے کے ساتھ پیک کر کے انہیں گفٹ دے دوں گی۔"

نادیہ نے اپنی بہن سعدیہ کے دیور کی شادی کی سالگرہ میں جانے کی پلاننگ کرتے ہوئے کہا تو احسن بولے بغیر نہ رہ سکا۔

"یعنی کہ تم نے ابھی بھی سبق نہیں سیکھا۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں سکھایا گیا کہ اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتے داروں پر خرچ کرو اور تم اپنا ناپسندیدہ مال لوگوں کو دے کر خوشی محسوس کرتی ہو۔ بہت بری بات ہے نادیہ!"

نادیہ اس کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ کچھ تازہ تازہ ہوئے آپریشن کا اثر بھی تھا کہ دل پسیج گیا۔

"اچھا تو ایسا کروں گی کہ اس جوڑے کو اللہ کے نام پر خیرات کر دوں گی۔ خیال بھی آ رہا تھا کہ کچھ دے دوں' آخر اللہ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ ثواب تو ملے گا۔ رشتے داروں کو تو کچھ بھی دے دو' انہیں پسند ہی نہیں آتا۔"

"چلو بھئی' میری بات کا یہ اثر ہوا۔ اچھی طرح سوچ لو ابھی تو وہی جوڑا گھوم پھر کر واپس آ گیا ہے۔ اللہ کے نام پر خیرات کرو گی تو اس جیسے نہ جانے کتنے جوڑے اللہ کی طرف سے تمہیں ملیں گے۔ سورہ بقرہ آیت نمبر 263 میں ہے نا کہ "جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں' ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اس طرح اللہ جس عمل کو چاہتا ہے' افزونی عطا کرتا ہے۔"

نادیہ کے تصور میں ایسے ہی سات جوڑے آ گئے' مسکرا کے بولی۔ "اف تو آخر میں اس کا کیا کروں؟ اچھا فی الحال تو ایسا کریں اسے اے پی کے والے خانے میں ڈال دیں۔ جب ٹھیک ہو جاؤں گی تب دیکھی جائے گی۔ ابھی تو اس کو دیکھ کر میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔"

"نادیہ! میں اسے تمہاری الماری میں تمہارے پہننے والے کپڑوں کے خانے میں رکھ رہا ہوں' کیونکہ آج سے تمہاری الماری میں اے پی کے والا خانہ ختم جب ٹھیک ہو جاؤ گی تو یا تو اسے سلوا کے پہن لینا اور اگر خیرات میں دینا چاہو تو پہلے بازار سے کوئی اپنی پسند کا جوڑا خریدنا اور پھر اس کے ساتھ ہی اس سوٹ کو بھی اللہ کے نام پر دے دینا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ "اپنے مال سے بہترین حصہ راہ خدا میں خرچ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بری سے بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرو' حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم اسے ہرگز بھی لینا گوارا نہ کرو گے۔" احسن نے اسے پھر سمجھایا۔

"اچھا بابا ٹھیک ہے' اب تو میں وہی کروں گی جو آپ کہیں گے۔ سچ مچ اس سوٹ کی واپسی نے تو میری آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"نادیہ! تم وہی کرو گی جو اللہ نے ہمیں سکھایا ہے تو بس پھر طے ہو گیا کہ آج سے نو اے پی کے۔"

"چلیں! آپ کے سمجھانے سے میری الماری سے تو یہ خانہ ختم ہو جائے گا' لیکن ابھی آپ ہی تو کہہ رہے تھے کہ ہر عورت کی الماری میں اسی طرح کا خانہ ضرور ہوتا ہے۔"

"دیکھو! ہمیں دوسروں سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ اچھائی ہمیشہ اپنی ذات سے شروع کرنی چاہیے بس۔ اس کے بعد ہم اچھے تو۔۔۔" احسن نے شرارت سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"سب اچھے۔" نادیہ نے مسکرا کر اس کی بات پوری کی اور دونوں ہنس دیے۔

مکمل ناول

آسیہ رزاقی

منانے کے لئے

"اتوار؟ اتوار کو تو ہمارا میچ ہے۔ سمی فائنل اف! جلدی فارغ ہوا تو درزی کی طرف چلا جاؤں گا۔"

محسن بڑا تھا۔ اس کے بہانے بھی بڑے تھے۔

"مجھے کمپیوٹر کا کام مکمل کرنا ہے۔ اتوار تو بہت بزی ہوتا ہے میرا۔ آپ کو معلوم ہے۔ پھر آپ کوئی بھی اہم کام اتوار کے دن ہی کیوں رکھتی ہیں۔"

احسن سے بحث لاحاصل سمجھ کر تلملاتی ہوئی باہر آئیں۔

کمبخت ٹیلر کے بھی دس بہانے۔ اتوار کو بڑے بھائی کے گھر پر ڈنر تھا۔ ہر دعوت میں نیا سوٹ، نئے میچنگ سینڈل اور پرس بھی ضروری مگر درزی کو کیا غرض اس کے پاس مصروفیت کے ایک نہیں دس بلکہ سینکڑوں بہانے تھے۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ، کاریگر کے نخرے، کٹر ماسٹر کا بہت دور سے دو بسیں بدل کر دیر سے آنا۔ کڑھائی والے کی سستی اور بھی۔ بے شمار تاویلیں اور یاسمین کو میکے کی دعوت میں جانے کے لیے نئے کپڑے ضروری۔

اپنی شان دکھانے کا کوئی موقع وہ ضائع نہیں کرتی تھیں۔ بھابھیوں کے سوالات، کپڑے کی قیمت سے لے کر سلائی کڑھائی کی اجرت معلوم کرنے کی بے تابی پھر انہیں خبر مل ہی جاتی کہ ان کی نقل میں کس بھابھی نے ویسا کپڑا ویسی کڑھائی، ویسا سوٹ سلوایا ہے۔ فخر سے گردن بلند ہو جاتی۔ سب میں نمایاں ہونے کا شوق۔ برتری کا زعم انہیں کئی دن خوش رکھتا۔

نئے سوٹ کے لیے انہوں نے درزی کو کئی فون بھی کیے۔ اس نے اتوار کی شام کا وعدہ کیا تھا۔ اتوار کو ڈرائیور چھٹی پر ہوتا تھا۔ اگر بھائی کے گھر دعوت نہ ہوتی تو وہ ایک دن انتظار بھی کر لیتیں۔ میاں سے امید نہ تھی کہ وہ ان کا سوٹ لینے درزی کے پاس جانے کی

زحمت گوارا کریں گے۔ بیٹوں کی اپنی مرضی اور مصروفیت اور اتوار کو میاں صاحب کی مصروفیت خاصی دل جلانے والی ہوتی۔ وہ تملماتی ادھر سے ادھر ٹہلتی رہیں۔ میاں صاحب کو توفیق نہ ہوئی کہ پوچھ ہی لیں۔

"بیگم! کیا پریشانی ہے؟" آخر تھک کر لیٹ گئیں۔ کل کچھ کر ہی لیں گی۔ صبح مرادن کو بس کا کرایہ دے کر بھیجنا پڑے گا اور اگر اس نے مرادن کو مایوس کر کے بھیجا۔ پھر کسی ساڑھی پر اکتفا کرنا ہو گا۔ گو کہ ساڑھی نئے سوٹ کا متبادل تو نہیں ہو سکتی۔ کس کو یقین آئے گا کہ یہ نئی ہے۔ سب سمجھیں گے۔ کبھی کی رکھی ساڑھی پہن کر آ گئی ہیں۔ سوٹ کی تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ مہنگا نئے ڈیزائن کا کپڑا۔ نئے ڈیزائن اور فیشن کے مطابق کڑھائی' بنارسی لیس' نیا سوٹ ان کی امنگوں کی ترجمانی کے عین مطابق تھا۔ خدا کرے کل مل جائے۔ فکروں میں مبتلا بستر پر دراز ہو گئیں۔ میاں صاحب سے بدستور ناراض۔

صبح ناشتے کے بعد میز سمیٹ رہی تھیں۔ چھٹی کے دن عموماً" ناشتے پر وہ دونوں ہی ہوتے تھے۔ محسن' احسن اور ثنا مرضی کے پابند تھے۔ آج محسن نے ناشتے پر ساتھ دیا تھا۔ جلدی میں تھا۔ میچ فائنل کی فکر میں مبتلا۔

برتن سمیٹتے ہوئے جونہی اتفاق سے زینے کی طرف نظر گئی۔ حیرت سے ساکت ہو گئیں۔ سیڑھیوں سے اترتی ساس جن کا ہاتھ محسن کے ہاتھ میں تھا۔ محسن مسکراتا ہوا انہیں کوئی قصہ سنا رہا تھا۔ برتن اٹھاتے ہوئے ہاتھ تھم گئے۔ ناگوار نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔ ساس کو بلند آواز میں سلام کیا۔ دعا دے کر آخری سیڑھی پر آ کر انہوں نے محسن کو پیار کیا۔ بلائیں لیں۔ محسن انہیں کرسی پر بٹھا کر اور ماں کی تیکھی نظروں کو نظر انداز کرتا ہوا باہر لپک گیا۔ ہائے ماں کی بے وقعتی۔ دل چاہا اسے کچا چبا جائیں۔

"اماں جان! آپ ناشتا کریں گی؟ بنوا دوں؟" ساس سے بنا کر رکھنا ان کی مجبوری تھی۔ ورنہ صاحب طنز کے تیر چلانے کے ماہر۔

"نہیں دلہن! ناشتا کر کے آئی ہوں۔ احتشام اور تم نے کر لیا؟"

"جی وہ۔ جو لاڈلی بیگم ہیں۔ ابھی تک سوئی ہوئی ہیں۔ چھٹی کے دن ان کی صبح دن کے بارہ بجے ہوتی ہے۔ محسن تو ناشتا کر کے چلا بھی گیا۔ اس کا میچ ہے۔"

وہ اوپری دل سے گفتگو کر رہی تھیں۔ ذہن ابھی تک محسن میں اٹکا ہوا تھا۔ کب ان کی نظروں سے بچ کر اوپر گیا۔ پتا ہی نہیں چلا۔

احتشام صاحب زور دار آواز میں سلام کرتے ہوئے ماں کے سامنے جھکے۔ انہوں نے شفقت کے اظہار کے طور پر ان کے سر پر ہاتھ پھیر کر پہلے سے ہی سنورے ہوئے بالوں کو بگاڑنے کی کوشش کی۔ پھر کندھے کو دبوچا۔ ماں کی محبت سمجھ کر احتشام صاحب نہالوں نہال ہو کر انہیں ہاتھ سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئے۔

چیخ زور سے بیچ کر انہوں نے ملازم لڑکے کو پکارا اور بیٹی کے کمرے میں جا گھسیں۔

"تم ابھی تک سو رہی ہو۔ وقت دیکھا ہے۔ دس بجنے والے ہیں۔" گو کہ بیٹی کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ مگر خفگی جتانا ان کی عادت تھی۔

"کہاں سو رہی ہوں۔ کب کی اٹھی ہوئی ہوں۔ آپ صبح صبح اس قدر شور کرتی ہیں۔ کون سو سکتا ہے۔ اتنی رات تک پڑھتی رہی کہ دیر تک سوؤں گی۔ مگر......"

"ہوش میں ہو۔ میں شور کرتی ہوں؟ ان نوکروں کو جب تک جگایا نہ جائے۔ چلتے پھرتے میں بھی سوتے ہوئے لگتے ہیں۔ سست نکمے اور ان صاحب زادے کو دیکھو! کل میں نے کہا کہ درزی سے میرے کپڑے لا دو تو ان کے پاس ٹائم نہیں اور صبح صبح جا کر دادی کو لے آئے۔ اس کام کے لیے بہت ٹائم ہوتا ہے۔" یہی بھڑاس نکالنے آئی تھیں۔ دیر نہ کی۔

ثنا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آ گئیں دادی؟ اچھا۔" پھر ماں کے بگڑے تیور دیکھ کر مصالحانہ انداز میں نرمی سے بولی۔ "امی! بھائی نہ جاتے تو ابا کو جانا پڑتا اسی لیے...... اور کون سا درزی صبح دکان کھولتا ہے۔ بارہ بجے سے پہلے تو کوئی بھی کام

نہیں کرتے بازار والے۔ بھائی کا میچ صبح دس بجے شروع ہو گا۔ اس لیے صبح ہی جا کر دادی کو لے آئے ہوں گے۔ ابا نے کہا ہو گا۔ آخر آپ کو اعتراض کیا ہے؟"

"اُف...... یہاں تو قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے والی مثال فٹ ہے۔ میں تو اس لیے کہہ رہی ہوں کہ دونوں لڑکیاں دادی کے کمرے میں سوتی ہیں۔ صبح صبح جوان لڑکے کا کمرے میں گھس جانا کون سی اچھی بات ہے۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گی۔ بھئی! بستر میں سوتے ہوئے کب خبر ہوتی ہے کہ بندہ کس طرح سویا ہوا ہے۔ چھٹی کا دن ہے۔"

"ان لوگوں کو چھٹی کے دن سے فرق نہیں پڑتا۔ دادی کے ساتھ فجر کے لیے اٹھتی ہیں۔ پھر پڑھائی کرتی ہیں۔ آپ خوامخواہ۔" ثنا بھی آخر تھی تو ان ہی کی بیٹی۔ کیوں چپ رہتی۔

"ارے خوامخواہ کیسے۔ آندھی آئے یا طوفان۔ دادی کے بہانے اوپر جانا لازمی۔ ہاں بھئی! ان لڑکیوں کو ادائیں بھی خوب دکھانی آتی ہیں۔ پھر بھلا لڑکے کیوں نہ آنکھیں سینکیں۔"

"امی!" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر چیخی۔ "پلیز الزام نہ لگائیں۔ وہ ایسی نہیں ہیں۔"

"اچھا! پھر کیسی ہیں؟ احسن' محسن کا دل کیوں اوپر اٹکا رہتا ہے۔ جانتی ہوں سب۔"

ثنا منہ پھلا کر واش روم میں گھس گئی۔ وہ دانت پیستی اپنے کمرے میں آ گئیں۔ جہاں احتشام صاحب ماں کی خدمت میں مصروف تھے۔ (ان کے خیال میں) جبکہ وہ ان سے باتیں ہی کر رہے تھے۔ وہی باتیں جو وہ ہر بار چھٹی کے دن ان سے کرتے تھے۔ ہفتے بھر کی رپورٹ۔

"اور اماں جان! محتشم کی صحت کیسی ہے۔ عرصہ ہو گیا۔ ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"میری ملاقات بھی کبھی کبھار ہی ہوتی ہے۔" اماں جان افسردگی سے کہہ رہی تھیں۔

"میں نماز کے بعد صبح سو جاتی ہوں۔ وہ فیکٹری چلا جاتا ہے۔ رات کو میرے سونے کے بعد آتا ہے۔ کبھی جلدی آ جائے تو آ کر میرے پاس بیٹھتا ہے۔ میرے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ عجیب مزدوروں والی زندگی ہے۔ کھانے کا ہوش نہ آرام کا خیال بس محنت مشقت۔"

اماں جان کی ٹھنڈی سانسیں' بہو بیگم کو آگ کی لپیٹ کی طرح جھلسا رہی تھیں۔ بس اسی طرح چالاکیوں سے قابو میں کر رکھا ہے بڑی بی نے اب کچھ وصول لینے کے بہانے تلاش کر رہی ہیں۔ ہمارے میاں بھی اتنے سیدھے ہیں۔ ارے ان کی چالیں تو بچے تک سمجھ سکتے ہیں۔ مگر میاں صاحب......

"اماں جان ناشتا لاؤں آپ کے لیے؟" اپنی طرف دھیان پا کر بڑبڑا کر بولیں۔

"ارے... بی بی! بتایا تو تھا میں نے۔ ناشتا تو میں صبح سویرے کر لیتی ہوں۔ بچیاں فجر کے وقت اٹھتی ہیں۔ تو ناشتا بھی جلدی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ پڑھنے کے لیے بیٹھ جاتی ہیں۔ صائمہ بے چاری پر دوہری ذمے داری ہے۔ محتشم بعد میں اٹھتے ہیں۔ تو ان کے لیے تازہ اسی وقت......"

چلو جی! پوری داستان امیر حمزہ...... شروع ہو گئیں تعریفیں۔

"اس کے بعد لڑکیاں کالج چلی جاتی ہیں تو گھر کی صفائی وغیرہ۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں اب تو دیر ہو گئی۔ بھوک لگی ہو گی۔ تو پھر سے کر لیں۔ کھانے میں شاید...... کچھ دیر ہو جائے تو۔"

بات بنانے میں ماہر' مصروفیت ظاہر کرنے کے لیے یونہی چادر کی سلوٹیں درست کرنے لگیں۔ احتشام صاحب کرسی پر بیٹھے انگلیوں سے ماتھا رگڑ رہے تھے۔ کسی بھی پریشانی کے وقت وہ ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ گھبراہٹ ظاہر کرتے کے لیے ان کے پاس پہنچیں۔

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے؟ سر میں درد ہے تو کچھ آرام کر لیں۔ آپ بھی بس! ذرا صحت کا خیال نہیں رکھتے۔ چھٹی کے دن بھی سویرے جاگ......"

"میں ٹھیک ہوں بھئی۔" وہ قدرے چڑ کر بولے۔ "تم ذرا احسن کو بلاؤ۔ دیکھو! کیا کر رہا ہے۔"

اونہہ مجھے یہاں سے ٹالنے کا بہانہ ۔۔۔ کوئی بات ہے ضرور۔

"اسے پڑھائی کرنی ہے۔ کہہ رہا تھا کمپیوٹر پر کوئی بہت ضروری کام کرنا ہے۔"

"جانتا ہوں۔ پھر بھی دیکھ لو۔ کام کے بہانے کمپیوٹر پر فلم نہ دیکھ رہا ہو۔ آج کل لڑکے کمپیوٹر پر غلط قسم کے کام بھی کرتے ہیں۔ چیک کرتے رہنا اچھا ہوتا ہے۔"

لو جی! اب میں جاسوسی کروں۔ کیسے بتاؤں میرے بچے ایسے نہیں ہیں۔ بھتیجیوں کی کچھ خبر نہیں۔ کالج کے بہانے کہاں کہاں جاتی ہوں گی۔ اللہ کو خبر ہے۔

"حسن! چلو۔۔۔ تمہارے ابا بلا رہے ہیں۔" وہ جو جم کا بیٹھا تھا۔ سیدھا ہو گیا انگڑائی لی۔

"مجھے۔۔۔ بہت ضروری۔۔۔ ابا نے کیوں بلایا ہے، خیریت۔۔۔؟" کمپیوٹر آف کر دیا۔ اب دیکھنے کو کچھ تھا بھی نہیں۔ سرمئی اسکرین کے سوا۔

"تم نے آج ناشتا بھی نہیں کیا۔ میں سمجھ رہی تھی تم سو رہے ہو۔ آخر ایسا کون سا ضروری کام کر رہے تھے کہ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں۔"

"واہ رے۔" اس نے مزاحیہ انداز میں سر ہلایا۔ "کس نے کہا سو رہا ہوں۔ ناشتا نہیں کیا۔ چچا کے گھر دادی کے ساتھ ایسا مزے دار ناشتا کر کے آیا ہوں کہ بس۔ امی کبھی آپ بھی ایسا ناشتا بنوا لیا کریں۔ وہی مرادن کے ہاتھ کا بدمزا آملیٹ اور سوکھے توس ہمارے مقدر میں لکھ دیے گئے ہیں۔ اب تو میں نے سوچا ہے، روز چچا کے گھر جا کر چچی کے ہاتھ کے بنے پراٹھے کا ناشتا کر لیا کروں گا۔ لطف آ گیا۔"

"کیا تم۔۔۔ کب؟" ہکلا گئیں۔

"کب کیا؟ ابا نے صبح ہی دوڑا دیا کہ دادی کو لے کر آؤ۔ وہاں عالیہ، غالیہ ناشتا کر رہی تھیں۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، ان کی ایک دفعہ کی آفر پر ڈٹ گیا۔ کرارے خستہ پراٹھے گرم گرم اور مزیدار خاگینہ مجھے دیر ہوئی تو بھائی آ گئے۔ وہی پھر دادی کو نیچے لائے۔ پھر تو لگا رہا کھانے میں۔"

"بہت ہی اچھا کیا۔ ماں باپ کو بدنام کرنے کا کوئی موقع نہ گنوانا۔ وہ بھی سمجھی ہوں گی بے چارا بھوکا فقیر ہے۔ چلو! اللہ نام پر کھلا دو۔ دعا دے گا۔" تلملا کر چلائیں۔

"ہاں، دعا تو ضرور دی تھی۔ اللہ کا شکر کر کے اور گیا تھا دادی کو لینے ابا جان کے حکم پر۔ رزق سامنے ہو تو اسے ٹھکراتے نہیں۔ یہی سوچ کر ناشتا کر لیا۔"

"کیا نیچے ناشتا نہیں ہوتا؟" جلبلا گئیں۔

"ہوتا ہے۔ مگر اس وقت مرادن دہی میں پھنسی ہی تھی جب میں یہاں سے گیا تھا اور میرا ڈبل فائدہ ہوا۔ لذیذ ترین ناشتا ملا اور کمپیوٹر پر جو کام دس بجے ناشتے کے بعد شروع کر کے پورا دن لگاتا۔ وہ ان دو گھنٹوں میں مکمل کر لیا۔ فارغ ہو گیا ہوں۔"

"تم بھی، بس ان ہی لوگوں کے گن گانا۔ چلو اب! بابا بلا رہے ہیں اور درزی سے میرے کپڑے بھی لے آنا۔"

کہتی ہوئی آ گئیں۔ دادی اب لاؤنج میں صوفے پر براجمان تھیں۔ احتشام صاحب بھی ان کے برابر بیٹھے کچھ چبا رہے تھے۔ لاڈلی منہ اٹھائے دادی سے محو کلام تھی۔ کہاں کہاں کی باتیں بگھار رہی تھی۔ منہ اس کا بھی چل رہا تھا۔ سونف اور ناریل، دادی کے پاندان میں یہی سوغات سب کی پسندیدہ تھی۔

"اور دادی! دادا کے بھتیجے وہی ہیں ناں؟ انعام الرحمٰن جو ایک دفعہ ہمارے ہاں بھی آئے تھے۔ حج کر کے آئے تھے۔ تو بڑی خوب صورت جاء نماز لائے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔ بڑی حسین تھی۔"

"ہاں بیٹی بہت حسین ہے۔ مگر بدنصیب۔۔۔ شادی کے دن دولہا ایک حادثے میں زخمی ہو کر فوت ہو گیا۔ بڑا اندوہناک سانحہ تھا۔ وہ دن آج کا دن، مستقل سوگ کی حالت میں ہے۔ کتنے رشتے آئے ہیں۔ سب سمجھاتے ہیں۔ مگر وہ شادی کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ ابھی تو کم عمر ہے۔ بہت ہی چھوٹی تھی۔ جب اس کی شادی طے کر دی۔ مگر نصیب۔"

"ہائے دادی! ہم ان لوگوں سے کیوں نہیں ملتے۔ ۔۔۔ سمجھائی کہ۔۔۔"

"ثنا! بہت باتیں بنانے لگی ہو۔ چلو اٹھو۔ مرادن ۔۔۔ ساتھ صفائی کروا لو۔" یاسمین کو دادی کے ساتھ ۔۔۔ اور آزادی کے ساتھ باتیں کرتی بیٹی پر غصہ آ ۔۔۔

"اچھا امی۔۔۔! ابھی کروا لوں گی۔ مرادن ناشتا تو ۔۔۔ لے۔ ابھی پہلی قسط ہے۔ گیارہ بجے دوسری، ۔۔۔ بجے تیسری قسط کے بعد ان کے اوسان بحال ہوتے ۔۔۔ تب ان کی جان میں جان آتی ہے۔ اس کے بعد ۔۔۔ صفائی کے قابل ہوتی ہیں۔ اچھا دادی! پھر ہم کیوں ۔۔۔ نہیں ملتے! ۔۔۔ قریبی رشتے دار ہیں۔"

۔۔۔ کا شدت سے دل چاہا ثنا کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا ۔۔۔ باتونی لڑکے! یہ میری بیٹی ہے۔ اسے میرے ۔۔۔ کا کوئی احساس نہیں۔ میں ان سسرال والوں سے دور رہنا چاہتی ہوں۔ مگر میرے بچے ان ہی میں ۔۔۔ رہنا پسند کرتے ہیں۔ دادی، چچا، چچی اُفوہ۔

"بیٹا! وہ تو جب موقع ملتا ہے۔ آ جاتے ہیں۔ ہم ۔۔۔ ان کو بھی بلاتے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقع پر۔ انعام ۔۔۔ کی مزنہ کی صائمہ سے خاصی دوستی ہے۔" دادی ۔۔۔ پوتی کو اطلاعات فراہم کرنے میں فیاضی دکھا رہی ۔۔۔ "جب محتشم رحیم یار خان میں تھے ہم کئی بار ۔۔۔ انعام کے گھر گئے۔"

"۔۔۔ دادی ہم لوگ کیوں نہیں ملتے ان سے۔"

"۔۔۔ میں انعام کا گھر بار ہے۔ زمین بھی ہے۔ ۔۔۔ میں ہیں۔ بہت خوش حال ہیں ماشاء اللہ ۔۔۔ اس بچی کا دکھ ہر خوشی کو ماند کر دیتا ہے۔۔۔ اور ۔۔۔ کے لیے ٹائم بھی تو ہو۔ خاص طور پر ۔۔۔ شہر جانا مشکل لگتا ہے۔ وہ لاہور آتے ہیں۔ ۔۔۔ ہو جاتا ہے۔"

"۔۔۔ کی بیٹی مجھے تو بہت پیاری لگی۔ کیسا سوگوار ۔۔۔" ثنا کی لن ترانی کو ماں کی للکار نے روکا۔

"۔۔۔ کہہ رہی ہوں میں۔ اٹھو! صفائی کرواؤ۔"

"۔۔۔ آتی ہوں۔" (چپکے سے) "ہم نہ کسی سے

ملیں گے۔ نہ ہی ان کی باتیں کریں گے تو واقفیت بھی کیسے ہوگی؟" کہتے ہوئے اٹھتے اٹھتے اس نے پاندان سے سونف ناریل کی مٹھی بھر کر پھنکا لگایا اور ٹہلتی ہوئی گنگناتی ہوئی چلی گئی۔

"اماں! محتشم سے کہیے۔ کبھی فرصت ملے نیچے کا چکر لگالیں۔ مجھے تو ان کے آنے کے وقت کا علم نہیں ہو پاتا۔ ورنہ چلا جاتا۔ جب کبھی گیا بھی تو وہ ملتے نہیں۔" اب احتشام کی بولنے کی باری آئی۔

"ہاں! یہ تو ہے۔ کہہ دوں گی میں۔ وہ آیا تھا دو بار۔ تم ملے نہیں۔ کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ یہاں لاؤنج میں کچھ دیر بیٹھ کر اخبار پڑھ کر چلا گیا۔"

"اوہ! اچھا مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔" احتشام صاحب چونک کر سیدھے ہوئے۔ "مرادن....."

مرادن کمرے میں صفائی کر رہی تھی۔ فوراً" حاضر ہوئی۔

"یہ بتاؤ! اوپر سے موتی آیا تھا۔ کب آیا' کب گیا' تم نے مجھے بتایا تک نہیں' ویسے ہر لمحے کی خبر پہنچاتی ہو۔"

مرادن کے پیچھے بیگم نمودار ہوئیں۔ مرادن نے گردن اور نظر ترچھی کر کے انہیں دیکھا۔ حسب توقع بیگم کی جانب سے جواب آیا۔

"یہ کیسی جواب طلبی ہے۔ وہ اخبار پڑھنے آئے تھے۔ پڑھ کر چلے گئے۔" چیں بہ جبیں ہو کر منمنائیں۔

"میں اگر گھر پر نہ ہوں۔ اسی طرح خاطر ہوتی ہے مہمان کی؟" انہوں نے طنزاً" کہا۔

"چائے وغیرہ دی تھی؟" وہ مرادن سے مخاطب تھے۔

وہ ہچکچائی۔ "جی! وہ بیگم صاحبہ نے کہا۔ چائے کا وقت نہیں ہے۔ دوپہر کو کون پیتا ہے چائے۔"

مرادن نے اپنی گردن بچائی۔ احتشام صاحب بیگم کو گھور کر بولے۔

"تو کھانا تو کھلایا جاتا ہے دوپہر میں۔ کھلایا تھا؟"

اماں جان نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں۔ وہ پھر آجائے گا۔ وہ کہیں دور تو نہیں ہے۔ مہمان تو نہیں تھا۔ چلو! اور اسے خود تمیز ہونی چاہیے کہ..... کبھی بھائی کو سلام کرنے آجائے....."

"آیا تو تھا۔ پھر کیسی عزت افزائی ہوئی؟" کہتے ہوئے وہ اندر کمرے میں چلے گئے۔ بیگم پیچھے پیچھے گئیں۔ حسب توقع ان کی جواب طلبی ہوئی۔ وہ تنتنے سے پیچ کر بولیں۔

"اچھا! تو وہ کہاں کے شہزادے تھے۔ جن کے لیے ڈونڈی پٹواتی کہ حضرات! نگاہ روبرو۔ شہزادہ محتشم تشریف لاتے ہیں۔"

احتشام صاحب تکیہ ادھر سے ادھر پٹخ کر دھیمی آواز میں بولے۔

"ہر بار کوئی نہ کوئی بدمزگی کرنا تمہاری عادت بن گئی ہے۔ نہ تمہیں اماں کی عزت' نہ میرے بھائی کا خیال۔"

"اور وہ..... جب آئیں گی۔ کوئی نہ کوئی شکایت ضرور کریں گی۔ چنگاری لگانے آتی ہیں۔"

"شٹ اپ کم ظرف عورت! خبردار' کینہ پروری کی بھی حد ہوتی ہے مریم اس عدت سے گزر رہی ہیں۔" غصے میں ہونٹ چبا رہے تھے۔

"رہنے دیں! مجھے ہی الزام نہ دیں۔ کبھی ان اماں کی ہوشیاری بھی سمجھ لیا کریں۔"

یاسمین تو مزید کچھ عقدہ کشائی پر تیار تھیں' احتشام صاحب نے ہی برداشت کر لیا۔ حسب سابق حسب عادت وہ بیوی کے مزاج کو خوب سمجھتے تھے۔ ان کی جہالت کا خیال کر کے چپ ہو جاتے۔ وہ خوش ہوتیں کہ میاں کو قائل کر لیا ہے۔ حالانکہ نہ وہ قائل ہوتے' نہ بیوی کو قائل کر سکتے تھے بات بڑھانے کے قائل نہ تھے۔ ابھی بیگم کا غصہ اترا نہ تھا کہ احسن ان کی فرمائش رد کر کے دوست کے بلانے پر چلا گیا۔ اس کے امتحان نزدیک تھے۔ دوست کے گھر پر کئی کلاس فیلو جمع ہو کر پڑھائی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ۔

"[illegible] کا گھر مغرب میں ہے۔ درزی کا انتہائی مشرق میں۔ جانے آنے میں دو گھنٹے لگ جائیں گے۔"

"جی!" کہہ کر چل دیا۔

"کمبختوں کو میرا تو خیال ہی نہیں۔ نہ میری اہمیت ہے۔ ارے! اب رات کو میں کیا پہن کر جاؤں گی۔"

"کپڑے نہیں ہیں تو نہ جائیں۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر بار ہی دعوت میں شرکت کریں۔ دادی آئی ہیں یہ خیال کر لیں۔ گھر پر ہی قورمہ پلاؤ پکوالیں۔ وہاں بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔"

یہ شوشہ دے کر ماں کو تلملاتا چھوڑ' یہ جا وہ جا۔ انہیں خبر نہ ہوئی' احتشام صاحب نے مرادن کو کھانے کا خاص آرڈر دیا ہے اور ثنا کو بھی کچن بھیجا ہے کسی ڈش کے لیے۔ ثنا تجربے بھی تو کرتی رہتی ہے۔

احتشام صاحب پھر والدہ محترمہ کی خدمت میں پیش ہونے چلے گئے تھے۔ وہ دیر تک کمرے میں موجود سب پر فرد جرم عائد کرتی رہیں۔ دل میں بھناتی رہیں۔ ہر چھٹی کا دن اسی طرح جی کا جلاوا ہوتا تھا۔ احتشام صاحب والدہ کو نیچے بلاتے۔ ان کی سنتے اپنی سناتے۔ ماں کو بھی لگائے رہتے۔ اماں جان کا دل بہلانے کے خاص آرڈر تھے۔ وہ چھوٹے بیٹے کے ساتھ اوپر کے پورشن میں رہتی تھیں۔ برسوں سے محتشم کے ہی ساتھ تھیں۔

پہلے تو رحیم یار خان اور خان پور میں محتشم کی ملازمت تھی۔ اب تو یہاں آکر بھائی کی محبت کچھ زیادہ [illegible] ہو گئی تھی۔ اماں جان کی موجودگی میں بیگم کو نظر انداز کرنے کی پالیسی اپنائے رکھنا۔ ان کا وتیرہ رہتا۔ مگر آج تو بھائی کے گھر جانا تھا۔ اب ناراض تو نہیں کر سکتی تھیں۔

[illegible] کے کھانے میں بریانی' قورمہ اور قوامی سویاں [illegible] جل کر خاک ہو گیا۔ "خوب! تو آج اماں جان [illegible] بھی۔ اس ثنا سے تو بعد میں نپٹوں گی۔ مرادن [illegible] ہے۔ کمبخت نے ان سے پوچھنے کی [illegible] بھی۔" "مگر وہ بھی ایک مکار۔ [illegible] بی بی نے جو کہا۔ میں نے پکا دیا اور سویاں تو وہ خود ہی پکانے آئی تھیں۔ صاحب نے ان سے کہا جو تھا۔"

کھانے کے بعد وہ برتن وغیرہ سمیٹنے کے بعد اماں جان کے پاس آکر بیٹھیں۔

"اماں جان! مجھے تو آج رات بھائی کے گھر جانا ہے۔ آپ مرادن کو رات کے کھانے کا بتا دیں۔ وہ پکا لے گی۔ محسن' احسن گھر میں ہوں گے۔ جب آپ چاہیں گی۔ وہ آپ کو اوپر لے جائیں گے۔ ورنہ آپ رات کو رک ہی جائیے۔ محسن' احسن کا دل بھی لگا رہے گا۔" چاپلوسی بھی ضروری' دنیاداری بھی۔

"ثنا..... جائے گی؟"

"پوچھتی ہوں۔ مرضی کی مالک ہے۔" کہہ کر میاں کی طرف متوجہ ہوئیں۔ "سنیے میں مرادن کو لے کر درزی کی طرف جا رہی ہوں۔ کمبخت کی دکان بھی اتنی دور ہے۔ ٹیکسی لے لوں گی۔ بھلا! دو دو جوان بیٹے' مجال ہے میرا کوئی کام کر دیں۔ ثنا کو ہی ڈرائیونگ سکھا دی ہوتی تو آج مجھے ٹیکسی پر کیوں جانا پڑتا۔"

وہ فوراً" چلی گئیں۔ احتشام صاحب سے کہنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ ہی ان کو لے جائیں۔ وہ اتنی عقل رکھتی تھیں۔ موقع محل کا خیال بھی تھا۔ ان کے جانے کے بعد احتشام صاحب نے لمبا سانس لے کر کہا۔

"چلیں اماں جان! بیگم تو گئیں لمبی مدت کے لیے۔ ہم کچھ آرام کر لیتے ہیں۔"

"رات کو..... کوئی خاص دعوت ہے اکرم کے گھر پر؟"

"جی! ان کے بیٹے کے رشتے کے سلسلے میں لڑکی والے آرہے ہیں۔ لڑکے کو دیکھنے۔"

"اچھا! بردکھوا ہے۔"

"جی! حالانکہ نہ تو وہ پردہ نشین ہے' نہ تارک الدنیا درویش۔ ہر جگہ بلکہ آفس میں بھی جا کر دیکھا جا سکتا ہے۔ آج کل تو کالج یونیورسٹی میں لڑکیوں کو دیکھ کر ہی رشتے ہو جاتے ہیں۔ مگر وہی پرانے رسم و رواج' دعوتوں کا شوق....."

"شاید وہ لوگ.... گھر دیکھنا چاہتے ہوں۔ آخر ان کی بیٹی کو اس گھر میں رہنا بسنا ہے۔"

دوپہر کی تھوڑی سی نیند لے کر ماں بیٹے پھر باتوں میں مصروف ہو گئے۔ پھر ثنا چائے لے آئی۔

ثنا دادی سے باتیں کرنے لگی۔ وہ خاصی منہ پھٹ اور صاف دل کی لڑکی تھی۔ جو دل میں ہوتا زبان پر بھی وہی ہوتا اور وہ اس بات کو برا بھی نہیں سمجھتی تھی۔ دادی کے پوچھنے پر کانوں کو ہاتھ لگا کر بولی۔

"میں اور ماموں کے ہاں دعوت میں؟ نہ جی نہ۔ توبہ! میرے منہ سے کچھ نکل گیا تو.... اگلی دعوت تک ای نصیحتیں کریں گی۔"

"اور ایسا ہو نہیں سکتا کہ تم اپنی ناگواری چھپالو؟" احتشام صاحب نے بیٹی کو نصیحت کی۔ "کبھی کبھی خاموش رہنا بہتر ہوتا ہے اور نظر انداز کرنے کی پالیسی اختیار کرنی چاہیے۔"

"سچائی بھی نظر انداز کر دیں؟" ثنا معصوم بن کر بولی۔

احتشام صاحب نے اماں کو دیکھا۔ وہ بولیں۔

"بیٹا! سچائی اپنی جگہ ضروری ہے۔ مگر دخل اندازی کوئی پسند نہیں کرتا۔ ہر گھر کے اپنے قاعدے قانون ہوتے ہیں۔ آپ اپنے گھر میں سچائی کو فروغ دیں۔ جو آپ دوسروں سے توقع کرتی ہیں۔ پہلے خود اس پر عمل کریں اور.... اعتراض کر کے برا بننے سے بہتر ہے کہ خود اچھا بن کر دکھائیں۔ پھر آپ کی بات کو لوگ غور سے سنیں گے۔ عمل بھی کریں گے۔"

ثنا گردن ہلاتی رہی۔

"اچھا دادی! یہ بتائیں ہم لوگ چچا انعام سے کیوں نہیں ملتے؟ اتنی حسین بیٹی ہے ان کی۔ میرا تو دل چاہتا ہے اسے اپنی بھابھی بنالوں۔ ابا! آپ ساہیوال کیوں نہیں جاتے؟ کبھی کبھار اپنے عزیزوں سے ملتے رہنا چاہیے، تعلق قائم رکھنے کے لیے.... اور تعلق ہو تو محبت بھی ہو جاتی ہے۔ کیوں دادی؟"

دادی ہنس پڑیں۔ "دیکھا! میری بچی کتنی سمجھ دار ہے۔ اچھی بات پر غور کرتی ہے۔ عمل بھی کرنا جانتی ہے۔ یہ دلہن نے بہت دیر کر دی۔ شام ہو گئی ہے۔"

احتشام صاحب نے بات ٹال دی۔ "بس! گھر سے نکلنے کا موقع ملے تو دس کام کر کے آتی ہیں۔ سوٹ کی میچنگ کے مطابق جوتے، پرس، چوڑیاں، ممکن ہوا تو کوئی زیور بھی۔"

"اور دادی تعلقات قائم رکھنے کے فائدے بھی بہت ہیں۔ خون میں جوش آتا ہے۔ جس سے خون کی روانی درست ہوتی ہے۔ صحت بحال ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ انسان ایک دوسرے کے کام آتا ہے۔ یہ ڈائیلاگ میں نے کہیں پڑھے تھے۔"

ثنا ابھی تک وہی سوچ رہی تھی۔ احتشام صاحب مسکرائے۔

"اچھا میری دادی! صحت قائم رکھنے کے لیے تو ہم ضرور ساہیوال جائیں گے۔ میں تم اور اماں۔"

دادی انہیں خوش دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔

"اور ثنا! کیوں نہ رشتے داروں سے ملاقات، تعلقات قائم رکھنے اور خون کی روانی کو رواں رکھنے کا طریقہ آج سے ہی شروع کر دیا جائے؟ پہل کرنے میں سستی کیا۔ اٹھو! آج ہم اماں کے ساتھ اپنے عزیز ترین بھائی سے تعلق بڑھانے کے لیے اوپر چلتے ہیں۔ صحت افزا مقام پر۔"

ثنا کھلا اٹھی۔ وہ مسکرا دی۔ دادی کا ہاتھ پکڑ کر چل پڑی۔ احتشام صاحب نے پاندان اٹھایا۔ احتشام صاحب کے گھٹنوں میں درد رہتا تھا۔ وہ بہت کم اوپر آتے تھے۔ آج بھی اوپر آتے ہی اماں کو فکر ہو گئی۔

"گھٹنوں میں درد تو نہیں ہوا؟ تھک گئے ہو گے۔ خوامخواہ تکلیف اٹھائی۔ رات کو اکرم کے گھر بھی جانا ہے۔ پتا نہیں وہاں کتنی دیر بیٹھنا پڑے۔"

وہ بڑے اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گئے۔

"چلو بھئی ثنا اب صحت بنائی جائے۔ بلالو! میرے عزیزوں، رشتے داروں کو۔ خون تو ابھی سے رواں ہو گیا ہے۔ شرر، شرر۔"

فوراً ہی عالیہ، غالیہ، صائمہ آگئیں۔ خوشی ان کے ... سے عیاں تھی۔

"بھائی جان! آپ کو زحمت ہوئی۔ مگر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ آپ کے بھائی بھی آج جلدی آجائیں گے۔ کئی دن سے کہہ رہے تھے، آپ کے ہاں جانے کا مگر آپ کی بے آرامی کا سوچ کر رہ جاتے۔ دراصل گھر آنے میں رات ہو جاتی تھی۔ تو......"

صائمہ کے لہجے میں خوشی کی کھنک تھی۔

"چائے لاتی ہوں۔" کہہ کر جانے لگیں تو احتشام صاحب نے کہا۔

"چائے بھی پی لیں گے۔ مگر رات کے کھانے کے بعد۔"

صائمہ خوش ہو کر ساس کو دیکھنے لگیں۔ عالیہ، غالیہ کھانا بنانے لگیں۔ ثنا بھی۔

"ابا بھی آجاتیں۔ سب مل کر کھانا کھاتے۔" صائمہ پرجوش ہو گئیں۔

پھر ہشام آگیا۔ احتشام صاحب اس سے پڑھائی کے بارے میں پوچھنے لگے۔ محتشم کے آنے کے بعد تو ایسی ہلچل پیدا ہوئی، جیسے پلیٹ فارم پر تیز رفتار ٹرین لڑکھڑاتی، دھڑ دھڑاتی آئی ہو۔ اس کے بعد بھاگ دوڑ شروع ہو جاتی ہے۔ روانہ ہونے والوں اور پہنچنے والوں کے درمیان ہنگامہ آرائی۔

گو کہ محتشم کی صحت خاصی گر چکی تھی، مگر حس مزاح خاصی تیز تھی۔ چند منٹوں بعد گھر قہقہوں سے گونجنے لگا۔ احتشام صاحب دل میں متاسف تھے۔ ... خراب صحت، محنت مشقت کی زندگی۔ اماں کے کمرے میں ایک ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر عالیہ دادی کے ساتھ سوتی تھی۔ سنگل بیڈ پر غالیہ۔ دونوں پلنگوں پر ... چادریں تھیں۔

... میں کل تین کمرے تھے۔ دو بیڈ روم ایک کو ڈرائنگ روم بنا لیا تھا۔ برآمدے میں کھانے کی میز رکھی تھی۔ صحن میں چھوٹا سا کچن۔ دوسرے بیڈ روم میں بیڈ اور کونے میں ہشام کے لیے گدا بچھا ہوا تھا۔ ... کی جانب چند کتابیں اسٹول پر رکھی تھیں۔

باتوں باتوں میں رات ہو گئی۔ کھانے کے لیے برآمدے میں آئے۔ میز پر کھانا رکھا تھا۔ پلاسٹک کی پلیٹیں اور ڈش۔ احتشام صاحب ندامت سے بجھ سے گئے۔ کبھی خبر نہ لی کہ بھائی کے کیا مسائل ہیں۔ اب بھی ثنا کی وجہ سے آئے اور اگر کھانا کھانے نہ آتے تو غور بھی نہ کرتے۔ کھانے میں دال چاول، کڑھی اور توری کی بھجیا تھی۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔ عرصہ بعد انہیں ایسا کھانا ملا۔ کھاتے ہوئے وہ کھل کر باتیں کرنے لگے۔

پھر احسن باپ کو بلانے آیا۔ ماموں کے گھر جانے کا یاد دلایا اور خود بھی "واہ! کڑھی چاول" کہہ کر شروع ہو گیا۔ لڑکیاں پیٹ بھر کھانے سے بھر کر کمرے میں چلی گئیں۔ سب کھا چکے تو کھانا ختم، ڈشز خالی۔ احتشام صاحب نے نادم ہو کر کہا۔

"میں کچھ زیادہ کھا گیا۔ سب ختم ہو گیا۔"

"بھائی جان! اسے ختم ہونا نہیں، اتفاق میں برکت ہے، کہتے ہیں۔ میں نے تو اپنے لوگوں کے لیے بنایا تھا۔ آپ لوگوں کی شرکت نے اتنی برکت ڈال دی۔ دیکھیں! کوئی بھوکا بھی نہیں اٹھا اور کتنا لطف آیا۔ عرصے کے بعد کھانا اتنا لذیذ معلوم ہوا۔ حالانکہ کوئی خاص چیز بھی نہیں تھی۔" صائمہ خوش تھی۔ بے حد خوش۔

"اچھا بھئی! کچھ میٹھا بھی بنایا ہے یا بس ایسے ہی باتوں سے ٹرخاؤ گی؟" محتشم نے کہا۔

ہشام کچن سے میوے والا گڑ لے آیا۔ احتشام صاحب نے ایک ڈلی اٹھائی اور منہ میں ڈال لی۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"آپ کو پتا ہے اماں؟ میں تو ایسی چیزوں کو ترس گیا ہوں۔ کتنا اچھا زمانہ تھا، جب ہم لوگ آپس میں گڑ کے لیے چھینا جھپٹی کرتے تھے۔"

"اس طرح؟ ہیں ابا؟"

احسن نے ہشام کے ہاتھ سے گڑ اچک لیا۔ سب قہقہے لگانے لگے۔ ہنسی کی آواز کھلی کھڑکیوں کے ذریعے نیچے پہنچ ہی گئی۔ بیگم صاحبہ کی طبیعت پر بوجھ آ

گرا۔

"یہ احسن بھی وہیں جا کر جم گیا۔ کہا تھا ابا کو بلا کر لاؤ۔ ساڑھے آٹھ ہو گئے ہیں۔ کب جائیں گے اور کب پہنچیں گے۔ محسن! تم جاؤ' لے کر ہی آنا۔ پتا نہیں کس مداری کا تماشا ہو رہا ہے کہ سب ادھر ہی پہنچے ہوئے ہیں۔ ثنا سے تو میں پوچھوں گی۔"

محسن کے لیے اشارہ کافی تھا۔ چار چھلانگوں میں اوپر پہنچا۔ جہاں گپ بازی ہو رہی تھی۔ اس نے بھی کسی کے ہاتھ سے چمچ چھین کر منہ بھر لیا اور جب اپنی آمد کا خیال آیا تو نو بج چکے تھے۔ نیچے بھاگا۔

"امی! ابا کھانا کھا چکے ہیں۔ چچا سے باتیں کر رہے ہیں اور وہاں کشمیری چائے کا دور چلنے والا ہے۔ میں بھی چائے پینے جا رہا ہوں۔" فوراً واپس ہوا۔

ماں کا کھلا ہوا منہ دیکھا ہی نہیں۔ جو اسے روکنے کے لیے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔

"لو بھلا' سر شام کھانا بھی کھا لیا گیا۔ مزدوروں کی طرح دعوت چھوڑ کر دال سبزی کھائی ہو گی۔ ہونہہ!" درزی کے پاس جا کر سوٹ لانا بے کار ہوا۔ نیا پرس' سینڈل' زیورات' میک اپ سب بے کار ہوا۔

"ثنا کو بلاؤ۔" چیخیں ضرور مگر سنتا کون۔

☼ ☼ ☼

بھائی کے گھر نہ جا سکنے کا ملال اپنی جگہ۔ نئے کپڑے میچنگ زیور' سینڈل نہ دکھانے کا غم الگ۔ میاں کے اوپر جا کر سب بھول کر کھانا کھانے اور سب کے ساتھ قہقہے لگانے کا دکھ سب سے زیادہ۔ اولاد تک بے نیاز' نہ جانے کون سا مقناطیس اوپر ہے کہ سب چپک جاتے ہیں۔ "ارے بھئی لڑکیاں" سب سے خفا ہو گئیں۔

سب سے بڑا صدمہ تو یہ تھا کہ صبح ہو گئی۔ کسی بھائی یا بھابھی نے پوچھا تک نہیں کہ وہ کیوں نہیں آئیں۔ خود ہی بڑی بھابھی کو فون کیا۔ وہ کچھ کھا رہی تھیں۔ چپ چپ کی آواز فون پر بھی ناگوار لگ رہی تھی۔ لاپروائی سے کہنے لگیں۔

"ارے اچھا ہوا یاسمین! تم نہیں آئیں۔ ایسے بینڈو لوگ۔ پورا کنبہ لے کر آ گئے۔ ڈرائنگ روم بھر گیا۔ تم ہوتیں تو عادت کے مطابق کوئی اعتراض کرتیں۔ بات بگڑ جاتی۔ خیر بھئی! ہمیں کنبے سے کیا لینا دینا۔ لڑکی سے واسطہ ہے۔ چلی جائے گی کینیڈا۔ سب سیکھ لے گی۔ اب کیا کریں۔ بیٹے کی ضد ہے۔ ورنہ ثنا بھی تو ہے۔"

جی جل گیا۔ "لو! میں بات بگاڑ دیتی؟ پھر کہیں ثنا کی وجہ سے اعتراض کر رہی ہوں۔"

منجھلی بھابھی روحینہ سے بات ہوئی۔ دبی زبان سے کہنے لگی۔

"آپا! سب خوش ہو کر گئے ہیں۔ پہلے پہل بڑی بھابھی نے ناک بھوں چڑھائی' مگر لڑکی کی ماں بہت سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔ عمر سے مل کر' بات کر کے سب مطمئن ہو گئے۔ اب ہم لوگ جواب لینے جائیں گے۔"

انہیں علم تھا۔ روحینہ بہت گہری اور معاملہ فہم ہے۔ صحیح بات نہیں بتائے گی۔ اس لیے چھوٹی چالاک بھابھی کو فون کیا۔ اندر کی خبریں وہی دیتی ہے۔

"بس آپا! خیر ہو گئی۔ ہمیں تو بڑی بھابھی کا یہ کہنا غضب ہو گیا کہ ہمارے تو خاندان میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی موجود ہے۔ ہمیں باہر جانے کی کیا ضرورت۔ مگر ... بیٹے کی ضد کے سامنے مجبور ہو گئے۔ لڑکی کے ابا تو تن فن ہو کر جانے لگے۔ ان کی بیوی نے روکا اور کہا کہ ہم سوچ سمجھ کر ہی رشتہ کریں گے۔ ہم تو اس وقت صرف آپ لوگوں سے ملنے آئے ہیں۔ رشتہ طے کرنے نہیں۔ پھر عمر آ گیا۔ اس نے خوب ہنسی مذاق کیا۔ سب کو وہ پسند آ گیا اور وہاں آئے لوگوں کو منجھلی بھابھی کی انوشا پسند آ گئی۔ وہیں بیٹھے بیٹھے رشتہ دے دیا۔ ہائے آپا! میں نے تو کہہ دیا' ہماری ثنا تو اس سے بھی زیادہ پیاری ہے۔ انوشا کا تو رنگ بھی میک اپ سے ہی نکھرتا ہے۔ اب منجھلی بھابھی انوشا کی خاطر اس رشتے کے لیے زور دیں گی۔ ان کا ڈاکٹر ہے۔ اس رشتے کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ گھر بیٹھے اتنا اچھا رشتہ مل گیا۔"

"ممانی نے کلیجے پر کیا تیر مارا۔ کسی نے جھوٹے منہ نہیں پوچھا "آپا! آپ کیوں نہیں آئیں۔" بلکہ کہہ ہی دیا کہ اچھا ہوا تم نہیں آئیں اور جب میں نے کہا بڑے بھیا کو بلا دو' میں بات کروں گی تو کہہ دیا گھر میں نہیں ہیں۔" "ارے! میں کیا بچہ ہوں۔ ریسیور سے بھیا کی صاف آواز آ رہی تھی۔ جی تو چاہا کہوں "یہ کیا تمہارا باپ بول رہا ہے۔" "اف! یہ ثنا۔ مجال ہے۔ خوشی سے ماموں کے گھر جانے کو تیار ہوتی۔ میں اسے لے ہی جاتی۔ ٹیکسی پر ہی ثنا اور میں صاحب کو دیکھو! بے نیاز چین کی نیند سوتے رہے۔ پوچھا ہی نہیں' مذمت تک نہ کی۔ ... انہیں ہر چیز سے بے خبر کر دیتی ہے ... کا دن برباد ہوتا ہے' مگر بھائی کے گھر نہ جانا اس قدر مہنگا ثابت ہو گا۔ یہ بھلا پہلے کیا پتا تھی۔ ثنا کی بچی بھی اوپر جا کر نیچے آنا بھول جاتی ہے۔ جا کر "ہو ہو ہا ہا" کرنے کا موقع خوب ملتا ہے نا۔ کیا ہاتھ سے نکل گیا۔ خیر! روحینہ کا بھتیجا بھی ہے۔ خوب صورت اور دولت مند۔ اور بھلا! عمر نے ثنا کو کیا دیکھا نہیں۔ مگر' گھر کی مرغی دال برابر۔ اب روحینہ سے بات کروں گی۔ اپنی بھابھی کو ثنا کے لیے راضی کرے۔ پہلے تو مائیں ہی بیٹے کے لیے لڑکی تلاش کرتی اور پسند کرتی ہیں۔ بہو کے ساتھ رہنا بھی تو ماؤں کو ہے۔ ان کا حق ہے۔ بہو پسند کرنے کا۔"

☼ ☼ ☼

... میں گم دادی کے پاس آ کر لیٹی۔ دادی بھی جاگ رہی تھیں۔ دونوں بیٹوں کے ساتھ کھانا کھا کر خوش تھیں۔ وہ جو اطلاع دینا چاہتی تھی' اس کے لیے ... تلاش کرنے لگی۔

"... چچا ابا آج بہت خوش تھے۔ ہیں؟ کتنا اچھا ... مجھ سے محتشم سے ملنے کی بات کر رہا تھا ... ملاقات ہو گئی۔ خوشی تو ہونی تھی۔ محسن ... گھر کیسا پر رونق ہو گیا تھا۔"

"دادی! میں چچا ابا کو خدا حافظ کہنے زینے تک گئی۔ کہنے لگے "آج عرصہ دراز بعد کھانے کا لطف آیا اور صائمہ کو انعام دینا چاہتا تھا۔ مگر وہ ڈانٹ نہ دے' اس ڈر سے چپ رہا۔ لو! یہ صائمہ کے انعام کی تم ہی مستحق ہو اور تمہارا انعام بھی مجھ پر قرض تھا۔ آج ہی ہشام نے بتایا کہ تم نے بی اے میں اول پوزیشن لی تھی۔ مجھے کسی نے بتایا نہیں۔" یہ کہہ کر زبردستی کچھ رقم میرے ہاتھ میں دے دی۔"

عالیہ نے کچھ نوٹ دادی کو دیے۔ "یہ تو بہت زیادہ ہیں۔ صائمہ سچ مچ خفا ہو گی اور محتشم بھی۔" دادی فکر مند ہو گئیں۔

"یہی تو سوچ رہی ہوں مگر دادی! میں اور غنیہ چچا ابا کو بتانے گئے تو تھے۔ وہ تھے نہیں اور میں نے چچی امی کو بتا دیا تھا اور محسن بھائی' احسن بھائی' ثنا سب کو خبر تھی۔ چچا ابا کو کسی نے نہیں بتایا۔ میرا کیا قصور ہے۔ ایسے انعام پر حق تو ہے دادی۔"

وہ اب خوش تھی۔ دادی کو بتا کر بوجھ ہلکا کر لیا تھا اور دادی جانتی تھیں۔ دونوں بہنیں خوشی خوشی چچا کو خوش خبری سنانے گئیں۔ وہ نہیں تھے تو چچی کو بتایا۔ وہ منہ ٹیڑھا کر کے طنزیہ ہنس کر بولیں۔

"واہ بھئی! مانگنے کے بھی خوب طریقے آتے ہیں تم لوگوں کو۔" دونوں فوراً واپس آ گئیں۔ رنجیدہ اور پشیمان۔

"میں نے پیسے لے کر ان کا شکریہ بھی ادا کیا تھا۔ اس وقت نہیں' مگر اب تو مجھے واقعی ضرورت تھی۔ ہیں نا دادی! یہ تو اللہ کی جانب سے امداد ملی ہے۔"

دادی پوتی کی وہ رات بہت سکون سے گزری۔ خوشی سے دن' اطمینان سے رات۔ بالکل احتشام صاحب کی طرح جو بستر پر لیٹ کر دیر تک گزری ساعتوں کو یاد کر کے مسکراتے رہے۔ بیوی کے غصے سے بے نیاز۔

پورا دن بہت اچھا گزار کر۔ سب کے ساتھ بہترین کھانا کھا کر پھر کشمیری چائے اور لطیفوں کے درمیان قہقہے لگاتے ہوئے ایک بار بھی کوئی فکر قریب نہ آنے

دی۔ بعد میں اپنی بے لطف زندگی کا خیال کرکے دکھ محسوس ہوا۔ مگر اسے بھی نظر انداز کر دیا۔ خوشیاں بہت دور نہیں۔ کبھی بھی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ امیدیں بہت طاقتور بناتی ہیں کسی بھی مایوس انسان کو۔ جب عالیہ نے ان کا ہاتھ تھام کر جذبات سے معمور آواز میں ڈبڈباتی آنکھوں بھرائے گلے سے کہا تھا۔

"چچا ابا! آپ کا شکریہ بھی کیسے ادا کروں۔ امی اور ابا تو ہرگز نہیں لینے دیتے، مگر مجھے آج واقعی اللہ کی رحمتوں کا شکر ادا کرنا ہے۔ کل میری فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔ اور ابا کے پاس مطلوبہ رقم نہیں۔ کیا یہ امداد منجانب اللہ نہیں؟"

کس قدر مشکور لہجہ اور مجبور انداز تھا۔ میں اتنا بے خبر کیوں رہا۔ شامی نے بتایا تھا کہ محتشم ایک سال بے کار بھی رہا۔ بہت تنگی سے وقت گزارا سب نے۔ عالیہ کا ایک سال کا نقصان ہو گیا۔ کالج میں داخلہ نہ ہو سکا۔ اماں نے کبھی بتایا نہیں۔ نہ جانے کیسے وقت گزارا ہو گا۔ اتنے قریب رہ کر میں اپنے بھائی سے بے خبر رہا۔ ہمارے مذہب میں تو پڑوسی کے بھی حقوق ہیں۔ میں ان کی ادائیگی سے قاصر رہا۔

اپنے گھٹنوں کے درد کے بہانے اوپر جانے سے کتراتا رہا۔ عرصہ دراز بعد شاہ کے آستانے پر گیا تو کتنی خوشی ملی۔ محبت، خلوص، اپنائیت، بے تکلفی کی فضا۔ محتشم کو کتنے لطیفے یاد ہیں اور کتنے لطیفے تو میں نے ہی اسے لڑکپن میں سنائے تھے اور وہ مجھے بتا کر شرمندہ کر رہا تھا۔ ارے! میں سب کچھ کیوں بھول گیا۔ اپنی خوش حال زندگی کے باوجود اور محتشم۔ فکر و پریشانی والے حالات کے باوجود ہنسنے ہنسانے کا کوئی موقع چھوڑتا نہیں۔ آج میں کتنا ہنسا ہوں۔

گھر میں کوئی نوکر نہیں مگر... اتفاق یکجہتی ہے۔ صائمہ پر کتنا بوجھ ہے۔ گھر کے کام۔ اماں کی خدمت۔ محتشم کو امید کی کرنوں کی نوید سنا کر ہمت بحال کرتے رہنا۔ مضبوط قوت ارادی، صبر و ضبط، تحمل اور محبت کی دولت سے مالا مال۔ محنتی عورت۔ اپنی کم نصیبی کے ساتھ۔ محتشم کی خوش نصیبی کا یقین ہو گیا۔

احتشام صاحب نے بھی بہت جدوجہد کی تھی۔ بہتر سے بہتر زندگی گزارنے کے لیے محنت بھی کی اور کچھ حالات سازگار تھے کہ ترقی ہوتی رہی۔ بہت کمایا اور بیگم نے بہت لٹایا۔ فضول خرچی کو وہ ضرورت سمجھتی تھیں۔ انہیں اپنی دولت اور خوشحالی کی نمائش کے لیے مواقع ملتے رہے۔

اللہ نے ہر طرح انہیں نوازا۔ اولاد، گھر، اعلا پوزیشن۔ مگر ایک شکوہ کہ بچے بھی ماں کے مقابلے میں باپ سے قریب تھے۔ ساری رازداری باپ سے۔ کبھی ماں سے کوئی فرمائش ہی نہیں کی۔ بچپن میں ماما سے کچھ مانگنے دو ٹالنے کے لیے کہہ دیتیں۔ "پاپا سے کہو!" بس پھر وہی روایت پڑ گئی۔

ثنا سب سے چھوٹی تھی۔ مگر بے حد معاملہ فہم۔ اس نے بھی باپ کے گلے کا ہار بننے میں اپنا فائدہ دیکھا۔ احتشام صاحب نے بہت دولت کمائی۔ وہ جانتے تھے اور کہتے بھی تھے کہ ان کی ترقی اماں کی دعاؤں اور کوششوں کا ثمر ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اماں ان ہی کے پاس رہیں۔ لیکن یاسمین کو ان کا وجود گوارا نہ ہوا۔

اماں نے بھی محتشم کے ساتھ رہنے میں عافیت سمجھی۔ ان کے پاس معقول بہانے تھے۔ محتشم کے بچے بہت چھوٹے تھے جب وہ رحیم یار خان کی فیکٹری میں ملازم ہوا۔ دس سال گزار دیے۔ پھر کسی فیکٹری میں کبھی کسی دوسرے شہر۔ پھر جب وہاں سے فارغ کر دیا۔ لاہور آئے تو سسرال میں قیام کیا اور کرائے کے مکان کی تلاش شروع ہوئی۔

احتشام صاحب کو جونہی خبر ملی۔ وہ ان سے ملنے گئے۔ محتشم کے سالے کا مکان بہت بڑا نہ تھا۔ خود فیملی اور ان کے سامان سے اثاث بھرا ہوا وہ گھر۔ اماں بھی بے چین نظر آئیں۔ انہوں نے محتشم سے کہا کہ وہ لوگ تین چار دن بعد ان کے گھر آ جائیں۔ اوپر کا پورشن خالی ہے۔ صفائی کروا کے وہ رہائش کے قابل ہو جائے گا۔

اماں کو وہ اپنے ساتھ ہی لے آئے۔ عالیہ دادی

ملنے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ اسے بھی لے لیا۔ راستے میں اماں نے دبی زبان سے پوچھ لیا۔

"یاسمین سے پوچھ لیتے۔ اسے اچھا نہیں لگے گا۔ میں نہیں چاہوں گی کہ تم میاں بیوی یا بھائیوں کے درمیان کوئی چپقلش ہو۔"

"اماں! گھر آپ کا ہے۔ میں، میری اولاد آپ کی ہے۔ یاسمین درمیان میں کہاں سے آ گئیں۔ میرے ہوتے ہوئے محتشم سسرال میں رہے۔ میرے لیے شرم کی بات ہے۔ اس کے علاوہ مجھے آپ کی شفقت اور دعاؤں کی بھی اشد ضرورت ہے۔"

حسب توقع یاسمین کے تیور بگڑ گئے اور جب وہ بار بار اماں سے کہتے۔

"آپ نے یہاں آنے کے بجائے موتی کی سسرال میں قیام کیسے گوارا کر لیا۔ آپ کو تو یہیں آنا چاہیے تھا۔ اپنے گھر۔"

یاسمین کے ہاتھ سے برتن یا جو بھی وہ پکڑے ہوتیں، پھسل جاتا۔ گلاس یا کپ گر کر ٹوٹ جاتے۔ دانت پیس کر رہ جاتیں۔ میاں کی خوشی ان سے دیکھی نہ جاتی۔

اگلے دن جب اوپر مزدوروں نے کام شروع کیا۔ ان کے استفسار پر مختصراً کہا۔

"کچن اور ایک واش روم بنوا رہا ہوں، ایک فیملی کے رہنے کے قابل۔"

"تو تمہیں کوئی کرایہ دار رکھنے کا پروگرام ہے۔ شکر ہے کہ میاں کو آمدنی بڑھانے کا خیال تو آیا۔"

ایک ہفتہ بعد جب محتشم کی فیملی آ گئی۔ انہوں نے کرائے کے لیے پوچھ لیا۔

"کیا محتشم کرایہ دے سکیں گے؟"

انہوں نے خشمگیں نظروں سے انہیں گھورا۔

"پاگل ہو؟ اتنا خود غرض سمجھا ہے؟ دراصل انہیں یہیں آنا چاہیے تھا۔ مگر آپ نے انسانوں سے زیادہ غیر ضروری فرنیچر کو جگہ دے رکھی ہے۔ گنجائش ہی نہیں رہی۔"

وہ دروازے پر تلملاتی چلی گئیں۔ ان کی تیوری کے بل گہرے ہونے لگے تو اماں اوپر چلی گئیں۔ ان کی خواہش کہ اماں ساتھ رہیں، یاسمین کی بدمزاجی کی نذر ہو گئی۔

اماں نے سمجھایا۔

"میرے لیے تم دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے احتشام! ایک ہی گھر ہے۔ نیچے رہوں یا اوپر۔ آتی رہوں گی۔ صائمہ بھی اکیلی کیا کیا کرے گی۔ میں کچھ مدد ہی کر دوں گی۔ وہاں فیکٹریوں میں تو کام کرنے والیاں مل جاتی تھیں آسانی سے۔ یہاں ابھی فوراً تو نوکر رکھنا بھی مشکل ہے۔"

جب تک اماں نیچے رہیں۔ یاسمین بلڈ پریشر کی بیماری میں مبتلا رہیں۔ بچے دادی کے گرد ہی بیٹھے پرانے قصے کہانیاں سنتے رہتے۔ پاندان سے سونف، ناریل کھانے کو ملتا۔

"تمہارے دادا کی تنخواہ میں مشکل سے گزارا ہوتا تھا۔ بڑا خاندان تھا۔ کسی کی شادی، کسی کی منگنی، بچوں کی بسم اللہ یا ختم قرآن پر آمین۔ دینے دلانے کا بہت رواج تھا۔ تو اس کے لیے سارا مہینہ بچت کر کرکے ہلکان ہو جاتی تھی میں۔ مگر کبھی اچانک ضرورت پر رقم گھر میں سے ہی نکل آتی۔ بس بیٹا! اللہ نے عزت قائم رکھی۔ مہنگائی ہے کہ بڑھتی جاتی ہے۔ پھر بھی عزت سے رزق حلال کی روٹی مل جاتی ہے۔"

"تو دادی! پھر ابا نے انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ وہ خرچ کہاں سے آیا؟ آپ نے اپنے زیور بیچے؟"

"نہیں! اللہ کی مہربانی۔ اللہ کی مدد۔" دادی ثنا کی بات پر مسکرا دیں۔

"آپ کے تو سارے کام اللہ کی مدد اور مہربانی سے ہو گئے۔ کیا دادا آپ کو کچھ نہیں دیتے تھے؟"

"سب کچھ اللہ دیتا ہے۔ پہلے بھی اب بھی۔" کس قدر مطمئن تھیں دادی۔ "اللہ سے جو مانگا، وہ مل گیا۔"

اماں کے اوپر چلے جانے سے وہ اداس ہو گئے۔ مگر پھر ہر چھٹی کے دن انہیں بلایا جاتا۔ کبھی کبھی صائمہ اور محتشم بھی بچوں کے ساتھ آ جاتے۔ پھر یاسمین کے موڈ کا اندازہ کرکے ان لوگوں نے یہ سلسلہ بھی کم سے

کم کردیا۔

اور اب تو کئی سال ہو گئے تھے۔ دادی بھی یہاں سے کوئی انہیں لانے جاتا تب آتیں۔ احتشام صاحب تو اوپر بہت کم جاتے تھے۔ وہ بیگم کے مزاج اور موڈ کو خوب سمجھتے تھے' مگر وہ اماں کا ہفتہ وار پروگرام ٹال نہیں سکتے تھے۔ برملا کہتے۔

"جب سے اماں کے قدم ان کے گھر آئے ہیں۔ کاروبار میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔"

اعتراف اور اقرار کے ان مواقع پر بیگم کے چہرے کے بنتے بگڑتے تیور ان کے تاثرات کو بخوبی عیاں کر دیتے' مگر اب انہوں نے پروا کرنا چھوڑ دی تھی۔

چھوٹے موٹے کئی واقعات ان کو سمجھا چکے تھے کہ ہر عورت نہ حساس ہوتی ہے' نہ ہمدرد' نہ دردمند' نہ صابر شاکر۔ کم از کم یاسمین ان خوبیوں سے دور ہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ایک روز محسن دادی کو لینے اوپر گیا۔ وہاں حسب سابق ناشتے میں شریک ہو گیا۔

"اور سنائیں' محترمہ عین غین سسٹرز! کیا مصروفیات ہیں؟ پی ایچ ڈی کرنے کا پروگرام ہے؟"

"ان شاء اللہ کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گی۔" عالیہ بے حد مطمئن تھی۔ "میں اپنے ابا کی بیٹی نہیں' بیٹا بن کر دکھاؤں گی۔ ان کے سارے خواب پورے کروں گی۔ اعلا تعلیم' بہترین جاب' ترقی۔"

"ترقی.... وہ بھلا کس قسم کی؟"

"ملک کے کسی اعلا ادارے میں اعلا عہدہ۔ اعلا کار کردگی۔"

"واہ بھئی! لمبے عزائم ہیں۔ کس اعلا ادارے کی اعلا عہدے داری کا ارادہ ہے؟"

"عدالت عظمٰی۔" نہایت وثوق سے جواب ملا۔

"یہ خیال کیسے آیا تم کو؟ ہمارے خاندان میں تو کوئی مرد بھی وکیل نہیں۔ لڑکیاں بھلا کیسے؟"

"لڑکیوں کے لیے یہ لائن بہت اچھی ہے۔"

"سب سے پہلا مقدمہ کس سے لڑو گی؟"

"آپ سے۔ تیار رہیں۔ اپنے حقوق کی جنگ لڑوں گی۔"

"حاضر ہوں جان و دل سے۔ کیڑا ہوں اگرچہ میں ذرا سا۔" محسن نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

جب اس نے ابا کو بتایا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ یاسمین حیران ہو گئیں۔ معترض بھی۔

"لو بھلا! لڑکی ذات' مردوں سے مقابلہ۔ ہے ہے۔ یہ اس پاگل کو کیا سوجھی۔ ڈاکٹری کر لیتی۔"

دادی بھی خلاف تھیں۔ مگر انہیں اس نے قائل کر لیا تھا۔ دراصل اس کی ٹیچر نے ادھر توجہ دلائی ہے۔ یہ کہہ کر کہ تم اس قدر دلائل سے بات کرتی ہو۔ بال کی کھال نکالتی ہو تو وکالت کیوں نہیں پڑھ لیتیں۔ بس پھر اس نے فیصلہ کر لیا۔

"جھوٹ بولنا پڑتا ہے دادی! یہ کامیاب نہیں ہو سکتی۔"

"جھوٹ بولنا مشکل نہیں اور آج کل تو جھوٹ بطور فیشن بولا جاتا ہے۔" یاسمین نے بھی رائے میں حصہ لیا۔

"امی! آپ بھی؟ بطور فیشن...." شا کہہ کر زبان دانتوں میں دبا کر بھاگی۔ یاسمین اس کے پیچھے لپکیں۔

محسن دیر تک سوچ میں گم رہا۔ کیا عالیہ اتنے دھڑلے سے جھوٹ بول سکے گی؟ کامیابی کیسے ملے گی؟

☼ ☼ ☼

نئی موٹر بائیک' تیز رفتار' بے آواز تھی اور پھر اپنی ملکیت کا احساس تو فخر و غرور بھی پیدا کرتا ہے۔ یونیورسٹی سے واپسی پر وہ بے حد مسرور تھا۔ ابا نے ایک پرانی خواہش پوری کر کے اسے بہت پر اعتماد بنا دیا تھا۔

ابا کے اس تحفے کی خوشی آخر کس سے شیئر کرے۔

"چلو! احسن کو تلاش کیا جائے۔ جل جائے گا۔ ثنا میں اتنی سمجھ نہیں کہ وہ اس بے پایاں مسرت کو محسوس کر سکے جو محسن کے اندر ابل رہی تھی۔ پھر ایک بس

اسٹاپ پر چچا نظر آئے۔ بڑے بڑے دو عدد شاپرز کے ساتھ۔

"ہائیں چچا!" وہ ان کے پاس آ کر رکا اور شاپرز اٹھانے لگا۔ وہ گھبرائے پھر اس کے چہرے پر نظر پڑی تو ہنس دیے کھسیانی ہنسی۔

اس نے دونوں شاپرز سامنے آگے رکھ لیے۔ "چلیے بیٹھیے۔"

"نئی لگتی ہے؟" وہ اس کی چمکیلی چکنی سطح پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

"جی چچا! آج ہی لے کر آیا ہوں۔ کیسی ہے؟"

"بہت شاندار' بے آواز۔ مبارک ہو۔ لگتا ہے' ہیلی کاپٹر ہے۔" "وہ بیٹھے۔ محسن خوشی سے پھول گیا۔

چند منٹوں میں وہ گلی میں پہنچ گئے۔ جہاں اوپر جانے کا راستہ تھا۔ محسن کے گھر کا گیٹ تو مین روڈ پر تھا۔ اوپر کا زینہ گلی میں بھی تھا۔ اندر بھی۔

دونوں شاپرز اٹھا کر وہ اوپر آ گیا۔ چچا کے "نہیں نہیں! میں اٹھاؤں گا۔ ارے بھئی" کے جواب میں اس نے چند قلانچیں بھریں اور چچی کے آگے دونوں شاپرز رکھ دیے۔

وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگیں۔ چچا کو آتے دیکھ کر سمجھیں کہ کیا معاملہ ہے۔ پھر سب کے "مٹھائی کھلائیں" کے جواب میں چچی نے مزے دار چائے کے ساتھ سوجی کا حلوہ کھلایا۔ اس دوران وہ عالیہ کو دیکھتا رہا' موٹی موٹی قانون کی کتابوں کے درمیان' کبھی کوئی کتاب کھولتی' کبھی کسی صفحے پر نظر جما دیتی۔

"اب بس کر دو۔ میں مستقبل میں تمہاری ناک پر موٹے شیشوں کی عینک لگا دیکھ رہا ہوں جو کہ مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔" مجبوراً" بول پڑا۔

عالیہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔ "کیوں؟ میری آنکھوں کی عینک سے آپ کے ہاضمے کو کیا تکلیف [illegible]"

"[illegible] لڑکیوں پر سوٹ نہیں کرتا۔"

"[illegible] خیال میں مجھ پر سوٹ کرے گا۔ بردباری [illegible] مزاج اچھا لگے گا۔"

"لڑکیوں کو سوٹ نہیں کرتا' قانون۔ اف! کتنا مشکل مضمون ہے یار! دفع کرو اسے۔"

"محسن بھائی! بہت لطف آ رہا ہے مجھے۔ شاید میڈیکل وغیرہ کسی میں اتنا مزا نہ آتا۔ یہ قانون کا علم تو جیسے زندگی کے ہزاروں شعبوں اور زاویوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اگر میں نے نہ پڑھا ہوتا تو کیسے پتا چلتا کہ عورتوں کے حقوق' مردوں کے فرائض دونوں کے درمیان انصاف کیسے ممکن ہے۔ یقین کریں۔ یہ لامحدود علم ہے۔ ہر قدم پر نیا مضمون۔ مختلف موضوع' ہزار رنگ کے پھولوں سے سجا گلدستہ۔ ہر پھول کی خوشبو جدا اور جس کے رنگ الگ۔ آپ پڑھ کر دیکھیں۔"

عالیہ بے حد پر اعتماد تھی۔ "پڑھنے اور سمجھنے سے ہی واقفیت ہوتی ہے۔ ہر علم کا یہی قانون ہے۔"

"بیٹا! تم سب کا علم محدود ہے ان کتابوں تک۔ اگر آپ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں تو محسوس ہو گا کہ لامحدود علم کیا ہے۔ اگر دنیاوی علم ہزار رنگ کے گلدستے جیسا ہے تو قرآن کروڑوں رنگ اربوں کھربوں خوشبوؤں سے مزین ایسا علم ہے جو انسان کو کبھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ گمراہ ہونے سے بچاتا ہے۔ حقوق و فرائض' انصاف اور عدل' کس نے یہ علم' یہ احساس دیا؟ قرآن نے۔"

محتشم سنجیدگی سے ان کی باتوں کے درمیان بول اٹھے۔ دونوں کا سر جھک گیا۔

"بے شک ابا!" عالیہ شرمسار ہو گئی۔ "مگر' اب دنیاوی علم کا حصول ترقی کا ضامن ہے۔ تو کیا کریں۔ ہمیں انہی کسی علم میں سے ایک کو منتخب کرنا پڑتا ہے۔"

"بیٹا! میں تو بس یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ جسے آپ لامحدود سمجھ رہے ہیں۔ وہ دراصل محدود ہے۔ لامحدود تو قرآن کا علم ہے۔ جہاں وہ سب ہے جو تمام دنیاوی علوم کا محور و منبع ہے۔"

چائے کے ساتھ بھی چچا اسے دینی علوم کے بارے میں بتاتے رہے۔ محسن کو محسوس ہوا کہ چچا کی واقفیت اور علم بہت وسیع ہے اور دین سے شغف بھی ہے۔

اس دن کے بعد سے روزانہ انہیں ان کے آفس

سے لانے کا ذمہ لے کر انہیں مشکور بھی کیا اور خود اپنی دینی معلومات میں اضافہ بھی۔ جس کا علم یاسمین کو تو نہیں' محسن اور ثنا کو تھا۔

اس دوران وہ چچا کے مالی حالات' ان کے گھر کے مسائل' غالیہ کی مصروفیات' پڑھائی کے علاوہ گھر کے کام' شام کا پڑھائی کے دوران چند بچوں کو ٹیوشن دینا۔ اس کے حساس اور ذمے دار ہونے کا پتا چلا۔ ان کے گھر میں ماں' باپ' بہن بھائی دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے ہمدرد' شیر و شکر' دادی کی خدمت اور فرماں برداری' غرض امن و سکون' صبر و قناعت کا گہوارہ۔

چچا کی آمدنی کم [illegible] ان سے کوئی شکوہ نہ سنا۔ محسن کو خیال آتا۔ یہاں تو مقابلے کا رجحان تھا ہی نہیں کسی کو۔ فلاں کے پاس وہ چیز ہے ہمارے پاس نہیں۔ اس احساس کا فقدان تھا۔ کیا بادشاہ لوگ ہیں۔ چچا بس میں آتے جاتے تھے۔ اب بھی ضد کرتے۔

"ارے بابا! یہ بسیں ہم جیسوں کے لیے ہیں۔ تم اپنا وقت ضائع نہ کرو۔"

"مگر یہ میری موٹر سائیکل کس کے کام نہ آئے تو مجھے تو بہت شرم آئے گی چچا!"

☆ ☆ ☆

دو ہفتوں سے دادی نیچے نہیں آرہی تھیں۔ ثنا آکر بتاتی۔

"دادی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

اس بار احتشام صاحب خود چلے گئے۔ اماں کی طبیعت بھی پوچھنی تھی۔ بلکہ ان کو دیکھنا مقصود تھا اور ایک خوش خبری بھی سنانی تھی۔ اماں کو کمرے میں کریلے چھیلتے دیکھ کر اطمینان ہوا۔

"السلام علیکم اماں! میں تو پریشان تھا کہ آپ شاید زیادہ بیمار ہو گئی ہیں۔" انہوں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں! بلڈ پریشر کا کچھ قصہ تھا۔ پتا نہیں کم تھا کہ زیادہ۔ احتیاط کر رہی تھی بس۔"

"تو... آج بھی چلیں گی... یا ہیٹ ٹرک کریں گی؟ احتیاط کی ہیٹ ٹرک۔"

"بس بھیا! یہ بڑھاپا جو ہے' احتیاط چاہتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کسی کو میری وجہ سے تکلیف پہنچے۔"

"آپ احتیاط کو پس پشت ڈالیں اور ہمت کو آواز دیں۔ کیونکہ آپا آرہی ہیں اور جتنے دن وہ میرے گھر رہیں گی۔ آپ کو وہیں رہنا ہوگا۔ ایک مہینہ۔ اماں! آپ کو میرے گھر رہنا ہوگا۔ بچے بھی آرہے ہیں۔ لطف رہے گا۔"

"بیٹا! نفیسہ آپ کے' میرا کیا ہے۔ یہیں رہوں گی۔ مل آجایا کروں گی۔ وہ بھی خود سب سے ملنے آجائے گی۔ میں نہیں چاہوں گی۔ ان دنوں کوئی چپقلش ہو۔ یاسمین بھی اکیلی سب کی مدارات... نفیسہ کے سامنے میرا بھرم رہے۔ جسے میں نے اب تک مشکل سے سہی قائم کیا ہوا ہے۔ نفیسہ یہاں بھی دو چار دن رہ لے۔ ہمارا بھی حق ہے۔ یاسمین کسی امتحان میں نہ پڑے۔ یہ چاہتی ہوں۔"

اماں نے لجاجت سے درخواست کی تھی۔ احتشام صاحب نے ماتھے اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ گردن اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر مضمحل ہو کر بیٹھے۔

"اور آپ کو میری خوشی' میری خواہش کا خیال نہیں؟ گھر میں رونق اور برکت کے لیے آپ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔ اماں! میرے بس میں ہوتا تو تم کو بھی اپنے ساتھ رکھتا۔ کیا چھوٹے گھروں میں کئی کئی فیملیاں رہتی نہیں ہیں؟ مگر یاسمین کا دل بہت تنگ ہے۔ نہ ان کے دل میں جگہ ہے نہ گھر میں گنجائش۔ کسی بھی بدمزگی سے بچنے کے لیے یہ تو [illegible] فیصلہ کیا ہے کہ محتشم کم از کم قریب تو رہے۔" بہت اداس اور مضمحل ہو رہے تھے۔

"اچھا خیر! دل برا نہ کرو۔ مجھے بھی تم سے ایک بات کہنی تھی۔" وہ کچھ ہچکچائیں۔

احتشام صاحب نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"جی اماں! کہیے۔"

"سوچ رہی ہوں' برا مانو گے۔ اسی ڈر سے ابھی تک

[illegible] میں دبائے بیٹھی ہوں۔"

"ایسی کیا بات ہے؟ آپ بلا جھجک کہیے۔ چلیے میں وعدہ کرتا ہوں' برا نہیں مانوں گا اب؟"

"وہ ایسا ہے کہ محتشم کے مالی حالات بھی اب بہتر ہو گئے ہیں... تو اس نے مجھے کچھ رقم دے کر کہا کہ میں تمہیں دے دوں۔ خود اس میں ہمت نہ تھی تمہیں دینے کی۔"

"کیسی رقم؟"

"بھائی' میں یہاں لا کر تم نے جو احسان کیا ہے' تو وہ کہتا ہے' ہم کہیں بھی رہتے کرائے کا گھر ہوتا۔ تو اب کئی سال ہو گئے ہیں۔ اب اس قابل بھی ہیں کہ کرایہ دے سکیں۔ احتشام"

اماں ان کو کھڑا ہوتا دیکھ کر گھبرائیں۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور ہونٹ کلٹ رہے تھے۔

"بس اسی لیے تو اب تک کچھ کہا نہیں۔ بیٹھو!" ہاتھ پکڑ کر بٹھایا۔

"اب میں' محتشم سے کرایہ لوں گا؟ یہ ہے میری قدر اس کے دل میں۔ الٹا اس نے یہاں آکر مجھ پر احسان کیا۔ میرا گھر آباد ہو گیا۔ میرے دل کو کتنی تقویت ہوتی ہے یہ سوچ کر کہ میں اکیلا نہیں ہوں۔ بھائی ساتھ ہے۔ اور گھر... کیا اس کا نہیں؟ پھر [illegible]۔"

"خیر' وہ رقم میرے پاس ہے۔ اسے کچھ بتایا نہیں۔ جب بھی گھر میں بچوں یا صائمہ کو کچھ ضرورت ہو' اس امانت سے نکل کر دے دیتی ہوں' یہ کہہ کر کہ احتشام مجھے دیتے ہیں۔"

"بہت اچھا کرتی ہیں آپ۔ اسے یہی سمجھنے دیجیے کہ میں نے کرایہ وصول کر لیا۔ اس طرح کچھ رقم آپ کے پاس جمع ہوتی رہے گی۔ بلکہ میں اس سے کہوں گا۔ 'یار! مہنگائی تو دیکھو کتنی ہو گئی ہے۔ اب کرایہ بڑھاؤ۔'" کہہ کر ہنس دیے۔ اماں کے دل پر پڑا [illegible]۔

"[illegible] چل رہی ہیں میرے ساتھ؟ یا آپا کے آنے پر ہی؟ اچھا! سوچیں نہیں۔ میں بھی آج کریلے کھانے کے موڈ میں ہوں۔ صائمہ کے ہاتھ کے۔ آپ نہیں جا رہیں۔ میں تو رہ سکتا ہوں آپ کے پاس۔"

عین کھانے کے وقت ثنا' محسن' احسن بھی پہنچ گئے۔

غالیہ نے تجرباتی طور پر کوئی خاص ڈش بنائی تھی۔ ثنا کو اسی نے بتایا تھا۔

ان کی ماں [illegible] جز بز ہوتی رہیں۔ جب لمبی میز کے گرد چھٹی کے دن انہیں [illegible] کھانا کھانا پڑا۔ محسن' احسن جانتے تھے۔ نیچے جا کر انہیں کیا کچھ سننا پڑے گا۔

"بھوکے قحط زدہ گھر میں کھانے کو نہیں ملتا۔ اسی لیے جہاں دیکھی توا پرات' وہیں گزاری ساری رات۔"

اور احتشام صاحب کا جواب بھی انہیں معلوم تھا۔

"رات نہیں بیگم! دوپہر کہیے۔"

"ہمارے گھر میں تو ہر کھانے کا ایک ذائقہ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ قورمہ' کباب یا پلاؤ۔ مرادن کو کچھ سکھا دیں امی! یا خود بھی کبھی کوئی نئی ڈش بنا لیا کریں۔ چائنیز' اطالوی یا۔"

"جو مرادن کو آتا ہے' وہی بناتی ہے۔ فضول نخرے اور کل آپا کے آنے پر جو کھانا بننا ہے۔ اس کے بارے میں ابھی سے بتا دو۔" وہ چڑ گئیں۔

"وہ لوگ تو امریکہ سے آرہے ہیں۔ انہیں جس طرح کے کھانے پسند ہوں گے' وہ آپ کی مرادن نہیں بنا سکے گی۔ امی! کوئی خانساماں رکھ لیں۔ کوئی غیر ملکی ڈشز بنانے والا۔"

"چپ رہو۔ وہ لوگ یہاں کے کھانوں کے ترسے ہوئے ہوتے ہیں۔ سب کھا لیتے ہیں۔ ان کے زیادہ نخرے ہوتے بھی نہیں۔ تم لوگوں کی طرح اور اپنی بہن سے بھی کہو' کچھ سیکھ لے۔"

"واقعی' کم از کم چچی سے کریلے پیاز کی ترکیب' غالیہ سے اٹالین چکن' اور سنگاپوری رائس جو اس دن غالیہ نے بنائے تھے اور افغانی کباب۔"

"ویسے بھائی! عالیہ قانون کی طالبہ ہے یا کوکنگ کی' بہت مزے کی چیز بناتی ہے۔ کیا اپنے چیمبر میں وکیلوں کو کوکنگ پر لیکچر دیا کرے گی؟" احسن کا ذہن اس دن عالیہ کے بنائے سنگاپوری رائس میں اٹکا ہوا تھا۔

"تم لوگ اب اوپر والوں کا ذکر چھوڑو۔ نیچے بھی آ جاؤ۔" یاسمین کی برداشت بس اتنی تھی۔ "میں کل ہی کتاب لاؤں گی ثنا اس میں دیکھ کر سیکھ لے گی۔ پھر بنایا کرے گی۔"

"کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ انٹرنیٹ پر سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے مگر امی کو میرے کچن میں داخلے پر کچن کی گندگی' بکھیڑا' فضول برتنوں کا استعمال وغیرہ وغیرہ پر اعتراض ہوتا ہے۔ بھئی! اچھی چیزیں بنیں گی تو بکھیڑا ہوگا۔ گندگی ہوگی تو صفائی بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارا کچن اس لیے زیادہ صاف رہتا ہے کہ وہاں کچھ نیا بنتا ہی نہیں۔ وہی چند مسالے' وہی چند چیزیں۔۔۔ اُفوہ! کہاں پھنس گئی۔ مجھے پڑھنا بھی ہے۔ اور ہاں امی! ابا نے چچا کی فیملی کو کل دوپہر کے کھانے پر بلا لیا ہے اور چچی نے رات کو ہم سب کو مع پھپھو کی فیملی کے بلایا ہے۔"

ثنا انہیں خبر دے کر رفوچکر ہو گئی' یاسمین پر ایک اور بوجھ گرا کر۔

"چلو جی! یہ اور ستم ہوا۔ وہ تو ایک وقت کا کھانا کھلا کر سستی چھوٹیں۔ یہاں مرادن اکیلی۔۔۔ کیا کیا پکائے گی اور کتنا۔ آپا کی آمد کے ساتھ میرے ہاتھ پیر پھول جاتے ہیں اور نوکر تک بیزار ہو جاتے ہیں۔ ہم بھی بھگتیں گے مہینہ بھر۔" نئی پریشانی۔

"اچھا۔۔۔ میں آپا سے کہہ دیتا ہوں' وہ نہ آئیں۔ مجھے روز یہی سننا پڑے گا۔" احتشام صاحب جو ابھی تک خاموش تھے' بول پڑے۔ "سات سال تک نہیں ملا کوئی بات نہیں۔ مروں گا تو آ کر دیکھ لیں گی۔" شدید غم اور غصہ تھا لہجے میں۔ یاسمین سٹپٹا گئیں۔

"اُفوہ! ایسا ستم بھی نہیں ہے۔ اصل میں غصہ تو ان سب پر ہے۔ سب نے اوپر جا کر کھانا کھا لیا۔ یہاں جو بیچارا ہے' اس کا کیا ہوگا؟"

"چلیے! رات کو کھا لیں گے۔ آپ کی بچت' مرادن کے عیش۔" احسن نے ہاتھ جھاڑے۔

"اور آپ تو اماں جان کو بلانے گئے تھے۔ کیوں نہیں آئیں؟ کافی دن ہو گئے۔" یاسمین نے بات بدلی۔

"ہاں! انہوں نے کہا' کل سے مہمان داری شروع ہو جائے گی۔ وہ اوپر ہی رہیں گی تاکہ آپ کا بوجھ کم ہو۔ ان کی وجہ سے مزید کام بڑھ جائے گا۔ آپا ان سے وہیں مل لیں گی۔"

یاسمین نے شکر ادا کیا۔ آپا سے تو انہیں بہت سی امیدیں تھیں۔ چار بیٹوں کی ماں۔ جب آتیں' سب کے لیے خوب قیمتی تحائف لاتیں۔ ہر بار وہ یا تو اکیلی یا کسی ایک بیٹے کے ہمراہ ہوتی تھیں۔ پہلی بار چاروں بیٹے آ رہے تھے۔ خاطر خواہ مدارات کی فکر میں غلطاں تھیں۔

احتشام صاحب کئی سال سے انہیں نہیں مل سکے۔ خوش خوش آئیں اور خوش خوش واپس جائیں۔ اسی میں ان کی (یاسمین کی) عافیت تھی۔ ورنہ احتشام صاحب کا مزاج توبہ توبہ! دل میں مہینہ بھر کے کھانے پینے کا حساب کرتے ہوئے اوسان خطا ہو گئے۔

☆ ☆ ☆

اور پھر اگلی صبح۔۔۔ وہ آ گئیں۔ چار بیٹے' پانچ چھ سوٹ کیس' بیگ علیحدہ' عجب ہلچل سی تھی۔ احسن' محسن گھر میں تھے۔ یک لخت چھ جوان لڑکوں کی آوازوں' قہقہوں سے گھر گونجنے لگا۔ قہقہے' شور' سوالات' احتشام صاحب تو بہن سے لپٹے بیٹھے تھے۔

یاسمین ادھر ہی چلی گئیں۔ ساتھ بیٹھ کر اخلاقاً خوشی کا اظہار کیا۔ لڑکے تو سب لمحوں میں بے تکلف ہو گئے۔ ثنا ان لڑکوں کی انگلش لہجے میں اردو سن کر چھپا کر ہنستی رہی۔ پھر دوڑی زینے کی طرف۔ عالیہ کو تفصیل بتا کر ہنسایا۔ وہ لوگ رات کھانے پر [illegible] ہی کر رہی تھیں۔

"سنو ثنا! آج دوپہر کو کیا بن رہا ہے؟ چچی امی سے پوچھ لو۔ میں نیچے آ کر کچھ بنا دوں یا کوئی اور مدد ہو تو۔"

ثنا نے حیرت اور خوشی سے اسے دیکھا۔ امی ان لوگوں سے کس قدر بدظن ہیں اور یہ۔

"نہیں جی! آپ اپنی مدد خود کریں۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے ماموں لوگ دوبئی گئے ہیں۔ ایک ماہ کے ٹور پر۔ ان کا خانساماں مل گیا ہے۔ وہ ہر قسم کے کھانے بنا لیتا ہے۔ آج صبح ہی نزول ہوا ہے ان کا۔ آمد ہستی کا۔ آتے ہی پہلا کام میز لگانے کا کیا۔ چائے بنا کر پلائی۔ اب لگتا ہے اپنی کارکردگی کا جوہر دکھانے۔ مرادن دیسی کھانے وغیرہ بنائے گی۔"

ثنا دادی کو ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر انہوں نے محتشم کے ساتھ آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ مگر ثنا پیچھے پڑ گئی۔ آخر وہ دادی اور عالیہ کو نیچے لانے میں کامیاب ہو گئی۔

عالیہ تعارف کے بعد چپ چاپ چچا کے پاس بیٹھ گئی۔ نانی نواسوں کی جذباتی ملاقات' شدت کی محبت کا اظہار۔ کوئی گردن سے لپٹ گیا تو دوسرا ٹانگوں سے۔ ایک نے نانی کی گود کو آغوش مادر سمجھ کر ادھر ہی قدم رنجہ فرمانے کو ترجیح دی۔ تو ایک ان کو چٹاچٹ چومنے میں مصروف۔

بالآخر پھپھو نے بیٹوں کو ڈانٹ کر تمیز سے بیٹھنے کو کہا۔

"[illegible] سوچ رہی ہوں گی کہ یہ مخلوق کسی پاگل خانے سے آئی ہے۔"

ثنا منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔

"یا پاگل گھر سے۔" پھپھو نے جملہ پورا کیا۔

پھر صائمہ اور محتشم کے آنے کے بعد وہی سین دہرائے گئے۔ محتشم بھانجوں سے پوچھتے رہے۔ کون کیا کر رہا ہے۔ کیا پڑھ رہا ہے۔ ماحول اچھا بھی تھا اور محفل بھی بے تکلف۔ دلچسپ اور پرلطف۔

بے حد بھرے محفل جمی۔ مہمان لڑکے اپنی نیندیں پوری کرنے کے لیے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ پھپھو جہاز میں سوتی ہوئی آئی تھیں۔ صائمہ اور محتشم سے باتیں کرنے لگیں۔

احتشام صاحب بے حد خوش تھے۔ لڑکیاں اوپر چلی گئیں۔ انہیں رات کے کھانے کی تیاری کرنی تھی۔ پھپھو کے بیٹے جڑواں تھے۔ رامس اور اریج پھر واعظ اور حافظ۔

آتے ہی یہ اطلاع ملی کہ اس بار وہ رامس اور اریج کی شادی کر کے جائیں گی۔ ایک مہینے میں سب کچھ۔

"پھپھو تو ہتھیلی پر سرسوں جمائیں گی۔ اتنی جلدی میں کون اپنی بیٹی دے گا؟" عالیہ کو فکر ہوئی۔

"اوہو بھئی! امریکہ' کینیڈا کے رہائشی کے لیے سب لڑکیاں پیش کر دیں گے۔" ثنا سنجیدہ تھی۔

"لو! بغیر کچھ معلوم کیے؟ ایسے کون سے ماں باپ ہوں گے؟" عالیہ منہ سکوڑ کر رہ گئی۔

"ہمارے ماں باپ۔" ثنا پھر بردباری سے بولی۔ عالیہ' عالیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تو اور کیا! امی کو شاید پھپھو نے بتا دیا تھا پہلے ہی۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ میں نے کہا۔ میں پہلے دیکھ لوں' پھر سوچوں گی۔ امی نے کہا۔ سوچنے کی گنجائش نہیں ہے۔"

عالیہ گھبرا کر بولی۔ "تو۔۔۔ کیا تم کینیڈا چلی جاؤ گی یا امریکہ؟ ایک لڑکا تو کینیڈا میں بھی ہے۔"

"پھپھو نے کہا تو تم انکار کر دو گی کیا؟" ثنا نے الٹا سوال کیا۔

"تم اکلوتی ہو۔ اکلوتی بیٹی کو چچا تو شاید اتنی دور نہ بھیجیں۔" عالیہ نے گردن ہلائی۔

"دور نزدیک کیا ہے؟ اگر رشتہ اچھا ہو' کون انکار کر سکتا ہے۔" ثنا بے حد مطمئن چاول دھوتی رہی۔

"خیر بھئی! میں تو اپنے والدین' دادی اور بہن بھائیوں کی دوری برداشت نہیں کر سکتی۔"

عالیہ جلدی جلدی سبزی کاٹ رہی تھی۔ "تم بہت بہادر ہو شاید۔ یار! تمہیں اپنے ماں باپ سے محبت نہیں ہے' جو امریکہ جانے پر راضی ہو؟"

"میرے ماں باپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے کیا؟" ثنا پھر سوال بنی۔ "پھر وہ کیوں راضی ہوئے؟ بات ہے ساری معاشی' اقتصادی اور روشن مستقبل کی۔ آیا سمجھ میں؟"

"پھر بھی میں تو کبھی اتنی دوری برداشت نہیں کر سکتی۔ امی ابا' دادی اور ہشام۔"

"اچھا اور میں؟ میرا نام نہیں لیا؟" عالیہ برا مان گئی۔

"میرا مطلب پوری فیملی سے ہی تھا اور مجھے تو تعلیم پوری کر کے ابا کا دست و بازو بننا ہے۔ یہ میرا خواب ہے اور اس سے دستبردار میں نہیں ہو سکتی۔" عالیہ حتمی انداز میں بولی اور مرغی کے گوشت کا تیا پانچہ کرنے لگی۔

"اکثر خوابوں کی تعبیر الٹی ہوتی ہے۔" ثنا چاول دھو کر فارغ ہو گئی اور عالیہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ "اور مجھے یقین ہے کہ تم وہ پہلی خاتون ہو گی جو اپنے ابا کی خواہش پر سب سے دور جانے کو تیار ہو گی۔ اب بتاؤ! کیا چچا تم سے محبت نہیں کرتے جو وہ خوشی خوشی جدائی کے لیے تیار ہوں گے؟"

"اول تو پھوپھو مجھے یا عالیہ کو پسند کریں گی ہی نہیں ہم غریب غربا لوگ اتنی اونچی چھلانگ لگا سکتے ہیں نہ ایسے شاہانہ خواب دیکھتے ہیں۔ پھوپھو اپنی حیثیت اور بیٹوں کے مرتبوں کے حساب سے بہو منتخب کریں گی۔ دوسرے یہ کہ... ابا بھی مجھ سے دور ہونا پسند نہیں کریں گے۔ خواہ کوئی بادشاہ یا شہزادہ ہی نہ ہو۔"

"یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے عالی آپی! اقتصادی اور خاندانی بھی۔ ایسا رشتہ' خوش قسمتی سے ملتا ہے۔ نہ پوچھ کچھ' نہ جستجو' نہ فکر... محبت اور خلوص کے پیمانے بھی اس میں شامل کر لو۔"

"بس ایچر لگتا ہے ثنا گئی۔" عالیہ نے ہنس کر عالیہ کو دیکھا۔ "چلو جی! پیشگی مبارکباد۔"

"جی! آپ ہم میں بڑی ہیں۔ باری آپ کی ہے۔"

"خیر! میں بتا رہی ہوں کہ میں اپنے گھر والوں سے ہی کیا' چچا ابا سے بھی دور ہونا پسند نہیں کروں گی۔"

"بڑے بول نہ بولیں۔ نہ جانے نصیب ہمارے کہاں کہاں لے جائیں گے۔ کیا پتا تنزانیہ' کینیا یا سوڈان میں ہماری قسمت کا ستارہ چمک رہا ہو۔" ثنا بہت بزرگ بن رہی تھی۔ عالیہ ہنس دی۔

"پھر وہ ستارہ نہیں' چاند ہو گا۔ چودھویں کا گرہن زدہ۔"

عالیہ نے چولہا جلایا۔ رات کے کھانے کی تیاری کا آغاز۔ چولہے سے ایک چنگاری نکلی۔ پھر نیلی روشنی نے اپنا جلوہ دکھا کر حرارت پھیلا دی۔

☆ ☆ ☆

شام تک نیند میں پوری کر کے سب اوپر آ گئے۔ محسن نے آتے ہی عین غین سسٹرز کی کارکردگی چیک کی۔ مطمئن ہو کر وہ بھی مہمانوں کے پاس چلا گیا۔

دادی کے کمرے میں سب نے ڈیرے جما لیے۔ جگہ کم تھی۔ لڑکیاں برآمدے میں کھانے کی کرسیوں پر جا بیٹھیں۔ لڑکے صحن میں آ گئے۔ نہ جانے کیا کیا قصے تھے جو وہ سنا رہے تھے اور محسن' احسن اور ہشام منہ دبا کر ہنسی روک رہے تھے۔

"یقیناً" یہ اپنی گرل فرینڈ کے قصے سنا رہے ہیں۔" ثنا نے چپکے سے کہا۔ "چلو! سنتے ہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں۔" عالیہ نے ڈانٹا۔ "بری بات ہے۔ چلو! کچن میں... وہاں ہماری زیادہ ضرورت ہے۔"

رات کو چچی امی کے آنے کے بعد میز پر کھانا رکھ دیا۔ صحن میں ایک چوکی بھی رکھ دی گئی تاکہ اس پر بیٹھ کر کھایا جا سکے۔ یاسمین ناگواری سے انتظام دیکھ رہی تھیں۔ بلند آواز سے بولیں۔

"اب اتنی گنجائش گھر میں نہیں تو کیا ضرورت تھی سب کو بلانے کی؟ آپا اور ان کے بچے آ جاتے۔"

"اور ہمارا کیا قصور تھا کہ ہم..." احسن نے بیچ میں زمین پر مارا۔ یاسمین نے اسے گھور کر دیکھا۔

"جگہ تو دل میں ہونی چاہیے۔ کیوں آپا؟" اقتدار صاحب نے نفیسہ کی طرف دیکھا۔

"بے شک! مجھے معلوم ہے' یہاں سب کے دل بے حد کشادہ ہیں۔ کھانے کے لیے کسی بات کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ رزق کی بے ادبی ہوتی ہے۔ ہم بڑے میز کے گرد کرسیوں پر کھائیں گے۔ بچے اپنا کھانا صحن میں لے جا کر کھا سکتے ہیں۔"

ابا نے بردباری سے سمجھایا۔ کھانے کے بعد کشمیری چائے کی تیاری کے لیے عالیہ اور ثنا کچن میں گھس گئیں۔

سب لوگ دادی کے کمرے میں چائے پی رہے تھے۔ صائمہ برتن سمیٹتے ہوئے چپ چپ اور متفکر سی تھیں۔ پھر عالیہ ان کا ہاتھ بٹانے آ گئی ۔۔۔ مہمان رخصت ہو گئے اور سارا شور ہنگامہ ساتھ لے گئے۔ ثنا کو یاسمین زبردستی پکڑ کر لے گئیں۔ عالیہ ان کے انداز پر مسکرا دی۔

"امی! یہ پھپھو کے بیٹے آخر کس دنیا کی مخلوق ہیں۔ کتنا بولتے ہیں اور بے تکلفی ۔۔۔ اُف نہ زبان رُکتی ہے نہ ہاتھ' نہ پیر' ادھر سے ادھر' کسی سے کباب چھینا' کسی کے ہاتھ سے سلاد اچکی۔ چائے کی بھری پیالی کس مہارت سے اس ہاتھ سے اس ہاتھ سروں کے اوپر ہی اوپر چھین لی گئی۔ یا خدایا مجھ سے تو کھانا بھی نہیں کھایا گیا اور جب میں نے انہیں بدتمیز کہا تو دادی نے پتا ہے کیا کہا؟ بولیں۔

"یہ آزاد معاشرے کے پلے ہوئے ہیں۔ آزادی ان کی روح میں شامل ہے۔ یہاں کے تکلفات اور شریفانہ طرز عمل سے واقف نہیں۔" اوپر سے پھپھو نے انہیں چھوٹ دی ہوئی ہے۔ یہ میرا اپنا نظریہ ہے۔"

عالیہ ان کی آزاد فطرت سے پریشان تھی۔ آزاد معاشرے کے آزاد ذہن' مگر روح تو پاکستانی ہونی چاہیے۔ کبھی کبھار آتے ہیں تو انہیں یہاں کی معاشرت کا خیال ہونا چاہیے۔ میرے کندھے پر کہنی ٹکا کر بولے "مس! آپ کو بولنا نہیں آتا۔" توبہ' توبہ! اگر ابا نے یہ منظر دیکھ لیا ہوتا۔ میں تو وہیں فوت ہو جاتی۔"

عالیہ کو ان لوگوں کی بے تکلفی ہضم نہیں ہو رہی تھی۔ عالیہ نے سمجھایا بھی۔

"دیکھو! پہلی بات یہ کہ وہ عرصہ دراز کے بعد سب ایک ساتھ آئے ہیں۔ قدرتی طور پر خوش بھی ہیں۔ دوسری بات میں سمجھتی ہوں کہ ہم بہن بھائی بھی چار بھائی ہوتے' ٹوئنز ہوتے۔ ان ہی کی طرح شرارت' ذہانت اور خود سری سے مالا مال ہوتے۔ بس! اتنا ضرور ہوتا کہ مجبور قوم کے فرد کی حیثیت کا احساس اتنی آزادی کی اجازت نہ دیتا۔ یہ لوگ ۔۔۔ پھر بھی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ بلکہ صرف اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ رویے مختلف سہی۔ قدرتی طور پر شریف تو ہیں۔ ان کی آنکھیں دیکھو۔ بے لوث اور پاکیزہ ہیں۔"

عالیہ کم عمر ہونے کے باوجود بہت حساس تھی۔ دونوں بہنیں بہت محتاط طبیعت کی تھیں۔ حالات نے انہیں مجبور کر دیا تھا' کمزور نہیں۔ وہ عام لڑکیوں کی مانند من مانی' خود سری سے گریز کرتی تھیں۔ انہیں ماں باپ کی توقعات پر پورا اترنے کا خیال رہتا تھا۔ وہ ہر قسم کے حالات سے سمجھوتا کر لیتی تھیں۔

انہوں نے بہت اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ جب ان کے باپ کی بہت اچھی ملازمت تھی۔ عزت بھی اور گھر میں خوش حالی کا دور دورہ بھی تھا۔ بہت بے فکری کا زمانہ تھا۔ پھر حالات بدلنے لگے۔ احتشام کی صحت گرنے لگی۔ زیادہ محنت نے کمزور کر دیا۔ یکے بعد دیگرے ملازمتیں چھوٹتی چلی گئیں۔ انہیں واپس آنا پڑا۔

دادی کی ذات کی برکت' ان کی دعائیں' پرشفقت سایہ' صائمہ کے صبر و ضبط اور ہر حال میں راضی بہ رضا رہنے کی فطرت بچوں پر بھی اثر انداز تھی۔ ان کی تربیت نے بچوں کو اللہ پر بھروسا کرنا سکھایا تھا۔ یہی بھروسا انہیں ہر مشکل کو آسان کرنے کا نسخہ نظر آتا۔ قدرتی ذہانت نے انہیں بے حد پرعزم بنا دیا تھا۔

عالیہ باپ کا دست و بازو بننے کا مصمم ارادہ لے کر محنت کر رہی تھی۔ عالیہ کو ماں کی مدد' دادی کی خدمت کا

[خیا]ل رہتا۔ ہشام بھی بہنوں سے کم نہ تھا۔ تعلیمی لحاظ سے بھی اور فرماں برداری میں بھی۔ ماں باپ کی ہمت' صبر و ضبط اور کوششوں سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

پھپھو کبھی نیچے' کبھی اوپر' کبھی کسی سسرالی عزیز کے گھر۔ کبھی کسی رشتے دار کے پاس وقت گزارتی تھیں۔ وہ منکسر المزاج' نرم اور پرخلوص بھی تھیں۔ خوش سائمہ کی بے دریغ تعریف' صائمہ کے صبر و تحمل کی مثالیں' کم آمدنی میں گزارا کرنے' چھوٹے سے گھر میں سلیقے اور خوش اسلوبی سے رہنے' وہ سب سے بڑھ کر ملنساری کا رویہ۔

یوں تو اور بھی لوگ معترف تھے مگر پھپھو کی بات الگ تھی۔ وہ جب احتشام صاحب اور یاسمین کے سامنے صائمہ کے گن گاتیں اور احتشام صاحب ہاں میں ہاں ملانے میں ان سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تو یاسمین کی ناگواری چھپی نہ رہتی۔ وہ اپنی قدر دانی کے لیے کتنی کوشش' کتنا ہی خرچ کر لیتیں۔ سائمہ بیگم مفت میں تعریفیں بٹور لیتیں۔ یہ احساس انہیں جلانے کو کافی تھا۔ عالیہ اب پھپھو کو پسند کرنے لگی۔ لڑکے بھی خاصے تمیز دار ہو گئے تھے۔ کم از کم اوپر آ کر وہ کوئی بے تکی حرکت نہ کرتے۔ ثنا ان کی بے تکی باتوں کا بیان کرتی۔ شاید اس لیے بھی کہ نیچے کے گھر میں ان کی آؤ بھگت بھی ہوتی تھی۔ یہاں عالیہ' عالیہ الگ تھلگ رہنے کی پالیسی اپنائے رکھتیں۔ پھر یہاں ان کی عمر کے لڑکے نہ تھے۔ ہشام ٹیوشن کے لیے شام تک گھر نہ آتا۔

"تم ان سے زیادہ بے تکلف نہ ہو جانا۔" عالیہ نے ثنا کو سمجھایا۔ "وہ تو بے باک ملک سے آئے ہیں۔ انہیں فرق نہیں پڑے گا۔ لڑکیوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔"

"ہونہہ! مجھے کیا نقصان ہو گا۔" ثنا منہ لٹکا کر مایوسی سے بولی۔ "نہ ان میں سے کسی نے مجھے پسند کیا۔ نہ ہی پھپھو نے میرا نام لیا' بلکہ ہماری امی نے ابا سے کہہ دیا کہ اگر پھپھو نے میرا نام لیا بھی تو انکار کر دیں۔ مجھے اپنی بیٹی دو بھر نہیں کہ لنگور کے پلے باندھ دوں۔"

عالیہ پانی پی رہی تھی۔ بے ساختہ ہنسی تو اچھو ہو گیا۔

"ہاں ہاں! اڑا لو مذاق۔" ثنا بگڑی۔

"کہیں انگور کھٹے تو نہیں؟" عالیہ ہنسے جا رہی تھی۔

"جی! ساری حرکتیں لنگوروں والی ہیں' درختوں پر چڑھنا' شاخوں سے لٹکنا۔ امی تو ہولتی رہتی ہیں کہ یہ لوگ خیریت سے واپس چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو' کہیں کچھ ہو جائے اور لوگ کہیں کہ ماموں کے گھر میں حادثہ ہوا تھا۔ لان کے درمیان جھولا ہے۔ اس پر لٹکے لٹکے جو ایک صاحب نے چھلانگ لگائی تو سیدھے کھڑکی کی گرل آ کر پکڑی۔ پنجوں کے بل چلتے ہوئے وہ کرتب دکھائے کہ بس اوپر کا سانس اوپر' نیچے کا نیچے سمجھو۔ زینے سے اترنے کا واحد ذریعہ ریلنگ سے پھسل کر وہ بھی الٹا لیٹ کر آنا۔ پھسلتے ہوئے ایک قدم سے گیلری پار کرنا۔ چاروں بھائی چھلانگ ایکسپرٹ ہیں۔ انسانوں کے روپ میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ میں تو اوپر آ کر ہی ان سے مخاطب ہوتی ہوں کہ یہاں وہ آدمی بلکہ آدم زاد ہو کر بات کرتے ہیں۔"

"تمہیں بات کرنے کی ضرورت کیا ہے؟! انہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی تو ۔۔۔"

"ہائے! میں تو چاہتی ہوں کوئی غلط فہمی ہو جائے۔" ثنا جھوم کر بولی۔ "کیونکہ مجھے ایک لنگور بھا گیا ہے۔ اب چاہے انگور کتنے بھی کھٹے ہوں۔" عالیہ ہنسی سے دہری ہو گئی۔

"کون سا لنگور؟" عالیہ نے پوچھا۔

"چھوٹا والا بے بی لنگور' واعظ۔ ہائے! کیا غضب کی چھلانگیں ہوتی ہیں۔ کل ٹیرس سے پورچ کی چھت پر کودا۔ وہاں سے لان میں آ گرا۔ امی گھبرا گئیں اور کہا کہ بیٹا اندر سیڑھیاں بھی ہیں تو حیرانی سے بولا۔ آنا تو لان میں تھا۔ یہاں تو زینہ نہیں ہے۔ میں یہاں کیسے آتا؟ پھر مجھے ان بھائیوں کی ایک بات اور بھی پسند آئی'

’خدمت گزاری۔ رات کو پھپھو کے پیر دباتے ہیں باری باری واہ۔“

”تو ہم بھی یہ کام کرتے ہیں۔“ عالیہ نے اطلاعاً“ کہا۔ ”امی کے ابا کے پیر دبانا۔۔۔“

”اچھا! میں نہیں کرتی۔ مگر۔۔۔ وہ یعنی واعظ تو بھائیوں کے بھی پیر دباتا ہے۔ پھپھو نے خود کہا کہ واعظ کی عادت ہے‘ جب تک کسی کے پیر نہ دبالے‘ سوتا ہی نہیں۔ یقیناً“ بیوی بھی اس عادت سے فیض یاب ہوگی۔۔۔ مگر واعظ کا تو ابھی ذکر بھی نہیں۔“

ثنا کی مایوسی پر عالیہ نے اسے تسلی دی۔ ”اللہ سے امید رکھو۔ دعا کرو۔ واعظ کی باری آنے تک تمہاری باری بھی آہی جائے گی۔“

”مگر سوچتی ہوں‘ انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ جب جیسا ارادہ ہم کرتے ہیں‘ وہ پورا نہیں ہوتا۔ یہ تو طے ہے۔“

”توبہ‘ توبہ!“ عالیہ گھبرا گئی۔ ”ایسا تو نہ کہو۔ آخر خواہش کے مطابق ہی تو دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ ہو رہا ہے۔ دنیا انسان کی خواہشوں اور ارادوں کے مطابق ہی چل رہی ہے۔ یہ ترقی‘ یہ کاروبار زمانہ‘ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسانوں کے لیے بنائی ہے۔ انسان کی خواہشوں کی تکمیل کے لیے‘ انسان کی ذہانت کے امتحان کے لیے۔ بھلا بتاؤ! کیا ان کو ناکام بنانا‘ اپنے ہی بنائے ہوئے شاہکار۔۔۔ خود ہی انہیں ناکام کرنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی وارننگ دی ہے کہ تمہاری کوئی خواہش پوری نہ ہوگی‘ اس لیے خواہش نہ کرو؟“

”ارے اللہ توبہ! میرا مطلب یہ تھا کہ ہم انسان بے حد کمزور مخلوق ہیں۔ اس لیے ضروری نہیں کہ جو ہم چاہیں‘ ویسا ہی ہو جائے۔ میرا مطلب تھا کہ انسان خواہشوں کا غلام ہے۔ اللہ جسے چاہے نوازے اور جب چاہے‘ ان کے ارادوں کو ناکام بنا دے۔ ہم جیسے لوگ بھلا اتنا اختیار کب رکھتے ہیں کہ جو چاہیے‘ وہ ہو جائے۔ یاد ہے حضرت علی نے کیا فرمایا تھا کہ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے خدا کو پہچانا۔ اتنی عظیم ہستی اور ایسی بے بسی۔“ ثنا نے سب کو لاجواب کر دیا۔

”دراصل میں تو اپنے ابا کو حوصلہ دینے کے لیے وکیل بننا چاہتی ہوں۔ وہ اب آرام کریں۔ صحت کتنی خراب ہے۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے۔“

”آپا! وہ مرد ہیں۔ گھر کے سربراہ۔“ ثنا عالیہ کو سمجھانے لگی۔ ”لڑکیاں کچھ بھی کرلیں۔ کچھ بن جائیں لڑکی ہی رہتی ہیں۔ پرایا دھن‘ شادی ہوئی اور سارے خواب حباب بن کر فضا میں اڑ جاتے ہیں۔ ابا کو ریٹائر نہ کرو۔ انہیں سربراہ بنا رہنے دو۔ میں نہیں چاہوں گی کہ ہم لوگوں کی کمائی سے گھر چلے۔ ابا کو احساس کمتری ہو کہ وہ بیٹیوں‘ بیٹے کے محتاج ہیں۔ انہیں سربراہ بنا رہنے دو۔ تاکارہ نہ بناؤ۔ جب تک ان کی ہمت ہے۔“

”یعنی میں اپنے خواب سے دست بردار ہو جاؤں؟ بھئی! ڈرتی کیوں ہو۔ میں تم میں سے کسی پر مقدمہ نہیں کروں گی۔ وعدہ۔۔۔ ارے! چار دن کی زندگی ہے۔ اس میں کسی سے کیا لینا۔ جو اپنے نصیب میں ہوا‘ بغیر مانگے ہی ملے گا۔“ عالیہ مطمئن تھی۔

”ہاں! چاہے لنگڑا ہو۔“ عالیہ آرام سے لیٹ گئی۔

”وہ تو ثنا کے ہوں گے۔“ عالیہ بھی ہنسی۔

”چاہے بطور امریکہ سے آئے۔ ارے ثنا نے تلاش ایک دلہن جو ڈرتی ہو“ کردے مجھ کو پاس‘ یہاں بھی حسن کی کمی نہیں ہے۔ مگر ان کے نصیب۔۔۔“

لڑکیاں بڑوں کے ارادوں سے بے خبر انہی باتوں میں لگی رہتیں۔

عالیہ کی ایک لڑکی سے دوستی ہو گئی تھی۔ کلاس فیلو ہونے کے ساتھ وہ بھی بہت سنجیدہ‘ لیے دیے رہنے والی تھی۔ اس نے کسی معاملے میں مشورہ کرنے کے لیے عالیہ کے پاس آنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ عالیہ نے گھر کا پتا سمجھا دیا۔ وہ آئی تو عالیہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہ عالیہ کے ساتھ کسی قانونی نکتے پر غور کرنے اور رائے لینے آئی تھی۔

عالیہ ان دونوں کے لیے چائے لے آئی۔ چائے رکھتے ہوئے وہ لڑکی کو بغور دیکھنے لگی۔

بظاہر معقول اور حلیے سے بھی دولت مند گھرانے سے تعلق لگتا تھا۔

”آخر اسے وکالت پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟“ عالیہ نے سوال کر ہی لیا۔

وہ ہنسنے لگی۔ ”ضرورت؟ بھئی یہ بھی ایک علم ہے۔ سب کو اپنے ملک کے قوانین سے واقفیت ہونی چاہیے اور خوش قسمتی سے یہاں قانون پڑھنے پڑھانے کی سہولت موجود ہے۔ تو زیادہ سے زیادہ لوگوں کو قانون پڑھنا چاہیے۔“

”قانون‘ ہمارے ملک میں ہے کہاں؟ ایسی تعلیم کا فائدہ کیا؟“

”ہاں! بدقسمتی سے حکمرانوں کی نالائقی‘ عیاشی‘ بددیانتی نے یہ حالات اور بدامنی پیدا کی ہے۔ ورنہ۔۔۔ قانون اندھا ہوتا ہے۔ ہر کسی کے لیے برابر ہوتا ہے اور ہر ایک کو واقف ہونا چاہیے۔ بڑی بڑی شخصیات قانون کے شعبے میں ہیں۔ عورتیں بھی وکیل ہیں۔ جج ہیں۔ خصوصاً“ عورتوں کے حقوق ان کے سماجی معاشرتی مسائل حل کرنے کے لیے خواتین کو قانون ضرور پڑھنا چاہیے۔ بہت مشہور خواتین ہیں اس شعبے میں مثلاً“۔۔۔

”جی ضرور! مثلاً“ وہ مشہور خاتون وکیل‘ جن کو عورتوں کے حقوق کا علم بردار کہا جاتا ہے اور جو گھریلو جھگڑوں کے تصفیے کے لیے آئی ہوئی خواتین کو مصالحت کے بجائے صرف طلاق کا مشورہ دیتی ہیں۔ یہ جیسے ان کا منشور ہو‘ ان کا قانون جو صرف عورتوں کو شوہروں سے نجات دلانے میں دلچسپی رکھتا ہے۔“

عالیہ سخت بدظن تھی۔ اس کی دوست کی بہن کو گھریلو جھگڑوں سے نمٹنے کے لیے کسی نے ان مشہور وکیل سے رجوع کے لیے کہا۔ وہ دراصل شوہر سے مصالحت چاہتی تھی مگر وکیل صاحبہ وہاں آئی ہوئی تمام خواتین کو صرف طلاق لینے کا درس دے رہی تھیں۔ ان کا نظریہ تھا‘ عورت کمزور نہیں جو ہمیشہ شوہر سے دب کر رہے‘ بلکہ مردوں پر حاوی ہونا ان کا حق ہے۔ وہ آزاد زندگی گزاریں۔“

وہ سامیہ سے بحث کرنے لگی۔ ان صاحبہ کی دوست کی بہن کے شوہر کو جونہی اطلاع ملی کہ وہ ان مشہور وکیل صاحبہ کے رابطے میں ہے۔ ان کا شوہر فوراً“ بیوی کو لینے آپہنچا اور اب معاملات سدھر چکے تھے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ بوکھلائی ہوئی ثنا آ پہنچی۔

”سامیہ آپی! آپ یہاں۔“

”ارے ثنا! تم ادھر کیسے۔۔۔“ وہ بھی کم حیران نہ تھی۔

”یہ ہمارا گھر ہے۔“ ثنا ہنسنے لگی۔ ”نیچے ہم لوگ‘ اوپر میرے چچا کی فیملی رہتی ہے۔“

”ارے لو پتا ہی نہ تھا۔ کمال ہے۔“

”کمال نہیں‘ آپ کو لینے کے لیے کامران بھائی آئے ہیں‘ نیچے ہمارے ہاں۔ آپ نے ان کو جو پتا دیا تھا۔ وہ اسی تلاش میں آئے۔ محسن بھائی کو دیکھ کر آ گئے۔ تب انہوں نے آپ کا بتایا اور بھائی بحث کر رہے تھے کہ سامیہ تو ہمارے گھر آئی ہی نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا تو سب نے انہیں روک کر بتایا کہ یقیناً“ سامیہ آپی‘ عالیہ آپی کے پاس آئی ہوں گی۔ چلیں!“

عالیہ سامیہ کے ساتھ نیچے اتری۔ برآمدے میں پھپھو اور دادی سے ملاقات ہو گئی۔ ثنا نے ان کو بھی ہنس ہنس کر سارا قصہ بطور لطیفے کے سنا دیا۔ ڈرائنگ روم میں محسن اور کامران منتظر تھے۔

چچی امی‘ عالیہ کو دیکھ کر جزبز ہو گئیں۔ وہ اس وقت کامران کی خاطر داری میں مصروف تھیں۔ سامیہ کی طرف پلیٹ بڑھائی۔ اس نے فوراً“ معذرت کرلی۔

”سوری آنٹی! میں تو عالیہ کی امی کے بنائے ہوئے مزیدار کباب کھا کر آئی ہوں۔ چائے بھی پی لی۔“

دونوں بہن بھائی چلے گئے۔ چچی امی‘ عالیہ کو دیکھ کر خاصی بیزار تھیں۔ جس طرح کامران اور سامیہ اس سے مخاطب ہو کر اس گھر کی مکین ہونے پر حیرت ظاہر کر رہے تھے‘ عالیہ ہنس رہی تھی۔ ”کمبخت! ہے بھی خوب صورت۔ ہنستے ہوئے اور بھی پیاری لگتی ہے۔ میں آج ہی روحینہ سے کہوں گی۔ اپنی بھابھی سے ثنا کا ذکر کرے‘ بلکہ اصرار کرے۔ اس سے اچھا داماد نہیں

ملے گا۔ یہ ثنا کے لائق ہی ہے۔"

عالیہ ان کے خیالوں سے بے خبر اوپر آ گئی۔ دادی کو پھپھو نے نیچے روک لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور اگلی شام نیچے کے راستے سے زینہ چڑھ کر سامیہ کو ہنستے کھلکھلاتے آتے دیکھ کر وہ جلدی سے آگے آئی تو اس نے کہا' سامیہ کے ساتھ اس کی امی بھی ہیں۔ عالیہ کچھ حیران سی انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ دادی اور پھپھو بھی تھیں۔ صائمہ بھی آ گئیں۔ عالیہ سے چائے بنانے کا کہہ کر اندر چلی گئیں۔

"کل والے کباب بھی تل لینا عالیہ! میں نے اتنی تعریف کیں کہ امی خود کھانے کے لیے آ گئیں۔"

"مگر مجھے دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔" عالیہ نے کہا اور بھاگ گئی۔

"تمہاری بہن بہت ہوشیار ہے۔"

سامیہ نے ہنس کر کہا اور عالیہ کو لے کر دادی کے کمرے میں جا بیٹھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد عالیہ پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔ سامیہ نے اسے کچھ بتایا نہیں کہ ان کی امی کی آمد کا کیا مقصد تھا۔

رات کو محتشم کے ساتھ کچھ مذاکرات بھی ہوئے۔ پھپھو رات میں کہیں رک گئیں۔ ان کے بیٹے سیر و تفریح کے لیے اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔

دوپہر جب عالیہ' غالیہ کالج میں تھیں۔ یاسمین غصے اور اشتعال میں تپی ہوئی اوپر آ گئیں۔ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ صائمہ ان کی مخاطب تھیں۔ وہ حیرانی سے جٹھانی کا غیظ و غضب سے انگارہ چہرہ اور انگارے برساتی زبان کے زراٹے سن اور دیکھ رہی تھیں۔

نفیسہ آپا نے ان سے پوچھا۔ "کیا معاملہ ہے؟"

تب انہوں نے بتایا کہ ان کی منجھلی بھابھی روحینہ کا فون آیا تھا۔ ان کی بھابھی مسز احسان کو عالیہ بہت پسند آ گئی تھی۔ مسز احسان' روحینہ یعنی اپنی نند سے کہہ رہی تھیں کہ وہ اپنی نند یاسمین کو تیار کرے کہ کامران کی عالیہ کے لیے سفارش کریں۔ بے حد تن فن تھیں۔

"یاسمین! جہاں لڑکی ہوتی ہے۔ رشتے آتے ہی ہیں۔ اس میں غصے والی کیا بات ہے؟"

"اس طرح رشتے آتے ہیں؟" وہ چیخیں۔ "میرے خاندان کا لڑکا اور یہاں؟ اف! لڑکیاں باہر نکل کر کیا گل کھلاتی ہیں۔ ماں باپ بے خبر۔ ارے! جو لڑکا قابل لائق ملا' اسے پھنسا لیا۔"

"یاسمین! ہوش میں رہو۔ لڑکیاں باہر جا کر نہیں پڑھیں گی تو کیا تم نے یونیورسٹی گھر میں بنا رکھی ہے؟ ثنا کیا باہر نہیں جاتی؟ فضول قسم کے الزام نہ لگاؤ۔ سامیہ کی امی نے مجھ سے بھی سفارش کرنے کا کہا تھا۔ یہ کوئی جرم تو نہیں اور کامران تو سامیہ کو لینے آیا تھا۔ وہ تو واقف بھی نہ تھا عالیہ سے۔"

"یہ سب ڈرامے بازی ہے آپا! میرے خاندان کا لڑکا۔ آخر عالیہ میں کیا خوبی ہے جو ثنا میں نہیں؟" جوشِ خطابت میں خیال ظاہر کر دیا۔ نفیسہ کو بھی غصہ آ گیا۔

"قسمت یاسمین بی بی! عالیہ بہت خوش نصیب ہے۔ شاید تمہیں علم نہیں' احتشام خود محسن کے لیے عالیہ کو مانگ چکے ہیں۔"

یاسمین کے لیے ایک اور دھچکا۔

"کیا؟" زور سے چیخیں۔ "میری مرضی کے بغیر؟ مجھ سے پوچھے بغیر؟ کیسے ہو سکتا ہے یہ۔۔۔ ہرگز نہیں۔ بھول جائیں یہ خواب۔ میں اور محتشم کی بیٹی کو بہو بناؤں گی؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ اونہہ بی بی صائمہ! ہوش کی دوا کرو۔ کیا ہے تمہارے پاس؟ کیا خاندان ہے تمہارا؟ بے زر' بے گھر' اور تمہاری بیٹی جس کے کردار کا مجھے یقین ہی نہیں۔ میں اسے قبول کروں گی؟ بیٹھی ہیں اماں جان ان ہی کی سازش ہے۔ بیٹھی تانے بانے بنا کرتی ہیں احتشام کے ساتھ۔"

"یاسمین کس کے بارے میں کیا کہہ رہی ہو؟ تمیز ہے تمہیں؟" نفیسہ آگ بگولہ ہو گئیں۔

"آپ کو کیا علم؟ میرے خلاف کیا کچھ کان بھرے جاتے ہیں۔" پیر پٹختی تن فن کرتی چلی گئیں۔

اماں دم بخود اپنی جگہ بیٹھی تھیں۔ آنکھوں سے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ نفیسہ نے گلے لگا کر کہا۔

"آپ کیوں رنجیدہ ہوتی ہیں؟ "دشمن کی گالی ہنس کر ٹالی" والے نسخے سے کام لیں۔"

دادی آنسو پونچھ کر مسکرائیں۔ "نفیسہ! تم نہ ہوتیں تو شاید میں بھی جواب دے دیتی۔ مگر خیر! اب صائمہ کی خبر لو۔ اس کو بہت افسوس ہوا ہو گا اور میں تم کو اختیار دیتی ہوں۔ جس رشتے کو چاہو۔ تم ہی خود فیصلہ کر لو۔ محتشم کی مجال نہیں کہ تمہارے کہے کو ٹالے۔"

نفیسہ نے اماں کو گلے لگا لیا۔

"بس اماں! اس الجھن کا یہی بہتر حل ہے۔ نہ محسن' نہ کامران۔۔۔ عالیہ میری ہوئی' مبارک ہو' صائمہ کو بتا دوں؟"

اماں نے سرد آہ سینے میں دبالی۔ دراصل انہیں کامران بھی پسند تھا۔ محسن بھی۔ مگر محسن کے ساتھ یاسمین کی بددلی' بدظنی اور بدباطنی بھی شامل تھی اور احتشام کو کسی امتحان میں ڈالنے کی خواہش نہ تھی۔ خوامخواہ گھر میں کوئی چپقلش ہو۔ بہتر ہے کہ کامران کے لیے اقرار کر لیا جائے۔ کامران کے والدین سے وہ خوب واقف تھیں۔ بہت شائستہ' قدر دان اور ملنسار تھے دونوں۔ پھر نفیسہ نے بھی اپنی آرزو کا اظہار کیا۔ یاسمین جس طرح ذلیل کر کے گئی تھیں۔ آئندہ بھی اس کا امکان تو تھا اور احتشام کے اصرار پر اگر یہ شادی ممکن بھی ہوئی تو وہ نہ صرف خود یاسمین کے تیروں کی نشانہ ہوں گی بلکہ احتشام بھی۔

نفیسہ نے تیز رفتاری کے مظاہرے میں ادھر بیگم کو فون کر دیا۔ دوسری جانب کامران کی امی کو فون معذرت کے ساتھ رامس کے لیے سامیہ کی نامزدگی کی۔ وہ کچھ چپ ہو گئیں' پھر کہا۔

"اچھا! میں احسان صاحب سے مشورہ کر کے بتاؤں گی۔"

صائمہ کمرے میں چپکے چپکے رو رہی تھیں۔ نفیسہ نے انہیں گلے لگا کر اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ کچھ حیران ہوئیں۔

"آپا! مجھے بھلا کیا اعتراض ہو گا۔ میں تو بھائی جان کی وجہ سے پریشان تھی کہ انہیں کیسے انکار کریں۔ محسن بہت پیارا بچہ ہے۔ پھر کامران' مگر بھابھی نے میری معصوم بچی پر جو الزام لگائے ہیں۔ میرے میاں سن لیتے تو نہ جانے کیسے برداشت کرتے۔ آپا! ہم لوگ تو سامیہ کو جانتے تک نہیں اور لڑکیاں تو اتنی محتاط ہیں۔ کبھی کسی لڑکے۔۔۔"

"ارے! میں خوب جانتی' سمجھتی ہوں۔" نفیسہ نے انہیں مطمئن کرنے کے لیے کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں سب سنبھال لوں گی۔ احتشام کو بھی سمجھاؤں گی۔ پریشان نہ ہو۔ اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ بس اب خوش ہو جاؤ اور میرے بیٹے ایرج کو قبول کر لو۔ اللہ کی رضا اسی میں ہے۔"

"مگر آپا! عالیہ کی تعلیم۔۔۔ وہ تو بہت۔۔۔"

مگر فیصلہ ہو چکا تھا اور شام تک سامیہ کی امی کا اقرار کا فون بھی آ گیا۔ کیونکہ آپا نے وقت کی کمی کا اظہار بھی کر دیا تھا اور ظاہر ہے ان کو لڑکیوں کی کیا کمی۔ احتشام' محتشم' نفیسہ' دادی اور صائمہ ایک کمرے میں کانفرنس کر رہے تھے۔

اور عالیہ اپنے پلنگ پر گھٹنوں میں سر دیے بے یقینی کے عالم میں گم صم بیٹھی تھی۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ اس سے پوچھے بغیر۔ پچھلی صدی کی جاہل ان پڑھ' ڈوگھو لڑکیوں کی طرح' اس کی قسمت کا فیصلہ۔۔۔ ماں باپ خود کر لیں۔ وہ جو بلند عزائم کے ساتھ باپ کا بازو بننے کی آرزو لے کر حالات کا مقابلہ کرنے چلی تھی۔ پھر کیا ہوا ناکامی۔۔۔ یہ کیا ہے؟ مقدر کا کارنامہ یا کوئی مجبوری عالیہ نے آ کر بغور معائنہ کیا۔

"آپا! کیا بات ہے۔ کیا تم خوش نہیں ہو؟"

"کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟ میری خواہشیں' میرے ارادے۔۔۔ مجھے اس قابل بھی نہیں سمجھا کہ میں کوئی رائے بھی دے سکتی ہوں۔ میری زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے کسی نے پوچھا ہی نہیں کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ میں کبھی ابا کو مایوس نہ کرتی۔ خواہ وہ مجھ

سے کوئی قربانی مانگتے۔ تعلیم کیا' جان بھی دے دیتی' مگر اس طرح اچانک دھماکا۔ میں اب پچھتا رہی ہوں کہ کیوں محنت' جدوجہد کو حاصل زندگی بنا کر ترقی اور خوش حالی کے خواب دیکھے؟ کیوں ماں باپ کی خدمت اور اطاعت کو فرض جان کر تعلیم پر اتنا خرچ کروایا؟ جہالت ہی مناسب تھی۔"

"آپا!" عالیہ سنجیدگی سے بولی۔ "ہم نے ابا کی خواہشات کے مطابق پڑھ کر معاشرے کا اہم ستون بننے کا عزم کیا تھا۔ ہمارے ارادے نیک ہیں' مگر قسمت پر بھی یقین ہے اور ابا یا دادی ہمارے ساتھ زیادتی یا ظلم کریں گے' یہ بھی نہیں سوچا جا سکتا۔ آپا! نیک نیتی سب سے بڑا وصف ہے۔ آپ کی نیت درست ہے تو یہ خیال آنا ہی نہیں چاہیے کہ ہمارے ساتھ کچھ برا ہو سکتا ہے۔ قدرت کے فیصلوں کے سامنے ہم بے بس اور لاچار ہیں۔ ہم کسی بھی ہونی کو ٹالنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہمیں اپنے اللہ پر یقین ہے۔ تو یہ یقین بھی ہونا چاہیے کہ ہمارے ساتھ اچھا ہی ہو گا۔ امید کا دامن تھامے رکھنا بھی انعام سے کم نہیں۔ مایوسی لاحاصل ہے۔ جو ہمارا نصیب ہے۔ اسی میں اپنے لیے عافیت اور خوشیاں مہیا کرنا ہماری جدوجہد کا صلہ ہے۔ آپا! اگر آپ کو چچا ابا کی پیش کش اور اس کے انکار کا غم ہے تو اس کو دل سے نکال دیں۔ چچا ابا کی بخشی ہوئی ذلت سے چھپھوکی دی ہوئی عزت بہت بہتر ہے۔ تمام زندگی شکر کرو گی' پھر بھی چچی امی کی نفرت اور الزام کے داغ نہیں دھل سکیں گے۔ بھول جاؤ اس بات کو کہ اپنی ماں کی حرمت اور باپ کی عزت کی خاطر۔۔۔ ہم نے کبھی کسی کا برا چاہا نہ کسی کے ساتھ برا کیا تو پھر کیوں فکر کریں۔ ہمارے ساتھ برا کیسے ہو گا؟ اللہ سب سے بڑا منصف ہے اور سب سے زیادہ مہربان۔"

عالیہ کے سر سے کوئی بوجھ سرک گیا۔ وہ مسکرا دی۔

"اچھا دادی اماں! شکریہ بہت بہت۔"

"دراصل آپا!" عالیہ بھی مطمئن ہو کر پلنگ پر آرام سے بیٹھ گئی۔ "میں نے ارج بھائی کے ساتھ لمبی میٹنگ کی ہے۔ وہ بہت سادہ مزاج' مگر اعلا دماغ اور مضبوط قوت ارادی کے مالک ہیں۔ آپا! خوشیاں کسی کے پیچھے نہیں آتیں۔ ہمیں اپنے لیے تلاش کرنی پڑتی ہیں۔ بھاگ بھاگ کر انہیں حاصل کرنا ہوتا ہے اور تمہارے ساتھ تو سب کچھ الٹ ہو گیا۔ خوشیاں تمہارے پیچھے آ گئیں امریکہ سے۔ آپا! سوالی کو دھتکارنا اللہ کے نزدیک بری بات ہے۔"

عالیہ چپ رہی۔ سب سے دوری کیسے برداشت کرے گی۔ مغرب کی نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے آنکھیں چھلک گئیں۔ دروازہ کھول کر ابا اندر آئے تھے۔ اس کا سر مزید جھک گیا۔ پاس بیٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"میرا بہادر بیٹا اداس ہے؟ میں تو سمجھتا تھا۔ میرا دلیر بیٹا ہر قسم کے حالات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ میں کیا دیکھ رہا ہوں" آنسو؟"

عالیہ نے ان کے کندھے پر سر رکھ دیا اور چپکے سے کچھ کہا۔

"ارے! اونچا سننے لگا ہوں۔ جو کہنا ہے' صاف آواز میں کہو۔ تمہیں اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا حق ہے۔ میں انکار سننے کا حوصلہ رکھتا ہوں' مگر تمہیں اداس' ناکام نہیں دیکھ سکتا۔ یہ فیصلہ اماں نے کیا تھا۔ میں انکار کی جرات کیسے کرتا۔ اماں بھی اس بے ضابطگی کے لیے مجبور ہو گئی تھیں۔ آپا کی خوشی بھی میرے لیے مقدم ہے۔ مگر۔۔۔ میں اماں کو منا لوں گا۔ اگر تم نہیں چاہتیں۔ تو میں آپا سے معذرت کر لوں گا۔ ورنہ۔۔۔ میں تو ان کے احسان کے نیچے دب چکا تھا۔ خوش تھا بہت۔ کہاں آپا' کہاں میں۔ آسمان کا جھکاؤ زمین کی طرف۔"

"ابا!" وہ ابا کو شرمسار اور نادم دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ "مجھے آپ کی خوشی درکار ہے۔ آپ پہلے پوچھتے' تب بھی میرا یہی جواب ہوتا۔"

ابا نے خوش ہو کر اسے گلے لگا لیا۔ "تمہاری فرماں برداری کا شکریہ۔ دراصل شکر تو اللہ کا کرنا چاہیے جس نے مجھے اتنی سمجھی ہوئی اولاد سے نوازا ہے' جو ہمیشہ مجھے

شرمندگی سے بچاتی ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں ان شاءاللہ تم اس فیصلے سے کبھی پچھتاؤ گی' نہ مایوس ہو گی۔ یہ ایک باپ کی دعا ہے۔ اللہ تمہیں ہزاروں نعمتوں سے نوازے گا۔ یہی تمہارا انعام ہو گا۔"

ان کی آواز بھرا گئی۔ وہ اٹھے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر چلے گئے۔ وہ وہیں بیٹھی رہی۔ اسے خوش ہونا چاہیے۔ باپ کی خوشنودی کے حصول کے بعد ..... یا رنجیدہ ..... سب سے دوری۔ ایک لمبی جدائی کبھی سوچا تک نہ تھا اور کیا کبھی سوچا ہوا پورا ہوا بھی ہے؟ یہ کسی بھی انسان کے اختیار میں کیوں نہیں؟ شاید اس لیے کہ انسان نادان متلون مزاج خود غرض ہے؟ وہ سوچ میں گم کتنی دیر بیٹھی رہی۔

اسے باہر کی خبر نہ تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ عالیہ کن کاموں میں مصروف ہے۔ ہشام کہاں ہے اور دادی ابھی تک باہر یا ڈرائنگ روم میں کیا کر رہی ہیں۔ پھر ہشام بہت تیزی سے اندر آیا۔

"دادی کی دوا لینے آیا ہوں۔ وہ اصل میں ہم ڈانس کی پریکٹس کر رہے ہیں۔ فنکشن کی تیاری ہے۔ وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ "میرے دوست اور احسن بھائی اور پتا ہے اریج بھائی ہمیں ڈانس کی پریکٹس کرا رہے ہیں۔ عالیہ سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"بہت زبردست پروگرام ہو گا منگنی کا۔ یاد رکھیں گی آپ۔"

دوا اٹھائی اور باہر نکل گیا۔ عالیہ نے چلا کر پوچھا۔

"عالیہ کہاں ہے؟"

"وہیں۔" باہر سے جواب ملا۔ پھر کچھ دیر بعد محسن اندر آیا۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟ تم سو رہی ہو اور وہاں پھپھو تمہیں امریکہ لے جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔" وہ تو شاید اسے جھنجھوڑنے آیا تھا۔ "وہ تمہارا عزم' وہ تمہاری جج بننے کی خواہش۔"

"میں جاگ گئی ہوں۔ پہلے سوئی ہوئی تھی۔ خواب ..... جو بے تعبیر تھے۔ لاحاصل خواہشیں بے ثمر۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟ یقین نہیں آتا یا یہ صبر کی انتہا ہے؟"

"یہ صرف حالات کا تقاضا بہتر فیصلہ ہے۔ ماں باپ کی فرماں برداری اور مشیت الٰہی پر یقین۔"

عالیہ اندر آ گئی۔ "بھائی! آپ کو اس فیصلے سے اختلاف تو ہو گا' لیکن یہ کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ صرف عزت کی خاطر..... آپ پر فوقیت دی گئی ہے۔ آپی کبھی نہیں بتائیں گی۔ میں بتاتی ہوں۔ جب کامران صاحب آپ کے گھر اپنی بہن کی تلاش میں آئے تھے۔ انہیں علم نہ تھا کہ ہم یعنی آپی بھی یہیں رہتی ہیں۔ وہ شاید پہلی بار ہی آئے تھے اور ہم لوگوں سے قطعاً" ناواقف۔ ان کی بہن آپی کی کلاس فیلو ہیں۔ ان کے آنے کو چچی امی نے ملاقات کا بہانہ۔ ان کے رشتہ دینے کو..... "گل کھلائے" جیسے الفاظ سے ابا جی کو نوازا۔ اتنی ذلت کے بعد..... آپ جانتے تو ہیں۔ ہمارے پاس عزت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ پھپھو تو بہت پہلے یعنی آنے کے فوراً" بعد ابا اور دادی سے سوال کر چکی تھیں۔ انتخاب بہت مشکل ہوتا۔ اگر..... چچی امی اس بات کو اپنے وقار کا سوال نہ بنا لیتیں۔"

وہ صاف گو بھی تھی' صاف دل بھی۔ محسن مضطرب سا ہو گیا۔

"لیکن میری کیا غلطی ہے؟ ابا نے تو بہت دن پہلے مجھ سے کہہ دیا تھا اور چچا نے تو شاید عالیہ کی لاعلمی میں ہی..... فیصلہ کر لیا۔"

"غلطی کسی کی ہو' نہ ہو۔" عالیہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔ "میں بہرحال اپنے باپ کی عزت کا بھرم رکھنا چاہتی ہوں۔"

محسن بہت الجھن میں گرفتار تھا۔ "تو وہ سارے ارادے' ترقی' کچھ بن کر دکھانے کے دعوے....."

"ارادے ٹوٹنے سے ذلت نہیں ہوتی۔ یہ قدرت کے فیصلے ہیں۔ ایک اطاعت شعار اولاد ہوں' یہ کم نہیں ہے۔"

"تم مجھے صرف ایک بات کا جواب دو' کیا تم خوش ہو؟"

"میں یقیناً" مطمئن ہوں۔ یہ کم ہے؟" عالیہ کے

مضبوط لہجے نے اس کے اطمینان کو ظاہر کر دیا۔

محسن کے لبوں پر تبسم کی لکیر ابھر کر معدوم ہو گئی۔ وہ مصلحت کو مشیت الٰہی سمجھ رہی ہے تو یہ شاید سب کے لیے بہتر ہو۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ عالیہ نے جوش جذبات سے عالیہ کو لپٹا لیا۔

"آپی! شاباش' یہی بہادری تم کو ہر جگہ فاتح بنائے گی۔" وہ اٹھ کر ناچنے لگی اور عالیہ کو ہنسی آ گئی۔

☆ ☆ ☆

پھر منگنی کا دن آ گیا۔ لڑکوں نے خوب ڈانس کیا۔ ابا نے اریج کو گھڑی پہنائی۔ پھپھو نے عالیہ کو زبردست قسم کا سیٹ پہنایا۔ رشتہ پکا ہو گیا۔

اس کے بعد سامیہ اور رامس کی منگنی کا غلغلہ ہوا۔ سامیہ کے گھر کے بڑے لان میں فنکشن ہوا۔ بے حد خوب صورتی سے سجایا گیا لان اور اسٹیج۔ چچی امی کے تینوں بھائیوں کی بیگمات اور بچے وغیرہ۔ مسز احسان کے میکے والے۔ کافی پررونق محفل تھی۔

چھوٹے دو لنگوروں نے ڈانس کیا۔ جسے عالیہ اور ثنا نے ڈانس بمقابلہ کرتب کے منظور کیا۔ تصویریں بنیں عالیہ جیسا سیٹ سامیہ کو بھی پہنایا۔

پھپھو نے عالیہ کو آگے آگے رکھا بطور بڑی بہو کے۔ عالیہ اور سامیہ ایک ساتھ بیٹھی تھیں۔ عالیہ نے چپکے سے سامیہ کے کان میں کہا۔

"جٹھانی بننے والی ہوں۔ اب میرا ادب تم پر لازم ہے۔"

"جٹھانی' پانچ منٹ بڑے جیٹھ اور اگر تم جٹھانی کے بجائے میری بھابھی بنتیں تو زیادہ خوشی ہوتی بہت زیادہ ادب کرتی میں۔ میرے سب خواب ..... بے تعبیر ہیں۔" سامیہ بھی سرگوشی میں اپنے دکھ کا اظہار کرنے لگی۔

"اب بھی' بھابھی ہی تو بن رہی ہوں۔" عالیہ نے سامیہ کو بے تعبیر خوابوں کو ہوا میں اڑا دیا۔ نئی آس' نئے ساتھ۔

..... نے کھانا کھاتے ہوئے چپکے سے اظہار کیا۔

"دونوں بہت شاندار لگ رہے تھے۔"

"میرا والا لنگور سب سے زیادہ شان دار ہے۔" ثنا نے آرام سے کہا۔

"ڈانس کرتے ہوئے بھی؟" عالیہ حیرت زدہ تھی۔

"اور سنو! یہ میرا والا کا کیا مطلب ہے؟ اتنا حق کس نے دیا تمہیں؟ چچی امی کہہ چکی ہیں' لنگور کو بیٹی نہیں دیں گی۔ بات ختم۔"

"پسند پر پابندی نہیں ہے۔ باقی امید پہ دنیا قائم ہے۔ ویسے عالیہ آپی میری سفارش کر سکتی ہیں' بلکہ سامیہ بھی۔"

"یہاں کیوں جم کر بیٹھ گئیں؟" یاسمین نے آ کر بیٹی کو ڈانٹا۔ "وہاں حمنہ' نجمہ بیٹھی ہیں پیچھے۔ ان کے پاس جا کر بیٹھو۔"

"کیوں بھئی؟ ہم تو لڑکے والے ہیں۔ اسٹیج کے سامنے صوفوں پر ہی بیٹھیں گے آرام سے۔ آپ جائیں وہاں۔"

ثنا بے نیازی سے جواب دے کر صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ یاسمین نے چڑ کر عالیہ کو گھورا اور چلی گئیں۔

سامیہ کے والدین بہت خوش تھے۔ انہوں نے کامران کے رشتے کے انکار کو انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ پھپھو کو دونوں بیٹوں کو منگنی کی مبارکباد دی۔

یاسمین بیگم کی تینوں بھابھیاں بھی بہت پیش پیش تھیں۔ چہک رہی تھیں۔ یاسمین بیگم کے سینے پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ بھابھیوں کی خوشی دیکھی جا رہی تھی' نہ ان کی چہک برداشت ہو رہی تھی۔ دانت پیس پیس کر جبڑے دکھ گئے۔ بھابھیوں کا غصہ نند اور ساس پر اتارنے کی تیاری کرنے لگیں۔

روحینہ کو سفارش کے لیے کامران کی امی نے اکسایا تھا۔ وہ جھٹ تیار ہو گئی۔ اب رامس سے اور اریج سے مذاق اور دل لگی میں پیش پیش۔

ثنا اسٹیج پر عالیہ کے ساتھ جڑی بیٹھی تھی۔ وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے گھر چلی گئیں۔ ثنا نے انکار کر دیا۔ احتشام صاحب کے سوال پر کہ کیسی

طبیعت ہے۔ بھنا کر بولیں۔

"مرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ بس دل جل گیا تھا۔ روحینہ کو دیکھا تھا۔ آپا سے کیسی باتیں بگھار رہی تھی۔ گھسے جا رہی تھی ان کے پہلو میں۔ سامیہ کے ساتھ عالیہ کے ساتھ بھی مذاق چل رہے تھے بھئی۔ چلو! سامیہ بھتیجی ہے۔ عالیہ سے کیا رشتہ ہے؟ مگر لگی ہیں چھچھورپن میں۔"

"بیگم! چھچھورپن نہیں۔ سچی خوشی اور صاف دلی کہتے ہیں اسے۔ جس سے آپ کا واسطہ نہیں ہے۔"

ایڑی سے لگی چوٹی پر بجھی۔ پیر پٹختی چلی گئیں۔

"ہونہہ! سب فرشتے ہیں۔ ایک میں ہی بری ہوں۔"

☆ ☆ ☆

کئی دن بڑی گہما گہمی رہی۔ آپا کبھی اوپر، کبھی نیچے چکر لگایا کرتیں۔ احتشام، محتشم کے ساتھ مشکیں ہوئیں۔ پھر سنا کہ دو ہفتے بعد شادی کی تاریخ طے ہوئی ہے۔ سامیہ کے والدین بھی مان گئے۔ اوپر کیا ہو رہا ہے۔ انہیں سروکار نہ تھا۔ احتشام صاحب البتہ بے حد پرجوش تھے۔ ان کا جی جلانے کا مقصد تھا۔ نہ جانے محتشم نے تیاری کیسے کی ہوگی۔ قرض کس سے لیا ہوگا۔ شاید بھائی سے قرض۔ بھائی اس قدر پرجوش تھے۔ آپا نے انہیں خصوصی بلاوا دیا۔

"تم چاہو تو میری طرف سے بارات میں چلنا یا اگر چاہو تو محتشم کی طرف سے۔ رشتہ برابر ہے۔ احتشام تو محتشم کی طرف سے شریک ہوں گے۔"

فیصلہ ہو گیا۔ انہوں نے باراتی بننا منظور کیا۔ یوں بھی انہیں محتشم سے چڑ تھی اور ساس سے نفرت۔ صائمہ انہیں بلاوا دینے آئی بھی تو انہوں نے معذرت کر لی۔

"آپا پہلے کہہ چکی ہیں۔ ویسے بھی احتشام تو تمہاری طرف سے شریک ہو ہی رہے ہیں۔ پھر میری کیا اہمیت۔" صائمہ کو یہ جواب عجیب لگا۔ چپ رہیں۔

شادی ہال میں دو باراتیں۔ بے حد پررونق شادیاں تھیں۔ دونوں دولہا، دونوں بہنیں بہت حسین لگ رہے تھے۔ آپا دونوں بہوؤں کو رخصت کرا کے اپنے دیور کے بنگلے میں لے گئیں جہاں بے حد پرتپاک استقبال ہوا۔ بے حد خوب صورتی سے سجایا ہوا بنگلہ۔ آپا کی سسرال کی شان و شوکت، دولت و ثروت کا غماز تھا۔ دلہنیں اپنے قیمتی لباس اور حسین زیورات سلیقے سے کیے میک اپ کی وجہ سے بہت ہی اچھی لگ رہی تھیں۔ سامیہ بھی قبول صورت تو تھی، مگر عالیہ کو بغور دیکھ کر یاسمین بیگم مبہوت ہو گئیں۔

لمحہ بھر کو تاسف نے گھیرا۔ کیا میں نے محسن کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر دی۔ اس کا اترا ہوا چہرہ، پھیکا رنگ کچھ کہانی سنا رہا تھا۔ وہ ہوٹل سے گھر چلا گیا تھا۔ ہر بات ان کی توقع کے خلاف ہو رہی تھی۔

ہوٹل میں اپنی بھابھیوں کے طرز عمل نے ایک بار پھر انہیں انگاروں پر لوٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ جو میکے جا کر اپنی ساس کی چالاکیوں، مکاریوں کی داستان دل سے گھڑ کر سنایا کرتی تھیں اور ان کی ہمدردی بٹورا کرتی تھیں۔ تینوں جس طرح ان کی ہاں میں ہاں ملا کر تسلی دیتی تھیں۔ وہی بھابھیاں ان کی مکار ساس کے آگے بچھی جا رہی تھیں۔ خاطر تواضع میں ایک دوسرے کو مات دینے کی کوشش میں لگی تھیں۔ کمبخت ماریوں کو اپنی نندکی تیوری کے بل نظر آ رہے تھے نہ انگارے برساتی آنکھیں۔

شادی کے بعد دعوتیں شروع ہو گئیں۔ آپا کی سسرال کافی بڑی تھی اور احسان صاحب کا خاندان بھی وسیع تھا۔ پھر ان کی سسرال۔ ہر جگہ سے دعوت وصول ہوئی اور ہر جگہ محتشم کی فیملی بھی مدعو تھی، احتشام صاحب کی بھی۔ جب چھوٹی بھابھی (ممتنی) نے ان سے پوچھا۔

"آپا! آپ دعوت نہیں کریں گی؟ اور رامس کی ساس سسر کو بلائیں گی نا؟"

جی میں آیا کہہ دیں، میرا ان احسان صاحب سے کیا رشتہ ہے جو انہیں بلاؤں گی۔ میری ثنا سے رشتہ دیں تو بات بھی ہے۔ لیکن سب کی دعوتیں کھا چکی تھیں۔ خود دعوت دینے کا ارادہ تھا ہی نہیں۔ سنا چکی تھیں کہ "دعوتیں کھا کھا کر بیزار ہو گئے ہیں۔ توبہ! تھکاوٹ الگ ہے۔" مگر ایک دن احتشام صاحب نے ان سے جب نارمل انداز میں کہا۔

"رات کو ہوٹل میٹروپول میں ڈنر دے رہا ہوں احسان صاحب کی فیملی کو۔ ہمارے گھر والے اور آپا وغیرہ تو ہیں ہی۔ آپ کا جی چاہے تو آجائیے گا۔"

ان کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ تو بات ختم کر کے جا چکے تھے۔ یہ پلنگ پر دھم سے گریں۔ "یہ کیا ہو رہا ہے میرے گھر میں ایسی رازداری۔ ارے! کیا میں گھر میں دعوت نہیں کر سکتی تھی؟ مہنگا ہوٹل۔ ہزاروں پانی پھر جائے گا۔ اوہ! یہ تو مجھے کنگال کر دیں گے بھالی کے اڈے میں۔"

وہ اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گئیں۔ مگر ثنا کے پرزور اصرار پر انہیں تیار ہو کر ہوٹل جانا ہی پڑا، بلکہ سب سے مل کر مسکرانا بھی پڑا۔ مہمانوں اور کھانوں کی اقسام کی تعداد دیکھ کر خرچ کا اندازہ لگانے لگیں۔

"گئے پچاس ہزار۔"

روحینہ سامنے تھی۔ وہ اشاروں سے پوچھتی رہیں۔ یقیناً" ان کے اصرار پر روحینہ نے اپنی بھابھی کو ثنا کے لیے تیار کر لیا ہوگا۔

"آج ثنا بہت پیاری لگ رہی ہے۔ یقیناً" کامران کو پسند آئی ہوگی۔ آج اچھا موقع ہے۔ خوب صورتی کو ترجیح دیں گی۔ روحینہ کی بھابھی اور ثنا کے باپ کی پوزیشن بھی خاصی اسٹرانگ ہے۔" مگر دعوت کے خاتمے تک... روحینہ اور ان کی بھابھی نے منہ سے بات تک نہ نکالی بلکہ داماد کے ہی صدقے واری ہوتی رہیں۔

غصے، مایوسی سے جلتی جھلتی گھر آئیں۔ غصہ ثنا پر اتارا۔ "بے وقوف گدھی، بے عقل!"

☆ ☆ ☆

دن گزرتے گئے۔ آپا بہوؤں کو لے کر چلی گئیں اور سکوت طاری ہو گیا۔ ہر طرف جامد سکوت۔ عالیہ کے فون آتے تصویریں آتیں۔ سامیہ کے ساتھ بہت پرمسرت زندگی گزار رہی تھی۔

"پھپھو بہت خیال رکھتی ہیں۔" وہ فون پر بتاتی۔

"گھر کا سب انتظام ہم دونوں کے سپرد ہے۔ چاروں جب چلے جاتے ہیں۔ گھر میں سناٹا ہو جاتا ہے اور جب چاروں آتے ہیں۔ اس قدر ہنگامہ خیز ماحول ہوتا ہے۔ اتنی مصروفیت کہ سانس لینے میں بھی ٹائم لگتا ہے۔

اریج بے حد مدد کرتے ہیں۔ وہ بہت بااخلاق اور بے حد تعاون کرنے والے ہیں۔ رامس کے البتہ بہت نخرے ہیں۔ بے چاری سامیہ نخرے اٹھاتے اٹھاتے ہلکان ہو جاتی ہے۔ پھر اریج رامس کو ڈانٹتے ہیں۔ سمجھاتے ہیں۔ رامس بھی شرمندہ ہو کر معافی مانگتے ہیں۔ پھر کئی دن بہت اچھا ماحول ہوتا ہے۔ عالیہ! سامیہ بہت پیاری طبیعت کی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے سامیہ بھی میری بہن ہے۔ اور واعظ، حافظ اتنے پیارے ہیں۔ حد نہیں۔ بہت پرلطف وقت گزرتا ہے ہنستے کھیلتے۔"

عالیہ اور ہشام کے امتحان ہو رہے تھے۔ وہ پڑھائی میں مصروف ہو گئے۔ محسن نے چچا کو ان کے آفس سے گھر لانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اوپر آکر چائے پینے اور گپ شپ کا بھی۔

عالیہ بی اے کے بعد ایک اسکول میں پڑھانے لگی۔

عالیہ کے بیٹا ہونے کی خبر نے گھر میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ عالیہ نیچے چچا ابا کو خوش خبری سنانے آئی۔

چچا ابا نے ہنس کر بیگم سے کہا۔

"لو بیگم! محتشم مجھ سے چھوٹا ہو کر نانا بن گیا۔ آخر! میں دادا کب بنوں گا؟"

بیگم ناک چڑھا کر بولیں۔ جب اللہ کو منظور۔"

"تو آپ نے کوئی لڑکی دیکھی؟ پہلی قسط اسی طرح شروع ہوتی ہے۔" احتشام صاحب پرشوق انداز میں بولے۔

"مجھے جلدی نہیں ہے۔ پہلے ثنا کی ہوگی۔ یہ طے ہے۔" احتشام صاحب محتشم کو مبارک باد دینے اوپر گئے۔ دادی بھی بہت خوش تھیں۔ احتشام صاحب کے آنے سے مزید رونق ہو گئی۔

"تم جس دن آجاتے ہو، محتشم کی عید ہو جاتی

ہے۔" اماں نے چپکے سے کہا۔

"جانتا ہوں۔ اسی لیے روز نہیں آتا۔ بہت مہنگی ہوتی ہے عید۔ دیکھیں! کتنا اہتمام کر دیا ہے۔ بڈھا آدمی ہوں۔ معدہ بھی برداشت نہیں کرتا یہ سب۔"

جب بھی عالیہ امریکہ سے آئی ہوئی تصویریں ثنا اور چچا ابا کو دکھانے نیچے جاتی، چچی کا بلڈ پریشر بڑھ جاتا۔

"کیا عیش کر رہی ہے عالیہ۔ کبھی خواب میں بھی ایسا گھر، ایسی چیزیں، ایسے برتن نہ دیکھے ہوں گے، جن کو استعمال کر رہی ہے۔ ارج کس قدر خوش ہے۔ بچے کو گود میں اٹھائے، اسے اچھالتے ہوئے، پیار کرتے ہوئے تصویریں۔ "یہ بھی جنت" کھلکھلاتی ہوئی اور بچے کا کمرہ کیسا بنایا ہے۔ جیسے نوادر خانہ، ہر چیز ہم رنگ۔ کھلونوں کے انبار، اف!" ثنا خوش ہو ہو کر انہیں بتاتی۔ وہ چڑ جاتیں۔

"اونہہ! اپنے باپ کو دکھاؤ۔ بیٹی کی فکر نہیں۔" آخری بات دل میں کہہ کر رہ جاتیں۔

ایک روز عالیہ بس کے انتظار میں کھڑی تھی تو ایک گاڑی آ کر رکی۔ اس میں سامیہ کی امی تھیں کامران کے ساتھ۔

"ارے! آؤ میں تمہیں گھر پہنچاتی ہوں۔"

"السلام علیکم آنٹی! دراصل میرا رکشہ والا بیمار ہے۔ آج آیا نہیں اس لیے۔"

ان کے اصرار پر وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ وہ بتانے لگیں۔

"امریکہ سے میری ایک بھتیجی آئی ہے۔ سامیہ اور عالیہ نے کچھ سامان بھیجا ہے۔ میں عالیہ کا پارسل لائی ہوں۔ تمہاری طرف ہی جا رہی تھی۔"

راستے میں وہ عالیہ سے اس کی پڑھائی کا پوچھنے لگیں۔ عالیہ نے بتا دیا کہ وہ تعلیم کو خیرباد کہہ چکی ہے۔ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ سامیہ کی امی بہت متاثر ہوئیں۔ بیٹے سے کہنے لگیں۔

"دیکھا! یہ ہے بہترین تربیت کا نتیجہ۔ جس عمر میں لڑکیاں سیر و تفریح، نئے کپڑوں اور میچنگ کی فکر میں مبتلا رہتی ہیں۔ یہ بچی جاب کر کے باپ کا سہارا بننا چاہتی ہے۔ عالیہ کے بھی کچھ ایسے ہی خیالات تھے۔ ادھر عالیہ ہماری سامیہ کا سایہ بنی ہوئی ہے۔ سامیہ بہت تعریف کرتی ہے۔ عالیہ کی وجہ سے سامیہ وہاں بہت مطمئن اور خوش ہے۔ ایک دوسرے کا خیال رکھنے والی۔ سامیہ کہتی ہے، عالیہ تو لگتا ہے میرے دل میں جھانک کر میرے جذبات سے آگاہ ہو جاتی ہے۔ مجھے اور احسان کو بھی عالیہ کی وجہ سے بہت اطمینان ہے۔"

پارسل عالیہ کو دے کر انہوں نے پھر کسی دن آنے کا وعدہ کیا اور چلی گئیں۔ عالیہ نے صائمہ، ابا اور دادی کے لیے سوئٹر بھیجے تھے۔ چند چیزیں بہن بھائی کے لیے اور ثنا کے لیے بھی۔ بچے کی تصویریں سب کے لیے توجہ کا مرکز تھیں۔

☆ ☆ ☆

کچھ وقت آگے سرکا، پھر ایک دن اچانک پھپھو، عالیہ اور بچے کو لے کر آ گئیں اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ خوشیوں کی برسات نے تمام افراد کو شرابور کر دیا۔ بچے کی رونق سب سے زیادہ تھی۔ احتشام صاحب اور ثنا کا وقت زیادہ تر اوپر گزرنے لگا۔

پھر یک لخت عالیہ کی شادی کا ذکر ہونے لگا۔ پھپھو خاص اس کام کی انجام دہی کے لیے ہی آئی تھیں اور ایک روز دھماکا ہو گیا۔

احسان صاحب نے اپنے بیٹے کامران کے لیے عالیہ کا رشتہ مانگا۔ پہلے عالیہ اور اب عالیہ۔ پھپھو اس رشتے کے حق میں تھیں۔ روحینہ نے فوراً یہ خبر اپنی نند یاسمین کو پہنچائی۔

"سچی بات ہے آپا! میری تو خواہش تھی بھائی جان ثنا کو سوچتا، میں مگر حکم تو بھابھی کا چلتا ہے۔ انہیں آپ کے دیور کی لڑکیاں بہت پسند ہیں۔ آخر! ایک ان کی بیٹی کی جٹھانی ہے۔ سہیلی بھی ہے۔ بھائی جان نے میری ایک نہ سنی۔ کیا کر سکتے ہیں۔ ان کی اولاد ہے۔ وہ مختار ہیں۔"

یاسمین کا غصہ عروج پر تھا اور بے بسی اس سے بھی بڑھ کر۔ روحینہ سے دبی زبان سے شکوہ کیا۔

"روحی! تم نے زور لگایا ہی نہیں۔ نند کی نند کے دیور کی لڑکی نظر آ گئی۔ نند کی نند کی بیٹی یاد ہی نہیں آتی۔ لگتا ہے کامران کی پسند پر یہ رشتہ اس کے کہنے سے دیا ہے۔"

دور کی کوڑی لائی تھیں۔ یاسمین کو یاد آیا۔ پچھلے دنوں احسان صاحب کے گھر میلاد شریف کی محفل میں صائمہ اور عالیہ دونوں موجود تھیں۔ بھلا ان کا رشتہ ہی کیا تھا۔ سامیہ ان کی بیٹی سہی۔ اس کی جٹھانی کی ماں بہن کو کیوں بلایا تھا بھلا۔ روحینہ کی بھابھی اتنی بھی ملنسار نہ تھیں جو نند کی نند کی دیورانی کو بلا لیتیں۔ یقیناً "صائمہ نے خود چکر چلایا ہے۔ کامران کے سامنے عالیہ کو پیش کر کے اس کا دل جیت لیا۔ ثنا تو اتنی بے عقل ہے، اسے کچھ آتا ہی نہیں۔ کس طرح کسی شان دار نوجوان کو اپنی جانب متوجہ کیا جاتا ہے۔ کیسے چالاکی سکھاؤں اسے کہ انسان کو اپنے فائدے کے لیے.... کچھ بھی کرنا چاہیے۔ امیروں سے میل جول بڑھا کر اپنا اسٹینڈرڈ ہائی کرنے میں بھلائی ہے۔ مگر وہی لے دے کے چچا کے گھر چکر لگاتی ہے۔

کیسے ان نادار پینڈو لوگوں سے بچاؤں۔ گھٹیا لوگ، نچلے درجے کا رہن سہن۔ گھر میں کوئی قیمتی چیز نہیں۔ ہاں! مگر لڑکیوں کو لڑکے پھانسنے کی خوب پریکٹس ہے۔

اس دن جب بہت دانت پیس پیس کر تھک گئیں تو بیٹی کو بلا کر سمجھانے کی کوشش کی۔

"ثنا! کچھ ہوش کرو۔ چچا کے گھر کے چکر چھوڑو۔ اچھی اعلا سوسائٹی میں بیٹھا کرو۔ تمہاری وہ کلاس فیلو ثمینہ ہے نا۔ کتنا اعلا معیار ہے اس کا۔ ڈیفنس میں رہتی ہے۔ تین بھائی ہیں اس کے۔ تینوں بڑی بڑی پوسٹ پر ہیں اور وہ جو ہے نذرہ سلجھی ہوئی، دولت مند ہے۔ اس کے گھر بھی جایا کرو۔" "امی! ثمینہ بہت بد دماغ ہے اور اس کے بھائی سڑیل مزاج۔"

"سڑیل اس لیے ہیں کہ دولت مند ہیں۔ نخرے جچتے ہیں ان پر.... اچھا! وہ نذرہ...."

"نذرہ؟ اف اللہ! اس کا کوئی دین ایمان ہی نہیں۔ پیٹھ پیچھے ہر کسی کی برائی کرتی ہے۔ میری دوسری دوستوں سے میری بھی برائیاں کرتی ہے۔ حالانکہ میں تو اس سے زیادہ بات کرتی ہی نہیں۔ میرا خیال یہ ہے کہ اپنے جیسوں سے ملنا چاہیے۔"

"چلو خیر! تم کو تو اپنے ماموں بھی نظر نہیں آتے۔ اپنے جیسے وہ بھی ہیں۔"

"میں جاتی تو ہوں۔ حالانکہ معاف کیجیے۔ آپ کی بھابھیاں ان کی بیٹیاں، اللہ توبہ! ایسے منہ بناتی ہیں، جیسے وہ شہزادیاں ہیں اور میں ان کی رعایا۔ پتا نہیں آپ کس طرح ان کے نخرے برداشت کر لیتی ہیں۔ فیشن کو ہی اوڑھنا بچھونا، ان کی عبادت ہے۔ اف!"

"تو وہ ہیں شہزادیاں۔ تم نے خود کو اتنا گرا لیا ہے کہ وہ خود کو تم سے برتر سمجھتی ہیں اور فیشن تو آج کل ضروری ہے۔ خود کو بہتر دکھانے اور خود اعتمادی کے لیے۔ مگر تم کو دقیانوسی اور گھٹیا لوگوں کی صحبت ہی پسند ہے۔ ہزار بار سمجھایا بہتر لوگوں سے ملا کرو۔"

"میں.... بہتر لوگوں سے ہی ملتی ہوں۔" ثنا نے تیز لہجے میں کہا۔ "اپنی دادی سے، پھپھو سے، چچا سے۔ کم از کم کھانا کھاتے یا چائے پیتے ہوئے شک تو نہیں ہوتا کہ پتا نہیں رزق حلال ہے یا۔"

یاسمین بھڑک گئیں۔ دو تھپڑ لگا کر چلائیں۔

"میرے بھائی کیا حرام کماتے ہیں؟ یہ سب تمہاری دادی نے تمہارے ذہن میں زہر بھرا ہے۔ میرے میکے والوں سے تو چڑ ہے انہیں۔"

آج کل عالیہ کا بچہ ثنا کی دلچسپی کا مرکز تھا۔ روز چلی جاتی۔

محتشم نے احتشام صاحب سے مشورہ کیا۔ "بھائی جان! احسان صاحب اپنے سوال کا جواب لینے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔"

"محتشم میری دلی آرزو تھی کہ ایک بھتیجی میرے گھر کی زینت بنتی۔" انہوں نے سوچتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! آپ کا اشارہ میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ بھائی! ہم کمتر لوگ ہیں۔ بھابھی ہرگز اس پر راضی نہیں ہوں گی۔ آپ تو جانتے ہیں۔ میری وجہ سے یا میری بیٹی کی وجہ سے آپ کے گھر میں بدامنی ہو،

نہ آپ کو خوشی ہو گی اور نہ مجھے اطمینان۔ مجھے احسان اور محسن' ہشام' جیسے عزیز ہیں۔ مجھے بہت خوشی ہوتی اگر ایسا ممکن ہوتا۔ میں ...... بھابھی کی ناراضی برداشت نہیں کروں گا۔ اس لیے آپا کی رائے کامران کے حق میں ہے۔ وہ دراصل آئی ہی اس لیے تھیں کہ ...... کامران کی سفارش کریں۔ سامیہ کی خواہش ہے۔"

محتشم افسردہ تھے۔ احتشام بھی اداس اور غمزدہ تھے۔ ان کی خواہش بیگم کی بدمزاجی کی نذر ہو گئی۔

"صبح سے اوپر کیا اٹھا پٹخ ہو رہی ہے؟ کرسیاں گھسیٹی جا رہی ہیں۔ نیا فرنیچر آیا ہے یا کیا ہے؟ پتا تو کریں۔"

یاسمین نے احتشام صاحب کو متوجہ کیا۔ احتشام صاحب نے ابرو اٹھا کر بیگم کو دیکھا۔

"آپ کو کب سے اوپر والوں کی فکر ہو گئی؟" طنزیہ جملہ' خشک لہجہ بھنا گئیں۔

"مجھے فکر نہ ہو گی تو اور کس کو ہو گی؟ آپ جیسی لاپروا نہیں ہوں۔ میں اپنے گھر کے کونے کونے کا دھیان رکھتی ہوں۔ پھر بھلا! یہ شور معلوم کرنا تو چاہیے قصہ کیا ہے؟"

"دوسروں کی جاسوسی قابل تعریف فعل نہیں ہے۔ ٹوہ لینے کی ضرورت کیا ہے؟ دوسرے کے گھر کیا ہو رہا ہے" اس معلومات سے کیا حاصل؟"

"آپ سے تو بات کرنا فضول ہے۔" غلطی کی جو توجہ اس شور کی طرف دلا دی۔" غصے میں ہاتھ سے گلاس نیچے گر کر چور چور ہو گیا۔

"اس سے پہلے کہ آپ جگ بھی گرا کر توڑیں۔ بتا دیتا ہوں۔ آج احسان صاحب کی فیملی آ رہی ہے۔ ان لوگوں کے لیے جگہ بنائی جا رہی ہے۔ اندر کمرے میں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے۔ گنجائش کم ہے۔"

یک لخت سکتہ طاری ہو گیا۔ "وہ کیوں آ رہے ہیں؟"

"رشتہ دیا تھا' اس کا جواب لینے۔ کاش میں اس قابل ہوتا کہ اپنے بیٹے کے لیے رشتہ مانگتا۔"

جل کر راکھ ہو گئیں۔ "اللہ نہ کرے جو ایسے گھر میں رشتہ کروں۔ لڑکیوں کی کوئی کمی ہے؟" اوپری دل سے جملہ ادا کیا۔ دل میں تو تیر جا چبھا تھا۔ کامران جیسا خوبرو' اعلا خاندان' برسر روزگار...... عالیہ غالیہ' کے پاس ہے ہی کیا۔ نہ باپ کی دولت' نہ پوزیشن۔ جب ایک بار روحینہ کو لالچ دینے کے لیے کہا تھا۔

"ثنا کے باپ کے پاس دولت اور پوزیشن بھی ہے۔ میں زور دوں گی تو یہ کوٹھی جہیز میں دے دیں گے۔"

روحینہ نے کہا۔ "بھائی کو بہو کی اعلا پوزیشن سے کیا اور کامران کی ہی ہے یہ کوٹھی۔ دو بہن بھائی ہی تو ہیں۔ سامیہ کو بھی ایک گھر دیں گے۔ ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہے۔ چاہیں تو ایک کوٹھی اور بھی خرید لیں۔ ان کی شرط ہی یہ ہے کہ ...... خاندانی شریف گھر کی لڑکی لائیں' جہیز کے بغیر ذاتی خوبیوں کے ساتھ کہ وہی جہیز سب سے قیمتی ہو گا۔"

"افوہ! جیسے ثنا میں کوئی خوبی نہیں۔" ایک بار پھر روحینہ کو فون کر کے تصدیق چاہی۔

"جی آپا! آج جواب لینے کے لیے جائیں گے آپ کے گھر۔"

"میرے گھر" آہ۔"

"ارے آپ کا ہی ہے۔ آپا! فکر نہ کریں۔ شگون نیک ہے۔ کل کو ثنا کے لیے آپ کے پاس۔"

"چھوڑو اس بات کو۔ میں تو تب خوش ہوتی' جب وہ بھی میرے پاس جواب لینے آتے ثنا کے لیے۔"

"آپا! ان شاء اللہ ثنا کا بھی ہو جائے گا۔ کوئی کمی تو ہے نہیں۔ کیوں اتنا دل پر لے رہی ہیں؟ دراصل ہماری بھابھی صائمہ بھابھی سے بہت متاثر ہیں۔ ان کی تربیت کی تعریف کرتی ہیں۔ اور سامیہ نے بہت زور دیا ہے۔ آپا رشتے تو قسمت سے ہوتے ہیں۔ بھائی جان احتشام بھائی کو پسند کرتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شادی کو اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ کامران سے کہہ رہے تھے۔ "بیٹا جی! تم نے بہت اونچی جگہ منتخب کی ہے اپنے لیے۔ ایک باحیا' باکردار۔ حساس' ذمے دار

لی پسند کرکے جو ہر قسم کی صلاحیت سے مالا مال ہے۔"

یاسمین پر جنون سا طاری ہو گیا۔ "احتشام کا خاندان' ہونہہ! اور صائمہ کے خاندان کا پوچھا تک نہیں۔" اپنی برتری۔ صائمہ کی کمزور پوزیشن کا ہمیشہ سے احساس تھا۔ مقابلہ بے کار تھا۔ کہاں وہ' کہاں صائمہ ...... نچلے درجے کے خاندان سے تعلق رکھنے والی۔" احتشام صاحب پر بھی غصہ تھا۔ کبھی جو اس عورت نے میری ہم نوائی کی ہو۔ ہمیشہ شرمندہ کرنے کے درپے رہے۔

"میں' یہ رشتہ نہیں ہونے دوں گی۔ ثنا سے نہ سہی کم از کم صائمہ سے تو ہرگز نہیں۔" دندناتی ہوئی اوپر آئیں۔ صحن میں کرسیاں لگائی جا چکی تھیں۔ فرش دھلا ہوا تھا۔ حسب استطاعت سجاوٹ بھی تھی۔ ایک چوکی پر پیلے اور ہرے رنگ کی چادر' سرخ گاؤ تکیے۔ میز پر تازہ پھولوں کا گل دان' یہ اہتمام اتنے بڑے اتنے معزز خاندان کے شایان شان ہرگز نہیں تھا۔

"کہاں ہو صائمہ؟ ذرا باہر آؤ۔" اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔ غصے میں بھرائی ہوئی۔

صائمہ کچن سے برآمد ہوئیں۔ شکن آلود کپڑے' بکھرے بال' منہ پہاڑ۔ "ہونہہ! ان سے متاثر ہیں کامران کی امی۔ حلیہ تو دیکھو جیسے ...... جیسے فقیرنی۔" (ہاں یہی تعریف کافی ہے)

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس کی دعوت ہے؟" انجان بن گئیں۔

"بھابھی! آپ کو بھائی جان نے بتایا نہیں؟ میں نے بھائی جان سے کہا تھا کہ آپ سے ......"

"اوہو چھوڑو' مجھے بتاؤ۔ اور تمہارے پیروں میں کیا مہندی لگی ہے؟ نیچے آکر بتا نہیں سکتی تھیں؟"

"وہ بھابھی! سامیہ کی امی' ابا اور ان کے چند عزیز آ رہے ہیں۔ غالیہ کے لیے ...... رشتے کے سلسلے میں۔"

بے چاری صائمہ ویسے بھی ان سے مرعوب تھیں۔ مزید ڈر گئیں۔

"بہت پورا جال ڈال چکی ہو تم۔ مگر میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ تم اس رشتے سے انکار کرو گی۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ سوچو! کہاں وہ' کہاں تم۔ آسمان میں زمین کا پیوند بھی کبھی لگا ہے؟ بس یہی کہنے آئی تھی۔" کہہ کر پرغرور انداز میں ہنسیں اور واپسی کے لیے مڑ گئیں۔ اندر کمرے سے محتشم برآمد ہوئے۔

"ارے آئیے بھابھی! السلام علیکم' آئیے نا بیٹھیے۔" بے حد خوش دلی سے مخاطب تھے۔

"نہیں! چلتی ہوں۔ بس یہی کہنے آئی تھی کہ اس رشتے سے انکار کر دو۔"

وہ بھونچکا سے ہو گئے۔ "مگر ...... کیوں؟ بھائی جان نے تو خود منظوری دی ہے۔"

"جو بھی ہو۔ میری رائے نہیں ہے۔ اگر اس کے خلاف تم نے ہاں کی تو آج سے مجھ سے تعلق ختم کرو۔ نہ مجھ سے نہ بچوں سے کوئی واسطہ رہے گا۔ پھر تم جانتے ہو۔ گھر بھی چھوڑنا پڑے گا اور بھائی کو بھی......"

محتشم انتہائی پریشان تھے۔ "کیا ہوا بھابھی! کچھ پتا تو چلے۔" کپکپانے لگے تھے۔

"یہ ضروری تو نہیں کہ تمہاری ہر خواہش پوری ہو۔ اونچی جگہ ہاتھ مارنے کی۔ مگر خیر! تم سے زیادہ تمہاری بیوی کے کارنامے ہیں۔ ان کے گھر جا جا کر۔ بیٹی کی نمائش کر کے خوب ہی پر چالیا۔"

محتشم لڑکھڑا کر کرسی پر بیٹھ گئے۔ طبیعت بھی خراب تھی اور اب پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ رہی۔ چکر سا آ گیا۔ صائمہ نے چیخ کر کہا۔

"خدا کے واسطے بھابھی! آپ چلی جائیں۔ میں انکار کر دوں گی؟"

وہ محتشم کی طرف لپکیں۔ وہ لمبے لمبے سانس لے رہے تھے' نڈھال سے۔ محتشم نے صائمہ کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"ہٹو! ذلیل کروا دیا مجھے۔ میری عزت کا خیال نہیں کیا۔"

محتشم نے جیسے تھک کر گردن کرسی کی پشت پر ٹکا دی۔ صائمہ رونے لگیں۔ اسی وقت نفیسہ آپا کمرے سے باہر آئیں۔ کڑی نظروں سے یاسمین کو گھور کر

زور سے بولیں۔

"یاسمین! تم اپنی بدباطنی سے باز نہیں آسکتیں؟ بند کرو اپنی بکواس اور محتشم! کیا تم واقف نہیں ہو یاسمین کی عادت سے؟ بدخصلتی اور الزام تراشی مزاج میں ہے۔ تم کیوں اثر لیتے ہو؟ نہ یہ صائمہ کی کوشش ہے' نہ کسی اور کی۔ میری کوشش اور صائمہ کی نیک فطرتی کے علاوہ سامیہ کی خواہش ہے اور جو اس رشتے میں رخنے ڈالے گا' بے شک وہ شریک نہ ہو۔"

"آپا! آپ ... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" یاسمین نفیسہ آپا کے بگڑے تیوروں سے ڈر گئیں۔ "آپ تو ہماری اپنی احتشام کی سگی بہن ہیں۔ آپ تو..."

"سگی بہن کو نا انصاف ہونا چاہیے؟ میں احتشام ہی کی نہیں محتشم کی بھی بہن ہوں۔ ایک باپ کی اولاد اور خدا کا شکر ہے کہ تم سے میرا خون کا رشتہ نہیں ہے اور رہا اس رشتے کا معاملہ تو یہ ہمارا خاندانی معاملہ ہے۔ ہم جہاں چاہیں گے' اپنے بچوں کے رشتے کریں گے۔ تم سے کوئی نہیں پوچھے گا اور کیوں پوچھے۔ تم ہوتی کون ہو دخل دینے والی؟"

آپا کے غصے کو دعوت دے دی تھی یاسمین نے۔ وہ اتنی مشتعل تھیں کہ محتشم کو بھی سخت سست سنانے لگیں جو یاسمین سے ڈرتے ہیں اور تعظیم کرتے ہیں۔ صائمہ پر بھی خفا ہوئیں کہ میرے طے کیے ہوئے رشتے سے انکار کرنے والی تم کون؟

"آپا! آپ تو اتنی دور رہتی ہیں۔ آپ نہیں جانتیں۔ یہ لوگ کس طرح ہم سے سوتیلے پن کا سلوک کرتے ہیں۔ مجھے خبر ہی نہیں اور میرے خاندان کے لڑکے سے رشتہ۔ وہ میرا اپنا ہے۔ میری بھابھی کا بھتیجا ہے۔"

"تمہارا اپنا ہے تو یہ شکوہ اپنوں سے کرو۔ احسان صاحب سے کہ تمہارے ہوتے ہوئے انہوں نے تم سے اس رشتے کی منظوری کیوں نہ لی۔ اپنا حق جتانے یہاں کیوں آگئی ہو؟ محتشم نے تو اپنے بڑے بھائی' بڑی بہن سے مشورہ کرنے کے بعد رشتہ کیا ہے۔ اور خبردار! اگر تم نے مزید کوئی بکواس کی۔ میں ہوں ذمہ دار اس رشتے کو جوڑنے کی۔ میری خواہش پر ہو رہا ہے۔ اور اب تمہارے کسی فساد سے بچنے کے لیے آج ہی نکاح بھی کرنے کا سوچ لیا ہے۔ تم سے مجھے خیر کی تو کبھی بھی توقع نہیں تھی۔ اب بھی وہی رائے ہے میری تمہارے بارے میں۔"

"آپا! کیا کہہ رہی ہیں۔ میں نے تو ہمیشہ آپ کو ہمدرد سمجھا۔ آپ ہی تو سگی بہن ہیں احتشام کی۔" آب دیدہ ہو گئیں۔ "آپ کو ... اپنی سگی بھتیجی سے زیادہ سوتیلی بھتیجی کا خیال ہے؟ ثنا کے بارے میں آپ نے کیوں نہیں سوچا؟ اس میں کیا کمی ہے؟"

"کمی ہے۔ اس میں نہیں تم میں۔ صائمہ کی شرافت' اس کا صبر' ضبط اور برداشت' تہذیب اور سلیقہ تم بھلا کیا مقابلہ کرو گی۔ کبھی سوچنا! تم کو تو کسی نے بات کرنے کی تمیز نہیں سکھائی۔ یہاں کون — دست نگر ہے تمہارا؟ جس پر حق جتا کر حکم چلانے آگئیں۔" آپا بھڑک گئیں۔ یاسمین سٹپٹا گئیں۔

"میں تو بس آپا! اپنا گھر سمجھ کر آگئی۔ آخر میرا گھر ہے۔ یہاں رہنے والوں سے بے خبر تو نہیں رہ سکتی۔"

"کون سا گھر بی بی؟" وہ طنزاً ہنس کر بولیں۔ "یہ گھر یہ ابا میاں نے اماں کے نام کر دیا تھا ہم سب کی گواہی میں۔ کیونکہ احتشام کی تعلیم کے لیے جو رقم درکار تھی' وہ اماں نے اپنے والد کے دیے ہوئے پلاٹ کو فروخت کر کے مہیا کی تھی۔ اماں کا احسان مانو۔ انہوں نے احتشام کو یہاں رہنے کی اجازت ہی نہیں دی' احتشام کے نام لکھ دیا۔ اس لیے کہ وہ بڑا بھائی ہے۔ سب کو ساتھ رکھنے کی خواہش تھی احتشام کی۔ مگر یہ تمہارا منحوس وجود تھا' جس نے بھائیوں سے ہی نہیں اماں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ایسی زیادتیاں کیں کہ وہ محتشم کے ساتھ چلی گئیں۔"

یاسمین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"مگر آپا! احتشام کا بھی تو کوئی حق ہوگا؟ حصہ' ترکہ؟"

"اس گھر کے سوا ابا میاں کے پاس کوئی جائداد

نہیں تھی۔ یہ تو اماں کی نیک نیتی اور محتشم کی نیک نفسی تھی کہ یہ راز آج تک راز رہا۔ محتشم کی حق تلفی پر میری ہمیشہ اماں سے بحث ہوئی مگر انہوں نے یہی کہا۔ جو دے دیا' وہ واپس کیوں لوں۔ محتشم نے' صائمہ نے تکلیفیں اٹھائیں۔ کبھی شکوہ نہیں کیا۔"

"چھوڑیں آپا!" محتشم کمزور آواز میں بولے۔ "میں احسان صاحب کو فون کر کے انکار کر دیتا ہوں۔ بھابھی خوش ہو جائیں۔"

"اگر تم سمجھتے ہو' تمہاری یہ قربانی یاسمین کو خوش کر دے گی تو تم سے بڑا احمق کوئی نہیں۔ اب میں ہی اس رشتے کو مضبوط کروں گی۔ آج ہی نکاح کر کے۔ ابھی تک میں دیکھتی رہی تھی کہ تمہارے ساتھ کس قدر بدسلوکی ہو رہی ہے۔ اماں کی نرم دلی نے یاسمین کے حوصلے بڑھائے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں نہ تمہاری حق تلفی دیکھ سکوں گی' نہ تمہارے بچوں کی۔ بہت ہو گیا۔ چلو صائمہ! فون ملاؤ... اور محتشم! تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اندر جا کر آرام کرو۔"

"آپا! ابھی تک آپ خاموش تھیں تو اب بھی نہ بولتیں۔ میں تو بھائی جان بھابھی کی برتری تسلیم کرتا ہوں۔ اماں نے مجھے قسم دی تھی۔ اس لیے خاموش رہا اب تک۔" محتشم اندر چلے گئے۔

"کیسے چپ رہتی؟ یاسمین کی بددماغی اور بدزبانی اور بدمزاجی بھی دیکھتی رہی۔ اب پانی سر سے اونچا ہو تو مجبور ہو کر بولی۔ جب مجھے اور احتشام کو اماں کی قربانیوں کا اتنا احساس ہے تو یاسمین کو بھی علم ہونا چاہیے۔ وہ آج تک اماں اور محتشم کے احسان کی منکر ہے۔ میں تو قرض کی ادائیگی کی قائل ہوں۔ یہ ادائیگی۔ میری پرورش اور شادی جس طرح اماں نے کی' اس احسان کو اسی طرح مان کر محتشم کی بیٹی کو بیاہ [illegible]ی۔ پھر بھی وہ قرض ادا نہ کر پائی۔ جو محبت' شفقت' تربیت ان سے سوتیلی ماں سے ملا' شاید سگی ماں نہ کرپاتی۔ اپنی ماں تو جو چاہے کر لے۔ دوسری کا یہی خوف ہوتا ہے کہ غیر تک منہ پھاڑ کر آگے بڑھتے ہیں۔ تعجب ہے آج تک تم نے ان کی محبت اور خلوص کا حق ادا نہ کیا یاسمین!"

یاسمین کی سٹی گم تھی۔ عجیب انکشافات ہو رہے تھے۔ انہوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ آپا اور احتشام کو سوتیلی ماں' سوتیلی کیوں نہیں لگتیں۔ وہ صرف اپنی بدباطنی کی وجہ سے انہیں غیروں کی صف میں شمار کرتی رہیں۔

احتشام صاحب جو زینے پر کھڑے بیوی اور بہن کے مکالمے سن رہے تھے اور سامنے آکر یاسمین کو کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے آپا کے قریب آگئے۔ ان کی نگاہ میں جو قہر تھا' تحقیر تھی' اس نے پسینہ پسینہ کر دیا۔ گو کہ وہ عادی تھیں سخت سست سننے کی مگر آج کی یہ نظر... ان کے فخر و برتری کے غرور کو زمین بوس کر کے بدخصلتی کا بورڈ چسپاں کر گئی۔ آپا نے تو جوتے مارے سوا لگ۔

"آپا!" احتشام صاحب نے مضمحل لہجے میں کسی ہارے ہوئے کھلاڑی کی طرح جیسے اعتراف شکست کا انداز اپنایا۔ "آپ نے آج بہت صحیح وقت پر درست فیصلہ کیا ہے۔ اب اماں اور محتشم کے احسانوں کے بوجھ سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ قرض کی فوری ادائیگی کے لیے۔ آج صائمہ اور محتشم سے ثنا کے لیے ہشام کا رشتہ مانگ کر سرخرو ہونا چاہتا ہوں۔ صائمہ! تم جواب دو۔"

صائمہ پہلے ہی حواس باختہ ہو رہی تھیں۔ ان کے سوال پر گڑبڑا گئیں۔ اندر گھس گئیں اور محتشم کے ساتھ باہر آئیں۔ یاسمین دم بخود تھیں۔ یہ کیسی الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ محتشم بھائی سے لپٹ گئے۔ دونوں آنسوؤں سے رو رہے تھے۔

"بھائی جان! آپ عظیم ہیں۔" محتشم کے منہ سے نکلا۔

"یار! میرا نام عظیم نہیں ہے۔ میں نے سوچا تمہاری بیٹی میری بہو نہ بن سکی تو میری بیٹی تمہاری بن جائے۔"

آپا نے آگے بڑھ کر دونوں بھائیوں کو لپٹا لیا۔ "اس سے بہتر تو فیصلہ ممکن ہی نہیں۔ آج ہی دونوں..."

یاسمین کو جس ذلت و خواری کا سامنا تھا' اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھیں۔ کسی نے انہیں اس قابل نہیں سمجھا کہ ان کی بیٹی کے بارے میں رائے مانگیں۔

"ارے! وہ زیر تعلیم لڑکا۔ وہ کمتریں محتشم کا بیٹا اور میری ثنا۔" بے اختیار زور زور سے روتی ہوئی زینے کی طرف لپکیں۔

"بیگم! ذرا آرام سے۔ کہیں مارے خوشی کے جلد بازی میں زینے سے لڑھک گئیں تو "اپنا نقصان خلق کی ملامت" والا محاورہ فٹ ہو جائے گا۔"

عجب نظارہ تھا۔ ہر کمرے کے دروازے پر کوئی نہ کوئی۔ اماں اپنے دروازے پر' عالیہ اور عالیہ ڈرائنگ روم' احسن' محتشم کے کمرے کے دروازے پر باہر کی کارروائی سکتے کی حالت میں ملاحظہ کر رہے تھے۔ پھر سب اماں کی طرف دوڑے۔ وہ بھی رو رہی تھیں۔ سب ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

"دونوں نکاح آج ہی ہوں گے۔" یہ فیصلہ ہو گیا۔ احسان صاحب کو بتا دیا گیا۔ مغرب کے بجائے عشا کے بعد اسی جگہ اسی گھر میں' فرق بس یہ کہ مہمانوں کی تعداد کچھ بڑھ گئی۔ کھانے کا انتظام بھی باہر لان میں ہو گا۔ ہشام ہر بات سے بے خبر کو باتھ روم میں دھکیلا گیا۔

ثنا کو اتنا... ہلا ڈالا۔ ... کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ ہاتھوں میں دوپٹہ دبا کر شرمانے اور کسمسانے لگی۔ عالیہ نے اپنے نئے سوٹ نکال کر عالیہ اور ثنا کو دیے۔

ثنا نے عالیہ سے کہا۔ "پہلے تم۔"

عالیہ نے کہا۔ "پہلے تم۔"

"جلدی کرو۔" عالیہ نے ڈانٹا۔

"جلدی کپڑے بدلو! میں خود تمہارا میک اپ کروں گی۔ کامران کی امی سیٹ لائیں گی۔ بعد میں پہن لینا اور ثنا! تمہیں میں اپنا دے دوں گی۔ واپس کرنے کے وعدے کے ساتھ۔ کیونکہ میری امی کے پاس زیور نہیں ہے۔" عالیہ بے چارگی سے بولی۔

"اور میری امی کے پاس ہے مگر وہ دیں گی نہیں۔ خفا جو ہیں۔" ثنا ہونٹ لٹکا کر بیٹھ گئی۔

"کتنی خود غرض لڑکی ہے۔" دادی ثنا پر ناراض ہونے لگیں۔ "زیور کا خیال ہے' ماں کا نہیں۔ بے وقوف! پہلے ماں کو منانا تھا۔ ماں کی ناراضی بری ہوتی ہے۔ ماں کو خوش کرنا لازمی ہے۔ جاؤ! پہلے انہیں مناؤ۔ ابھی نکاح سے پہلے۔ بچے جا کر ماں کو منا کر اوپر لاؤ۔ بیٹی کے نکاح' رخصتی پر ماں کی موجودگی ضروری ہے۔ نئی زندگی کی ابتدا۔ ماں کی دعاؤں کے زیر سایہ ہونا چاہیے۔"

"تمہیں مانیں گی۔ بعد میں چلی جاؤں گی۔" خاصی خوفزدہ تھی۔

"مان جائیں گی۔ شکست خوردہ سپہ سالار عزت کی بحالی کے لیے ذرا سا موقع بھی گنواتا نہیں۔ ذرا سی بھی عقل ہے تو۔"

"لیکن شکست خوردہ سپہ سالار عقل سے زیادہ انا اور ضد کا بہانہ کرے تو کون سا ہتھیار استعمال کرنا چاہیے؟"

"خوشامد اور آنسوؤں کا۔ ایک ماں کے لیے یہ سب سے بڑا ہتھیار ہوتا ہے۔"

دادی اسے بہلاتی رہیں۔ وہ چپ چاپ سنتی رہی۔ داستا جگانے کا طریقہ اب امی کو منانے کے لیے جذباتی ڈائیلاگ اور آنسوؤں کا ذخیرہ بلکہ چشمہ ایجاد کرنے کی ضرورت تھی ورنہ' دادی سے بعید نہیں' وہ نکاح ہی رد کر دیں۔

ثمینہ سعید

فیصلہ
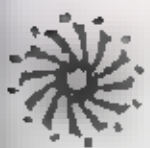
"سرمد! بس دانستہ پریشان نہیں ہوتی۔ یہ پریشانیاں دکھ بننے اور منفی رویے میری روح کو زخمی کر رہے ہیں۔" سیماب نے انگلی کی پور سے آنکھ کا کونا صاف کیا۔ سرمد کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہو بیٹھا۔

"اب تو میں کھل کے ہنس بھی نہیں پاتی۔ جب بہت کام تھے، بہت ساری ذمہ داریاں تھیں تب بھی ایسی اوازاری نہ تھی۔" سیماب کے سینے سے سرد آہ نکلی۔

"میری محبت کافی نہیں ہے کیا؟" سرمد نے اس کے ہاتھ اپنے گرم مضبوط ہاتھوں میں دبائے۔ "ہر وقت ہر لحہ تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"ہاں تم تو ساتھ ہو مگر میں بہت اکیلی ہو گئی ہوں سرمد! اب مجھے تمہاری ضرورت تب محسوس ہوتی ہے جب تم میرے پاس نہیں آسکتے۔ جب میں اور امی اکیلے ہو جاتے ہیں، جب مجھے خوف گھیر لیتا ہے کہ امی کو کچھ ہو گیا تو..." سیماب کی آواز میں لرزش بہت واضح تھی۔

"ارے جان! یہ سب تمہارا وہم ہے ایسا کچھ نہیں ہوگا۔" سرمد نے طفل تسلی دی، جو اسے خود بھی جھوٹ لگی۔

"سرمد! کبھی کبھی محبت کافی نہیں ہوتی۔ وہ محبت جس کے لیے ہم ترس رہے ہوتے ہیں، ہمیں مل جائے تو پھر ساتھ بھی چاہیے، قربت بھی، تحفظ بھی، سچ مچ کا ساتھ، خوابوں سے گزارا نہیں ہوتا۔"

سیماب جو سمجھانا چاہ رہی تھی سرمد جان بوجھ کے انجان بن رہا تھا لیکن آج سیماب بھی فیصلہ کرکے بیٹھی تھی کہ بات ٹھکانے لگا ڈالے۔ خاموش نظروں سے سرمد کو دیکھتی رہی اور وہ ڈھیٹ بنا مسکراتا رہا۔

"ہم اپنے تعلق کو رشتہ کیوں نہیں بنا سکتے؟ ہم مکمل طور پہ آزاد اور مختار ہیں۔" سیماب، سرمد کے بالکل خاموش چہرے پہ نگاہیں ٹکائے بیٹھی رہی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا پھر اٹھ گیا۔

"چلتا ہوں یار! میری زینی کو صبح بہت تیز بخار تھا، اس کی ماں تو ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں لے جاسکتی، تمہیں تو پتا ہے وہ میرے بغیر گھر سے قدم بھی نہیں نکالتی۔"

سرمد یہ کہتے ہوئے چلا ہی گیا۔ دروازہ ہلتا رہا اور آج پہلی بار سیماب کو لگا جیسے سرمد یہ جتا رہا تھا کہ اس کی بیوی کس قدر مشرقی ہے اور میں...

"سرمد! میں گھر سے باہر جاتی ہوں، کما کے لاتی ہوں، اپنا اور اپنے بہن بھائیوں کا پیٹ پالتی ہوں، خرچے ہوتے ہیں۔ کون اٹھائے، کون مجھے کہے کہ آج تم آرام کرو سیماب مجھ سے لے لو، جو چاہیے۔"

✲ ✲ ✲

سیماب اسمٰعیل ایک کلرک کی بیٹی تھی۔ اسے پولیس کی نوکری کا جنون تھا۔ اسمٰعیل حیدر کی چار بیٹیاں تھیں، بیٹا نہ ہونے کا روگ دونوں میاں بیوی کو اندر اندر کھا رہا تھا۔ سیماب کی نوکری کا پہلا دن تھا جب باپ کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ جانبر نہ ہو سکا۔ بس اسی دن سے ساری ذمہ داریاں سیماب کے کندھوں پہ آ پڑیں۔ وہ لڑکوں جیسی بہادر زندگی کے جہاد پہ نکل پڑی۔ بہن بھائیوں کی تعلیم، ان کی خوشیاں، غم، فکریں کرتے کرتے کسی لمحے سرمد بھی زندگی میں آگیا۔

سرمد انکم ٹیکس آفیسر تھا۔ ایک کیس کے سلسلے میں سیماب سے ملنے اس کے تھانے آیا اور پھر بہانے

بہانے سے آتا رہا نجانے کب مردانہ سی عادات والی سیماب اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ سیماب کو بھی سرمد کی توجہ بہت اچھی لگنے لگی۔ دونوں میں دوستی کیا ہوئی۔ زندگی جیسے آسان اور خوب صورت ہو گئی۔ سیماب کو اپنا آپ اچھا لگنے لگا۔ وہ غیر محسوس طریقے سے نسوانیت سے بھرنے لگی۔ پہننے اوڑھنے، بننے سنورنے لگی۔ اپنی ایک ایک بات سرمد کو بتا کر جیسے وہ ہلکی پھلکی ہو جاتی تھی۔ وہ اکثر سرمد کی شدتوں کے جواب میں کہتی۔

"بس میری چند ذمہ داریاں پوری ہو جائیں، پھر ہم بھرپور زندگی گزاریں گے۔"

اور اب... اب تو ساری ذمہ داریاں پوری ہو گئیں مگر بھرپور زندگی کہاں ہے...

"تم ذرا سا ذہن پہ زور ڈالو تو یاد آئے گا تمہیں ہر وہ لمحہ... جب میں تڑپ رہا تھا کہ ہم صرف نکاح ہی کر لیتے ہیں۔ میرے گھر والوں کا منہ تو بند ہو جائے، مگر تمہاری ایک ہی رٹ تھی، ذمہ داریاں ذمہ داریاں..."

سرمد جھنجلا کے بولا تو وہ پاس آبیٹھی "سرمد! تب ممکن نہیں تھا۔ تم تو مجھ سے میرے حالات سے اچھی طرح واقف ہو۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں، یہ کافی نہیں؟ میں عمر بھر تمہارے ساتھ رہوں گا۔ اب تم نے یہ کیسی ضد پکڑ لی ہے؟"

"سرمد! مجھے تمہارا نام بھی چاہیے، مجھے رات دن کا ساتھ بھی چاہیے۔"

"تمہارے کہنے پہ ہی شادی کی تھی میں نے... اب کیا کروں؟" سرمد نے نہ صرف یاد دلایا، بلکہ اپنی بے بسی بھی دکھا دی۔

"اب سرمد؟" وہ سراپا سوال بنی ہوئی تھی۔

"امی ابا کی وفات کے بعد بیوی بچوں کو ایک رات بھی گھر میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری روح تو تمہارے ساتھ ہے میری جان! مگر وہ جو میری ذمہ داری ہیں، ان کا کیا کروں؟" سرمد نے لنگڑی لولی مجبوری پیش کی اور آج پھر بات ادھوری چھوڑ کے اٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

رات کا سناٹا گہرا ہو رہا تھا۔ عجیب خوف سا فضا میں گھلا ہوا تھا اور امی کی "ہائے ہائے" سیماب کے حواس معطل کر رہی تھی، پھر نجانے کیا ہوا، فضا میں سناٹا بڑھ گیا۔ سیماب اس سناٹے میں ڈوبتی ابھرتی رہی، پھر سہمے سہمے قدموں سے ماں کے پاس چلی آئی۔

"امی جان..." سیماب کا بہادر سا دل ڈوب گیا۔ اس نے ماں کی ناک کے آگے ہاتھ رکھ کے سانس محسوس کی، پھر بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور ایک... دوسرے اور پھر تیسرے بھائی کو فون کر کر کے پاگل ہونے لگی، کوئی فون اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ وہ ہمت کر کے اٹھی اور امی کو سہارا دے کے باہر تک لائی۔ گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے آئی۔ آج تنہائی اور بے بسی کی حد ہو گئی تھی، وہ خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی تب ہی ڈاکٹر نے امی کے ہوش میں آنے کی اطلاع دی۔

یہ رات خوف بن کے دل میں جاگزیں ہو گئی تھی۔ اگلے کچھ دن وہ اسی خوف میں رہی۔

خوف اور وحشت کے ان ہی دنوں میں جمشید گورایا نے سیماب اسمٰعیل کو پروپوز کر دیا۔ وہ حیران تھی لوگ بات کرتے ہوئے کچھ بھی خیال نہیں کرتے۔ جمشید گورایا تحصیل دار تھا۔ ساٹھ سال کا بوڑھا مگر صحت مند بڑھے ہوئے پیٹ والا شوقین مزاج مرد۔ سیماب اسمٰعیل کو اچانک خود سے نفرت ہونے لگی۔

"تو سیماب اسمٰعیل اب تمہاری یہ اوقات ہو گئی۔" آفس میں ٹہلتے ہوئے اس نے خود کلامی کی۔ پھر چلا کر کانسٹیبل کو بلایا۔ "جا کر جمشید گورایا کو بتاؤ کہ میڈم نے کہا ہے، آئندہ میرے آفس میں قدم رکھا تو جیل میں سڑتے نظر آؤ گے۔"

وہ سب کو بڑے دھڑلے سے کہتی۔ "مجھے شادی کرنا، مرد کی محکومی کرنا پسند ہی نہیں، مجھے تو حیرت ہوتی ہے، عورتیں کس طرح مردوں کی جرابیں، بنیانیں دھوتی ہیں، کپڑے استری کر کر کے ہینگرز بھر دیتی ہیں۔ کھانے پکا پکا کر معدے کے ذریعے دل میں اترنا چاہتی

ہیں۔ مرد کا دل تو صحرا کی طرح ہے۔ پیاسا کا پیاسا سیراب ہو ہی نہیں پاتا، جسے ہمیشہ نئی بارشوں کا انتظار رہتا ہے ہمیشہ، ہر موسم میں، اس کے ہونٹ پیاسے رہتے ہیں۔ مرد کے اندر تو محبت کی کسی ایک بوند کو جذب کر کے سیراب ہو جانے کی طاقت تو ہے ہی نہیں۔"

وہ بڑے غرور سے کہتی۔ "میں داسی نہیں بن سکتی۔"

مگر در حقیقت وہ پوری عورت تھی... بے بس ارمانوں سے بھری ہوئی محبوب کی ایک جھلک کو ترستی ہوئی، اس کے اندر بھی مرد کی جرابوں اور بنیانوں کو سنبھال کے رکھنے والی حسرتیں روز روتیں، مگر وہ اپنی عمر اور ذمہ داریاں نبٹاتے گئی۔ اب جبکہ سب ذمہ داریاں پوری ہو گئیں تو وہ سرمد کے انتظار میں بیٹھی تھی، اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں۔

سرمد کی محبت کی جگہ واہموں اور سناٹوں نے لے لی تھی۔ وہ کئی دن سے نہیں آسکا تھا۔ فون پہ کہہ دیتا۔

"جان! بہت بزی ہوں۔ آج آنے کی کوشش کروں گا۔"

یہ بات وہ گزشتہ پندرہ دنوں سے کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"آپ شادی کیوں نہیں کرتیں سیماب؟" شہباز نے چیٹ کرتے ہوئے لکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر سیماب نے لکھا۔

"جو مرد پروپوز کرتے ہیں، وہ زہر لگتے ہیں اور جو پروپوز نہیں کرتا وہ مجبور ہے، آپ کو میں نے بتایا تو تھا۔"

"کوئی بھی مجبور نہیں ہوتا مس سیماب! جو خود کو مجبور کہتے ہیں، وہ مخلص نہیں ہوتے اصل میں۔"

شہباز کی بات پہ سیماب کا دل زور سے ہنسا "وہ تو وہ سمجھ گیا۔ مگر تجھے سمجھ نہ آئی۔"

"وہ مجھ سے محبت کرتا ہے، لیکن شادی..."

"اپنا فقرہ مکمل کریں کہ وہ دوسری شادی کرنے کا نہیں۔" شہباز نے اس کی بات کاٹ کر آگہی کا ایک اور در وا کیا۔

"ہماری محبت اس کی شادی سے بہت پہلے کی ہے۔" سیماب نے خود کو تسلی دی۔ "اور مجھے شادی کرنا پسند بھی نہیں شہباز صاحب!"

"آپ نے خود کو دوغلی زندگی گزارنے پہ مجبور کر رکھا ہے ورنہ آپ بھی بہت عام سی لڑکی ہیں۔ خواب سجانے والی، کمزور سی... اور سہارے کے لیے مرد کے مضبوط بازوؤں کی چاہت کرنے والی۔"

سیماب لاجواب۔

شہباز رضی سے اس کی فیس بک پہ دعا تھی۔ شہباز کی بیوی دس سال پہلے وفات پا گئی تھی۔ ایک بیٹا تھا جو ڈاکٹر بننے رشیا گیا ہوا تھا۔ شہباز اسلام آباد کے ایک آرمی کالج میں پروفیسر تھے۔ سیماب نے انہیں اپنے اور سرمد کے متعلق بتایا تھا۔ اپنی بہنوں کی شادیوں اور سرمد کی مجبوریوں کے تذکرے بھی کیے تھے۔

"پھر آج شہباز نے ایسے کیوں کہا کہ سرمد مخلص نہیں..." سیماب نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ نجانے کیوں آج آنکھوں میں سرمد کی دلکشی سے مسکراتی شبیہہ نہیں اتر سکی۔

وہ کچھ لمحے بے جان پڑی رہی، پھر ایک جھٹکے سے سیدھی ہو بیٹھی۔

"آپ شادی کیوں نہیں کرتے؟" سیماب نے لکھا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ دل نجانے کن واہموں میں ڈوب ابھر رہا تھا۔

"مجھے انتظار تھا کہ آپ پروپوز کریں۔ ہاہا..."

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟" سیماب بے حد شرمندہ ہوئی۔

"نہیں، لیکن اب میں بھی تنہائی سے تھک گیا ہوں، مجھے آپ کا ساتھ چاہیے۔" شہباز نے بے جھجک لکھا تو سیماب مزید کچھ کہے بغیر اپنا ایڈریس لکھ کے آف لائن ہو گئی۔ وہ بھی تو تھک گئی تھی دوغلی زندگی گزارتے گزارتے...

☼

نبیلہ عزیز

میں شرمندہ ہوں

مکمل ناول

ایس پی قاسم علی اس وقت اپنی تمام پولیس فورس کے ساتھ اپنے ایک اہم کیس کے آپریشن کے لیے بالکل تیار کھڑا تھا اور تمام پولیس فورس مستعد کھڑی اس کے ایک اشارے کی منتظر تھی...... یہ کسی مجرم کا بنگلہ تھا' یہاں پہ بہت سے غیر قانونی کاموں کی سرگرمیاں دیکھنے میں آئی تھیں۔ ایس پی قاسم علی بہت دنوں سے اس کیس پہ کام کر رہا تھا۔ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ شخص ان دنوں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اگر وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کے بنگلے پر چڑھائی کرتا تو یقیناً" وہ بڑی آسانی اور بڑی صفائی سے بچ نکلتا' بلکہ ہو سکتا تھا کہ دوبارہ وطن واپس ہی نہ آتا' اس لیے اس نے کچھ عرصہ خاموشی سے اس کی واپسی کا انتظار کیا تھا اور اس انتظار کا صلہ یہ ملا کہ وہ پچھلے تین روز سے وطن واپس آیا ہوا تھا اور آج خوش قسمتی سے اپنے بنگلے پہ موجود تھا۔

ایس پی قاسم علی کے خفیہ ذرائع کے مطابق اس وقت اس مجرم کا رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا سو فیصد یقین تھا' سو اس نے آج رات چڑھائی کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس وقت اپنے منصوبے کے مطابق وہ اس

بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر چکے تھے۔ کیونکہ دوسری طرف سے بھی جوابی کارروائی کے پورے پورے امکانات تھے' اس لیے ایس پی قاسم علی نے ہر طرف سے اطمینان کرنے کے لیے اس بنگلے کا خود چاروں اطراف سے جائزہ لینا چاہا تھا اور اس کے لیے وہ خود جیپ سے اتر آیا تھا.....!

"سر! میں بھی آپ کے ساتھ ہوں....." ایس ایچ او عرفان اعظم بھی جیپ سے اتر آیا تھا۔

"لیکن.....!" ایس پی قاسم علی نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن عرفان اعظم نے تھوڑی بہت بے تکلفی ہونے کی وجہ سے اس کی بات درمیان میں ہی روک دی تھی۔

"سر! ہمارے لیے ... ہی اہم نہیں ہے' ہمارے لیے تو آپ کی زندگی بھی اہم ہے۔" ایس ایچ او عرفان اعظم نے احتراماً کہا تھا۔

"نہیں! میری زندگی اتنی اہم نہیں ہے' جتنی میری نظر میں اس آپریشن کی اہمیت ہے' کیونکہ اس آپریشن سے کئی اور زندگیاں بھی جڑی ہوئی ہیں' جنہیں اس آپریشن کے بعد کھل کر جینے اور سانس لینے کی نوید ملے گی۔" قاسم علی جیسا آفیسر عرفان اعظم نے اپنے اتنے سالوں کی سروس میں آج تک نہیں دیکھا تھا' نڈر بھی اور عاجز بھی' پتھر جیسا سخت اور ریشم جیسا نرم' کسی کے حق کے لیے ڈٹ جانے والا' انصاف پسند اور اصول پرست' بات اصول کی ہوتی تو رعایت ذرا بھی نہیں دیتا اور جسے رعایت دیتا تھا اسے حیرت میں ڈال دیتا تھا..... اس کی شخصیت بہت گمبھیر تھی.....!

ایس پی قاسم علی اور ایس ایچ او عرفان اعظم دونوں ایک ساتھ چلتے ہوئے بنگلے کی دائیں طرف سے جائزہ لیتے ہوئے پیچھے کی طرف آ گئے تھے۔ اس بنگلے کی چاروں اطراف پہ سڑک تھی۔ یہ بنگلہ رہائشی علاقے کے سب سے آخری سرے پہ تھا اسی لیے وہ لوگ آسانی سے اپنی کارروائی مکمل کر رہے تھے حالانکہ انہیں آس پاس رہائش پذیر شہریوں کے آرام کا بھی بہت خیال رکھنا پڑ رہا تھا اور اسی خیال کی وجہ سے حد سے زیادہ احتیاط کی جا رہی تھی۔ وہ اس بنگلے کی ... ترین چار دیواری کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ... طرف بڑھ رہے تھے جب ان دونوں کو کسی کے بھاگتے قدموں کی آواز سنائی دی تھی' وہ دونوں ہی ایک دم ... ہو گئے۔ دونوں نے اپنے اپنے پستول بھی سنبھال لیے تھے.....

"یہ بھاگنے کی آواز کس طرف سے آ رہی ہے.....؟" ایس ایچ او عرفان اعظم اس قدر خطرناک صورت حال کی وجہ سے تھوڑا گھبرا گیا تھا لیکن ایس پی قاسم علی پورے اعتماد سے ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔

"آواز بائیں طرف سے آ رہی ہے۔" اس نے آواز کی سمت کھوجی۔

اور ساتھ ہی قدم آگے بڑھا دیے۔ اس سے پہلے کہ وہ اس آواز کی سمت جھانک کے دیکھتا کوئی تیزی سے سڑک سے مڑتے ہوئے دھڑام سے اسی کے ساتھ ٹکرا گیا تھا۔

ایس پی قاسم علی نے اس افتاد پہ بمشکل اپنے قدموں کو غیر متوازن ہونے سے روکا تھا ورنہ یقیناً وہ بھی زمین بوس ہو چکا تھا۔

"کک..... کون؟" دہشت زدہ سی نسوانی آواز سنائی دی تو پتا چلا کہ مقابل ایک نسوانی پیکر ہے' جس کا دماغ اس کے فولادی جسم سے ٹکرانے کے بعد چکرا گیا تھا۔

"کک..... کون ہو تم؟" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں دوبارہ پوچھا تھا لیکن مزید قدموں کے بھاگنے کی آواز سن کر ایس پی قاسم علی نے اس کے منہ پہ اپنی مضبوط ہتھیلی جما کر اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا جس پہ اس لڑکی نے احتجاج کرنا چاہا تھا مگر وہ اپنا پستول اس کی کنپٹی پہ ٹکا کر اس کے سارے احتجاج ختم کر چکا تھا۔

"تم جو بھی ہو' خاموش رہو' یہاں اس وقت تمہاری ذرا سی آواز بھی قیامت برپا کر سکتی ہے۔" ایس پی قاسم علی کی سرگوشی نما آواز اس لڑکی کے کانوں کے قریب سنائی دی تھی کیونکہ اس نے اس ... اپنے بازو کے حصار میں جکڑا ہوا تھا۔

... کی طرف کافی اندھیرا تھا' اس لیے وہ ... ایک دوسرے کو صاف اور واضح نہیں دیکھ سکتے ... لڑکی کا کندھا ایس پی قاسم علی کے سینے سے ... تھا..... اور وہ کنپٹی پہ پستول ہونے کی وجہ سے ... بھی نہیں کر رہی تھی۔

"ایس ایچ او عرفان اعظم!" اس نے گردن ترچھی ...

"یس سر.....؟" دوسری طرف سے مستعد سی آواز ...

"اس لڑکی کے پیچھے آنے والوں کو اریسٹ کرو' ... آواز نہیں آنی چاہیے۔" اس نے حکم دیا ... لڑکی اس کی بات اور انداز سے ہی سمجھ گئی تھی کہ ... اور نہیں' بلکہ پولیس آفیسر ہے' اسی لیے اسے ... تحفظ کا احساس ہوا تھا' لیکن دوسرے ہی پل اسے ... ایسے پولیس آفیسر بھی یاد آ گئے تھے جن کے ... سے اکثر اخبارات کے صفحات سیاہ نظر آتے ... سو وہ پھر سے خوف زدہ ہو گئی۔

"اوکے سر.....!" عرفان اعظم کہہ کر ایک طرف گیا اور اگلے پانچ منٹ میں اس نے تین آدمیوں کو اریسٹ کر لیا تھا جو اس لڑکی کا پیچھا کر رہے تھے۔

"... کو جیپ میں بٹھاؤ....." اس نے مزید ہدایات ...

"... سر....." ایس ایچ او عرفان اعظم اس کے ہر ... تعمیل کر رہا تھا کیونکہ یہی اس کی ڈیوٹی تھی۔

"ان تینوں کو حوالات میں بند کرو' اور ان کو میرے ... تک میرے روم میں بٹھاؤ....." اس نے اس ... کی سمت اشارہ کیا تھا۔ اس لڑکی نے کچھ حرکت ... کی کوشش کی تھی' لیکن ایس پی قاسم علی نے اس کی کنپٹی پہ پستول سے تھوڑا دباؤ ڈالا تھا۔

"میں آپ کے ساتھ عزت سے پیش آ رہا ہوں کہ ... کو حوالات میں بند نہ کیا جائے' اس لیے آپ بھی عزت داروں جیسا مظاہرہ کیجیے گا اور خاموشی سے بیٹھ کر کوئی بھی واویلا کیے بغیر میری واپسی کا انتظار کیجیے۔"

ایس پی قاسم علی کو اس لڑکی کی حرکات و سکنات دیکھ کر ہی احساس ہو چکا تھا کہ وہ کافی جذباتی اور جلد باز سی ہے اور کچھ بے خوف بھی... اس لڑکی نے سر اٹھا کر ایس پی قاسم علی کو دیکھنا چاہا تھا لیکن اندھیرے کی بدولت دیکھ نہیں پائی تھی۔ وہ اسے اپنے پستول کی زد اور اپنے بازو کے حصار سے آزاد کر چکا تھا۔

"لے جائیے انہیں اور ہاں دھیان رہے یہ خاتون ..." اس نے اس کی ذمہ داری ایس ایچ او عرفان اعظم کو سونپی تھی۔

"اوکے سر....." اس نے مؤدب سے انداز میں سر ہلایا تھا۔

اور جیسے ہی اس لڑکی کو جیپ میں بٹھانے کے بعد جیپ اسٹارٹ کی گئی تھی وہ بھی پلٹ کر دوبارہ اس بنگلے کی طرف آ گیا تھا۔

"سر! آپ نے ایس ایچ او عرفان اعظم کو کیوں بھیج دیا....؟" ڈی ایس پی اظہار خان بھی قریب آگئے تھے۔

"جیپ میں ایک لڑکی تھی اور اس وقت کسی بھی لڑکی کا یہاں رکنا مناسب نہیں تھا۔ کچھ ہی دیر میں یہاں کوئی بھی ہنگامہ ہو سکتا ہے اور اس ہنگامے کے بعد میڈیا والوں کی تیز دھار آنکھیں اور زبانیں کھل جائیں گی۔ وہ کس وقت کس کو اپنی لپیٹ میں لے لیں کچھ پتا نہیں چلتا' اس لیے میں نے اس لڑکی کو پولیس اسٹیشن بھیج دیا ہے۔"

اور اگلے سات منٹ میں واقعی ایسا ہنگامہ برپا ہوا کہ پورا علاقہ فائرنگ کی گونج سے لرز اٹھا تھا۔ دونوں طرف سے ہار نہیں مانی جا رہی تھی اسی لیے یہ آپریشن بہت طویل دورانیے پہ محیط ہو گیا تھا لیکن آخر کار کامیابی ایس پی قاسم علی کا ہی مقدر ٹھہری تھی....!

☆ ☆ ☆

پولیس اسٹیشن میں ایک کھلبلی سی مچی ہوئی تھی ہر طرف بھاگ دوڑ اور افراتفری کا سا عالم تھا۔ پولیس' مجرم اور میڈیا ایک ہی جگہ پہ موجود جیسے محفل لگائے ہوئے تھے اور وہ اندر بیٹھی باہر کی صورت حال اندازے سے نوٹ کر رہی تھی۔ اسے یہاں بیٹھے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے' لیکن جس نے اسے اپنی واپسی تک انتظار کرنے کا کہا تھا' اس کا فی الحال دور دور تک کوئی اتا پتا ہی نہیں تھا اور باہر جو ہنگامے ہو رہے تھے ان کو دیکھ کر نہیں لگتا تھا کہ اگلے تین گھنٹے بھی اس کی آمد کا کوئی امکان ہو گا' وہ بیٹھے بیٹھے اکتانے لگی تھی اس کی پیشانی پہ سلوٹیں نمودار ہو چکی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے' لیکن یہ بھی سچ تھا کہ یہاں سے بھاگنا بھی آسان نہیں تھا کیونکہ پہلے تو اس کا پیچھا تین آدمیوں نے کیا تھا لیکن اب اس کا پیچھا تیس آدمی بھی کر سکتے تھے اور دوسرا خدشہ یہ بھی تھا کہ اگر وہ اس کمرے سے باہر نکلتی تو یقیناً" میڈیا والے اسے گھیر لیتے اور پوچھ گچھ.... شروع کر دیتے کہ وہ کون ہے....؟ کہاں سے آئی ہے؟ اور یہاں کس سلسلے میں موجود ہے....؟ کیا چکر تھا....؟ کیا معاملہ تھا آخر....

میڈیا والوں کے انہی متوقع سوالوں کا سوچ کر اس نے اپنے اٹھنے کا اور باہر نکلنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا اور دوبارہ سے اس آفیسر کا انتظار شروع کر دیا جس کو اس نے اندھیرے کے باعث ٹھیک طرح دیکھا بھی نہیں تھا۔

"دادا صاحب....! میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ پریشان نہ ہوں' میں بس تھوڑی دیر تک گھر پہنچتا ہوں۔" ایس پی قاسم علی موبائل فون پہ کسی سے بات کرتے ہوئے اندر داخل ہوا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی جبکہ فون پہ مصروف ایس پی قاسم علی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ دوبارہ بیٹھ گئی تھی اور ایس پی قاسم علی اپنی وسیع و عریض ٹیبل کی طرف سے گھوم کر اپنی کرسی کی سمت آیا اور اس کے بالکل مقابل بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں اپنے سامنے بیٹھے ایس پی قاسم علی کے چہرے پہ الجھ رہی تھیں۔

"دادا صاحب! میں کہہ رہا ہوں نا' میں بالکل ٹھیک ہوں' آپ فکر نہ کریں' بس تھوڑی دیر کی بات ہے میں آ رہا ہوں' نماز ایک ساتھ ہی پڑھیں گے۔" وہ اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی ہوئی گھڑی دیکھتے ہوئے فون پہ اپنے مخاطب کو تسلی دے رہا تھا۔ وہ یونیفارم میں ملبوس شاندار شخصیت کے حامل ایس پی قاسم علی کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی کیونکہ اس نے کیپ بھی پہنی ہوئی تھی' اس لیے پہچاننے میں تھوڑی دقت ہو رہی تھی۔

"جی اللہ حافظ....!" اس نے مختصر سا کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ گہری سانس کھینچتے ہوئے موبائل فون ٹیبل پہ ڈالا اور پھر اپنی کیپ بھی اتار کر سائیڈ پہ رکھ دی۔

"السلام علیکم....!" ایس پی قاسم علی کو یہ بھی یاد تھا کہ اس نے اندر داخل ہوتے ہوئے سلام نہیں کیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" وہ بمشکل اپنے ہونٹوں کو جنبش دے پائی تھی۔

"جی خاتون! کہیے کیا مسئلہ ہے آپ کا....؟ کون لوگ تھے وہ جو آپ کا پیچھا کر رہے تھے....؟" ایس پی قاسم علی کہتے ہوئے اس کی سمت متوجہ ہوا تھا اور پھر منجمد ہو کے رہ گیا۔ اس کی ایک سرسری نظر نے دس سالوں کا عرصہ دس سیکنڈ میں طے کیا تھا۔ وہ پہچان جو اس کے لیے مشکل ہو رہی تھی وہ ایس پی قاسم علی کے لیے یوں آسان ثابت ہوئی تھی جیسے ابھی دس منٹ پہلے کی بات ہو....!

"آپ کا نام....؟" اس نے اپنے یقین پہ تصدیق کی مہر لگانی چاہی۔

"زرنگاہ نواز....!" اس نے یقین کے تابوت پہ اپنے نام کی آخری کیل ٹھونک دی۔ ایس پی قاسم علی نے یکدم اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں زور سے بھینچتے ہوئے لب بھی بھینچ لیے تھے اور ساتھ ہی اپنا سر بھی جھکا لیا تھا تاکہ اس کے چہرے کے تاثرات نہ دکھائی دے سکیں۔

"ایس پی صاحب! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟" وہ الجھ کر بولی۔ اس کے سوال پہ ایس پی قاسم علی نے فوراً" سر اٹھا کر براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ اس کی لال سرخ انگارہ سی دہکتی آنکھیں دیکھ کر اندر ہی اندر دہل گئی تھی' جب ہی نظر چرانے کے لیے سر جھکا لیا تھا۔ وہ اس کے غصے پہ حیران بھی تھی۔

"آپ جانتی ہیں میں کون ہوں....؟" وہ بڑے ضبط سے بول رہا تھا۔

"نہیں...." اس نے جواباً" نفی میں گردن ہلائی تھی۔

"مولوی امام دین کا پوتا ہوں میں' ایس پی قاسم علی۔" اس نے اپنا تعارف نہیں کروایا تھا بلکہ زرنگاہ کے سر پہ ایک ہیوی ویٹ بم بلاسٹ کیا تھا۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ایس پی قاسم علی کی سمت پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھا تھا....

"ایس پی قاسم علی....؟ مولوی امام دین کا پوتا....؟"

وہ ششدر سی اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا' زبان گنگ ہو چکی تھی' وہ کچھ بھی کہنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وقت کا پہیہ گھوم کے کہاں سے کہاں آن ٹھہرا تھا....!

☆ ☆ ☆

"کیا بات ہے نواز! تم کچھ پریشان لگتے ہو....؟" ملک نواز احمد اپنے ڈیرے پہ بیٹھے خاموشی سے کسی سوچ میں گم سگریٹ پی رہے تھے' جب ان کے اباجی اور بڑے بھائی ملک امتیاز احمد بھی وہیں چلے آئے تھے۔

"کچھ نہیں...." ملک نواز احمد سگریٹ بجھا کر سیدھے ہو بیٹھے۔

"تمہاری پریشانی تمہارے چہرے سے صاف نظر آ رہی ہے اور تم کہتے ہو کہ کچھ نہیں....؟" ملک امتیاز احمد نے ان کے برابر سرخ رنگ کے پایوں والی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا۔ ان کے اباجی ملک خورشید احمد دوسری چارپائی پہ بیٹھ چکے تھے اور ڈیرے پہ کام کرنے والے ملازم نے فوراً" ان کے سامنے تازہ تیار کیا گیا حقہ لا رکھا تھا' حقہ ان کا شوق اور ان کے ڈیرے کی پہچان تھی۔

"میری پریشانی آپ لوگ نہیں سمجھیں گے...." ملک نواز احمد نے نفی میں سر ہلایا۔

"ارے بابا! سمجھاؤ گے تو سمجھیں گے نا....؟" ملک امتیاز احمد اصرار کر رہے تھے۔ انہیں بولنے پہ اکسا رہے تھے۔

"بھائی صاحب! میں زرنگاہ کی وجہ سے پریشان ہوں' وہ آج پھر دوسری مرتبہ میٹرک میں فیل ہوئی ہے' آخر کیا بنے گا اس کا....؟" ملک نواز احمد اپنی اکلوتی بیٹی کے لیے حد درجہ پریشان ہو رہے تھے۔ انہیں اس کی تعلیم کی فکر تھی کیونکہ وہ تعلیم سے کوسوں دور بھاگتی تھی' اسے پڑھائی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسی عدم دلچسپی کی وجہ سے وہ دو مرتبہ میٹرک میں فیل ہونے کی سند حاصل کر چکی تھی۔

"بس! اتنی سی بات کے لیے پریشان ہو....؟"

ملک امتیاز احمد نے جیسے مذاق اڑایا تھا۔

"یہ اتنی سی بات نہیں ہے' کوئی ویلیو نہیں ہے تعلیم کے بغیر اور وہ تعلیم کی طرف دھیان ہی نہیں دیتی' وہ اس ویلیو کو سمجھ ہی نہیں پارہی۔"

ملک نواز احمد خود پڑھے لکھے آدمی تھے اس لیے اپنی بیٹی کو بھی پڑھا لکھا اور باشعور دیکھنے کا شوق تھا۔

"نواز احمد! میٹرک تک تو پہنچ ہی گئی ہے نا؟ چاہے فیل ہوئی ہے چاہے پاس۔ تم سمجھو کہ اس نے میٹرک کر لیا ہے اور بچیوں کے لیے میٹرک ہی کافی ہوتا ہے۔ زیادہ اسکول اور کالجوں کے جھنجھٹ پالنے کی بھلا ضرورت ہی کیا ہے..... ؟اس نے کون سا ہمیں نوکریاں کرنی ہیں..... ؟شادی کے بعد بچے ہی پالنے ہیں نا....."

ملک امتیاز احمد نے سرے سے بات ہی ختم کر ڈالی تھی لیکن ان کو اس بات سے اختلاف تھا۔ "تعلیم صرف نوکریاں کرنے کے لیے ہی حاصل نہیں کی جاتی' تعلیم کے اور بھی بہت سے فوائد ہیں جن کو آپ یقیناً" نہیں جانتے اور نہ ہی سمجھتے ہیں۔ زرنگاہ میری اکلوتی بیٹی ہے' میری اکلوتی وارث۔ میرے بعد میرا سب کچھ اسی کا ہے' اسی نے سنبھالنا ہے اور اگر وہی ان پڑھ رہی تو کیا کر پائے گی بھلا..... ؟کیسے سنبھالے گی سب کچھ..... ؟اپنا اچھا برا بھی نہیں سمجھ سکے گی... اور میں یہ نہیں چاہتا۔ میں اسے سمجھدار بنانا چاہتا ہوں' کیونکہ وہ اتنی نادان اور من موجی سی ہے کہ اسے جو بھی کہا جائے' وہ بنا سوچے سمجھے کر گزرتی ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ سمجھ دار ہو جائے....."

ملک نواز احمد کی سوچ نے جہاں ملک امتیاز احمد کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجائی تھی' وہیں ملک خورشید احمد کو متفق ہونے پہ مجبور کر دیا تھا۔

"ہوں! ٹھیک کہتے ہو تم' زمانہ بہت چالاک ہے اور چالاک کے ساتھ چالاک ہو کر ہی چلنا پڑتا ہے' ورنہ انسان مات کھا جاتا ہے۔" اباجی نے سر ہلاتے ہوئے اتفاق کیا تھا۔

"لیکن اباجی! مجھے اس مسئلے کا کوئی حل نہیں مل رہا۔" وہ متفکر سے تھے۔

"کیسا حل ڈھونڈ رہے ہو؟ اس کی استانیاں کیا کہتی ہیں؟" وہ حقہ گڑگڑاتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔

"وہ کہتی ہیں کہ اسے پڑھائی میں کسی کی مدد کی ضرورت ہے' جو اسے سمجھا بجھا کر پڑھنے پہ آمادہ کرے اور اچھے طریقے سے پڑھائے' مطلب کہ اسے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔"

"تو ٹھیک ہے نا' کسی سے کہہ دو! روزانہ اسے ٹیوشن پڑھا دیا کرے۔" وہ لاپروائی سے بولے۔

"لیکن کس سے کہوں؟ یہاں اتنا پڑھا لکھا ہے کون؟ اور اگر کوئی ہے بھی تو کسی پہ بھروسہ کرنا آسان بھی نہیں ہے۔ جوان بیٹی کا معاملہ ہے آخر....." ملک نواز احمد کو ہر طرح کی فکریں گھیرے ہوئے تھیں۔

"السلام علیکم ملک صاحب!" مولوی امام دین کی آواز پہ وہ تینوں ہی چونک گئے۔ مولوی صاحب کو دیکھ کر ملک نواز احمد احتراماً" اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"وعلیکم السلام مولوی صاحب! آیئے تشریف رکھیے۔" انہوں نے مولوی صاحب کو اپنی جگہ پیش کی تھی۔

"جزاک اللہ! آپ بیٹھیے ملک صاحب! میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔" مولوی صاحب نے ملک خورشید احمد کے مقابل والی چارپائی پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کہیے مولوی صاحب! کیسے آنا ہوا..... ؟" اباجی ان سے خود پوچھ رہے تھے۔

"ملک صاحب! مسجد سے نماز پڑھا کر نکل رہا تھا کہ آپ کی حویلی کی ملازمہ بہو بیگم کا پیغام لے کر پہنچ گئی۔ آج جمعرات ہے شاید دعا کروانا ہے انہوں نے اپنے ماں باپ کے ایصال ثواب کے لیے۔" مولوی صاحب نے اپنی آمد کی وجہ بتائی۔

"ہاں ہاں! فاخرہ نے آج صبح ہی قرآن پاک ختم کیا ہے..... آپ جائیے' حویلی کے اندر چلے جائیے۔" ملک امتیاز احمد بیوی کا ذکر آتے ہی فوراً" بول اٹھے۔

"جی! میں نے سوچا' پہلے آپ سے اجازت...

لوں۔" مولوی صاحب آہستگی سے بولے۔
"ارے مولوی صاحب! اس میں اجازت کہاں سے آگئی۔ آپ ہمارے بزرگ ہیں، ہمارے استاد ہیں بلکہ ہمارے بچوں کے بھی استاد ہیں۔ آپ کے لیے حویلی کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔" ملک امتیاز احمد نے قدرے احترام اور ۔ خوش دلی سے کہا۔
"اللہ آپ کو زندگی دے، ہدایت دے، سیدھی راہ پہ چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔" وہ بھی جواباً انہیں دعا دیتے ہوئے کھڑے ہوگئے۔
"رکیے مولوی صاحب!" اباجی کی آواز پہ مولوی صاحب کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے اور ان دونوں بھائیوں نے بھی چونک کر دیکھا تھا۔
"جی حکم ملک صاحب۔۔۔"
"بیٹھیے۔۔۔" انہوں نے ان کو دوبارہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔
"جی۔" وہ سرہلا کر بیٹھ گئے۔
"آپ کا ایک پوتا بھی ہے نا۔۔۔؟ خادم علی کا بیٹا؟"
"جی، جی! ماشاء اللہ جوان ہو چکا ہے اب تو۔۔۔" مولوی صاحب نے خوشی خوشی بتایا۔
"سنا تھا، شہر میں پڑھ رہا ہے وہ۔۔۔؟" وہ حقے کا کش لیتے ہوئے دھواں خارج کرتے ہوئے بولے۔
"جی! پڑھ رہا ہے ابھی۔"
"آج کل کہاں ہے۔۔۔؟"
"گھر پہ ہی ہوتا ہے، اس نے کہاں جانا ہے بھلا؟ یونیورسٹی کے بعد شام تک گھر واپس آجاتا ہے۔"
"اچھا! اتنا لمبا سفر طے کرکے آجاتا ہے روزانہ؟" انہیں حیرت ہوئی تھی۔
"جی ملک صاحب! پہلے ہاسٹل میں ہی رہتا تھا لیکن اب ہاسٹل کا خرچا زیادہ ہوگیا ہے، مجبوری ہے اس لیے واپس آنا پڑتا ہے۔"
"ہوں! یعنی کہ کافی محنتی بچہ ہے۔۔۔" ملک خورشید احمد کے لہجے میں ستائش تھی۔
"محنتی بھی اور صابر و شاکر بھی۔۔۔" مولوی صاحب اپنے پوتے کی تعریف میں بولے تھے۔

"اچھا! نام کیا ہے اس کا۔۔۔؟"
"قاسم علی نام ہے اس کا۔۔۔"
"ہوں تو مولوی صاحب! ہم چاہتے ہیں کہ آپ کا پوتا قاسم علی ہماری پوتی زرنگاہ کو روزانہ دو گھنٹے ٹیوشن پڑھا دیا کرے، وہ پڑھائی میں ذرا کمزور ہے، اسے کسی پڑھے لکھے اور سمجھ دار بندے کی مدد کی ضرورت ہے، لیکن ہمیں اس معاملے میں کسی پہ بھروسا نہیں ہو رہا، لیکن آپ کی اور آپ کے گھرانے کی عزت اور شرافت دیکھتے ہوئے ہمیں یقین اور بھروسا ہے کہ وہ یہ کام بہتر طور پہ کرے گا اور شکایت کا موقع نہیں دے گا۔"
ملک خورشید احمد نے بیٹھے بیٹھے ملک نواز احمد کا مسئلہ حل کر دیا۔ وہ حیران پریشان سے دیکھتے رہ گئے اور حیران تو مولوی صاحب بھی ہو رہے تھے لیکن زیادہ حیران ہونے کا وقت نہیں تھا۔
"کیا خیال ہے مولوی صاحب۔۔۔؟"
"کک کیوں نہیں ملک صاحب! میں اسے کہہ دوں گا، وہ پڑھا دیا کرے گا آکر۔" انہوں نے فوراً ہامی بھرلی تھی۔
"ہم پڑھانے کا معاوضہ دیں گے اسے، مفت میں اس کا ٹائم ضائع نہیں ہوگا۔" ملک نواز احمد نے فوراً اس کے معاوضہ کا اعلان کیا تھا۔
"نہیں ملک صاحب! معاوضے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آپ کا دیا ہی کھا رہے ہیں، آپ کے بڑے احسان ہیں ہم پہ، مجھے تو اس بات کی خوشی ہو رہی ہے کہ میرا پوتا آپ کے کسی کام آسکے گا۔"
مولوی صاحب کو واقعی خوشی ہو رہی تھی کہ ملک صاحب نے ان کے پوتے کو اس قابل سمجھا ہے کہ اپنی عزت کے معاملے میں بھی اس پہ بھروسا کیا ہے۔
"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن جو اس کا حق ہے وہ اسے ضرور ملے گا۔" ملک نواز احمد بہت سمجھ دار اور نرم دل آدمی تھے جبکہ ملک امتیاز احمد ان سے یکسر مختلف تھے، کرخت اور دبدبے والے، وہ بس دوسروں سے اپنا کام نکلواتے تھے اور پلٹ کر خبر نہیں لیتے تھے۔

"مہربانی ہے آپ کی۔۔۔" وہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔
"قاسم علی سے کہیے گا، کل سے آجایا کرے۔۔۔" انہوں نے مولوی صاحب کو تاکید کی۔
"ٹھیک ہے ملک صاحب! جیسے آپ کا حکم، آجائے گا کل۔۔۔" وہ کہہ کر ان سے اجازت لیتے ہوئے رخصت ہوئے تھے۔ ان کا رخ حویلی کی سمت تھا۔ اباجی اور ملک نواز احمد مسئلہ حل ہو جانے پہ مطمئن اور خوش ہو رہے تھے جبکہ ملک امتیاز احمد خاموش بیٹھے تھے۔۔۔

☆ ☆ ☆

"قاسم علی۔۔۔" وہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد قرآن پاک پڑھ کر مسجد کی دیوار میں نصب لکڑی کی الماری میں رکھ رہا تھا جب انہوں نے اسے پکارا۔
"جی دادا صاحب؟" وہ الماری بند کرکے ان کے سامنے آکھڑا ہوا۔
"بیٹھو!" انہوں نے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
قاسم علی خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔
"بیٹا۔۔۔! ملک نواز صاحب کی بیٹی پڑھائی میں تھوڑی کمزور ہے، میٹرک میں دوسری بار فیل ہوئی ہے، وہ اسے ٹیوشن پڑھانا چاہتے ہیں لیکن انہیں کسی پہ بھروسا نہیں ہے، اس لیے انہوں نے مجھ سے کہا ہے کہ تم اسے روزانہ دو گھنٹے جا کر پڑھا دیا کرو اور بیٹا! مجھ سے انکار نہیں ہوا، میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ تم جا کر پڑھا دیا کرو گے۔"
مولوی صاحب نے کہا تو قاسم علی بدک گیا۔ کسی لڑکی کو پڑھانا اور وہ بھی اس کے گھر جا کر۔۔۔ یہ روگ قاسم علی کے بس کا نہیں تھا، اس کی گردن خود بخود نفی میں ہلنے لگی۔
"دادا صاحب! آپ کو پتا ہے میں یونیورسٹی سے کتنا لیٹ واپس آتا ہوں؟" اس نے بہانہ ڈھونڈا۔
"تم بے شک لیٹ ہی جا کر پڑھا دیا کرنا مگر بیٹا! انکار مت کرنا، میں نے ہامی بھرلی ہے، زبان دی ہے انہیں۔"
مولوی صاحب متفکر ہو رہے تھے کیونکہ انہیں خود بھی احساس تھا کہ اس کے دن بھر کی کتنی ٹف روٹین ہوتی ہے۔۔۔ صبح سویرے شہر جانے کے لیے گھر سے نکلتا تھا اور شام ڈھلے واپس لوٹتا تھا۔ ایسی تھکان کے ہوتے ہوئے کسی کے گھر جا کر اسے پڑھانا آسان کام نہیں تھا آخر۔۔۔ لیکن اپنے دادا صاحب کی زبان کا پاس رکھنے کے لیے قاسم علی کو ہامی بھرنا ہی پڑی تھی۔
وہ بے ساختہ خوش ہو گئے تھے اور قاسم علی کا کندھا تھپکتے ہوئے اسے جانے کی اجازت دی تھی۔ وہ انہیں خدا حافظ کہہ کر مسجد سے نکل آیا کیونکہ اسے یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکلنا تھا اس لیے اسے گھر پہنچنے کی جلدی تھی جہاں دادی صاحبہ یقیناً اس کا ناشتا تیار کیے اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

چن سجناں وے نیڑے نیڑے ہو
ڈھول جانیاں وے نیڑے نیڑے ہو
کنڈیاں نے بانہواں مہتھوں دور نہ کھلو
چن سجناں وے نیڑے نیڑے ہو۔۔۔

نور جہاں کی خوب صورت اور کھنک دار آواز فل والیوم میں گونج رہی تھی اور وہ جھوم رہی تھی۔ یہ گانا اس کا پسندیدہ گانا تھا اور وہ جب بھی یہ گانا سنتی تھی، والیوم فل چھوڑ دیتی تھی۔ اس وقت بھی یہی حال تھا۔ قاسم علی کے قدم سیڑھیوں پہ ہی تھم گئے۔ وہ اس کو پڑھانے کے لیے کافی دیر سے نیچے حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا اور وہ تھی کہ ڈرائنگ روم میں آہی نہ رہی تھی۔ مجبوراً قاسم علی نے ملازمہ کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا تب جواباً" آرڈر ملا کہ وہ حویلی کی چھت پہ ہی آجائے۔ اس کا خود نیچے آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اس لیے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق اسے ہی آنا پڑا تھا لیکن وہ ایسے رسیلے اور مستی بھرے گانے کو سن کر

آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

"قاسم علی! تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اوپر جاؤ ناں' نگاہ بی بی تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔" کلو اسے دیکھ کر اس کے پیچھے آگئی تھی۔

"ہوں! جا رہا ہوں۔" وہ سر جھٹک کر اوپر جانے کے لیے آمادہ ہوا۔

"آجاؤ! میں بھی ساتھ ہوں۔" کلو کہتی ہوئی باقی کی وہ سیڑھیاں بھی طے کر گئی۔

شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چہرے کو چھوتی ہوئی اپنا آپ محسوس کروا رہی تھی' حویلی کی بے حد وسیع و عریض چھت بالکل خالی تھی' حویلی کے پچھلے حصے والی دیوار پہ بازو ٹکائے کوئی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے شولڈر کٹ بال ہوا سے اڑ رہے تھے اور یہی حال اس کے دوپٹے کا تھا جسے اس نے محض گلے میں ڈال رکھا تھا۔ قاسم علی کی سمت اس کی پشت تھی اس لیے وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن وہ اس کے مزاج کا اندازہ لگا چکا تھا اور اس کے لیے چہرہ دیکھنا ضروری نہیں تھا۔ وہ اکثر لوگوں کے انداز و اطوار دیکھ کر ہی ان کے مزاج بھانپ لیتا تھا۔

"قاسم علی آیا ہے نگاہ بی بی!" کلو نے قریب جا کر اطلاع دی۔ اپنی مستی میں گم زرنگاہ نے چونکتے ہوئے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ قاسم علی قریب رکھی بید کی ٹیبل اور کرسیوں کے پاس نظر جھکائے ہوئے کھڑا تھا یوں جیسے اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو کسی گناہ کا ارتکاب ہو جائے گا۔۔۔ اور زرنگاہ کو وہ پہلی نظر میں ہی کافی پرہیز گار اور زاہد قسم کا بندہ لگا تھا' شریف اور حد درجہ شریف۔۔۔!

"اوہ! تو یہ ہے قاسم علی۔۔۔" زرنگاہ نے اسے سر سے پاؤں تک تنقیدی اور جائزہ لیتی ہوئی نظروں سے دیکھا تھا۔ قاسم علی کی نظر جھکی ہوئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کی نظریں خود پہ جمی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اسے بہت عجیب بھی لگ رہا تھا۔ وہ دو لڑکیوں کے درمیان مجرم بنا کھڑا تھا حالانکہ وہ دونوں عمر میں اس سے چھوٹی تھیں' ایک مالک تھی اور ایک ملازم لیکن عورت ذات ہونے کے ناتے وہ اسے برابر نظر آ رہی تھیں۔

"نگاہ بی بی! ملک صاحب نے پیغام بھیجا ہے کہ قاسم علی آپ کو پڑھانے کے لیے آیا ہے' اس کو کوئی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔۔۔" کلو نے پیغام پہنچایا تھا۔

"کیسی شکایت۔۔۔؟" اس نے گھور کے کلو کو دیکھا۔

"یہ آپ کو بہتر پتا ہوگا بی جی۔" کلو نے اسے جیسے کچھ باور کرایا تھا اور زرنگاہ اس کی بات پہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔

"ٹھیک ہے! نہیں ہوگی شکایت' لیکن اگر مجھے قاسم علی سے شکایت ہوئی تو۔۔۔؟" وہ ایسے بات کر رہی تھی جیسے قاسم علی وہاں موجود ہی نہ ہو۔

"امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔" کلو نے سکون سے کہا تھا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔۔۔؟"

"میں یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ میں نے قاسم علی کی دادی صاحبہ سے قرآن پاک پڑھا ہے' روزانہ ان کے گھر پڑھنے کے لیے جاتی تھی' روز سامنا ہوتا تھا لیکن کبھی شکایت نہیں ہوئی۔" کلو کے لہجے میں قاسم علی کے لیے ستائش تھی جس پہ زرنگاہ کو ہنسی ہوئی تھی۔

"اچھا اچھا! جاؤ اب' پڑھنے دو مجھے۔" اس نے کلو کو جانے کا اشارہ کیا اور وہ سر ہلا کر پلٹ گئی تھی۔

"بیٹھیے۔" اس نے لٹھ مار سے انداز میں کہتے ہوئے خود بھی کرسی سنبھال لی تھی۔ قاسم علی دائیں طرف والی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا اس کی نظریں ابھی بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"اسے بند ہی رہنے دیجیے۔" قاسم علی ٹیپ ریکارڈر کی سمت بڑھتا اس کا ہاتھ دیکھ کر بے ساختہ بول پڑا۔

"کیوں؟ کیوں بند رہنے دوں؟" وہ گھور کے بولی۔

"آپ گانا سنیں گی یا مجھے سنیں گی۔۔۔؟" قاسم علی نے بے ساختہ کہتے ہوئے خفگی سے اس کی سمت دیکھا تھا اور ڈھلتی شام کے سرمئی عکس میں وہ اسے دیکھ کر ششدر رہ گیا تھا۔ وہ بہت کم سن تھی لیکن اس کی اٹھان بہت غضب کی تھی' وہ اپنی عمر سے بڑی نظر آ رہی تھی۔ قاسم علی کو دوبارہ نظر جھکانی پڑ گئی تھی۔

"اوکے! آپ کو سن لیتی ہوں۔ سنائیں' کیا کہتے ہیں آپ؟" وہ نجانے کیا سوچ کر کندھے اچکاتے ہوئے متوجہ ہوئی تھی۔

قاسم علی لب بھینچ کے رہ گیا۔

"بولیے ناں قاسم علی صاحب! کیا سنانا چاہتے ہیں آپ؟" وہ اسے زچ کرنے پہ اتر آئی تھی لیکن قاسم علی بھی اتنی جلدی برداشت کا دامن چھوڑنے والا نہیں تھا۔

"آپ کی کتابیں کہاں ہیں؟" اس نے مطلب کی بات نکالی۔

"آپ کے سامنے۔۔۔" زرنگاہ نے ٹیبل کی سمت اشارہ کیا' ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ ہی کتابیں بھی رکھی تھیں۔

"کون سا سبجیکٹ مشکل ہے آپ کے لیے؟" وہ اس کی ساری کتابیں اپنے سامنے کر چکا تھا۔

"میرے لیے تو سارے ہی مشکل ہیں۔" اس نے سرے سے بات ہی ختم کر دی تھی۔

"کس کس کی سپلی آئی ہے؟" وہ کافی تحمل سے پوچھ رہا تھا۔

"ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں' سسی پنوں' رومیو جیولیٹ ان سب کی سپلی آئی ہے' تب ہی تو بے چارے سب کے سب فیل ہو گئے' میری طرح۔" اس نے بات کو مذاق میں اڑا دیا تھا۔

"دیکھیے زرنگاہ بی بی! میں یہاں عشق و محبت کا درس دینے نہیں آیا جو ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں' اور سسی پنوں کی سپلی کا پوچھوں گا' میں یہاں آپ کو پڑھانے کے لیے آیا ہوں' آپ سے آپ کے تمام سبجیکٹ کا پوچھ رہا ہوں' کس کس سبجیکٹ کی سپلی آئی ہے۔۔۔؟ پلیز ٹیل می۔" اس نے ذرا لہجہ بدل کر بات کی اور زرنگاہ مسکرانے لگی۔

"آپ مجھے پڑھانے کے لیے آئے ہیں تو سمجھیں کہ آپ پڑھا چکے مجھے۔" اس نے ہاتھ جھاڑے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" وہ چونکا تھا۔

"مطلب مجھے پڑھنا نہیں ہے۔"

"کیوں؟ آپ کو کیوں نہیں پڑھنا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"کیونکہ مجھے پڑھنے کا کوئی شوق نہیں ہے' اگر شوق ہوتا تو میں اسکول میں ہی پڑھ لیتی' ٹیوشن کی بھلا کیا ضرورت تھی؟" اس نے کندھے اچکائے۔

"لیکن کچھ کام بغیر شوق کے نہ چاہتے ہوئے بھی کرنے پڑتے ہیں۔" قاسم علی نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن کیوں؟ کیوں کرنے پڑتے ہیں؟"

"کیونکہ کچھ کام ہمیں دوسروں کے لیے کرنے ہوتے ہیں۔ جیسے مجھے دیکھ لیں! میں بھی پڑھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ کام کرنا چاہتا تھا' کوئی کاروبار سیٹ کرنا چاہتا تھا تاکہ اپنے پیروں پہ کھڑا ہو سکتا' لیکن میرے دادا صاحب کو میری پڑھائی کا شوق تھا' وہ چاہتے ہیں کہ میں بہت زیادہ پڑھوں اور کسی اونچے عہدے پہ فائز ہو سکوں' سو مجھے ان کے اس شوق کا احترام کرنا پڑا اور میں اس وقت اپنا ماسٹرز کمپلیٹ کر رہا ہوں۔ ان شاء اللہ اس کے بعد سی ایس ایس کروں گا اور ان کا شوق پورا کروں گا کیونکہ ان کا یہ شوق صرف میں پورا کر سکتا ہوں' کوئی اور نہیں۔" قاسم علی نے اسے کافی تفصیل سے سمجھایا۔

"لیکن آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں۔۔۔؟" وہ اسے تیکھے چتون سے دیکھ رہی تھی۔

"میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کے بابا کے شوق بھی صرف آپ پورے کر سکتی ہیں' وہ آپ کو پڑھانا چاہتے ہیں' ان کا شوق ہے یہ؟" وہ سوال کر رہا تھا۔

"قاسم علی صاحب! کسی کا شوق پورا کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا' اس کے لیے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔"

"جی ہاں! صحیح کہہ رہی ہیں آپ' کسی کا شوق پورا کرنا اور بات ماننا آسان نہیں ہوتا' اپنا آپ مارنا پڑتا

ہے' جیسے اس وقت میں کر رہا ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا تھا۔

"کیا مطلب؟ کیا کر رہے ہیں آپ؟"

"اپنے آپ کو مار رہا ہوں' کیونکہ میں یہاں آپ کو پڑھانے کے لیے نہیں آنا چاہتا تھا' لیکن دادا صاحب کی بات مان کر آنا پڑا۔"

اس نے صاف صاف بتا دیا تھا اور زرنگاہ نجانے کیوں پل بھر کے لیے خاموش ہو گئی تھی' پھر بعد میں بھی اس نے زیادہ بات نہیں کی تھی' بس بے دلی سے کتابیں کھول کر بیٹھ گئی تھی اور بددل تو قاسم علی بھی ہو چکا تھا' اسے ان ملکوں میں تیل نظر نہیں آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دادا صاحب! آپ نے مجھے بڑی مشکل جگہ پہ پھنسا دیا ہے۔" قاسم علی مولوی صاحب سے شکایت کر رہا تھا۔

"کیوں کیا ہوا ہے؟" وہ ٹھٹک گئے۔ قاسم علی پائنتی بیٹھا ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔

"زرنگاہ بی بی کا پڑھائی کی طرف کوئی رجحان نہیں ہے' مجھے تین دن ہو گئے ہیں سر کھپاتے ہوئے' لیکن انہوں نے ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں پڑھا۔ وہ الٹا مجھے کہتی ہیں کہ مت آیا کرو' اب آپ سوچیے! اگر میں انہیں پڑھانے کے لیے نہیں جاتا اور انکار کر دیتا ہوں تو ملک صاحب کیا سوچیں گے.... ہو سکتا ہے کہ انہیں غصہ بھی آئے' لیکن آپ مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں؟" قاسم علی بے چارا کافی الجھا ہوا تھا۔

"تم تسلی رکھو اور ہمت مت ہارو۔ زرنگاہ بی بی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہیں۔ ماں کی وفات کے بعد ملک نواز صاحب نے بہت لاڈ پیار دیا ہے انہیں' اسی لیے وہ اس طرح ضد اور من مانی کرتی رہتی ہیں' لیکن رفتہ رفتہ سمجھ بھی جاتی ہیں۔ میں جب انہیں قرآن پاک کا سبق پڑھانے کے لیے جاتا تھا تو وہ اسی طرح ضد اور انکار کرتی تھیں' لیکن پھر سب بچوں سے پہلے قرآن پاک پڑھ گئیں' ان کا رجحان نہیں ہے تو نہیں ہے.... اور اگر رجحان ہو گیا تو پھر سب سے زیادہ ہو گا۔ تم اپنی کوشش جاری رکھو اور صبر سے کام لو۔" وہ اسے ہر طرح سے تسلی دے رہے تھے۔

"لیکن دادا صاحب! اس وقت وہ چھوٹی تھیں اور کسی طرف رجحان نہیں تھا' لیکن اب وہ بڑی ہو چکی ہیں' سو طرف رجحان ہے ان کا' گانے سننا' ٹی وی دیکھنا' رسالے پڑھنا' فیشن کے مطابق لباس پہننا اور خیالی دنیا بسانا اور ان چیزوں کے ہوتے ہوئے میرا نہیں خیال کہ وہ پڑھائی کی طرف توجہ دیں گی۔"

قاسم علی کے ذہن میں ابھی تک اس روز والا گانا "چن بنا ہوئے نیڑے نیڑے ہو" گھوم رہا تھا۔

"سنبھل جائیں گی بیٹا! سنبھل جائیں گی۔ تم پریشان نہ ہو اور اب تم بھی آرام کرو' صبح جلدی اٹھنا ہوتا ہے۔" انہوں نے اپنے پاؤں ایک طرف کو کر لیے تھے۔ وہ دادا صاحب کو خدا حافظ کہہ کر اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کوکب.... ارے کوکب.... کہاں مر گئی ہو؟" وہ حویلی کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا زرنگاہ کا انتظار کر رہا تھا جب اچانک کوئی آواز دیتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ قاسم علی فوراً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم!" اس نے سلام میں پہل کی اور اپنی عادت کے مطابق نظر جھکا لی تھیں۔

"وعلیکم السلام.... ! آپ کون ہیں؟" قندیل اچانک اسے دیکھ کر تھم سی گئی۔

"میں قاسم علی ہوں' مولوی امام دین کا پوتا' زرنگاہ بی بی کو پڑھانے کے لیے آیا ہوں۔" اس نے جھکے ہوئے سر کے ساتھ اپنا تعارف کروایا۔ اس گاؤں کا بچہ بچہ مولوی امام دین کو جانتا تھا اس لیے اپنی پہچان کے لیے قاسم علی کو انہی کا حوالہ دینا پڑتا تھا۔ خود قاسم علی اس گاؤں میں بہت کم ہی رہا تھا اس لیے زیادہ تر لوگ اسے نہیں پہچانتے تھے۔

"مولوی امام دین کا پوتا.... ؟ زرنگاہ کو پڑھانے کے

لیے.... ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا.... ؟" قندیل نے حیرت سے بڑبڑا کر کہا تھا۔

"ملک صاحب نے خود پڑھانے کے لیے کہا تھا۔" قاسم علی نے اس کی حیرانی دور کرنا چاہی۔

"اچھا! کب سے پڑھا رہے ہیں آپ.... ؟" وہ پوری پوری تفتیش کر رہی تھی۔

"آج آٹھواں دن ہے۔"

"ہوں! تو ان آٹھ دنوں میں اتنا کچھ ہو گیا ہے.... ؟ وہ بھی ہماری غیر موجودگی میں.... ؟"

قندیل کو اور زیادہ حیرت ہوئی تھی' وہ دونوں بہنیں قندیل اور کوکب پچھلے دس بارہ دن سے اپنے ننھیال گئی ہوئی تھیں' اپنے ماموں کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ ان کے ماموں زاد کزن کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا اس لیے آج کل وہاں کافی رونق اور جشن کا سماں تھا۔ سب کزنز نے انہیں بھی روک لیا تھا۔ ان لوگوں نے زرنگاہ کو بھی ساتھ چلنے کا کہا تھا لیکن اسے اپنے گھر پہ اور اپنی موج مستی میں رہنے کی عادت تھی' اس لیے انہوں نے بھی زیادہ اصرار نہیں کیا تھا' مگر پیچھے کیا ہوا تھا یا کیا ہو رہا تھا' وہ دونوں بے خبر تھیں۔ وہ کل شام کو ہی واپس آئی تھیں۔

"آپ پھر آ گئے قاسم علی صاحب؟" زرنگاہ نے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی غصے اور خفگی کا اظہار کیا۔

"یہاں آنا اور آپ کو پڑھانا میری ڈیوٹی' میری ذمہ داری ہے زرنگاہ بی بی! اور میں اپنی ذمہ داری سے ہٹ نہیں سکتا۔" اس کا انداز اور لہجہ ہمیشہ کی طرح پرسکون تھا۔

"لیکن میں آپ سے کہہ چکی ہوں کہ آپ کو یہ ذمہ داری نبھانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہو گا' سب کچھ زیرو کا زیرو رہے گا۔"

زرنگاہ قاسم علی پہ اچھا خاصا رعب جما رہی تھی قندیل کو بڑی حیرت ہوئی تھی اور زرنگاہ کی عقل پہ ماتم کرنے کو دل چاہا تھا۔ وہ شخص جو دل میں سجانے کے قابل تھا' وہ اسے اپنے گھر سے نکال رہی تھی' اور وہ تھا کہ شرافت سے سر جھکائے کھڑا سب سن رہا تھا۔ قندیل فدا نہ ہوتی تو اور کیا کرتی.... ؟ اس شخص میں ادا ہی ایسی تھی کہ قندیل اپنے آپ کو گھائل ہونے سے نہیں روک پائی تھی۔

"زرنگاہ! یہ کیا بدتمیزی ہے؟ کیا کہہ رہی ہو تم؟" ملک نواز احمد کی آواز پہ جہاں قاسم علی اور قندیل چونک گئے تھے' وہیں زرنگاہ بھی سٹپٹا گئی تھی۔

"بابا.... وہ' وہ.... یہ قاسم علی۔" زرنگاہ سے فوری کوئی بات نہیں بن پڑی تھی۔

"قاسم علی تمہارا استاد ہے' تمہارا ملازم نہیں ہے جس پہ تم اس طرح چیخ چلا کر غصہ کر رہی ہو؟ بجائے اس کے کہ تم اس کا احترام کرو' الٹا اس سے بدتمیزی کر رہی ہو.... ؟ یہ کون سا طریقہ ہے بات کرنے کا.... ؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ تمہیں پڑھانے کے لیے آئے اور جب تک میں اسے منع نہیں کروں گا' وہ یہاں آتا رہے گا۔"

ملک نواز احمد کو کبھی غصہ نہیں آیا تھا لیکن بیٹی کی بدتمیزی دیکھ کر وہ ضبط نہیں کر سکے تھے۔ زرنگاہ خاموش ہو گئی۔

"قاسم علی! بیٹھو تم' اور تم جاؤ! اپنی کتابیں لے کر آؤ۔" انہوں نے تحکم آمیز لہجے میں کہا۔ اور زرنگاہ فوراً جا کر اپنی کتابیں لے آئی۔

قندیل اور ملک نواز احمد وہاں سے جا چکے تھے۔ زرنگاہ سر جھکائے بیٹھی تھی۔ قاسم علی کی غیر ارادی سی نظر اس کی سمت اٹھ گئی۔ وہ رو رہی تھی اور اس کے آنسو اس کی گود میں رکھی کتاب پہ گر رہے تھے۔ اس کا انداز بہت معصوم اور بچگانہ سا تھا' قاسم علی کے ہونٹوں کو اک خفیف سی مسکراہٹ چھو گئی تھی.... اسے پتا تھا کہ اب اگر اس نے کچھ کہا تو وہ یقیناً پھٹ پڑے گی' اسی لیے وہ اس کے چپ ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ قاسم علی کی خاموشی بھانپ چکی تھی جب ہی اپنے آنسو ہاتھ کی پشت سے رگڑ کر پونچھتے ہوئے سیدھی ہو بیٹھی اور اپنی گود سے کتاب اٹھا کر قاسم علی کی گود میں پٹخ دی۔

"لیں! پڑھائیں مجھے، آپ ہی مجھے پڑھانے کا میڈل لے لیں۔" وہ غصے سے دانت پیس کر بولی تھی۔ اس کا چہرہ غصے سے اور رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہا تھا۔ قاسم علی نے اپنا چہرہ جھکا لیا تھا تاکہ وہ اس کے چہرے کا متبسم سا تاثر نہ دیکھ سکے کیونکہ اگر وہ دیکھ لیتی تو یقیناً "اور بھی تپ اٹھتی۔

"پڑھائیں ناں! اب چپ کیوں بیٹھے ہیں؟" وہ چڑ کر بولی۔ قاسم علی کو بالآخر متوجہ ہونا ہی پڑا تھا۔ آج وہ "اچھی بی بی" بنی بیٹھی تھی۔ قاسم علی نے اسے دو گھنٹے سکون سے پڑھایا۔ ان دو گھنٹوں میں قندیل نے بیس چکر تو ضرور لگائے تھے، جن کو زر نگاہ نے تو نہیں البتہ قاسم علی نے کافی گہرائی سے نوٹ کیا تھا اور اسے خطرے کی گھنٹی سنائی دی تھی۔ اس کی پیشانی پہ شکنیں پڑ گئی تھیں۔

✵ ✵ ✵

"قاسم علی بہت خوب صورت ہے کوکب!" قندیل نے بستر پہ لیٹے ہوئے جیسے آہ بھر کے کہا۔

"تم نے مجھے کیوں نہیں دکھایا؟" کوکب بہن پہ خفا ہوئی۔

"دکھاتی تو تب نا جب تمہیں کچھ ہوش ہوتا۔ تم تو گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی تھیں جیسے کبھی رات تو ہوئی ہی نہیں ہے۔" قندیل کو غصہ آیا تھا۔

"بس اتنے دنوں بعد اپنے بستر پہ لیٹ کر آیا تھا تو نیند بھی آئی اور تھکی ہوئی بھی تھی اس لیے ہوش ہی نہیں رہا۔" کوکب نے کندھے اچکائے تھے۔

"تم بھی اسے دیکھ لیتیں ناں! تو ساری نیندیں اڑ جاتیں تمہاری۔۔۔۔"

"اچھا۔۔۔؟ ایسی بھی کیا چیز ہے وہ۔۔۔؟" کوکب نے تجسس سے پوچھا۔

"یار! تم دیکھو گی تب پتا چلے گا بہت اچھا لگ رہا تھا ہر دن جھکی ہوئی تھی، نظر نیچی تھی، لہجہ گمبھیر تھا، آواز دھیمی تھی، براؤن رنگ کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا، سنہری گندمی رنگت پہ ہلکی ہلکی شیو تھی اور خوب صورت تیکھے عنابی ہونٹ بھینچے ہوئے تھے، چپ چاپ خاموشی سے نگاہ کی ڈانٹ سن رہا تھا اور میرے تو دل میں اتر رہا تھا۔" قندیل نے اپنے دل پہ ہاتھ رکھتے ہوئے پھر آہ بھری تھی۔

"نگاہ کی ڈانٹ سن رہا تھا۔۔۔؟ مگر کیوں۔۔۔؟" کوکب کو حیرت ہوئی تھی۔

"یار۔۔۔! وہ مصیبت ہمیشہ ہمارے لیے مصیبت ہی بنی رہے گی۔ وہ قاسم علی کا آنا پسند نہیں کرتی، اسے نکالنا چاہتی ہے، منع کرتی ہے اسے۔۔۔" قندیل کہتے ہوئے یکدم اٹھ بیٹھی تھی۔

"ہر کام میں اسی محترمہ کی پسند تو نہیں چلے گی ناں؟ اگر قاسم ہمیں پسند ہے تو وہ یہاں آتا ہی رہے گا۔" کوکب نے جیسے وعدہ کیا تھا۔

"وہ کیسے۔۔۔؟ وہ تو پڑھنے کا نام ہی نہیں لیتی۔۔۔؟" قندیل نے ناسمجھی سے کہا۔

"لے گی، ضرور نام لے گی، اس کا دھیان پڑھائی سے ہٹانے والی اگر میں ہوں تو اس کا دھیان پڑھائی کی طرف لگانے والی بھی میں ہی ہوں گی۔" کوکب نے جیسے فخریہ کالر کھڑے کیے تھے۔

"کیا مطلب۔۔۔؟" قندیل کوکب سے بڑی تھی لیکن اکثر باتیں ایسی کر جاتی تھی کہ اس کے چھوٹے ہونے کا گمان ہوتا تھا اور کوکب بڑی لگتی تھی۔

"مطلب کہ اماں اور پاپا نہیں چاہتے تھے کہ نگاہ پڑھے لکھے اور اس کا رجحان تعلیم کی طرف ہو، اس لیے میں نے اس کا دھیان پڑھائی سے ہٹا کر ادھر ادھر کی دلچسپیوں میں لگا دیا ہے تاکہ باقی جاہل اور گنوار عورتوں کی طرح ڈنڈے مارتی پھرے، کوئی کام کرنا بھی ہو تو ہم سب سے پوچھ کر کرے، یہ نہ ہو کہ خود ہی پڑھ لکھ کر سمجھ دار ہو جائے اور ہمارے مقابل آ کھڑی ہو۔ اتنی جائیداد میں آدھا حصہ اس اکیلی کا ہے اور آدھا ہم سب کا۔۔۔ اب تم سوچو! کہ محترمہ کے کتنے ٹھاٹ ہیں آخر۔۔۔ جتنا وہ اکیلی لے گی، اتنا ہم سب کو ملے گا۔ وہ اکیلی ہے اور ہم زیادہ، لیکن حصہ برابر کا۔۔۔ یہ کہاں کا انصاف ہوا بھلا۔۔۔؟ اوپر سے یہ حویلی بھی اسی محترمہ

کے حصے میں ہے اور ہمارے لیے وہ پرانی حویلی۔ واہ! کیا بٹوارہ کیا ہے دادا جان نے۔۔۔ ہونہہ!" کوکب غصے سے سلگ گئی۔

"اوہ! اچھا تو یہ بات ہے۔۔۔؟" قندیل کے ذہن میں یہ زہریلی سوچ اب سمائی تھی ورنہ وہ اس سارے قصے سے [illegible] انجان گھوم رہی تھی۔

"ہاں! ایسی بات ہے، تم بھی دھیان رکھنا نگاہ بی بی چالاک نہ ہونے پائے، بس ہم پہ انحصار کرتی رہے، ویسے اس کی ایک عادت بہت اچھی ہے، ہمارا کہنا فوراً مان جاتی ہے انکار نہیں کرتی۔"

کوکب کہتے کہتے استہزائیہ سے انداز میں مسکرائی تھی۔ قندیل بھی بے ساختہ مسکرا اٹھی۔ اب کوکب اس کے ساتھ تھی اسے بھلا کیا پریشانی تھی، وہ قاسم علی سے کھل کر اظہار کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

زرنگاہ کا اسکول گاؤں سے ذرا ہٹ کے اور کافی فاصلے پر تھا اس لیے روزانہ اسے گاڑی ہی پک اینڈ ڈراپ کرنے آتی تھی۔ آج بھی اسے گاڑی ہی پک کرنے آئی تھی لیکن چند قدم پہ آکر گاڑی کا انجن بند ہو گیا۔ ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر چیک کیا تو پریشان ہو گیا تھا کیونکہ انجن بغیر مکینک کے ٹھیک ہونے والا نہیں تھا اور گاڑی میں زرنگاہ بیٹھی ہوئی تھی جسے حویلی چھوڑنا بھی زیادہ ضروری تھا۔

"کیا بات ہے بشیر؟ کیا مسئلہ ہے اب۔۔۔؟" وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئی تھی۔

"بی بی جی! گاڑی کا انجن خراب ہو گیا ہے، مکینک کو بلانا پڑے گا۔" بشیر اس کے لیے پریشان ہو رہا تھا۔

"تو اب کیا ہو گا۔۔۔؟ میں حویلی کیسے جاؤں گی۔۔۔؟"

"یہی تو میں سوچ رہا ہوں بی بی جی!" اس نے فکر مندی سے کہا۔

"جلدی سوچو! مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ مجھے گھر جا کر کھانا بھی کھانا ہے۔" وہ بے چینی اور عجلت سے بولی۔

"رکشے پہ چلی جائیں گی۔۔۔؟"

"کیا؟ رکشہ پہ میں جاؤں؟ نو نیور۔" اس نے سختی سے انکار کر دیا۔

"اچھا ٹھہریں! میں کوئی اور بندوبست کرتا ہوں۔"

بشیر بے چارا ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ شاید اسے کوئی سواری مل جائے لیکن اسے کوئی سواری تو نہیں البتہ قاسم علی ضرور مل گیا تھا۔ وہ بھی کہیں سے پیدل چلتا ہوا آ رہا تھا۔۔۔ اس کے ہاتھ میں بھی کتابیں تھیں۔

"قاسم علی۔" بشیر کی آواز پہ اپنے دھیان میں چلتے قاسم علی نے چونک کر دیکھا تھا۔

"جی! کیا بات ہے؟" وہ اس کے پاس آکر ٹھہر گیا۔

"گھر کی طرف جا رہے ہو؟"

"جی ہاں! خیریت؟"

"ایک کام کرو گے؟"

"ہوں! کیسے۔۔۔؟"

"وہ دراصل نگاہ بی بی کو اسکول سے لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں گاڑی خراب ہو گئی، اب گاڑی ٹھیک ہونے میں تو نجانے کتنا وقت لگے گا، تم ایسا کرو کہ نگاہ بی بی کو حویلی چھوڑ دو۔" بشیر کی بات پہ قاسم علی ٹھٹک گیا تھا۔

"کیا۔۔۔ پیدل۔۔۔؟"

"ہاں وہ پیدل چلی جائیں گی لیکن رکشے پہ نہیں جا رہیں اور آس پاس کوئی گاڑی بھی نہیں ہے۔" بشیر نے وجہ بتائی۔

"لیکن بشیر! میرے ساتھ وہ کیسے۔۔۔؟"

"چلی جائیں گی یار! تم تو ان کے استاد ہو۔ کافی آنا جانا اور واقفیت ہے تمہاری، اسی لیے تو تمہارے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ ملک صاحب کو پتا چلا تو وہ بھی کوئی اعتراض نہیں کریں گے۔ تم پہ تو انہیں ویسے ہی بہت بھروسا ہے۔"

بشیر اسے تسلی دینے کو کہہ رہا تھا اور قاسم علی جز بز سا ہو کے رہ گیا تھا۔ نہ انکار کر سکتا تھا، نہ اقرار۔۔۔

"تو پھر بلاؤں نگاہ بی بی کو۔۔۔؟" وہ قاسم علی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہوں۔۔۔؟" قاسم علی "ہوں" کے سوا کچھ نہ کہہ سکا اور بشیر نے آگے بڑھ کے گاڑی کا دروازہ کھول دیا وہ بھی ان کی ساری بات سن چکی تھی۔

"السلام علیکم!" قاسم علی نے ہی سلام کرنے کی زحمت کی تھی وہ تو ایسے آداب سے بے بہرہ تھی۔

"وعلیکم السلام!" اس نے آہستگی سے کہا اور اپنا بیگ کندھے سے لٹکا کے اس کے آگے آگے چل پڑی۔

"جاؤ قاسم علی! اکھڑے کیوں ہو؟" بشیر نے اسے ٹہوکا دیا۔ قاسم علی نے بے دلی سے قدم بڑھا دیے۔ اس کا آج کوئی ٹیسٹ تھا، اس لیے وہ یونیورسٹی سے ذرا جلدی فارغ ہو گیا تھا لیکن گاؤں کی حدود میں آکر بس سے اترا تو کوئی تانگہ، رکشہ وغیرہ نہیں ملا، اس لیے وہ پیدل ہی چل پڑا تھا، لیکن یہاں راستے میں آکر ایک اور مصیبت گلے پڑ گئی تھی، اس لیے اسے اب گھر کے بجائے حویلی کی طرف جانا تھا۔

"آپ کہاں سے آ رہے ہیں اس وقت؟" زرنگاہ ٹھہر گئی تھی۔

"یونیورسٹی سے۔۔۔" اس نے نپا تلا سا جواب دیا تھا۔

"اتنی جلدی۔۔۔؟" وہ اسے سر تا پا دیکھتے ہوئے بولی۔ وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے جوتوں پہ جمی مٹی بتا رہی تھی کہ کافی دور سے چل کے آیا ہے۔

"پیپر تھا۔" اس کے جواب مختصر سے تھے۔

"اچھا! پیپر بھی اتنی جلدی ختم ہو گیا؟" وہ جان بوجھ کے سوالات کا سلسلہ بڑھا رہی تھی کیونکہ اسے پتا تھا کہ قاسم علی کا موڈ ٹھیک نہیں ہے۔

"بتایئے ناں قاسم علی! پیپر اتنی جلدی ختم ہو گیا؟" وہ اب اسے زچ کرنے کے لیے اصرار کرنے لگی۔

"پیپر نو بجے شروع ہوا اور بارہ بجے ختم ہو گیا۔ میں [illegible] وہاں سے واپسی کے لیے نکلا ہوں اور دو بجے یہاں پہنچا ہوں۔ اب آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے مجھے پیدل چلتے ہوئے، اس لیے آپ ٹائم دیکھ لیں پورے اڑھائی بجے کا ٹائم ہو رہا ہے، ایک منٹ بھی آگے پیچھے نہیں ہے۔" قاسم علی نے خفگی سے کہتے ہوئے اپنی مضبوط کلائی پہ بندھی بلیک لیدر کے پٹے والی رسٹ واچ اس کے سامنے کی تھی اور زرنگاہ بے ساختہ مسکرا اٹھی تھی۔

اور قاسم علی اس کے مسکرانے پہ حیران ہوا تھا۔

"میں اتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ میں اتنا کچھ کہتی ہوں پھر آپ کو غصہ کیوں نہیں آتا۔۔۔؟ آپ ہمیشہ ٹھنڈے ٹھنڈے کول کول رہتے ہیں، لیکن آج مجھے یقین ہو گیا ہے کہ آپ کو غصہ آتا تو ہے مگر آپ ضبط کر جاتے ہیں۔" زرنگاہ اپنی حرکت پہ خود ہی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ قاسم علی اس کی شرارت پہ خجل سا ہو گیا۔

اس نے گلابی دوپٹے اور سفید یونیفارم میں ملبوس اس کم سن سی اور شرارتی لڑکی کو نرمی سے دیکھا اور گردن جھکا لی۔ وہ پورے راستے یونہی اوٹ پٹانگ سی حرکتیں کرتی ہوئی آئی تھی۔ اتنا طویل راستہ کٹنے کا پتا ہی نہ چلا۔۔۔ اس کے قدم تب رکے، جب وہ حویلی کے سامنے پہنچے تھے۔

"کیا آج پھر آئیں گے۔۔۔؟" وہ گیٹ سے اندر داخل ہونے سے پہلے پوچھ رہی تھی۔

"مجبوری ہے۔۔۔" اس نے بے چارگی سے کہا۔

"آپ کی مجبوری میرے گلے کا طوق بن گئی ہے۔" وہ برا سا منہ بنا کے بولی۔

"اپنے بابا سے کہیں، وہ یہ طوق آپ کے گلے سے اتار دیں۔" قاسم علی نے مشورہ دیا۔

"یہ طوق میں خود ہی اتاروں گی۔"

"وہ کیسے۔۔۔؟" قاسم علی ٹھٹکا۔

"یہ ابھی سوچنا ہے۔"

"کچھ اچھا سوچیے گا۔" قاسم علی نے درخواست کی تھی۔

"آپ! میرے استاد نہ ہوتے تو بہت اچھے ہوتے۔" وہ ناک چڑھا کے کہہ رہی تھی۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"مطلب یہ کہ آپ جس روپ میں میرے سامنے آئے ہیں وہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ آپ میرے ٹیچر بن کے میرے سامنے آئے ہیں اس لیے قطعی اچھے نہیں لگتے البتہ آپ صرف قاسم علی بن کے آتے تو میری آپ سے کافی بن سکتی تھی۔ اتنے برے بھی نہیں ہیں۔۔۔ اچھے انسان ہیں آپ۔"

زرنگاہ اس کی تعریف کرنے کے بعد گیٹ کے اندر غائب ہو چکی تھی اور قاسم علی حیرت زدہ سا بس دیکھتا رہ گیا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"قاسم علی۔۔۔ قاسم علی! اٹھو بیٹا شام ہونے والی ہے اور کتنی دیر سوؤ گے؟ عصر کی نماز بھی قضا ہو گئی تمہاری۔"

دادی صاحبہ نے کمرے میں آکر اس کا کندھا ہلایا اور وہ نماز قضا ہونے کا سن کر یکدم گڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔

"آپ مجھے اب جگا رہی ہیں دادی صاحبہ جب نماز قضا ہو گئی؟" قاسم علی ناراضی سے کہتا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"پہلے بھی تمہیں آواز دی تھی لیکن تم نے سنا ہی نہیں اس لیے اب سب بچیوں کو چھٹی دے کر تمہاری طرف ہی آئی ہوں۔" وہ قاسم علی کا بستر درست کرنے لگیں۔

"اب فوراً" نیند سے اٹھ کر نہانے کے لیے مت گھس جانا بیمار پڑ جاؤ گے۔" انہوں نے اسے تولیہ اٹھاتے دیکھ کر منع کیا تھا۔

"اور جب تک نہاؤں گا نہیں طبیعت فریش نہیں ہوگی۔" اس نے انہیں وجہ بتائی۔

"لیکن بیٹا!" انہوں نے کچھ کہنا چاہا۔

"دادی صاحبہ! مجھے وضو کرنا ہے قضا نماز پڑھنی ہے اور ابھی کچھ اسائنمنٹ بھی بنانی ہیں۔ اس لیے میرا فریش ہونا ضروری ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ذرا ذرا سی بات سے بیمار ہونے والا نہیں ہوں۔" اس نے ان کے کندھے دبا کے کہا اور وہ اسے مزید منع نہیں کر سکیں۔ قاسم علی مسکرا کر غسل خانے کی سمت بڑھ گیا۔ تقریباً" دس منٹ بعد وہ نہا کر تولیے سے بال رگڑتا ہوا باہر نکلا تو اتنے میں مولوی صاحب بھی گھر آ چکے تھے۔

"السلام علیکم دادا صاحب۔۔۔!" اس نے تولیے سے ہاتھ روکتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام! اس وقت کیوں نہائے ہو۔۔۔؟ آج کل موسم تو ویسے ہی اتنا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔" وہ صحن میں بچھی چارپائی پہ بیٹھ گئے۔

"سو گیا تھا اس لیے ٹائم گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا ابھی جاگا ہوں۔" اس نے دوبارہ بال رگڑنے شروع کر دیے۔

"اچھا! تو کیا تم زرنگاہ بی بی کو پڑھانے کے لیے بھی نہیں گئے۔۔۔؟" مولوی صاحب کا پہلا خیال اسی طرف گیا تھا۔۔۔ قاسم علی کا ہاتھ ایک بار پھر رک گیا۔

"جی! نہیں جا سکا۔۔۔"

"جا نہیں سکے سے کیا مطلب ہے تمہارا۔۔۔؟ زیادہ وقت نہیں گزرا ابھی بھی جا سکتے ہو قمیص پہنو بال ٹھیک کرو اور جاؤ اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرو کوتاہی کرو گے تو شرمندگی اٹھاؤ گے۔"

مولوی صاحب نے اسے سرزنش کی۔ قاسم علی چپ کا چپ رہ گیا وہ تولیہ کندھوں پہ ڈالے ان کی چارپائی کے قریب رکھے موڑھے پہ بیٹھ گیا۔

"کیا بات ہے اس طرح کیوں بیٹھ گئے ہو۔۔۔؟" اس کے بیٹھنے پہ انہیں خفگی ہوئی تھی۔

"دادا صاحب! میرا حویلی جانا ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے بالآخر کہہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ مولوی صاحب یکدم چونک اٹھے۔

"حویلی جانا ٹھیک نہیں ہے۔۔۔؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم۔۔۔؟" ان کے لہجے میں پریشانی گھل گئی۔

"دادا صاحب! حویلی میں زرنگاہ بی بی کے علاوہ بھی جوان بیٹیاں ہیں اور میں ایک نامحرم ہوں ان کے لیے میرا وہاں آنا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ حویلی میں کوئی افسانہ بنے۔۔۔" قاسم علی نے کچھ واضح اور کچھ ڈھکے چھپے الفاظ میں انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ مولوی صاحب حیرت سے گنگ ہوئے رہ گئے تھے۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو قاسم علی۔۔۔؟"

"میں کچھ غلط نہیں کہہ رہا دادا صاحب! عورت ذات نادان اور کم عقل ہوتی ہے جب اپنے من مرضی کا سوچتی ہے تو ہر اونچ نیچ اور ذات پات کا فرق بھول جاتی ہے لیکن دنیا یہ فرق بھولنے نہیں دیتی۔ دنیا کیچڑ اچھالنا شروع کر دیتی ہے اور اس سے پہلے کہ دنیا اپنی زبان کا استعمال کرے ہمیں خود ہی سمجھ جانا چاہیے۔" قاسم علی نے مولوی صاحب کو پریشانی اور تفکرات میں دھکیل دیا تھا۔

"کیا کسی نے کچھ کہا ہے تم سے؟"

"کہنا ضروری نہیں ہوتا دادا صاحب!"

"تو پھر۔۔۔؟ تم یہ سب کیوں اور کس بنیاد پر کہہ رہے ہو؟" مولوی صاحب نے اس بات کو غلط ثابت کرنا چاہا تھا۔

"میں نے یہ سب محسوس کیا ہے اور میرے محسوسات کبھی غلط ثابت نہیں ہوئے۔" اس کے لہجے اور انداز میں یقین تھا۔

"لیکن بیٹا! یہ سب غلط فہمی بھی تو ہو سکتی ہے نا؟"

"ہو سکتی ہے ضرور ہو سکتی ہے لیکن میری وہاں موجودگی کے دوران بار بار ایک ہی انسان کا وہاں چکر لگانا اور بار بار بہانے سے زرنگاہ بی بی کو وہاں سے اٹھا کر باہر بھیج دینا مجھ سے غیر ضروری اور بلاوجہ باتیں کرنے کی کوشش کرنا اور میرے لیے چائے وغیرہ اور دیگر لوازمات بھیجتے رہنا بھی غلط فہمی ہے کیا۔۔۔؟ دادا صاحب! میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ ان کے دیکھنے کا انداز ہی کیسا ہوتا ہے ان کی نظریں بہت بے باک ہوتی ہیں شرم اور لحاظ سے عاری بے خوف اور نڈر جیسے کسی کی کوئی پرواہ نہ ہو۔۔۔ ایسے میں کچھ ہو گیا تو کیا کریں گے ہم۔۔۔؟ دیکھنے سننے والے ہمیں غلط کہیں گے انہیں نہیں۔ سارا الزام مرد پر ہی آتا ہے۔ سب کچھ مرد ہی کرتے ہیں۔ چاہے مرد ہر طرف سے بے گناہ اور بے قصور ہی کیوں نہ ہو۔" قاسم علی ایک حقیقت بیان کر رہا تھا اور مولوی صاحب جواباً" کچھ نہ کہہ سکے سوائے ایک بات کے۔۔۔!

"کس کی بات کر رہے ہو۔۔۔؟" ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"قندیل بی بی کی۔۔۔" اس نے بھی آہستگی سے جواب دیا تھا۔

"لیکن بیٹا! میں چاہتا ہوں جیسے تیسے ہی سہی ایک بار تم زرنگاہ بی بی کو میٹرک پاس کروا دو پھر بعد کی بعد میں دیکھی جائے گی اور اس طرح نواز صاحب بھی خوش ہو جائیں گے۔ اب اگر تم یہ کام ادھورا چھوڑو گے تو انہیں کیا وجہ بتاؤ گے؟ اور تمہیں پتا ہے کہ صاف وجہ تو ہم بتا بھی نہیں سکتے اور اس طرح تو کام بھی ادھورا اور ان کی ناراضی بھی اور اوپر سے جو اتنا عرصہ تم وہاں جاتے رہے ہو اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں رہے گا۔ وہ نیکی بھی سمجھو کہ ضائع ہو گئی اس لیے تم سے کہہ رہا ہوں کہ اپنی نیکی خود ہی ضائع نہ کرو تھوڑا صبر کرو کہ کیا ہوتا ہے۔ اللہ سے بہتری اور بھلائی کی امید رکھنی چاہیے اللہ تمہاری مدد کرے گا۔" انہوں نے اس کا کندھا تھپکا۔ قاسم علی خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا تھا اس نے تولیہ کھونٹی پہ لٹکایا قمیص پہنی اپنے بال سنوارے اور کالے رنگ کے سلیپر پہن کر حویلی جانے کے لیے گھر سے نکل آیا۔ البتہ جاتے جاتے راستے میں مسجد میں قضا نماز ادا کرنا نہیں بھولا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! آپ لوگ واپس کب تک آئیں گے؟"

قندیل سیڑھیاں اترتی ہوئی فاخرہ بیگم کے قریب آگئی تھی وہ کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔

"دیکھو بیٹا! آج مہندی کی رسم ہے کل شادی اور پرسوں شام کو ولیمہ کی رسم ہوگی اس کے بعد ہی واپسی کا کچھ بنے گا۔" انہوں نے قندیل کا رخسار تھپکتے

ہوئے کہا تھا۔
"تو آپ لوگ نگاہ کو کیوں ساتھ لے کر جا رہے ہیں؟ اسے تو چھوڑ جائیں۔" قندیل نے غصے سے چڑ کر کہا تھا۔
"اسے ہم نہیں' اس کا باپ ساتھ لے کر جا رہا ہے۔ باپ اور دادا کی چہیتی خود جانے کی ضد کر رہی تھی اور ظاہر ہے وہ تو اسے منع نہیں کریں گے' جو وہ کہے گی وہی کریں گے۔" فاخرہ بیگم دانت پیس کر بولیں۔ انہیں بھی زرنگاہ اتنی ہی ناپسند تھی جتنی ان کی بیٹیوں کو بھی۔
"یعنی وہ بھی تین دن بعد ہی آئے گی...؟" قندیل کو دراصل یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ اگر وہ گھر پہ نہیں ہو گی تو قاسم علی بھی نہیں آنے کا۔
"ظاہر ہے' وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آئے گی۔" فاخرہ بیگم نے کافی نخوت سے کہا تھا۔ وہ لوگ کسی قریبی رشتہ دار کی شادی میں مدعو تھے۔ ملک امتیاز احمد' فاخرہ بیگم اور ملک نواز احمد تینوں جا رہے تھے اور زرنگاہ کے دل میں نجانے کیا سمائی کہ وہ بھی جانے کے لیے تیار ہو گئی تھی' شاید اس لیے بھی کہ یہ شادی شہر میں ہو رہی تھی اور ان سب کو شرکت کے لیے شہر ہی جانا تھا۔
"بیگم صاحبہ! ملک صاحب بلا رہے ہیں' گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" کلو نے آکر اطلاع پہنچائی۔
"اچھا بیٹا! میں چلتی ہوں۔ بڑے ملک صاحب گھر پہ ہی ہیں۔ تم لوگوں کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دو تین دن گزرتے ہوئے پتا بھی نہیں چلے گا' خدا حافظ۔" وہ قندیل کو تسلی دے کر اس کا گال تھپکتے ہوئے چلی گئیں۔
"او کے قندیل آپی! میں بھی جا رہی ہوں۔" زرنگاہ نک سک سے تیار چہکتی ہوئی سیڑھیاں اتر کر نیچے آئی اسے دیکھ کر قندیل کا دل جل کے رہ گیا۔
"اور ہاں قندیل آپی! قاسم علی آئیں تو انہیں کہہ دیجیے گا کہ میں پورا ایک ہفتہ شہر رہ کر آؤں گی' اس لیے وہ فی الحال نہ آئیں۔" زرنگاہ نے جاتے جاتے اسے تاکید کی تھی۔
"ایک ہفتہ...؟" قندیل کو تعجب ہوا تھا۔
"ارے آپی! آنا تو مجھے تین دن بعد ہے' بس اس کے سامنے ہفتے کا بہانہ کرنا ہے۔ اچھا ہے' چند دن جان چھوٹی رہے گی۔" زرنگاہ نے شرارت سے کہا۔ قندیل مزید جل اٹھی۔
"او کے بائے...." وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی پلٹ کر چلی گئی۔
شام گہری ہو رہی تھی جب وہ گھر سے نکلے تھے۔ قندیل اور کوکب گھر پہ اکیلی تھیں' قندیل کو زرنگاہ پہ رہ رہ کر تاؤ آ رہا تھا' البتہ کوکب اسے سمجھا بجھا کر تسلیاں دے رہی تھی۔
"تم... ! تم نہیں سمجھو گی کوکب! وہ' وہ قاسم علی میرے سینے کی آگ بن چکا ہے۔ میں پاگل ہو چکی ہوں اس کی طلب میں۔" قندیل پوری شدت سے اظہار کر رہی تھی۔ کوکب اسے دیکھتی رہ گئی۔ آخر وہ کیا حل سوچتی اپنی اس قدر جنونی اور جذباتی بہن کے لیے....؟
"قندیل بی بی! وہ قاسم علی آیا ہے۔" ان کی ملازمہ سکھن نے آکر اطلاع دی۔ قندیل کی آنکھیں چمک اٹھیں اور چہرے پہ عجیب سی خوشی بکھر گئی۔
"دادا جان کہاں ہیں؟" کوکب نے ملازمہ سے پوچھا۔
"ڈیرے پہ ہیں' کہہ رہے تھے کہ ذرا دیر سے آئیں گے' ان کے کچھ جاننے والے آئے ہوئے ہیں۔" سکھن کے تو فرشتوں کو بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کس نیت سے پوچھ رہی ہے۔
"اچھا! ٹھیک ہے۔ جاؤ تم... اور ہاں قاسم علی کو بھیج دو۔" کوکب نے ذرا لاپروائی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ سکھن سر ہلا کر چلی گئی۔
"کیا ارادہ ہے اب؟" کوکب نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"آج میں سب کچھ کہہ دوں گی' سب اظہار کر دوں گی' اس سے کہہ دوں گی کہ مجھے اپنا بنا لے۔" قندیل کے انداز میں بے قراری تھی۔
"ٹھیک ہے! پھر اس کمرے میں چلی جاؤ' میں اسے وہاں بھیج دیتی ہوں۔ یہاں تو کوئی بھی ملازم آ سکتا ہے۔" کوکب نے سیڑھیوں کے قریب کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ قندیل کوکب کے ساتھ دینے پہ اور بھی شیر ہو گئی۔
"تھینک یو! تھینک یو سو مچ۔" وہ کوکب کا گال چومتی ہوئی کمرے میں چلی گئی تھی اور خود کوکب ڈرائنگ روم میں ٹی وی لگا کے بیٹھ گئی۔
"السلام علیکم بی بی جی!" چند سیکنڈ بعد قاسم علی کی آواز ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے سنائی دی۔
"وعلیکم السلام! قاسم علی تم اس وقت...؟" کوکب نے اسے شام گہری ہونے کا احساس دلایا۔
"معافی چاہتا ہوں بی بی جی! تھکا ہوا تھا اس لیے سو گیا تھا اور نیند میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا' اسی لیے کچھ لیٹ ہو گیا ہوں۔" وہ نظریں جھکائے ہوئے جواب دے رہا تھا۔
"اٹس او کے! لیکن آئندہ کے لیے دھیان رکھنا۔ اپنے وقت پہ آیا کرو۔" کوکب نے اسے ہدایات دیتے ہوئے خوامخواہ رعب جمانے اور اپنے ڈرامے میں رنگ بھرنے کی کوشش کی۔
"ان شاء اللہ! ایسا ہی ہو گا۔" اس نے اسے اطمینان دلایا۔
"اچھا جاؤ! نگاہ اس کمرے میں ہے۔ کمپیوٹر پہ کچھ کام کر رہی ہے۔" کوکب نے لاپروائی سے کمرے کی سمت اشارہ کیا تھا۔
"کمرے میں....؟" قاسم علی کے قدم رک گئے۔
"ہاں! یہاں میں ٹی وی دیکھ رہی ہوں۔ آج تم وہیں بیٹھ کر پڑھ لو۔" اس نے لاتعلقی سے کہا اور مجبوراً قاسم علی کو کمرے کی طرف قدم بڑھانا پڑے۔ کوکب پیچھے سے دیکھ کر مسکرائی اور ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا۔

☆ ☆ ☆

دروازے پہ ہلکی سی دستک دینے کے بعد وہ اندر آیا۔ اندر کمرے میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا تھا۔
"زرنگاہ بی بی!" اس نے الجھتے ہوئے پکارا' لیکن اسے کمرے میں کوئی بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔
"اس حویلی میں زرنگاہ کے علاوہ بھی کچھ لوگ بستے ہیں قاسم علی!" قندیل کی بہکی بہکی اور نشیلی سی آواز سنائی دی۔ قاسم علی یکدم کرنٹ کھا کے پیچھے پلٹا مگر قندیل دروازہ مقفل کر چکی تھی۔
"قندیل بی بی! آپ....؟" قاسم علی اس کا حلیہ دیکھ کر گنگ ہو گیا تھا۔ وہ نیم اندھیرے میں بھی بہت واضح نظر آ رہی تھی اور اس کا حلیہ ایسا تھا کہ قاسم علی کی نظریں جیسے زمین میں گڑ گئی تھیں۔ وہ اک نظر کے بعد دوسری نظر دیکھ نہیں پایا تھا۔
"آئی لو یو قاسم علی! آئی لو یو۔" قندیل بے اختیار ہو کر اس کی طرف بڑھی۔
"یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟" وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔
"قاسم علی! میں تم سے محبت کرتی ہوں' تمہیں چاہتی ہوں' تمہارے لیے پاگل ہو چکی ہوں میں۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا' گھر پہ اور کوئی بھی نہیں ہے' تم ڈرو نہیں۔" قندیل کہہ رہی تھی۔ قاسم علی ششدر سا کھڑا تھا۔ اس عورت نے اپنے نفس کی خاطر کس حد تک خود کو گرا لیا تھا' وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
"قاسم علی دیکھو! اتفاق سے ہمارے نام بھی ایک ہیں۔ تم بھی "ک" اور میں بھی "ک" اور تم اسی چیز سے سوچ لو کہ ہمیں بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔" وہ اسے بار بار جھنجھوڑ کے اپنی سمت متوجہ کر رہی تھی۔
"نام ایک ہونے سے نیت' کردار اور چلن ایک جیسا نہیں ہو سکتا قندیل بی بی! آپ اپنے آپ کو اس حد تک گرا لیں گی میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔" اس نے جیسے حواسوں میں آتے ہوئے اسے دوبارہ پیچھے دھکیل دیا۔
"اپنے آپ کو گرا کر بھی اگر تم مجھے مل جاؤ تو یہ سودا مہنگا نہیں ہے میرے لیے' میں تمہیں پانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔ میں جانتی ہوں' ہماری کبھی شادی نہیں ہو سکتی' لیکن محبت کرنے پر تو پابندی نہیں

ہے۔ بس! ایک بار قبول کر لو مجھے۔" قندیل اس کا گریبان دبوچ چکی تھی۔

"میں ایسی عورت پہ لعنت بھی نہیں بھیجنا چاہتا قندیل بی بی! جو ایک غیر اور نامحرم مرد کے سامنے اس طرح بچھ جائے۔" قاسم علی کے لہجے میں حقارت اتر آئی۔ "چاہتا تو اس پہ ہاتھ بھی اٹھا سکتا تھا لیکن وہ کسی عورت پہ ہاتھ اٹھا کر خود کو کمزور مرد نہیں کہلانا چاہتا تھا۔

"قاسم علی! میں صرف تمہارے لیے بچھ رہی ہوں' صرف تمہارے لیے۔"

"میں بدکردار اور نفس کا ماکا نہیں ہوں قندیل بی بی! گھن آتی ہے مجھے عورت کے اس روپ سے' جو آپ مجھے دکھا رہی ہیں۔" اس نے نفرت سے سر جھٹکا۔

"قاسم علی! تم حد سے بڑھ رہے ہو۔" وہ غصے سے پھنکاری۔ اس کا نفس اس کے اندر زہر بننے لگا تھا۔

"میں حد سے بڑھ رہا ہوں تو معافی چاہتا ہوں آپ سے' لیکن میں آپ کی کوئی گندی اور غلیظ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لیے آپ کسی اور کا انتخاب کیجیے۔ اللہ حافظ۔" وہ کہہ کر دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

"نہیں قاسم علی! تم مجھے اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔ تم چاہو تو میں تمہیں منہ مانگی رقم دے سکتی ہوں' اتنی کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔" وہ یکدم اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گئی تھی لیکن قاسم علی نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے اسے دھکیلا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

"قاسم علی!" وہ پیچھے سے بلند آواز میں پوری قوت سے چیخی۔

"قاسم علی۔۔۔! میں تمہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔ پچھتاؤ گے تم۔" وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ اسے ٹھکرائے جانے کا درد تڑپا رہا تھا لیکن قاسم علی وہاں سے نکلتا چلا گیا۔ کوکب بھی پکارتی رہ گئی تھی۔۔۔!

☼ ☼ ☼

وہ شاید گھر آ کر مولوی صاحب کو ایسی شرمناک بات نہ بتاتا مگر اچانک دادی صاحبہ کی نظر اس کی قمیص کی پھٹی ہوئی جیب کی سمت اٹھی تھی اور گریبان کے دو بٹن بھی ٹوٹے ہوئے تھے۔

"قاسم علی! کسی سے جھگڑا ہوا ہے کیا؟" دادی صاحبہ کی بات پہ مولوی صاحب بھی چونک گئے۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر یہ تیری قمیص کیوں پھٹی ہوئی ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو تم پہن کر گئے تھے؟" وہ پریشان ہو گئیں اور مولوی صاحب بھی اپنے بستر سے اٹھ کے بیٹھ گئے۔

"پتہ دنہاں قاسم علی! کہاں گئے تھے تم۔۔۔ اور کہاں سے آ رہے ہو؟" اب کی بار انہوں نے خود پوچھا تھا۔۔۔ اور قاسم علی نے اک نظر انہیں دیکھنے کے بعد سر جھکا لیا۔

"حویلی گیا تھا اور حویلی سے ہی آ رہا ہوں۔" اس کا جواب بے حد مختصر تھا۔

"حویلی۔۔۔؟ مگر یہ سب؟" وہ الجھ گئے۔

"گھر پہ کوئی بھی نہیں تھا صرف قندیل بی بی اور کوکب بی بی تھیں۔"

قاسم علی کے اگلے جواب پہ مولوی صاحب دھک سے رہ گئے۔ قاسم علی وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس کا ذہن بری طرح منتشر ہو رہا تھا۔ اسے اس وقت ہر چیز بری لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی قمیص اتار کر غصے سے زمین پہ دے ماری۔

دادی صاحبہ اور مولوی صاحب الگ اپنے کمرے میں پریشان حال بیٹھے تھے' اس مسئلے کا کوئی حل نہیں مل رہا تھا انہیں۔

☼ ☼ ☼

"نگاہ بیٹا! ادھر آؤ' بات سنو۔۔۔" ملک نواز احمد ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے جب انہوں نے راہداری سے گزرتی نگاہ کو آواز دی۔

"جی بابا!" وہ چپس کھاتے ہوئے قریب آ گئی۔

"تم لوگوں کو چار دن ہو گئے ہیں شہر سے واپس آئے ہوئے اور میرا خیال ہے کہ قاسم علی ایک بار بھی نہیں آیا؟" انہیں قاسم علی کی غیر حاضری پہ فکر ہو رہی تھی۔

"جی!" اس نے بمشکل جی کہا ورنہ وہ دل ہی دل میں یہی چاہ رہی تھی کہ وہ نہ ہی آئے تو اچھا ہے۔ وہ دن بھر اسکول میں سر کھپا کے گھر آتی ہے تو دو گھنٹے اس کے نامعقول کے بیٹھا رہتا ہے۔

"تو تم نے خود مجھے کیوں نہیں بتایا کہ قاسم علی نہیں آ رہا؟" وہ خفگی سے بولے۔

"میں نے سوچا کہ ایک دو روز میں آ جائیں گے۔" اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔۔۔! وہ سکھن یا کلو کو بھیجو میری طرف۔"

"جی اچھا!" وہ کہہ کے پلٹ گئی۔

پھر ملک نواز احمد نے کلو کو مولوی صاحب کے گھر بھیج دیا تھا قاسم علی کو بلانے کے لیے' لیکن قاسم علی نے بہانہ کر دیا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے' جب ٹھیک ہوئی تو آ جائے گا۔

"اچھا! ٹھیک ہے۔ صبح ہم خود جائیں گے اس کی طبیعت پوچھنے۔" وہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئے اور زرنگاہ پاؤں پٹخ کے رہ گئی۔

"یہ قاسم علی بھی پتا نہیں کب جان چھوڑے گا میری۔۔۔ اتنے دنوں سے آزاد پھر رہی تھی اور اب پھر وہی طوق۔" اس نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"تم جان چھڑانا چاہو تو ایک منٹ میں چھڑا سکتی ہو۔" قندیل کا نفرت بھرے انداز میں بولی۔

"مگر کیسے آپی؟" وہ جھنجلا کر بولی۔

"کیسے؟ یہ تو میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ پہلے تم بتاؤ کہ میرا ساتھ دو گی اپنی جان چھڑانے کے لیے؟" قندیل نے اسے پکا کرنا چاہا۔

"ہوں! دوں گی ساتھ۔" اس نے اپنی مستی اور لاپروائی میں ہامی بھر لی۔ قندیل زہرخند سے انداز میں مسکرائی۔ اسے قاسم علی نے چوٹ پہنچائی تھی اور لازم ہے کہ اب اسے قاسم علی کو چوٹ پہنچانی تھی'

چاہے اس کے لیے اسے کچھ بھی کرنا پڑتا۔

زرنگاہ نے اس سے پوچھا بھی' لیکن قندیل نے فی الحال کوئی بھی بات بتانے سے انکار کر دیا۔

☼ ☼ ☼

دروازے پہ بہت زوردار دستک ہوئی تھی۔

قاسم علی جوتے پہن کر تیزی سے اپنے کمرے سے باہر آیا۔

"کون ہے۔۔۔؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے پوچھا۔

"ملک صاحب ہیں قاسم علی! دروازہ کھولو۔" حویلی کے ڈرائیور بشیر کی آواز تھی۔ قاسم علی نے فوراً دروازہ کھول دیا۔

"ملک صاحب! آپ یہاں؟" سے اچنبھا ہوا۔

"السلام علیکم قاسم علی! ہم تمہاری عیادت کے لیے آئے ہیں۔ اندر نہیں آنے دو گے؟"

"جی ضرور! آئیے آپ اندر آ جائیے۔" قاسم علی ایک بری لڑکی کی وجہ سے باقی سب کے ساتھ بداخلاقی سے پیش نہیں آ سکتا تھا۔ اس نے ان دونوں کو اندر آنے کے لیے راستہ دیا اور انہیں ساتھ لے کر مولوی صاحب کے کمرے میں آ گیا۔

"دادا صاحب! دیکھیے ملک صاحب آئے ہیں۔" قاسم علی کے بتانے پہ وہ فوراً" اٹھ بیٹھے۔

"زہے نصیب! آج ہمارے گھر کے بھاگ کیسے جاگ گئے۔" قاسم علی نے ان کے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی۔

"ہم نے تو سنا تھا قاسم علی بیمار ہے' لیکن ہمیں تو ماشاءاللہ کہیں سے بیمار نظر نہیں آ رہا۔" ملک نواز احمد نے جو بات دل میں آئی تھی' وہ کہہ ڈالی۔

"اس کی طبیعت چار پانچ روز پہلے خراب ہوئی تھی جس کی وجہ سے اس پہ تھوڑی سستی اور کاہلی سوار ہو گئی ہے۔ میں تو اسے کہہ رہا تھا کہ یہ شہر چلا جائے' وہیں ہاسٹل میں رہ لے۔ میں خرچا برداشت کر لوں گا اور یہ خود بھی وہاں کوئی نوکری شروع کر سکتا ہے۔"

مولوی صاحب نے خود ہی طریقے سے بات سنبھالنے کی کوشش کی تھی۔ ملک نواز احمد نرمی سے مسکرائے۔

"اگر قاسم علی شہر چلا گیا تو زرنگاہ کو کون پڑھائے گا؟" وہ کافی نارمل طریقے سے بات کر رہے تھے۔ قاسم علی نے بے ساختہ مولوی صاحب کی طرف دیکھا تھا۔

"اگر یہاں رہے گا تو ضرور پڑھائے گا' لیکن اگر شہر جانے کی تیاری بن گئی تو پھر۔" مولوی صاحب نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں مولوی صاحب! جب تک زرنگاہ میٹرک نہیں کر لیتی' قاسم علی کو کہیں نہیں جانا چاہیے۔ میں دراصل یہ چاہتا ہوں کہ وہ میٹرک کلیئر کرلے تو میں اسے شہر بھیج دوں گا۔ وہاں وہ فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لے گی اور ساتھ ساتھ اسے ٹیوشن بھی پڑھاتے رہیں گے۔ شہر میں تو کوئی بھی اچھا سا ٹیوٹر آسانی سے مل سکتا ہے' بس مسئلہ ہے تو صرف گاؤں کا۔ صرف کچھ عرصے کی بات ہے......"

"لیکن ملک صاحب وہ میں......" قاسم علی نے کچھ بولنا چاہا مگر مولوی صاحب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے ملک صاحب! آپ اتنا مجبور کر رہے ہیں تو قاسم علی آجائے گا۔ اب آپ کے سامنے انکار تو نہیں ہو سکتا ناں؟ کچھ عرصہ بعد شہر چلا جائے گا۔" مولوی صاحب انہیں صاف انکار نہیں کر سکے۔ قاسم علی ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ کے رہ گیا۔

"شکریہ مولوی صاحب! بہت بہت شکریہ۔" ملک نواز احمد خوش ہو گئے۔ دادی صاحبہ نے ان کے لیے چائے بنا کر اندر بھیجی۔ چائے پینے کے بعد وہ واپسی کے لیے کھڑے ہو گئے۔ انہیں رخصت کر کے قاسم علی واپس مولوی صاحب کے پاس آ بیٹھا تھا' مگر اس کا موڈ آف تھا۔ یہ بات وہ بھی نوٹ کر چکے تھے۔

"قاسم علی!" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"دادا صاحب! آپ شاید اس مسئلے کو اس گہرائی سے نہیں سمجھ رہے جس گہرائی سے میں آپ کو سمجھانا چاہ رہا ہوں۔ میرا وہاں جانا ٹھیک نہیں ہے کوئی بھی فساد کھڑا ہو سکتا ہے۔ آپ کیوں نظریں چرا رہے ہیں کہ چند روز پہلے کیا ہوا تھا آخر......؟"

"وہ سب ٹھیک ہے بیٹا! مگر اب یہ دیکھو کہ وہ خود گھر چل کے آئے ہیں۔" مولوی صاحب بھی عجب کشمکش کا شکار تھے۔

قاسم علی انہیں سختی سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے بزرگ تھے اور وہ تھے کہ مصلحت نبھاتے نبھاتے ہر طرف سے آنکھیں ہی بند کر چکے تھے۔

☆ ☆ ☆

چن تے چکوری دنگوں پیار کرییے
اسی دو وے دنیا توں کیوں ڈرییے
پیار دیاں بانہواں وچ مینوں تو لکو
چن سجناں وے نیڑے نیڑے ہو
ڈھول جانیاں وے نیڑے نیڑے ہو

آج پھر ان گانے نے قاسم علی کے قدموں کو رکنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی دہلیز پہ کھڑا تھا اور زرنگاہ سامنے صوفے پہ بیٹھی ٹی وی پر تیز آواز کے ساتھ یہ گانا دیکھ رہی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے کافی بلند آواز میں سلام کیا تھا تاکہ وہ سن لے۔

"وعلیکم السلام! آئیے آئیے...... اندر آ جائیے۔" زرنگاہ فورا" صوفے سے کھڑی ہو گئی اور والیوم بھی کم کر دیا۔

"آپ اپنی کتابیں لے کر باہر لان میں آجائیں۔ یہاں بیٹھنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔" وہ کہہ کر قدم واپس موڑ چکا تھا۔

زرنگاہ نے اسے پیچھے سے آواز بھی دی مگر اس نے سنی اور باہر نکل گیا۔ مجبورا" زرنگاہ کو ہی اپنا بیگ لے کر باہر آنا پڑا۔

"میں تو اتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ چلو! اچھا ہے کہ میرا پیچھا چھوٹ گیا' مگر مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ اتنی جلدی میرا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔" زرنگاہ اس کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے برا سا منہ بنا کر بولی۔ قاسم علی نے کوئی بھی جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔

"سنا تھا' بیمار ہو گئے تھے آپ......؟ بائی دا وے ہوا کیا تھا......؟" زرنگاہ نے بیگ سے کتابیں نکالتے ہوئے شرارت سے اسے چھیڑا۔

"یہ وقت باتیں کرنے کا نہیں ہے۔" اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! کیا کرنے کا ہے؟" وہ باز نہیں آئی۔

"شٹ اپ! میں بڑا ہوں آپ سے۔ آپ کو بات کرنے کی تمیز نہیں ہے کیا؟" قاسم علی خوامخواہ چڑ چڑا رہا تھا۔ زرنگاہ کا کوئی قصور نہ ہوتے ہوئے بھی اسے اس پہ غصہ آرہا تھا۔ زرنگاہ حیرت زدہ سی اس کی سمت دیکھتی رہ گئی۔ قاسم علی نے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کبھی اس پہ غصہ نہیں کیا تھا' کبھی ڈانٹ ڈپٹ کے بات کرنے کی یا پڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی' ہمیشہ نرمی سے اور دھیمے لہجے میں بات کرتا تھا۔ غصہ آیا بھی ہوتا تو ضبط کر جاتا تھا' لیکن آج اس کا مزاج کچھ اور ہی کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی حیران ہوئی تھی۔

"ایم سوری! میں تو بس مذاق کر رہی تھی۔" وہ یقینا" دھیمی پڑ گئی تھی۔

"میرے اور آپ کے درمیان مذاق کا کوئی رشتہ نہیں ہے' اس لیے بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھا کریں۔"

قاسم علی حد سے زیادہ تلخ ہو رہا تھا۔ جو کچھ ہو چکا اس کے بعد وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرنگاہ اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کرے' اسی لیے اسے ایک حد میں رکھنے کے لیے اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی ڈانٹ دیا تھا۔

"ہوں! ٹھیک ہے۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کی طبیعت بہت زیادہ خراب رہی ہے۔ ڈونٹ وری! ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ آپ کا حق بنتا ہے۔ آپ استاد محترم ہیں میرے۔"

وہ سنجیدگی سے کہتے کہتے بھی مذاق کر گئی تھی اور قاسم علی نے دوبارہ کچھ بھی کہنے سے خود کو باز رکھا تھا' کیونکہ اسے پتا تھا کہ اب وہ اس کی ضد میں آکر بھی اسے تنگ کرے گی۔

"ویسے میں جس شادی میں گئی تھی ناں وہ دلہن بہت خوب صورت تھی' لیکن دولہا تو حد سے زیادہ خوب صورت اور شاندار تھا' واہ! کیا کمال کی جوڑی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ جب آپ کی شادی ہو گی تو آپ بھی ایسے ہی لگیں گے۔ شاندار پرسنالٹی ہولڈر' لیکن مزا تب آئے گا جب آپ کی دلہن بھی خوب صورت ہو گی۔"

وہ اپنی دھن میں کافی اوٹ پٹانگ بول رہی تھی لیکن قاسم علی خاموش تھا بس...... اور پھر وہ پہلے سے زیادہ خاموش اور محتاط ہو گیا تھا' لیکن اس دوران ہی اس کے خلاف کیا کھچڑی پکی تھی' کیا منصوبہ ترتیب دیا گیا تھا۔ وہ جان ہی نہ سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

قاسم علی اب اسے روزانہ لان میں بیٹھ کر ہی پڑھاتا تھا تاکہ آنے جانے والے بھی دیکھتے رہیں کہ وہ پڑھا رہا ہے۔ کوئی غلط کام نہیں کر رہا' لیکن آج اس کے لیے مسئلہ ہو گیا تھا کہ حویلی آتے آتے بارش شروع ہو گئی تھی' لہٰذا مجبورا" اسے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھنا پڑا آج اس کے علاوہ زرنگاہ بھی ذرا چپ چپ سی تھی مگر قاسم علی نے پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

تقریبا" آدھا گھنٹہ گزرا تھا جب زرنگاہ کو قندیل نے آواز دے کر باہر بلایا تھا اور زرنگاہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے اٹھ کر جانا پڑا تھا۔ قاسم علی اس کا انتظار کرنے لگا لیکن چند سیکنڈ بعد زرنگاہ کے بجائے قندیل ضرور آگئی۔ قاسم علی اسے دیکھ کر یکدم کرنٹ کھا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پہ عجیب سی مسکراہٹ تھی۔

"کیسے ہو قاسم علی؟" وہ کافی تمسخرانہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"آپ ۔۔۔ آپ' یہاں؟" وہ کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"چند روز پہلے میں تڑپی تھی قاسم علی! آج تم تڑپو گے۔ اس روز تم نے میری نہیں سنی تھی' آج تمہاری کوئی بھی نہیں سنے گا۔ آج تمہاری باری ہے۔"

وہ اسے کسی انہونی کا الارم دے رہی تھی۔ قاسم علی کے ذہن میں ۔۔۔ خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ وہ وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن قندیل بھی پوری تیاری سے کھڑی تھی۔ وہ اسے اتنی آسانی سے بھلا کیسے جانے دے سکتی تھی ۔۔۔؟ اس نے قاسم علی کو پوری قوت سے پیچھے دھکیلا اور اس کو نوچتے کھسوٹتے ہوئے شور مچا دیا تھا۔ ۔۔۔ منٹ کی بات تھی اور حویلی کے تمام لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ۔۔۔ کوکب' ملک خورشید احمد' گھر کے ملازم اور زرنگاہ بھی وہاں بھاگی آئی تھی اور سب ہی پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ قندیل کا دوپٹہ نیچے کارپٹ پر گرا ہوا تھا۔ خود وہ بلند آواز سے رو رہی تھی اور قاسم علی ششدر سا آنکھیں پھاڑے اس کا یہ ڈراما دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہوا ہے ۔۔۔؟ سب یہاں کیوں جمع ہیں ۔۔۔؟" ملک امتیاز احمد کی آواز پہ سب لوگوں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ ان کو دیکھ کر سارے ملازم ایک طرف پہ ہو گئے تھے ڈرائنگ روم کے اندر کا منظر دیکھ کر ملک امتیاز احمد کی بھنویں تن گئیں۔

"بابا ۔۔۔!" قندیل روتی ہوئی ایک کراہ سے ان کے سینے سے لگ گئی۔

"قاسم علی نے ۔۔۔ مم' مجھے اکیلے دیکھ کر میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے' میرا دوپٹہ چھینا ہے مجھ سے' اگر میں شور نہ مچاتی تو یہ ۔۔۔ یہ جانے کیا ۔۔۔"

وہ کہتے ہوئے یکدم ہچکیوں سے رونے لگی۔ پھر کوکب اور فاخرہ بیگم کا واویلا بھی شروع ہو گیا تھا جبکہ ملک امتیاز احمد کا خون کھول اٹھا تھا۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' خونخوار انداز میں آگے بڑھتے ہوئے اسے یکدم گریبان سے دبوچ لیا اور ایک زوردار مکا اس کے منہ پر رسید کیا۔

"تایا جی!" زرنگاہ بے ساختہ قاسم علی کی چوٹ پہ بلبلا اٹھی' لیکن کوکب نے اس کا بازو کھینچتے ہوئے اسے خاموش کرا دیا۔ یہ اور بات تھی کہ ملک امتیاز نے اس کی آواز پہ کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔

"بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" ملک نواز احمد بھی ان کے ساتھ ہی ڈیرے سے اٹھ کر آئے تھے' لیکن وہ باہر فون سننے کے لیے رک گئے تھے مگر جب اندر آئے تو دنگ رہ گئے۔

"میں مار ڈالوں گا اس کمینے کو۔ اس نے ۔۔۔ اس نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے میری بیٹی پہ بری نظر ڈالی ہے۔ اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ یہ ایسی حرکت کہاں کر رہا ہے۔ میں اس بے غیرت کا خون پی جاؤں گا ۔۔۔" وہ اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑ رہے تھے۔

"میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی جس کی وجہ سے آپ کی عزت ۔۔۔"

"بکواس بند کرو۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو کہ تم نے ایسی حرکت نہیں کی۔ کیا میری بیٹی جھوٹ بول رہی ہے' ایسا شرمناک جھوٹ وہ بھلا کیوں بولے گی؟" ملک امتیاز نے اسے مزید تھپڑ اور گھونسے رسید کیے تھے' لیکن ملک نواز احمد فوراً سامنے آ گئے۔

"بھائی صاحب! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ پہلے ساری بات تو سن لیں کہ آخر ہوا کیا ہے؟" انہوں نے ان کا ہاتھ روکنے کی کوشش کی۔

"میں سن چکا ہوں ساری بات مجھے اور کوئی بات نہیں سننی۔ اپنی آنکھوں سے اپنی بیٹی کو بلکتے دیکھا ہے۔ اس ذلیل' کمینے کی جرات کیسے ہوئی کہ میری عزت پہ ہاتھ ڈالے؟" ملک امتیاز کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

"ملک صاحب! میں نے کچھ نہیں کیا' میں بے قصور ہوں' میں نے کبھی بھی ان پہ بری نظر نہیں ڈالی۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ ڈراما ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھ پہ کیچڑ اچھالنے کے لیے یہ سب کیا گیا۔" قاسم علی نے اپنی صفائی میں بولنے کی کوشش کی۔

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ سب جھوٹ ہے؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟" ملک نواز احمد نے اسے بولنے کے لیے موقع دیا تھا' لیکن قاسم علی بے بس تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسا ثبوت نہیں تھا کہ وہ اپنی صفائی دینے کے لیے کچھ کہتا ۔۔۔ اس کا دماغ بند ہو رہا تھا جب اچانک ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اسے زرنگاہ کا خیال آیا تھا۔ زرنگاہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیر رہی تھی۔

"آپ ۔۔۔ آپ زرنگاہ بی بی سے پوچھ لیں' میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ تھوڑی دیر پہلے میرے پاس ہی کمرے میں انہیں پڑھا رہا تھا کہ باہر سے قندیل بی بی نے انہیں بلا لیا اور ان کو بھیج کر یہ خود اندر آ گئیں۔ زرنگاہ بی بی! بتائیے ناں آپ' میں' میں سچ کہہ رہا ہوں' میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ پلیز! بتائیے ملک صاحب کو' میں بے قصور ہوں۔ میرا دامن' میرا کردار صاف ہے۔ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ میرا ضمیر زندہ ہے۔ آپ' آپ مجھے اچھی طرح جانتی ہیں' میں ایسا نہیں ہوں' زرنگاہ بی بی! خدا کے لیے ایک بار بولیے تو سہی۔"

قاسم علی اپنے جسم پہ پڑنے والی مار کے لیے نہیں بلکہ کردار پہ لگنے والے داغ کے لیے تڑپ رہا تھا وہ ایسا نہیں تھا لیکن اسے ایسا بنایا جا رہا تھا۔ دوسروں کی نظروں میں گرایا جا رہا تھا۔ ملک نواز احمد اس پہ بھروسا کر کے اسے اس حویلی میں لائے تھے تو اب اس بات کے بعد وہ کیا سوچیں گے ۔۔۔؟ قاسم علی یہی سوچ کر پاگل ہو رہا تھا۔

"زرنگاہ بی بی! آپ چپ کیوں ہیں؟ بولیے نا' بتائیے سب کو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔"

قاسم علی اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا لیکن زرنگاہ نے کچھ بھی نہیں کہا' بلکہ خاموشی سے نظریں جھکا کر سر بھی جھکا لیا تھا اور اس کی جھکی نظر اور خاموشی نے قاسم علی کو ساکت کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے کھڑی زرنگاہ کو بے یقین نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ نجانے کیوں اتنے بہت سارے لوگوں میں قاسم علی کو لگا تھا کہ وہ اس کا ساتھ دے گی۔ وہ سچ بولے گی' وہ چپ نہیں رہے گی' لیکن ۔۔۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ گنگ سا رہ گیا۔

اور زرنگاہ کی چپ اور جھکی گردن دیکھ کر ملک نواز احمد کو بھی یقین کرنا پڑا کہ قاسم علی غلط ہے اور قندیل واقعی سچ کہہ رہی ہے ۔۔۔ یہاں سارے ایک ہی ضمیر کے لوگ تھے' قاسم علی اکیلا بھلا کیا کرتا؟

"سن لیا زرنگاہ بی بی کا جواب؟" ملک امتیاز احمد نے اپنی بندوق اتارتے ہوئے بندوق کا بٹ اس کے کندھوں پہ دے مارا۔ قاسم علی منہ کے بل فرش پہ گرا ۔۔۔ زرنگاہ بے ساختہ چیخنے لگی تھی کہ کوکب اسے کھینچتی ہوئی وہاں سے باہر لے گئی' پھر بازو کا زور تھا اور ملک امتیاز کا قہر جو قاسم علی نے اپنے وجود پہ سہا تھا' وہ تو شاید اسے جان سے ہی مار دیتے لیکن اسی وقت علاقے کے ایم پی اے کے آنے کی اطلاع ملی۔ وہ اسے چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

قاسم علی کے منہ اور ناک سے بہنے والا خون حویلی کے ڈرائنگ روم' راہداری اور روش کو بھی رنگین کرتا گیا۔ ملازمین اسے حویلی سے مارتے ہوئے مولوی صاحب کے گھر تک لائے تھے اور اسے لا کر مولوی صاحب کے قدموں میں پھینک دیا تھا ۔۔۔ مولوی صاحب الگ اس افتاد پہ گھبرائے ہوئے کھڑے تھے۔ اب گاؤں میں رہنا ممکن نہیں تھا۔ وقتی طور پر اس کی جان بچ گئی تھی لیکن ملک امتیاز اسے زندہ نہ چھوڑتے۔ مولوی صاحب نے رات کی تاریکی میں چپکے سے گاؤں چھوڑ دیا تھا۔ قاسم علی کو نیم بے ہوشی کی حالت میں بس کے اڈے تک اس کے دوست نے اپنے تانگے میں چھوڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایس پی قاسم علی کے آفس میں گہری اور دبیز خاموشی کا راج تھا۔

آج دس سال بعد بھی وہ اس کے سامنے خاموش اور سر جھکائے بیٹھی تھی' وہ زندگی بھر اپنے آپ کو قاسم علی کا سامنا کرنے کے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ لیکن قدرت نے یہ سامنا کروا ہی دیا تھا اور کروایا بھی اس وقت تھا جب زرنگاہ نواز بے بسی کی حالت میں تھی بالکل ایسی بے بسی جیسی آج سے دس سال پہلے قاسم علی پہ تھی۔

وہ وقت' وہ منظر آج بھی قاسم علی کو یاد آجاتے تھے تو وہ نئے سرے سے زخمی اور لہولہان ہو جاتا تھا۔ اس کی کنپٹی کی رگیں تن جاتی تھیں اور وہ اپنے دل و دماغ میں اٹھتی قیامت کو بمشکل دبا پاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کے اندر اک قیامت کا اشتعال اٹھ رہا تھا لیکن وہ بھی آخر قاسم علی ہی تھا۔ [illegible] کر بھی صبر اور برداشت کرنے والا' کیونکہ مولوی امام دین نے بچپن سے لے کر اب تک اسے صبر کرنا ہی تو سکھایا تھا۔

"یو مے گو ناؤ۔" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو چکا تھا۔

"جی سر!" وہ کہہ کے پلٹ کر چلا گیا تھا اور قاسم علی کی توجہ دوبارہ زرنگاہ کی سمت مرکوز ہو چکی تھی۔

"جی خاتون! کیسے یہ واقعہ پیش آیا ہے آپ کے ساتھ؟" وہ اپنے پروفیشنل روپ میں ڈھل چکا تھا۔۔۔ زرنگاہ نے چونک کر اس کے چہرے کی سمت دیکھا۔ وہ بہت بے تاثر سے انداز میں اسی کو دیکھ رہا تھا۔

"دیکھیے خاتون! آپ کی خاموشی میرا ٹائم ویسٹ کر رہی ہے۔ آپ کے مسئلے کے علاوہ بھی ہزاروں مسائل ہیں اس پولیس اسٹیشن میں۔ ہمیں سب کو ٹائم دینا ہوتا ہے۔ آپ پلیز! ذرا جلدی بتا دیں کہ آپ کو کیا پریشانی ہے۔۔۔؟ وہ لوگ کون تھے' جو آپ کا پیچھا کر رہے تھے۔۔۔؟"

وہ اس وقت صرف قاسم علی نہیں' بلکہ ایس پی قاسم علی تھا' آن ڈیوٹی تھا' اس لیے اسے اس وقت ڈیوٹی ہی نبھانی تھی۔

"وہ لوگ مجھے جان سے مارنا چاہتے تھے اس لیے میرا پیچھا کر رہے تھے۔۔۔" بالآخر زرنگاہ کو اپنی شرمندگی کے باوجود زبان کھولنی پڑی تھی۔

"لیکن وہ لوگ ہیں کون؟" وہ پوری توجہ سے سن رہا تھا۔

"ان میں ایک میرے تایا جی کا بیٹا ہے اور دو اس کے آدمی ہیں۔" اس نے تایا جی کے بیٹے کا کہتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔

"ہوں ٹھیک۔۔۔ ٹھیک! لیکن وہ آپ کو مارنا کیوں چاہتے ہیں؟" قاسم علی پوری تفتیش کر رہا تھا۔

"وہ جائیداد میں میرے حصے پہ بھی قابض ہونا چاہتے ہیں۔ میرے دادا جان نے آج سے کئی ماہ پہلے ہی جائیداد کا بٹوارہ کر دیا تھا۔ آدھی جاگیر اور جائیداد تایا جی کے نام کر دی اور آدھی میرے بابا کے نام کر دی' لیکن تایا جی کو یہ بٹوارہ پسند نہیں آیا تھا۔ دادا جان اور میرے بابا سے اکثر متنفر ہی رہتے تھے حالانکہ بابا نے کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ بس اپنی ذات میں گم رہنے والے آدمی تھے۔ امی کی ڈیتھ کے بعد انہوں نے ہر چیز سے اپنی دلچسپی ختم کر لی تھی۔ وہ اگر کسی کے بارے میں سوچتے تھے تو وہ صرف میں تھی۔ انہوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا' لیکن تایا جی نے آج تک ہر ایک کا برا ہی چاہا ہے۔ پانچ سال پہلے دادا جان کی ڈیتھ ہوئی تو بابا اور بھی اکیلے ہو گئے' تایا جی کو بھی چھوٹ مل گئی تھی۔ وہ انہیں اندر ہی اندر سلو پوائزن دیتے رہے' یہاں تک کہ انہوں نے بابا کی جان لے لی۔"

زرنگاہ کے حلق میں آنسوؤں کا گولا اٹک گیا۔ بات کرتے کرتے لمحہ بھر کے لیے خاموش ہو گئی تھی' وہ ضبط کرنے کی کوشش کرنے لگی کیونکہ وہ اس وقت قاسم علی کے سامنے بیٹھ کر آنسو بھی نہیں بہانا چاہتی تھی۔ وہ سامنے بیٹھا اس کے مزید بولنے کا انتظار کر رہا تھا۔

"چھ ماہ پہلے ہی بابا جان کی ڈیتھ ہوئی ہے اور مجھے [illegible] ماہ ہو چکے ہیں اپنے بابا کے قاتلوں کے ساتھ رہتے ہوئے۔ میرے بابا مجھے بہت سمجھاتے تھے کہ دنیا ظالم ہے' یہاں کوئی کسی کا نہیں ہے' لیکن میں سمجھتی نہیں تھی۔ تایا جی کے دو بیٹے تھے دونوں ہی پڑھنے کے لیے ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ تایا جی کسی ایک بیٹے کے لیے بابا سے میرا ہاتھ مانگنا چاہتے تھے لیکن بابا نے صاف انکار کر دیا' کیونکہ وہ اپنے دونوں بھتیجوں کی بد مزاجی اور رنگین مزاجی کو جانتے تھے۔ ان دونوں نے امریکا میں شادیاں کر رکھی تھیں اور ابھی [illegible] اور کتنی شادیوں کا ارادہ تھا۔ اس لیے بابا نے ان کے بیٹے کا پرپوزل ٹھکرا دیا۔ وہ میری شادی کسی اچھی جگہ کرنا چاہتے تھے۔ کسی شریف اور عزت دار گھرانے میں' لیکن اسی دوران ان کی ڈیتھ ہو گئی۔ ان کی ڈیتھ کے دو ماہ بعد ہی تایا جی نے مجھے شادی کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کو [illegible] شادی کے لیے تیار کر لیا تھا اور واپس پاکستان بلا لیا تھا تاکہ میری شادی کسی اور سے نہ ہو اور جائیداد کا آدھا حصہ کسی اور کے حق میں نہ چلا جائے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جس رشتے کے لیے میرے بابا راضی نہیں ہوئے تھے' اس کے لیے میں بھلا کیسے راضی ہو سکتی تھی۔۔۔؟

اپنے بابا کی طرح میں نے بھی صاف انکار کر دیا' اس پہ وہ مشتعل تو ہوئے۔۔۔ لیکن میرے سامنے اپنا غصہ دبا گئے۔ انہوں نے مجھے لاڈ پیار' بلکہ ہر ممکن طریقے سے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میرا انکار' انکار ہی رہا تھا' جس پہ انہوں نے میرے لیے بھی اندر ہی اندر پلان بنانا شروع کر دیا۔ وہ مجھے گاؤں میں ہی جان سے مار سکتے تھے لیکن اس طرح سارا الزام ان پہ آجاتا' اسی لیے انہوں نے میری موت کے لیے میرے شہر آنے کا انتظار کیا تھا۔ آج میری ایک دوست کی شادی تھی۔ تایا جی کا بہت اصرار تھا کہ مجھے ان کی شادی میں ضرور شرکت کرنی چاہیے' اس لیے مجھے آنا ہی پڑا۔ شادی کا فنکشن تھوڑا لیٹ تھا۔ میں ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سوچا میں اپنی دوسری فرینڈز سے فون کر کے پوچھ لوں کہ وہ گھر سے نکل رہی ہیں۔۔۔ اور یہی پوچھنے کے لیے میں فون پہ آئی اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا تھا لیکن وہ سب کچھ جو میں پہلے کبھی نہیں جانتی تھی' وہ سب ایک پل میں جان گئی تھی۔"

☼ ☼ ☼

"لیکن بابا جان! بشیر کا کیا ہو گا۔۔۔؟" ملک امتیاز احمد کے بیٹے ملک توقیر احمد کی آواز قدرے پریشان تھی۔

"بشیر کا بھی وہی ہو گا جو زرنگاہ کا ہو گا۔" ملک امتیاز احمد کی آواز انتہائی سفاک اور بے رحم محسوس ہو رہی تھی۔

"کیا؟ لیکن بابا جان! بشیر اپنا آدمی ہے۔ آپ کوئی اور طریقہ سوچ لیں' جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ زرنگاہ کا ایکسیڈنٹ کسی اور طریقے سے بھی تو کروایا جا سکتا ہے نا؟"

ملک توقیر احمد کی واضح بات پہ زرنگاہ ایک پل کے لیے تو سر تا پا کانپ اٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹتے چھوٹتے بچا تھا۔۔۔

"کسی اور طریقے سے ہو گا تو ڈراما لگے گا۔ اس طرح دونوں موقع پہ ہلاک ہوں گے تو کسی کو ہم پہ شک بھی نہیں ہو گا۔ لوگ یہی کہیں گے کہ ڈرائیور بھی ساتھ ہی ہلاک ہو گیا۔" ملک امتیاز احمد نے ہر بات کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا لیکن ملک توقیر احمد ہر پہلو کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اور اگر وہ اس ایکسیڈنٹ کے باوجود بچ گئی تو۔۔۔"

وہ تصویر کا دوسرا رخ دکھا رہا تھا۔

"اگر وہ اس ایکسیڈنٹ کے باوجود بچ گئی تو اسے وہیں گلا دبا کر یا زہر دے کر مار دینا۔ اس کے باپ کو تو قطرہ قطرہ زہر دیا تھا' لیکن اسے قطرہ قطرہ زہر دینے کا ٹائم نہیں ہے۔ بہت ہو گیا انتظار۔ اسے زہر دینا ہے تو ایک ساتھ ہی دینا پڑے گا' بس بات ختم۔"

وہ زہر اگل رہے تھے اور زرنگاہ ساکت رہ گئی۔ اسے نہیں پتا چلا کہ کب ان دونوں کی باتیں ختم ہوئیں اور کب انہوں نے فون بند کیا۔۔۔ وہ جہاں کھڑی تھی' وہیں پتھرائی ہوئی کھڑی رہی اس کا پورا جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ایسے ہولناک اور بھیانک انکشاف پہ سب کچھ

بھول چکا تھا وہ انتظار میں تھے کہ کب وہ تیار ہو کر باہر نکلے اور کب اس کی موت کی خبر سننے کو ملے' ملک امتیاز احمد گاؤں میں تھے اور وہیں بیٹھے ساری ہدایات دے رہے تھے۔ شہر والے گھر میں اس وقت فاخرہ بیگم' کوکب' زرنگاہ اور توقیر احمد موجود تھے۔ وہ دونوں ماں بیٹی اپنی شاپنگ کرنے کے لیے شہر آئی تھیں اور زرنگاہ شادی میں شرکت کے لیے آئی تھی ملک توقیر احمد ان لوگوں کے ساتھ آیا تھا کہ وہ تینوں اکیلی نہ ہوں' مگر زرنگاہ کو اب پتا چلا تھا کہ ان لوگوں کا اصل مقصد کیا تھا۔۔۔؟

"زرنگاہ۔۔۔! تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔۔۔؟ اتنا ٹائم ہو رہا ہے' بابا کب سے ... نہیں۔" ملک توقیر احمد نے دروازے پہ دستک دے کر کہا۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے ٹیبلٹ لی ہے۔ تھوڑی دیر تک تیار ہو کر آتی ہوں۔" نجانے زرنگاہ کے ذہن میں کیا سمائی کہ اس نے فوری بہانہ کر دیا۔

"تم انا ٹھیک ہو رہی ہو تو واپس کب آؤ گی؟" ملک توقیر احمد کے ساتھ ساتھ باقی سب کو بھی اس کے جانے کی جلدی تھی۔

"جلدی آجاؤں گی۔ مجھے کون سا زیادہ دیر بیٹھنا ہے وہاں۔" زرنگاہ بمشکل اندر سے ہی اسے جواب دے رہی تھی۔

"اچھا! پھر دس منٹ تک آجاؤ تیار ہو کر۔" ملک توقیر احمد کہہ کر وہاں سے ہٹ گیا۔ زرنگاہ نے گہری سانس کھینچی۔

اس کے پاس اب صرف دس منٹ تھے اور جو بھی بچاؤ کرنا تھا وہ انہی دس منٹ میں کرنا تھا اور بہت سوچنے کے بعد بھی اسے بھیڑیوں کے اس شکنجے سے بچنے کا کوئی حل نظر نہیں آیا۔ وہ بہت ہمت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دبے پاؤں اپنے بیڈروم سے باہر آئی اور یونہی دبے پاؤں سیڑھیاں اترتی ہوئی ڈرائنگ روم کے پیچھے کی طرف کھلنے والے دروازے سے نکل کر پچھلے لان میں آگئی۔ پچھلے لان میں ایک چھوٹی میز اور چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے بہت تیزی میز کھینچ کر دیوار کے ساتھ رکھی اور اس کے اوپر اور کرسی رکھ کے وہ دیوار پہ چڑھنے میں کامیاب ہو گئی لیکن اسے دیوار پہ چڑھتے ہوئے لیمپ پوسٹ کی روشنی میں فاخرہ بیگم نے دیکھ لیا۔ ان کے کمرے کی کھڑکی پچھلے لان میں ہی کھلتی تھی اور وہ کھڑکی کے قریب کھڑی کوکب سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں جب اچانک نظر دیوار پہ پڑی تھی۔ انہوں نے یکدم شور مچا دیا کیونکہ وہ ملگجے سے اندھیرے کے باوجود پہچان چکی تھیں کہ وہ زرنگاہ ہی ہے۔۔۔ لیکن ملک احمد کے ہوشیار ہونے تک وہ دیوار کی دوسری سمت اتر چکی تھی۔ ملک توقیر احمد اپنے دو آدمیوں کے ساتھ ... کی طرح گھر سے نکلا۔۔۔ اتنے میں وہ وہاں سے بھاگ چکی تھی ملک توقیر احمد بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

وہ اندھا دھند بھاگتی ہوئی پہلے دائیں سمت بھاگ رہی' پھر بائیں سمت مڑ گئی۔ وہ لوگ بھی اس کے پیچھے ہی آرہے تھے۔۔۔ اس ٹاؤن کے ایک حصے سے بھاگ ہوئی دوسرے حصے میں آچکی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کونے والے بنگلے کے ارد گرد پولیس ... ہوا ہے بے دھیانی میں بھاگتی ہوئی اس بنگلے کے پیچھے کی طرف مڑی ہی تھی کہ یکدم سامنے آجانے والے ایس پی قاسم علی سے ٹکرا گئی اور ایس پی قاسم علی نے اس کے پیچھے آنے والوں کو بھی فوری گرفتار کروا لیا۔۔۔!

☆ ☆ ☆

ایس پی قاسم علی کے آفس میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی تھی۔

زرنگاہ اسے سب کچھ بتا کر ایک بار پھر خاموش لب چپ ہو چکی تھی۔

"میں اس بات پہ کیسے یقین کر لوں کہ آپ جو کہہ رہی ہیں' وہ سب سچ ہے۔۔۔؟" قاسم علی کی بات یہ زرنگاہ کے منہ پہ ایک طمانچہ پڑا تھا۔ وہ اپنے ہونٹ کچل کے رہ گئی۔

"ایس پی صاحب! آپ کا حق بنتا ہے کہ آپ میری سچ بات کو بھی جھوٹ قرار دے دیں۔ مجھے اس پہ کوئی افسوس نہیں کرنا چاہیے۔" زرنگاہ نے سر جھکا لیا۔

"دیکھیے خاتون! آپ ادھر ادھر کی باتیں نہ چھیڑیں۔ آپ اپنے موجودہ مسئلے پہ دھیان دیں۔ کیا آپ ملک توقیر احمد اور ملک امتیاز احمد کے خلاف مقدمہ درج کروانا چاہتی ہیں یا نہیں؟" قاسم علی نے اسے سختی سے منع کرتے ہوئے محض کام کی بات پوچھی تھی۔

"نہیں۔۔۔!" اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کر دیا۔

"کیوں۔۔۔؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"کیونکہ میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ ہوں۔ میرے پاس نہ تو سر چھپانے کے لیے چھت ہے اور نہ ہی پیٹ بھرنے کے لیے روٹی یا پیسہ ہے۔ میرے بابا کے سوا میرا اس دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں کسی کے پاس رہ بھی نہیں سکتی کیونکہ کوئی رشتہ دار' کوئی اپنا نہیں ہے اور جو ہیں وہ سب تایا جی کے جاننے والے ہیں۔ ایسے میں' میں کوئی کیس کیسے لڑ سکتی ہوں بھلا؟" زرنگاہ نے کافی سمجھداری کا ثبوت دیا تھا۔

"اور بغیر کسی کیس کے میں ملک توقیر احمد کو حوالات میں بند نہیں رکھ سکتا اور دوسری طرف آپ یہ بھی سوچ لیں کہ اگر ملک توقیر احمد حوالات سے نکل گئے تو آپ کی زندگی دوبارہ خطرے میں پڑ سکتی ہے' کیونکہ آپ کے پاس چھپنے کے لیے کوئی چھت نہیں ہے اور نہ ہی پیٹ بھرنے کے لیے روٹی یا پیسہ ہے۔" قاسم علی نے اسے آئندہ کے متوقع حالات سے آگاہ کیا تھا۔ زرنگاہ چند ثانیے کے لیے خاموش رہ گئی وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا۔ ملک توقیر احمد دوبارہ مارنے کی کوشش کر سکتا تھا اور وہ بھلا کہاں چھپ سکتی تھی؟ کیسے اپنی جان بچا سکتی تھی؟ اسے ہر طرف سے خطرہ لاحق تھا۔

"آپ مجھے سوچنے کے لیے چوبیس گھنٹے کا ٹائم دے سکتے ہیں؟" وہ تذبذب کا شکار تھی۔

"جی ہاں! دے سکتا ہوں' لیکن صرف چوبیس گھنٹے کا' کیونکہ اس سے زیادہ میں ان لوگوں کو حوالات میں نہیں رکھ سکتا۔ آپ اچھی طرح سوچ لیں' پھر مجھے بتا دیجیے گا۔ ایس ایچ او عرفان اعظم آپ کا کیس درج کر لیں گے۔ اب یہ آپ پہ ڈیپینڈ کرتا ہے کہ آپ کو یہ کیس درج کروانا ہے یا نہیں؟" وہ بات سمیٹتے ہوئے بولا اور کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

لیکن وجود کی تو ... ہی رہی۔ قاسم علی اب گھر جانے کے لیے ... رہا تھا ... صاحب کی کال دوبارہ بج رہی تھی۔

"خاتون! آپ اب جا سکتی ہیں' ٹھیک چوبیس گھنٹے بعد آپ سے ملاقات ہو گی۔" وہ دروازے کی طرف آگیا تھا۔

"ایس پی صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میرے جانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے میرا۔" زرنگاہ کی دھیمی سی آواز پہ قاسم علی کے قدم ٹھٹھک گئے۔ وہ واقعی بھول گیا تھا۔

"تو پھر کہاں جانا ہے آپ کو؟"

"یہ پتا ہوتا تو آپ سے کیوں کہتی؟" اس کے لہجے میں بے بسی کا رنگ تھا۔

"یہ آپ کا مسئلہ ہے کہ آپ کو کہاں جانا ہے اور کہاں نہیں؟ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" قاسم علی کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"آپ مجھے ڈراپ تو کر سکتے ہیں نا؟" زرنگاہ کو سارے فیصلے خود ہی کرنے تھے' وہ بھلا اس کا ساتھ کیونکر دیتا۔

"ہوں! آئیے میرے ساتھ۔" وہ آہستگی سے کہتا ہوا سر ہلا کر پلٹا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس کے پیچھے زرنگاہ بھی قدم بڑھا چکی تھی۔ اسے دیکھ کر پورے عملے نے سلیوٹ کیا تھا۔ وہ زرنگاہ کے آگے آگے مضبوط قدم اٹھاتا پولیس اسٹیشن کی پارکنگ میں آگیا۔ اس کا ڈرائیور گاڑی نکال چکا تھا' لیکن قاسم علی نے ڈرائیور کو گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً ڈرائیونگ سیٹ خالی کر دی۔

قاسم علی نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ساتھ ہی زرنگاہ کے لیے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول دیا تھا۔ جیسے ہی وہ گاڑی میں سوار ہوئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھادی۔

"لگتا ہے یہ کوئی خاص ہستی ہے ورنہ ایس پی صاحب تو کبھی کسی عورت کے قریب سے بھی نہیں گزرے۔" پیچھے پولیس اہلکاروں کا آپس میں تبصرہ ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"جی! بتایئے اب؟ کہاں جانا چاہتی ہیں آپ؟" گاڑی مین روڈ پر ڈالتے ہوئے اس نے خاموش بیٹھی زرنگاہ کو مخاطب کیا۔

"دارالامان۔۔۔" وہ بے حد آہستگی سے بولی۔ قاسم علی ایک بار پھر ٹھٹک سا گیا تھا لیکن کہا کچھ بھی نہیں تھا۔ گہری سانس کھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

"اوکے۔۔۔!" اس کا اپنا لہجہ بھی دھیما تھا۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ سڑکوں پہ زندگی بیدار ہو رہی تھی۔ ملگجا سا اندھیرا لمحہ بہ لمحہ اجالوں میں تبدیل ہو رہا تھا۔

کچھ دیر پہلے بیت جانے والی رات میں کیا کچھ ہوا تھا یہ تو وہی جانتے تھے جن پہ رات بیتی تھی۔ ایسی ہی ایک رات قاسم علی اور اس کے دادا صاحب اور دادی صاحبہ پہ بھی بیتی تھی۔ جب وہ گھر سے بے گھر ہوئے تھے۔ جب ان کے پاس سر چھپانے کے لیے چھت نہیں تھی۔ جب وہ اپنے بوڑھے دادا دادی کے ساتھ اس شہر کی سڑکوں پہ مارا مارا پھر رہا تھا اور جب وہ ان کو اس بڑھاپے میں اپنے ساتھ ذلیل اور خوار ہوتے دیکھتا تھا تو اندر ہی اندر روتا تھا جبکہ زرنگاہ نواز کو تو اس نے پھر تھوڑا بہت سہارا دے ہی دیا تھا۔ وہ اس وقت سڑکوں پہ بھٹک رہی ہوتی تو اسے اندازہ ہوتا کہ گھر سے بے گھر ہونا کیسا ہوتا ہے؟ کیسی اذیت ہوتی ہے اس چیز کی؟ یہ بھی اس کی اعلا ظرفی تھی کہ اس نے زرنگاہ کو سڑکوں پہ بھٹکنے کے لیے نہیں چھوڑا تھا اسے عزت دیتے ہوئے اس کی مطلوبہ جگہ پہ چھوڑنے کے لیے رضامند ہو گیا تھا۔

"لیجیے! آگئے دارالامان۔۔۔" اس نے ایک چھوٹے سے دارالامان کے سامنے بریک لگائے تھے۔ شاید اس لیے کہ یہاں کی انچارج سے اس کی تھوڑی بہت جان پہچان بھی تھی اور یہاں کی شہرت بھی اچھی تھی۔

زرنگاہ گاڑی سے اتری۔ اس کے ساتھ وہ بھی گاڑی سے نیچے اتر آیا۔ دارالامان کی انچارج اسے دیکھتے ہی احتراماً کھڑی ہو گئیں۔

"ارے ایس پی صاحب! آپ یہاں؟ آپ حکم کرتے میں خود حاضر ہو جاتی۔" میڈم فرخندہ بخاری اس کے احترام میں کہہ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے یو سوچ میڈم! اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں بس آپ کی ذمہ داری پہ ان خاتون کو چھوڑنے کے لیے آیا ہوں۔ آپ انہیں محض مہمان بھی سمجھ سکتی ہیں اور مہمانوں جیسا ہی سلوک ہونا چاہیے۔ کوئی جانچ پڑتال کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ آپ ان کے ناشتے وغیرہ کا انتظام کروائیں۔ آپ سے بعد میں فرصت سے ملاقات ہو گی اللہ حافظ۔"

قاسم علی میڈم فرخندہ بخاری کو مختصر الفاظ میں سمجھا کر پلٹ گیا۔ اس نے جانے سے پہلے اسے ایک نظر بھی نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس سے نظریں نہیں ملانا چاہتا تھا۔ اس کے دیکھتے دیکھتے ہی وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ گھر میں تھکے قدموں سے داخل ہوا تھا ورنہ وہ جب بھی آتا تھا اس کے قدموں کی دھمک سے دھرتی کا سینہ ہلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

"قاسم علی!" وہ کوریڈور سے گزر کر اوپر جانے والی سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا جب ڈرائنگ روم کے داخلی دروازے سے دادا صاحب کی آواز سنائی دی تھی۔ مجبوراً وہ پلٹ کر ان کے قریب آگیا تھا۔

"السلام علیکم!" قدم ہی نہیں اس کا لہجہ بھی تھکا تھکا سا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ کیسے ہو؟" دادا صاحب بھانپ چکے تھے کہ کچھ غیر معمولی بات ہوئی ہے اسی لیے اس کا مزاج ایسا نیا تلا سا ہو رہا ہے۔

"ٹھیک ہوں آپ پریشان نہ ہوں اور میں معذرت چاہتا ہوں آپ کو کہنے کے باوجود وقت پہ نہ پہنچ سکا ایک مسئلے میں الجھ گیا تھا۔" اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

"مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم کہیں الجھ گئے ہو اسی لیے اکیلے ہی نماز پڑھ لی اور مجھے یہ بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ تمہاری اپنی نماز بھی قضا ہو چکی ہے۔" دادا صاحب کا اندازہ بالکل درست تھا۔

"جی! آپ کا اندازہ درست ہے میں ابھی فریش ہو کر قضا نماز ادا کرنے ہی جا رہا ہوں۔"

"ہوں جزاک اللہ! جاؤ دیر ہو رہی ہے۔" وہ اس کا کندھا تھپک کر باقی سوالات کا ارادہ فی الحال ملتوی کرتے ہوئے خود بھی وہاں سے ہٹ گئے تھے۔ اب تو وہ پہلے سے بھی زیادہ ضعیف ہو چکے تھے۔ گھر میں بھی بمشکل چلتے پھرتے تھے۔ ہمہ وقت وضو میں رہتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت عبادت میں ہی گزرتا تھا اور یہی حال دادی صاحبہ کا بھی تھا۔ وہ بھی بے حد بوڑھی ہو چکی تھیں البتہ ان کی صحت دادا صاحب سے قدرے بہتر تھی۔

قاسم علی نماز ادا کرنے کے بعد نیچے چلا آیا۔ صبح کے ساڑھے سات بجے تھے۔ سورج اپنے سنہرے پر پوری طرح سے پھیلا چکا تھا۔ ملازمہ ناشتا تیار کر رہی تھی دادی صاحبہ بھی ملازمہ کے ساتھ کچن میں ہی تھیں۔ قاسم علی وہیں کچن میں چلا آیا۔

"تم یہاں؟ خیریت؟ بھوک لگ رہی ہے کیا؟" دادی صاحبہ اسے کچن میں دیکھ کر حیران ہوئیں۔

"نہیں! بس سر میں درد ہو رہا ہے ایک کپ چائے کی طلب ہو رہی ہے۔" اس نے کنپٹی کو انگلیوں سے دباتے ہوئے کہا۔

"ہوں! ساری رات جاگتے رہے ہو نا اس لیے تھوڑی دیر سو جاتے تم۔" وہ اسے کہتے ہوئے چائے کا پانی چولہے پہ چڑھا چکی تھیں۔

"نہیں! اس وقت نیند نہیں آئے گی۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا باہر نکل آیا تھا۔ اس کا رخ دادا صاحب کے کمرے کی طرف تھا۔ انہیں شاید سردی لگ رہی تھی اس لیے دوبارہ آکر اپنے بستر میں لیٹ گئے تھے اور قاسم علی ان کے بیڈ کے قریب رکھی کرسی پہ بیٹھ گیا۔ فریش ہونے کے باوجود اس کی خاموشی اور تھکاوٹ دادا صاحب سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ دادا صاحب اسے دیکھ کر اٹھنے لگے لیکن قاسم علی نے روک دیا۔

"لیٹے رہیے! باہر کافی ٹھنڈ ہے آپ کی طبیعت خراب ہو جائے گی۔" اس نے ملازمہ کے ہاتھ سے چائے کا ایک کپ لے کر دادا صاحب کی سمت بڑھا دیا اور دوسرا کپ خود تھام لیا۔

"قاسم علی! بتاؤ کیا بتانا چاہتے ہو تم؟" دادا صاحب جان چکے تھے کہ وہ کچھ الجھا ہوا ہے اور کسی کشمکش کا شکار ہے۔

"بات بہت عجیب سی ہے دادا صاحب! میری خود سمجھ میں نہیں آرہا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے؟ کیا بتاؤں آپ کو؟" قاسم علی کی عادت تھی کہ وہ دادا صاحب سے کچھ بھی نہیں چھپاتا تھا۔ اچھی بری ہر بات ان سے شیئر کرتا تھا۔

"جو مناسب لگتا ہے وہ بتا دو جو نہیں لگتا وہ نہ بتاؤ۔" انہوں نے اسے حل بتایا۔ قاسم علی چند ثانیے کے لیے چپ ہو گیا۔ پھر قدرے توقف کے بعد بولا۔

"مجھے زرنگاہ بی بی ملی تھیں۔" قاسم علی کے انکشاف پہ انہوں نے یکدم چونک کر دیکھا تھا۔

"زرنگاہ بی بی؟ ملک صاحب کی بیٹی؟" انہوں نے تصدیق کے لیے پوچھا۔

"جی۔۔۔!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر کہاں؟"

"جہاں رات کو میرے کیس کا ایک اہم آپریشن

تھا۔"

"لیکن بیٹا! وہ وہاں کیسے تھیں؟" دادا صاحب حیران پریشان ہو رہے تھے۔

"وہ بھی اپنی جان بچانے کے لیے وہاں آئی تھیں اور اتفاقاً مجھ سے ٹکرا گئیں۔"

"پھر...؟"

"پھر کیا؟ مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ زرنگاہ بی بی ہیں، میں نے ان کو ایس ایچ او کے ساتھ تھانے بھیج دیا تھا۔"

"تھانے... مگر کس جرم میں؟" دادا صاحب گھبرا کر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"میری ذات پہ جھوٹا الزام لگانے کے جرم میں۔" تلخی سے بولا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا، انکار کر رہے ہو تم؟" دادا صاحب کی پیشانی پہ فکر کی لکیریں تھیں۔

"ہونہہ! دادا صاحب آپ جانتے بھی ہیں، پھر بھی مجھ سے سوال کر رہے ہیں؟ آپ کو پتا بھی ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود میں نے آج تک اس الزام کا کوئی بدلہ یا انتقام لینے کا نہیں سوچا۔ کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ تو پھر آج یہ کام کیسے کر سکتا ہوں بھلا؟" قاسم علی کی بات پہ دادا صاحب کو تھوڑی تسلی ہو گئی تھی۔

قاسم علی نے انہیں رات بھر کی پوری روداد سنا دی۔ وہ سن کر الٹا زرنگاہ کے لیے پریشان ہونے لگے۔

"تو اب وہ کہاں ہیں؟"

"دارالامان میں۔" وہ آہستگی سے بولا اور اسے دادا صاحب کے جس ردِعمل کی توقع تھی، وہی سامنے آیا تھا۔

"کیا؟ دارالامان میں؟" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ سائیڈ پہ رکھ دیا تھا۔ قاسم علی بھی چائے ختم کر چکا تھا۔

"تو اور کیا کرتا؟ انہیں اپنے ساتھ گھر لے آتا؟" اسے خفگی ہوئی تھی۔

"ہاں! لے آتے۔ اس طرح یتیم اور بے سہارا لڑکی کو اکیلے دارالامان میں نہ چھوڑتے، کچھ اور نہ سہی وہ لڑکی ہمارے گاؤں کی عزت ہے۔ ہمارے گاؤں کی بیٹی ہے۔ تمہاری اور میری شاگرد رہ چکی ہے۔ قرآن پاک پڑھایا تھا میں نے۔" دادا صاحب بے چین ہو رہے تھے کہ زرنگاہ دارالامان میں ہے۔

"معافی چاہتا ہوں دادا صاحب! آپ جیسا اعلا ظرف نہیں ہوں میں۔ اپنے دشمن اپنے قصوروار کو سب کچھ بھول بھال کے گلے لگا لینا آسان کام نہیں ہے مجھ پہ۔ جو بیتی ہے وہ میں جانتا ہوں میرے ... کیچڑ داغ ہے جو آپ کو تو نظر نہیں آتا لیکن مجھے ... تمام دکھائی دیتا ہے، اس لیے تکلیف بھی مجھے ہی ہوتی ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ دادا صاحب ٹھہرے گئے۔

"تو پھر اتنی مدد کیوں کی اس کی؟" انہوں نے نقطہ اٹھایا۔

"میں نے مدد نہیں کی بلکہ اپنا فرض پورا کیا ہے۔ ایک پولیس آفیسر ہونے کے ناتے میرا فرض بنتا تھا کہ اس کی مدد کروں، سو میں نے کر دی، بلکہ آئندہ بھی ضرورت پیش آئی تو ضرور کروں گا، لیکن ہمدردی نہیں کروں گا، ترس نہیں کھاؤں گا، رحم نہیں آئے گا۔ ایس پی قاسم علی بن رہوں گا، بھی قاسم علی نہیں بنوں گا۔ قاسم علی، زرنگاہ بی بی کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں جیتے جی مر گیا تھا۔ اب وہی قاسم علی زندہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

قاسم علی بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ دادا صاحب چپ ہو گئے۔

"ٹھیک ہے۔ تم جاؤ، اپنا فرض نبھاؤ اور ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑ دو۔" دادا صاحب دوبارہ لیٹے اور کمبل سر تک تان لیا۔

"دادا صاحب!" قاسم علی کو اور بھی خفگی ہوئی۔

"جاؤ قاسم علی! چلے جاؤ۔ اور آئندہ ہمیں کوئی بات بھی مت بتانا۔ تمہارا نہ سہی، لیکن ہمارا ضمیر ہمیں ملامت کرنے لگتا ہے۔ ہم ضمیر پہ کوئی بوجھ نہیں سہ سکتے۔" وہ کمبل کے اندر سے ہی بول رہے تھے۔

"لیکن... آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" وہ جھنجلا گیا۔

"ہم کچھ نہیں چاہتے، بس ہمیں آرام کرنے دو۔" ناراض ہو چکے تھے۔ قاسم علی کے اندر ابال اٹھ رہا تھا، دبائے نہیں دب رہا تھا۔ دادا صاحب نے اسے ... کے رکھ دیا تھا۔

وہ کمرے سے باہر آ کر ڈرائنگ روم میں ٹہل رہا تھا اور اس کی سوچیں بھی چکرا رہی تھیں۔

... گیارہ بجے کا وقت تھا جب اس نے دارالامان کے سامنے گاڑی کو بریک لگائے تھے اور بریک سے پاؤں ہٹاتے ہوئے ایک بے حد گہری سانس کھینچی۔ ہونٹ بھینچ رکھے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اپنے آپ پہ ضبط کر رہا ہو۔ اور اسی ضبط کے عمل میں دس پندرہ منٹ یوں ہی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے گزر گئے تھے۔ پھر بالآخر وہ گاڑی کا دروازہ کھول کے گاڑی سے نیچے اتر آیا تھا، اس کا رخ اندر کی سمت تھا۔ دارالامان کی انچارج میڈم فرخندہ بخاری اسے دیکھ کر سیٹ سے کھڑی ہو گئیں۔

"السلام علیکم ایس پی صاحب! آپ خود بار بار زحمت کیوں کر رہے ہیں، ہمیں حکم کیجیے آپ کا ہر کام گھر بیٹھے ہو جائے گا۔" میڈم فرخندہ بخاری نے بیٹھنے کے لیے صوفے کی سمت اشارہ کیا تھا۔

"ایم سوری میڈم! میں گھر بیٹھے اپنی فون کال سے کام لینے والا آدمی نہیں ہوں۔" اس کا اشارہ سفارش کی طرف تھا۔

"یہ تو میں بھی اچھی طرح جانتی ہوں ایس پی صاحب! اگر ہر آفیسر آپ جیسا سچا کھرا ایماندار اور ... ہو جائے تو یہ پاکستان جنت سے کم نہیں ہو گا، ہم لوگوں کی بے ایمانیاں ہمارے ملک کو تباہ کر رہی ہیں۔" میڈم فرخندہ بخاری نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔

"ایس پی صاحب! آپ بتائیں کیا لیں گے، ٹھنڈا یا گرم؟" انہوں نے میزبانی کے آداب نبھائے۔

"تھینکس میڈم! میں بس جن خاتون کو چھوڑ کر گیا تھا، انہیں لینے کے لیے آیا ہوں۔" اس نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔

"جی ضرور! آپ بیٹھیے، میں خود انہیں لے کر آتی ہوں۔" وہ کہہ کر وہاں سے چلی گئیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی زرنگاہ نے اندر قدم رکھا۔ دن کے اجالے میں وہ اور بھی فریش اور نکھرا نکھرا سا نظر آ رہا تھا۔ سفید شلوار قمیص میں ملبوس، بلیک کھیڑی پہنے، صوفے پہ براجمان وہ کسی ریاست کا حکمران لگ رہا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پہ ہلکی ہلکی شیو ہوتی تھی، لیکن اب اس کے رخسار صاف ستھرے تھے، البتہ اس کی گھنی مونچھیں اس کے چہرے پہ بہت سج رہی تھیں۔ ان دس سالوں میں اس کی صحت اور قد و قامت قابلِ رشک حد تک اچھا ہو چکا تھا، جبھی تو زرنگاہ اسے پہلی نظر میں پہچان نہیں پائی تھی اور اب اس سے نظر نہیں ہٹا پا رہی تھی۔ قاسم علی اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"السلام علیکم...."

"وعلیکم السلام!" زرنگاہ نے اپنی محویت سے چونکتے ہوئے جواب دیا۔

"میں آپ کو لینے کے لیے آیا ہوں۔"

"آپ؟" زرنگاہ کو یک دم بے یقینی کا جھٹکا لگا تھا۔

"جی! وہ دراصل دادا صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" اس نے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ خود سے اسے لینے کے لیے نہیں آیا۔

"مگر..." زرنگاہ تذبذب میں پڑ گئی۔

"آپ نے جو بھی اگر مگر کرنا ہے ان سے جا کر کہیے گا، میرے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے۔"

وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ مجبوراً زرنگاہ کو اس کے پیچھے قدم بڑھانے پڑے۔ وہ اس کے پہنچنے تک اپنی گاڑی نکال چکا تھا، زرنگاہ خاموشی سے آ کر اس کے برابر والی سیٹ پہ بیٹھ گئی۔

قاسم علی اسے رات سے بھی زیادہ سرد و سپاٹ نظر آ رہا تھا۔ زرنگاہ اس کے تاثرات دیکھ کر ہی پہچان گئی تھی کہ وہ واقعی دادا صاحب کے دباؤ میں آ کر اسے لینے

کے لیے آیا ہے' ورنہ اس کام میں اس کی اپنی کوئی مرضی شامل نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو وہ اسے پہلے کیوں دارالامان میں چھوڑ کر جاتا؟ بلکہ اسی وقت اپنے ساتھ اپنے گھر لے جاتا؟ لیکن پھر بھی مولوی صاحب کا اور اس کا احسان تھا کہ وہ اسے دارالامان کے بجائے اپنے گھر لے آئے تھے۔

قاسم علی کی گاڑی سیدھی اپنے گھر کے پورچ میں آکر رکی تھی۔

"آیئے!" وہ اسے کہتا ہوا اندر کی سمت بڑھ گیا۔ کوریڈور سے گزر کر وہ دائیں طرف مڑ گیا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے تھی' پھر وہ سامنے نظر آتے بیڈ رومز میں سے ایک کے سامنے رک گیا تھا اور دستک دے کر اندر داخل ہوا تھا۔

"السلام علیکم دادا صاحب!" اس کی آواز اور لہجے کی سنجیدگی پہ دادا صاحب بھی یکدم چونک گئے تھے۔

انہوں نے تسبیح والا ہاتھ روکتے ہوئے گردن موڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا۔ قاسم علی کے ساتھ ہی کوئی لڑکی کھڑی تھی اور یہ لڑکی کوئی اور نہیں زرنگاہ نواز تھی' وہ اک لمحے میں جان گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ کر زرنگاہ سے ملتے قاسم علی خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ وہ دونوں دیکھتے رہ گئے۔

وہ دادا صاحب کی وجہ سے اسے اپنے گھر تو لے آیا تھا' لیکن اس کا غصہ اور ناگواری ہنوز تھی۔

☼ ☼ ☼

شام آٹھ بجے کا وقت تھا۔

وہ میڈیا والوں کے گھیرے میں تھا' جب اس کے موبائل فون پہ دادا صاحب کی کال آئی تھی۔

"آدھے گھنٹے کے اندر اندر گھر پہنچو۔" سلام دعا کے بعد انہوں نے حکم دیا اور فون بند کر دیا۔

"دادا صاحب!" لیکن فون بند ہو چکا تھا وہ پریشان ہو گیا۔۔۔ اس نے مختصر الفاظ میں بات سمیٹی اور ان سب سے معذرت کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"لیکن ایس پی صاحب! آپ یہ تو بتا دیں کہ آپ نے اس کیس پہ کتنا عرصہ کام کیا ہے؟" ایک نیوز رپورٹر نے سوال پوچھتے ہوئے مائیک اس کے سامنے کر دیا۔

"تین مہینے۔" اس کا جواب مختصر تھا۔

"جو لڑکیاں بازیاب ہوئی ہیں' ان کے بارے میں کچھ بتانا چاہیں گے آپ؟" دوسرا کھوجتا ہوا سوال دائیں طرف سے سنائی دیا تھا۔

"نہیں! کیونکہ میں غریب اور شریف والدین کی عزت نہیں اچھالنا چاہتا۔ ان لڑکیوں کو انویسٹی گیشن کے بعد ان کے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ کسی کی غلطی اور نادانی کی تشہیر نہیں کی جائے گی۔" وہ کافی عجلت میں مگر سمجھ داری سے جواب دے رہا تھا۔

"لیکن ایس پی صاحب! اس سے تو یہ سمجھا جائے گا کہ کوئی بھی لڑکی بازیاب نہیں ہوئی' آپ محض اپنے کارنامے میں جان ڈالنے کے لیے ایسا کہہ رہے ہیں۔" تیسرا نقطہ نظر بھی سامنے آگیا تھا۔

"کوئی بات نہیں' جس کے جی میں جو آتا ہے' کہے اور سمجھے۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میرے ضمیر اور میری گورنمنٹ کو تو پتا ہے نا کہ میں نے کیا کیا۔ اور کیا نہیں؟ اگر کسی شریف کی عزت اچھال کر، اسے دنیا کے سامنے شرمندہ کر کے مجھے کریڈٹ ملتا ہے تو مجھے یہ کریڈٹ نہیں چاہیے۔ میں کسی کی بہن بیٹیوں کی عزت اور عیب سے پردہ نہیں ہٹا سکتا۔ کون اچھا ہے اور کون برا' یہ اوپر والا دیکھ رہا ہے۔ ہاں دشمن' ہمارے ملک کا دشمن ہمارے شکنجے میں ہے۔ ہاں! اسے سخت سے سخت سزا دی جائے گی' یہ تو سارے پھیلاوے کی جڑ وہی ہے۔ وہ اپنے ہر جرم کا اعتراف کرے گا اور سب کے سامنے کرے گا۔ یہ اپنے عوام' اپنے شہریوں سے وعدہ ہے۔"

قاسم علی نے سب کو اطمینان سے جواب دیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ اسے اس وقت بس گھر پہنچنے کی جلدی تھی' کیونکہ دادا صاحب نے جس انداز میں اسے گھر پہنچنے کے لیے حکم دیا تھا' وہ انداز کافی غیر معمولی تھا۔ وہ بہت کم اس طرح بات کرتے تھے۔

دوسری بات کہ زرنگاہ بھی ان کے گھر پہ تھی۔ وہ اس کی طرف سے بھی پریشان ہو چکا تھا کہ اسے کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔۔۔ وہ بہت رش ڈرائیو کرتے ہوئے گھر پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

قاسم علی ششدر سا کھڑا دادا صاحب اور دادی کے چہرے دیکھ رہا تھا اور زرنگاہ' قاسم علی کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

اس کے چہرے سے یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار کو اس کے جسم پہ پلٹ دیا ہو اور اس کی رنگت نیلی پیلی ہو گئی ہو۔ دادا صاحب کے کمرے میں موت کا سا سکوت تھا' وہاں موجود چاروں نفوس اتنے خاموش تھے جیسے زمین میں اتر گئے ہوں۔

"سمجھ لو کہ یہ ہماری زندگی کی آخری خواہش ہے۔ اس کے بعد کبھی تمہیں کچھ ماننے کو کہا' تم بے شک ہمیں اس گھر سے نکال دینا۔ ہم سے ہر رشتہ توڑ دینا' ہماری عزت' ہمارا احترام مت کرنا' دھتکار دینا ہمیں' لیکن خدا کے واسطے اس خواہش سے انکار نہ کرنا۔ یہ ہماری تو خواہش ہے' لیکن کسی کی مجبوری ہے۔ اس مجبوری میں اس بچی کا ساتھ دو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اجر دے گا۔ دیکھ لینا! یہ بات پتھر پہ لکیر ہے۔ وہ اپنے وعدوں کے خلاف کچھ نہیں کرتا۔"

دادا صاحب کی آواز نے اس خاموشی کا تسلسل توڑا۔ قاسم علی ابھی تک دم بخود سا انہیں دیکھ رہا تھا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ دادا صاحب اسے کس آزمائش میں ڈال رہے ہیں' کس طرح اس کی ہمت آزما رہے ہیں' کیوں وہ اس کے صبر کا امتحان لے رہے ہیں؟ آخر کیوں؟

حالانکہ وہ جانتے بھی تھے کہ وہ آج سے دس سال پہلے کس اذیت اور کس کرب سے گزرا تھا' کیسی ذہنی اذیت سہی تھی اس نے۔۔۔ اور اس کے باوجود وہ اس سے ایسی خواہش کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ کیسے اس پہ سر تسلیم خم کر دیتا؟ آخر کیسے؟

"اگر تم اس بات سے انکار کرتے ہو تو بھی ہم آئندہ تمہیں کچھ ماننے کے لیے نہیں کہیں گے۔ کچھ بھی نہیں منوائیں گے تم سے۔ بس' یہ آخری خواہش' آخری فیصلہ ہے' چاہو تو مان لو' چاہو تو۔۔۔"

انہوں نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی۔

قاسم علی پلٹ کر وہاں سے نکلا اور دندناتا ہوا اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد زرنگاہ بھی جیسے ہوش میں آگئی تھی۔

"مولوی صاحب! یہ آپ نے کیا کہہ دیا ہے؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا؟"

"یہ ہو سکتا ہے بیٹا! اور اس میں تمہاری ہی بھلائی ہے۔۔۔ اور ہاں! اب ہم تمہارے لیے مولوی صاحب نہیں' دادا صاحب ہیں' جیسے قاسم علی کے دادا صاحب ہیں۔" انہوں نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ زرنگاہ کا سر جھک گیا اور یہ سر شرم کی وجہ سے نہیں' شرمندگی کی وجہ سے جھکا تھا۔ وہ لوگ اس کی وجہ سے گاؤں سے نکالے گئے تھے۔ اگر وہ قاسم علی کے حق میں بول دیتی تو یقیناً آج صورت حال کچھ اور ہوتی' لیکن پھر بھی ان کا ظرف اور بڑا پن تھا کہ وہ اس کا ساتھ دے رہے تھے' بلکہ اپنے پوتے کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔ زرنگاہ تو ان کے سامنے سر اٹھانے کے بھی قابل نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کے گیارہ بجے کا وقت تھا۔

ایس ایچ او عرفان اعظم اور ڈی ایس پی اظہر خان اس کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بطور گواہ موجود تھے اور ایس پی قاسم علی ان گواہوں کی موجودگی میں نکاح نامے پہ دستخط کر رہا تھا۔ وہ لوگ بھی اس ایمرجنسی نکاح پہ حیران تھے' لیکن کوئی سوال کرنے کی جرات نہیں تھی ان میں۔۔۔ نکاح کے بعد سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے' اس دعا میں سب سے زیادہ خوش مولوی صاحب تھے۔ جیسے ہی سب نے دعا کے بعد چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے آمین کہا۔ مولوی صاحب نے اونچی آواز میں سب کو مبارک باد دی اور قاسم علی کو

گلے لگالیا۔ اس کا سرد و سپاٹ چہرہ سب ہی کو نظر آرہا تھا۔

مولوی صاحب نے خود سب کا منہ میٹھا کروایا۔ قاسم علی اندر سے کافی چپ چپ سا تھا' بالآخر سوا بارہ بجے کے قریب سب نے واپسی کے لیے اجازت چاہی تھی۔ قاسم علی انہیں رخصت کرکے گیٹ تک آیا تھا اور پھر باہر لان میں ہی ٹہلنے لگا۔۔۔ لیکن آخر کب تک؟ کبھی نہ کبھی تو اندر جانا ہی تھا؟ اس کا سامنا بھی ہونا تھا؟ تو پھر وہ کب تک اس دن اپنے غصے اور ناگواری کا اظہار کرتا؟ اس لیے بہتر تھا کہ جو کچھ بھی ہے' اس کا سامنا کرلیا جائے۔ اس نے قدم اندر کی سمت بڑھا دیے۔

"قاسم علی! کہاں جارہے ہو؟" اس نے ابھی سیڑھی پہ قدم رکھا ہی تھا کہ دادی صاحبہ کی آواز پہ ٹھٹک کے رک گیا تھا۔

"اپنے کمرے میں جارہا ہوں' خیریت؟" اس نے گردن موڑ کر دادی صاحبہ کی سمت دیکھا تھا اور ان کے ساتھ کھڑی زرنگاہ کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ خیریت نہیں ہے۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

"اپنی دلہن کو تو لیتے جاؤ' کیا اسے یہیں چھوڑ جاؤ گے؟" دادی صاحبہ جان بوجھ کے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔

"یہ دلہن آپ کی خواہش ہے' آپ کے پاس ہی اچھی لگے گی۔"

قاسم علی کے جواب پہ دادی صاحبہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی اور زرنگاہ کا ڈوب مرنے کو دل چاہا تھا۔

"قاسم علی! یہ کیا بدتمیزی ہے؟" انہوں نے ناگواری سے کہا۔

"یہ بدتمیزی ہے دادی صاحبہ؟" اس کے ماتھے پہ بل پڑ گئے۔

"اچھا! ٹھیک ہے' ٹھیک ہے' جو بھی ہے یہیں ختم کرو' رات بہت ہو رہی ہے' تم بھی کل رات سے نہیں سوئے اور دلہن بھی اس مصیبت میں پڑ کے مسلسل جاگ رہی ہے' اس لیے باقی ساری باتیں پھر کبھی پہ رہنے دو اور اس وقت دونوں جاکر آرام کرو۔ جاؤ شاباش۔"

انہوں نے آگے بڑھ کے قاسم علی کا کندھا تھپکا اور پھر زرنگاہ کا ہاتھ پکڑ کر قاسم علی کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ قاسم علی نے یک دم دادی صاحبہ کو دیکھا' لیکن انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں چپ رہنے کی التجا کی تھی۔ جس پہ وہ چاہ کر بھی مزید کچھ نہ کہہ پایا اور زرنگاہ کا ہاتھ پکڑے یوں ہی سیڑھیوں کی سمت بڑھ گیا۔ وہ اس کے ساتھ کھنچی جارہی تھی۔

دادی صاحبہ نیچے کھڑی ان دونوں کو دیکھتے ہوئے ان کی سلامتی کے لیے دعا کر رہی تھیں۔

بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی زرنگاہ کے قدم تھم گئے' اس نے غیر محسوس انداز میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے نکالنے کی کوشش کی' لیکن قاسم علی کے مضبوط ہاتھ کی گرفت بہت سخت تھی۔ اس نے داخل ہوتے ہی کمرے کی تمام لائٹس جلادیں' پھر پیچھے پلٹ کر ایک ہاتھ سے دروازہ مقفل کر دیا۔ زرنگاہ کا دل اچھل کر حلق میں آگیا اس کے دبے ہاتھ کی ہتھیلی میں پسینہ اتر آیا تھا' لیکن قاسم علی نے اس کا ہاتھ ابھی بھی نہیں چھوڑا۔ اسے اپنے ساتھ لیے کمرے کے وسط میں آرکا۔

"میں آپ کو بس یہاں لانے تک پابند تھا۔ اس سے آگے اور نہیں۔ میرا آپ سے تعلق بیڈ روم سے باہر کا ہے۔ بیڈ روم سے اندر کا تعلق نہ میں سوچوں گا نہ آپ سوچئے گا اور ہاں اسے میری وارننگ سمجھ لیں۔ بیڈ روم کے اندر کی بات باہر نہیں جانی چاہیے۔ اگر بات باہر گئی تو پھر آپ بھی باہر گئیں۔۔۔ کیونکہ ابا صاحب اور دادی صاحبہ اپنی آخری خواہش تو پہلے پوری کروا چکے ہیں' اب نہ وہ مجھ سے کچھ منوائیں اور نہ میں مانوں گا۔ انڈر اسٹینڈ؟"

اس نے انگلی اٹھا کے اسے وارننگ دی تھی۔ زرنگاہ دم بخود سی اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ اپنا فیصلہ سنا کے وہاں سے ہٹ کے واش روم میں چلا گیا۔ منٹ شاور لینے کے بعد واپس آیا اور بیڈ پہ لیٹ

اس نے یہ دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ ابھی تک کمرے کے وسط میں جوں کی توں کھڑی ہے۔ اس کی سنائی ہوئی سزا پہ تو وہ ہلنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح فجر کی اذان پہ اس کی آنکھ کھلی تھی' اس نے کمبل ہٹاتے ہوئے کروٹ بدل کر دیکھا۔ اسے بیڈ خالی نظر آیا' وہ ٹھٹک گیا تھا' لیکن دوسرے ہی پل اسے کھڑکی کے پاس اس کا ہیولا دکھائی دیا اسے دیکھ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا اور کمبل پرے ہٹا کر بیڈ سے اٹھ گیا۔

کلمہ شریف پڑھتے ہوئے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا اور اٹھ کر واش روم میں وضو کرنے چلا گیا تھا۔ اسے نماز ادا کرنے کے لیے دادا صاحب کے ساتھ مسجد جانا تھا' بچپن سے اس کا یہی معمول تھا' وہ سات سال کی عمر سے ان کے ساتھ مسجد جا رہا تھا اور اس وقت اس کی عمر اکتیس سال کی ہو رہی تھی' لیکن پھر بھی اس کے اس معمول میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔ وہ دونوں دادا پوتا مسجد کے لیے جا چکے تھے۔ زرنگاہ تھکی تھکی نڈھال سی آ کر بیڈ پہ گر گئی۔ اس نے پوری رات یوں ہی آنکھوں میں گزار دی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ آخر کیا ہوا ہے؟ ایک رات اس پہ اس کی اپنائیت کا انکشاف ہوا تھا اور دوسری رات قاسم علی کی اجنبیت کا انکشاف ہو گیا تھا۔ وہ ایک دن میں بن بیاہی سے بیاہی اور سہاگن بن گئی تھی' لیکن اس کا شوہر اس کا سہاگ اسے اپنا ماننے سے ہی انکاری ہو گیا تھا۔ وہ کیا کرتی آخر؟ سارا گناہ اپنا ہی تو تھا؟ قاسم علی کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کا ایسا رویہ تو حق بجانب تھا۔ وہ اب بھلا کیا کرتی؟ اس معاملے میں وہ اپنے ساتھ کسی اور کو شریک بھی نہیں کر سکتی تھی' کیونکہ یہ اس کی وارننگ تھی۔۔۔ اور وہ اسے پہلے والا قاسم علی سمجھتے ہوئے اس کی وارننگ سے انحراف بھی نہیں کر سکتی تھی۔ آج کے قاسم علی میں اور پہلے کے قاسم علی میں بہت فرق تھا۔۔۔ پہلا قاسم علی بہت اچھا تھا۔۔۔ زرنگاہ کو اس بات کا اعتراف کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی یہ سب سوچتے سوچتے اس کی اتنے دن کی جاگی ہوئی اور تھکی ہوئی آنکھیں خود بخود بند ہوتی چلی گئیں۔ وہ یوں ہی بیڈ پہ بے ترتیب سی پڑی نیند کی گہری وادیوں میں اتر چکی تھی۔۔۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد قاسم علی نماز پڑھ کے واپس آیا تھا۔ لیکن بیڈ پہ بے ترتیب پڑی زرنگاہ کو دیکھ کر قدم وہیں کے وہیں تھم گئے تھے۔ ایک مرتبہ اس کا دل چاہا کہ آگے بڑھ کے اس پہ کمبل ڈال دے' لیکن دوسرے ہی پل اس نے اپنے اس خیال کو بری طرح جھٹک دیا۔ وہ اب اس کے ساتھ اتنی سی نرمی بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا' سو آگے بڑھ کے اپنی تیاری میں مصروف ہو گیا تھا۔

وہ تیار ہو کر نیچے آ گیا تھا۔

"دلہن کہاں ہے؟" دادی صاحبہ کو امید تھی کہ اس کے ساتھ وہ بھی آئے گی' اس لیے اسے نہ پا کر حیران ہوئی تھیں۔

"سو رہی ہے شاید۔۔۔" اس نے ناشتا شروع کرتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا! ابھی تک سو رہی ہے؟" انہوں نے اپنی بے دھیانی میں پوچھا تھا اور پھر بے ساختہ ان کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی' جسے قاسم علی نے بھی دیکھا اور پھر نظریں جھکائیں' ان کی معنی خیز سی مسکراہٹ کا مفہوم سمجھ چکا تھا' تب ہی اسے احساس ہوا تھا کہ زرنگاہ نے اس وقت سو کر واقعی غلطی کی ہے اور آئندہ اس غلطی سے اسے پرہیز کرنا ہو گا۔

"دلہن نے کیس کے بارے میں کیا سوچا ہے؟" دادا صاحب نے قاسم علی کو اٹھتے دیکھ کر سوال کیا۔

"میں نے اس ٹاپک پہ اس سے بات نہیں کی۔ وہ اٹھ جائے تو آپ پوچھ لیجئے گا اور مجھے فون پہ بتا دیجئے گا۔ اللہ حافظ۔۔۔" عجلت میں جواب دیتا وہاں سے چلا گیا۔ اور وہ دونوں چپ کے چپ بیٹھے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

دن کے تین بجے وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تھی۔

وہ یک دم ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ اور تیزی سے بیڈ سے اتر گئی۔ اس کا ارادہ باہر جانے کا تھا' لیکن یوں سر جھاڑ اور منہ پہاڑ اٹھ کر جانے کا خیال آیا تو قدم ٹھٹک گئے۔ اسے قاسم علی کی رات والی وارننگ یاد آ گئی تھی' اس نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھو کر بال سنوارے اور اپنے کپڑے وغیرہ درست کرتی ہوئی باہر آ گئی۔ دادا صاحب اور دادی صاحبہ باہر لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے' اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

"السلام علیکم!" اس نے آہستگی سے سلام لیا تھا۔

"وعلیکم السلام بیٹا! آؤ بیٹھو یہاں۔" انہوں نے اپنی قریبی کرسی کی سمت اشارہ کیا۔

"تھینک یو۔" وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"ہو گئی نیند پوری؟ اتنے دن سے جاگ رہی تھیں۔" دادی صاحبہ نے اس کا سر تھپکا۔

"جی۔۔۔!" وہ محض جی ہی کہہ پائی تھی۔

"ہم نے تمہیں جان بوجھ کے۔۔۔ نہیں جگایا' سوچا تم جتنی دیر آرام کرو' تمہاری طبیعت کے لیے اچھا ثابت ہو گا۔"

"جی تھینک یو۔"

انہوں نے ابھی چائے کا کپ زرنگاہ کو تھمایا ہی تھا کہ اتنے میں گیٹ کھلا اور قاسم علی کی گاڑی فراٹے بھرتی اندر آ رکی۔

"لو قاسم علی بھی آ گیا۔" دادا صاحب اسے دیکھ کر مسکرائے۔ قاسم علی کی آمد پہ زرنگاہ کا دل عجیب سی دھن پہ دھڑک اٹھا' حالانکہ ان دونوں کے درمیان ابھی جذبات کا کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا جس کی بدولت اس کی ایسی کیفیت ہوتی' لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں اس کی ہتھیلیاں بھیگنے لگی تھیں۔

"السلام علیکم!" اس نے بھی قریب آتے ہوئے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام! جیتے رہو' بیٹھو۔" دادی صاحبہ نے قاسم علی کو زرنگاہ کے مقابل والی کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے اس محفل میں؟" قاسم علی نے اپنی کیپ اتار کے میز پہ رکھ دی۔

"ایک پولیس والے کے گھر میں کیا ہو سکتا ہے بھلا؟ کھانا پینا' سونا جاگنا اور باتیں کرنا اس کے علاوہ کچھ کرو تو ڈر لگنے لگتا ہے۔"

دادی صاحبہ کے جواب پہ قاسم علی کے ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور زرنگاہ اس کے سنجیدہ چہرے پہ مسکراہٹ کی بہار دیکھ کر ٹھہر سی گئی تھی۔ وہ بہت تیزی سے قاسم علی کی اسیر ہو رہی تھی۔ اس کا ذہن پوری طرح سے اس کی سمت مائل ہو چکا تھا اور دل تھا کہ ریت کی مانند ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔ زرنگاہ کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی ایسی کیفیت کیوں ہو رہی ہے؟ وہ بھی محض دو روز میں؟ پہلے تو وہ قاسم علی سے خار کھائے ہوئے رہتی تھی' جب بھی وہ ان کی حویلی آتا تھا اسے کوفت اور بیزاری ہوتی تھی' لیکن اب اچانک اس کے جذبات نہ جانے کیوں اور کیسے بدل گئے تھے کہ وہ لمحہ بہ لمحہ اس کی سمت کھنچ رہی تھی اور وہ تھا کہ آنکھ ہی نہیں ملا رہا تھا' لیکن اس وقت وہ مسکرایا تھا تو وہ بے ساختہ دیکھنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ قاسم علی بھی محسوس کر چکا تھا کہ اس کے چہرے پہ اس کی نظروں کا لمس بکھر رہا ہے' اسی لیے تو اس نے نظریں اٹھا کر زرنگاہ کو کنفیوز نہیں کیا تھا۔

"ایک پولیس والے کے گھر میں آپ اور کیا کرنا چاہتی ہیں؟ ہر کام آپ کی مرضی' آپ کی خواہش پہ ہی تو ہوتا ہے؟ پھر بھی آپ کو ڈر لگتا ہے؟" قاسم علی ذرا جھکتے ہوئے اپنے لیے چائے بنانے لگا۔

"میں بنا دیتی ہوں۔" زرنگاہ نے اس کے ہاتھ سے ٹی پاٹ تھام لیا تھا۔

"اوکے! آپ بنا دیں۔" اس نے آہستگی سے کندھے اچکائے۔۔۔ اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"چینی۔۔۔؟" زرنگاہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"دو ٹی سپون۔" اس نے بتاتے ہوئے دادا صاحب کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے' آج دادا صاحب کیوں چپ چپ

سے نظر آرہے ہیں؟" وہ ان کی خاموشی بھانپ چکا تھا۔
"میں اس لیے چپ ہوں کہ آج تمہاری نئی زندگی کا پہلا دن ہے' لیکن نہ تم میں کوئی نئی بات نظر آرہی ہے اور نہ دلہن روایتی دلہنوں کی طرح لگ رہی ہے' کوئی رنگ ہی نہیں دونوں پہ؟"
دادا صاحب جو سوچ رہے تھے انہوں نے کہہ دیا تھا۔ بے ارادہ ہی قاسم علی اور زرنگاہ کی نظروں کا آپس میں تصادم ہوا تھا اور پھر فوراً" ہی زرنگاہ نے نظریں چرالی تھیں۔
"اچھا! کیسے رنگ دیکھنا چاہتے ہیں آپ؟" وہ اس کے ہاتھ سے کپ تھامتے ہوئے بولا۔
"نئے کپڑے' نئی مسکراہٹ' نئی باتیں' نئی روٹین سب کچھ نیا ہونا چاہیے' زندگی نئی' یہ نئی زندگی ہے تم دونوں کی۔" دادا نے [illegible] تھے۔
"نئے کپڑے؟" قاسم علی نے زیر لب دہرایا تھا اور پھر فوراً" ہی دادا صاحب کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ ان کا اشارہ زرنگاہ کی طرف تھا۔ وہ دو روز سے ایک ہی سوٹ میں نظر آرہی تھی جو اب کافی شکن آلود ہوچکا تھا۔
"ہوں اچھا تو یہ بات ہے؟" اس نے پرسوچ سے انداز میں سرہلایا۔ "نئے کپڑوں والا مسئلہ تو آج ہی حل ہوجائے گا۔ دادی صاحبہ! آپ انہیں ساتھ لے جائیں اور ان کی پسند کی شاپنگ کروادیں۔" اس نے لاپروائی ظاہر کی۔
"یہ کام دادی صاحبہ کا نہیں' تمہارا اپنا ہے۔ وہ بوڑھی بھلا کہاں بازار بازار پھرے گی؟" دادا صاحب کو اعتراض ہوا تھا۔
"تو آپ کا مطلب ہے کہ میں خود...؟" اس نے بدک کے دیکھا تھا۔
"ہاں! تم خود' کیونکہ بیوی تمہاری ہے' اس کی ضروریات بھی تم ہی پوری کروگے۔"
"لیکن دادا صاحب! لوگ کیا کہیں گے؟ میں بیوی کو شاپنگ کرواتا پھر رہا ہوں؟ نو نیور' میں یہ کام نہیں کرسکتا۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی — اور دادا صاحب اس کی بات پہ مسکرادیے تھے۔
"لوگ کچھ نہیں کہیں گے' بلکہ یہ سوچیں گے کہ قاسم علی اپنے گھر کے فرائض بھی احسن طریقے سے نبھاتا ہے۔ ایک بہت اچھا آفیسر ہی نہیں' ایک بہت اچھا شوہر بھی ہے۔"
"نہیں! میں ایسا کوئی کام نہیں کرسکتا' پلیز ایم سوری۔" وہ مسلسل انکاری تھا۔
"یہ کام تم ہی نے کرنا ہے' دلہن خریداری کرے گی اور تم بس بل پے کروگے۔"
دادا صاحب کے انتہائی اصرار پہ قاسم علی کو خاموش ہونا ہی پڑا تھا اور دادی صاحبہ مسکراتی ہوئی اٹھ کر اندر چلی گئی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں ایک مخملی ڈبہ تھا۔ اس میں سونے کی چھ چوڑیاں تھیں جو انہوں نے قاسم علی کی دلہن کے لیے ہی بنوا کر رکھی ہوئی تھیں' کل رات افراتفری میں انہیں دینا یاد نہیں رہا تھا' اسی لیے وہ اب نکال لائی تھیں۔
"یہ لو! دلہن کو پہنادو' منہ دکھائی کا تحفہ۔" ان کی اس نئی فرمائش پہ قاسم علی ٹھٹک گیا۔
"آخر آپ کیا کیا کروانا چاہتی ہیں؟"
"وہ سب جس کا میرے دل میں ارمان ہے۔ میں تجھے تیری دلہن کے ساتھ ہنستا کھیلتا اور خوش باش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میرا [illegible] علی بھی اپنی دلہن کے ساتھ بہت خوش رہتا تھا' لیکن دونوں خوشیاں نہیں دیکھ سکے' نہ ہی میرے ارمان پورے ہوسکے تھے' لیکن اب یہ ارمان تم تو پورے کرسکتے ہونا؟"
دادی صاحبہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں اور قاسم علی ان کے دکھ پہ خاموش ہوگیا تھا۔
"لو! پکڑو نا۔" انہوں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے دوبارہ اسے چوڑیاں تھمانے کی کوشش کی جو اس نے آہستگی سے تھام لی تھیں۔
"دلہن! ہاتھ آگے کرو بیٹا!" دادی صاحبہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر قاسم علی کے سامنے کیا۔ زرنگاہ کے ہاتھ میں ہلکی لرزش سی محسوس ہورہی تھی۔ دادی' دادا کے سامنے اس کا ہاتھ پکڑنا زرنگاہ کے لیے بے پناہ شرم کا باعث تھا۔ اس کی پلکیں جھک گئی تھیں۔ قاسم علی نے اس کا نازک سا ہاتھ تھاما اور اسے سونے کی چوڑیاں پہنانے لگا۔
ساری چوڑیاں ایک ایک کرکے پہنانے کے بعد قاسم علی نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
"پہلا تحفہ مبارک ہو بیٹا!" دادی صاحبہ نے اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا۔
"خیر مبارک!" زرنگاہ نے آہستگی سے جواب دیا تھا۔
"اللہ جوڑی سلامت رکھے' دانو اب دونوں بازار چلے جاؤ۔" انہوں نے قاسم علی کو اشارہ کیا تھا۔
"میں شاور لے کر چینج کرلوں۔" وہ یونیفارم چینج کرنے کے ارادے سے اٹھ گیا۔
"ٹھیک ہے' مگر جلدی آنا۔" انہوں نے پیچھے سے آواز دی تھی۔
وہ اندر جاچکا تھا اور زرنگاہ اپنے ہاتھ پہ اور چوڑیوں پہ نقش اس کے لمس کو چھو کے محسوس کرتی ہلکے سے مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کے ساتھ خریداری کے لیے تو آگیا تھا' لیکن اس کا موڈ آف تھا' کافی لاتعلق سا انداز تھا اس کا۔ زرنگاہ نے لاکھ کچھ کہنے کی کوشش کی' مگر نہ کہہ سکی۔ اس کے الفاظ زبان تک آتے آتے ہمت ہار جاتے تھے۔ وہ اس سے کچھ کہتے ہوئے اندر سے ڈر رہی تھی کہ جانے اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ اور اس کے ردعمل سے ڈرتے ہوئے ہی وہ خاموش بیٹھی اپنے ہاتھوں کو گود میں بے چینی سے مسل رہی تھی۔
اور پھر خریداری کے دوران بھی ان دونوں کا یہی حال تھا۔ وہ لاتعلق سا نظر آرہا تھا' جبکہ زرنگاہ کی ساری توجہ اسی پہ مرکوز تھی۔ ڈارک براؤن کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس اجنبی' لاتعلق اور سرد وسپاٹ سادہ سا شخص زرنگاہ کو مسلسل پچھتاووں میں ڈال رہا تھا اور وہ کوشش کے باوجود ان پچھتاووں اور ندامتوں سے نکل ہی نہیں پارہی تھی۔ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ایسا کیا کرے؟ اور ایسا کیا کہے کہ قاسم علی کے دل سے ساری کدورتیں اور ساری بدگمانیاں دھل جائیں۔ اس کا دل صاف شفاف ہوجائے۔ وہ اس کی دس سال پہلے والی خطا معاف کردے۔
اس نے کافی بے دلی سے شاپنگ کی تھی۔ قاسم علی نے اس کی شاپنگ پہ کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ اس نے جو کچھ بھی خریدا تھا' قاسم علی نے خاموشی سے بل پے کردیا تھا اور سب کچھ خریدنے کے بعد اسی خاموشی سے واپسی کا رخ کیا تھا' لیکن زرنگاہ سے یہ خاموشی برداشت نہیں ہورہی تھی۔
"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے بالآخر ہمت باندھ ہی لی تھی۔
"لیکن میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔" اس نے درشتی سے انکار کردیا۔ زرنگاہ ٹھٹک کے رہ گئی۔
"پلیز قاسم علی! آپ ایک بار میری پوری بات..."
"بس! میں سن چکا آپ کی پوری بات۔" اس نے ہاتھ اٹھا کے اسے روک دیا تھا۔ زرنگاہ خاموش ہوگئی۔
اور اسی خاموشی میں سفر بھی کٹ گیا تھا' وہ لاتعلق سا گیا تھا اور لاتعلق سا گھر آگیا۔ البتہ زرنگاہ' دادی صاحبہ کے پاس بیٹھ گئی' وہ اس کی شاپنگ دیکھ رہی تھیں' لیکن زرنگاہ کا ذہن وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ سوچوں ہی سوچوں میں کہاں سے کہاں نکل گئی تھی۔ قاسم علی کی لاتعلقی اور اجنبیت نے اسے بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ کافی بے کل سی ہورہی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ سونے کے لیے کمرے میں آیا تو یک دم ٹھٹک گیا تھا۔
کمرے میں زیرو بلب کی مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی' گویا وہ سوچکی تھی۔
رات کافی ہورہی تھی' اس لیے اسے بھی نیند آرہی

تھی، سونے کے لیے لیٹ گیا۔ ابھی اسے آنکھیں موندے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ زرنگاہ کروٹ بدل کر سیدھی ہوئی تھی اور اس کے حرکت کرنے پہ اس کی کلائی میں بجی چوڑیاں کھنک اٹھی تھیں۔ چوڑیوں کی اس کھنک پہ قاسم علی کے خیالات میں خلل پڑا تھا۔ اس نے چونک کر دیکھا زرنگاہ کو کروٹ بدلتے دیکھ کر سمجھ گیا کہ یہ اس کی چوڑیوں کا شور ہے، اس نے سر جھٹکتے ہوئے پھر سے اپنی سوچوں کا سلسلہ جوڑ لیا اور اس کی طرف سے کروٹ لے لی، لیکن پانچ منٹ بعد پھر ایسا ہی ہوا تھا۔

زرنگاہ اپنے [illegible] سے لپٹا دوپٹہ نکال کر سرہانے رکھ رہی تھی کیونکہ اسے الجھن ہو رہی تھی وہ اپنا دوپٹہ [illegible] سے نکال کے سونے کی عادی [illegible]۔ رات کو گلے میں لپٹا ہوا دوپٹہ اسے پھندے کی طرح محسوس ہوتا تھا، لیکن قاسم علی کی موجودگی میں بغیر دوپٹے کے لیٹے ہوئے اسے عجیب بھی لگ رہا تھا اور شرم بھی آ رہی تھی، لیکن اس کے لیے یہ تسلی ہی کافی تھی کہ وہ کروٹ بدل کے لیٹ چکا ہے اور دوسرے یہ کہ کمرے میں ملگجا سا اندھیرا ہے۔ وہ کروٹ بدلتا بھی تو اسے صاف یا واضح نہیں دیکھ سکتا تھا۔

لیکن یہ بھی سچ تھا کہ قاسم علی کی نیند اور سوچیں اڑ چکی تھیں، اس کا سارا دھیان زرنگاہ کی [illegible] ڑیوں کی کھنک کی سمت ہو چکا تھا۔ وہ آج تک عورت کے وجود سے اور اس کی خوب صورتیوں سے کوسوں دور رہا تھا۔ کبھی نظر اٹھا کے بھی نہیں دیکھا تھا کہ عورت میں کتنی دلکشی اور نزاکتیں پائی جاتی ہیں۔ مرد کے لیے اللہ نے عورت کو ایک تحفے کا نام دیا ہے اور وہ ہمیشہ اس تحفے سے نظریں چرائے ہوئے رہتا تھا کیونکہ یہ تحفہ اس پہ حلال نہیں تھا۔

لیکن اب یہ تحفہ اس پہ حلال ہو چکا تھا، اب اس سے نظریں چرانا اور کوسوں دور رہنا ایک انتہائی مشکل مرحلہ تھا احساس ہو رہا تھا کہ عورت کے وجود سے دور رہنا ایک مرد کے لیے آسان کام نہیں ہے، جبکہ وہ اس سے چند انچ کے فاصلے پہ بھی موجود ہو اور اس کی ملکیت بھی ہو۔ اس وقت قاسم علی واقعی مشکل میں پڑ گیا تھا۔

کل رات اس نے خود ہی اپنے اور اس کے درمیان لاتعلقی کی دیوار کھینچی تھی اور آج رات وہ خود ہی اس دیوار کو کیسے گرا دیتا؟ یہ بھی تو آسان نہیں تھا، لیکن طلب تھی کہ پاگل کر رہی تھی، کنپٹیوں میں [illegible] ٹھوکریں مارنے لگا تھا، وہ اس وقت ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہا تھا۔ اسے بھلا کیا خبر تھی کہ [illegible] کے لیے آزمائش بن جائے گی۔ اس کی قربت، تنہائی اور [illegible] اسے [illegible] کر ستائیں گے۔ [illegible] زرنگاہ کی ذرا سی حرکت پہ شور [illegible] چوڑیاں آگ جلتی پہ تیل کا کام کر رہی تھیں۔ وہ جھنجلانے لگا۔

"آپ پلیز! یہ چوڑیاں اتار دیں۔" وہ نہ رہ سکا اور اسے کہہ ہی دیا۔ لیکن زرنگاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں کیا کہہ رہا ہوں آپ سے؟" اس نے کروٹ بدل کر زرنگاہ کی سمت دیکھا۔ وہ اپنی آنکھوں پہ کلائی رکھے سونے کی کوشش کر رہی تھی۔

"لیکن کیوں؟"

"کیونکہ میں ان کی آواز سے ڈسٹرب ہو رہا ہوں۔ مجھے نیند نہیں آ رہی۔" وہ ابھی تک [illegible]

"اس میں میری چوڑیوں کا کیا قصور ہے؟" [illegible] لگ رہا تھا جیسے [illegible] کیفیت [illegible] گئی تھی۔

"قصور [illegible] ان کی آواز آتی ہے۔" وہ آج برا پھنسا تھا۔

"تو آپ اپنے کانوں پہ تکیہ رکھ لیں، آواز نہیں آئے گی۔" اس نے مشورہ دیا تھا۔

"میں ساری رات تو کانوں پہ تکیہ رکھ کے نہیں سو سکتا نا؟" اس نے خفگی سے کہا تھا۔

"تو اتنی سی بات پہ میں اپنی چوڑیاں بھی تو نہیں اتار سکتی نا؟" وہ بھی جیسے ضد پہ اڑ چکی تھی۔

"یہ اتنی سی بات ہے؟" وہ تعجب سے پوچھ رہا تھا۔

"میری چوڑیوں کے سامنے اتنی سی بات ہے۔ ایم سوری! میں یہ چوڑیاں نہیں اتار سکتی۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"آپ جانتی ہیں آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"

"جی! بہت اچھی طرح۔" وہ کہہ کے کروٹ بدل گئی تھی اور قاسم علی اس کی پشت دیکھ کے رہ گیا۔

"کیوں نہیں اتار سکتیں آپ؟" اس نے زرنگاہ کو بازو سے دبوچ کر جھٹکے سے اپنی سمت سیدھا کیا تھا۔

"کیونکہ یہ چوڑیاں مجھے آپ نے پہنائی ہیں، میں انہیں اتارنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔" اس نے قطعیت سے کہا۔

"لیکن میں تو سوچ سکتا ہوں نا؟"

"ہرگز نہیں۔" زرنگاہ نے فوراً اپنی کلائی پیچھے کر لی تھی۔

"میں پہنا سکتا ہوں تو اتار بھی سکتا ہوں۔" اس نے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ زرنگاہ کے اوپر سے بڑھا کے اس کی کلائی پکڑ لی۔ زرنگاہ تڑپ گئی۔

"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی، لیکن قاسم علی نے اسے اتنی مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا کہ وہ بے بس ہونے لگی تھی، لیکن اچانک اس کے ذہن میں نہ جانے کیا آیا تھا کہ وہ زور سے چلا اٹھی۔

"اتارتی ہوں... اتارتی ہوں، لیکن ایک شرط پہ۔" اسے اپنی بات منوانے کا موقع اچھا لگا تھا۔

"شرط... کیسی شرط؟" وہ ٹھٹکا، وہ تقریباً اس پہ جھکا ہوا تھا اور ملگجے سے اندھیرے کے باوجود وہ اسے [illegible] دیکھ رہا تھا۔ اس کی دودھیا رنگت دمک رہی تھی۔

"اگر آپ کو منظور ہے تو بتاتی ہوں۔"

"ہوں! بتائیں؟" اس نے ٹھہرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔" اس نے پھر وہی بات دہرائی تھی، لیکن قاسم علی خاموش تھا۔

"میں... وہ... مم میں..." اس نے بات تو شروع کر لی تھی، لیکن اب کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ البتہ وہ ہنوز منتظر اور خاموش تھا۔

"وہ... میں... میں شرمندہ ہوں۔"

اس نے بمشکل زبان سے یہ لفظ ادا کیا تھا، لیکن اس کے اس لفظ پہ قاسم علی کی مضبوط گرفت اس کے وجود پہ ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ اس نے اس کی کلائی چھوڑ دی، اور اس کے دل و دماغ پہ چھایا ان فسوں خیز لمحات کا طلسم یک دم موتیوں کی مالا کی طرح ٹوٹ کے بکھر گیا۔ وہ جو اپنے جذبات کی منہ زوری میں آ کر بہک رہا تھا، وہ زرنگاہ کے اس ایک جملے سے یک دم ہوش و حواس کی تلخ دنیا میں لوٹ آیا تھا اور دماغ جیسے جھنجھنا اٹھا۔ وہ دس سال پہلے کی اذیت میں جا اترا تھا اور پھر اس سے برداشت کرنا مشکل ہو گیا۔ [illegible] ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا تھا، لیکن زرنگاہ نے بھی ایک جست [illegible] اور بڑی پھرتی سے اس کی قمیص کا گریبان پکڑ لیا۔

"پلیز قاسم! میری بات تو سن لیں... پلیز... آپ کی نظر میں، میں واقعی غلط ہوں، لیکن میں آپ کو بتانا..."

"میں آپ کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا... [illegible] ختم۔" وہ سختی سے بولا۔

"قاسم! میں واقعی [illegible] میری وجہ سے..." [illegible] کاٹ دی تھی۔

"آپ شرمندہ ہیں؟ آپ صرف شرمندہ ہیں؟ [illegible] کردار داؤ پہ لگ گیا، میرا دامن داغ دار ہو گیا، قصور نہ ہوتے ہوئے بھی میں قصوروار ٹھہرا دیا گیا، مجھے حویلی سے لے کر میرے گھر تک گلیوں میں ذلیل کیا گیا، مجھے میرے بوڑھے دادا، دادی کے ساتھ بے عزت ہو کر گاؤں سے نکلنا پڑا اور آپ... آپ صرف شرمندہ ہیں؟ آپ سمجھتی ہیں آپ کی یہ ذرا سی شرمندگی میرے دس سالوں کی اذیتوں کا مداوا کر سکتی ہے؟ کیا آپ کا یہ لفظ میرے بوڑھے دادا، دادی کے دل میں بنے ناسور کا علاج کر سکتا ہے؟ وہ دونوں جنہوں نے پوری زندگی اس گاؤں میں گزار دی، گاؤں کے بچے بچے کو قرآن پڑھایا، اتنے سال امامت کی اور آپ لوگوں نے کیا صلہ دیا؟ دھکے؟ یا پھر گاؤں سے نکل جانے کا حکم؟ اور یہ سب کس کی وجہ سے ہوا؟ آپ کی وجہ سے؟ صرف اور صرف آپ کی وجہ

سے... اب آپ کا یہ شرمندہ ہونا ہمارے کس کام کا؟ کیا کریں گے ہم آپ کے اس لفظ سے؟ اور آپ کی اس شرمندگی سے؟ جو جھیلنا تھا وہ تو ہم نے جھیل لیا۔ اب آپ کی شرمساری سے ہمیں کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا؟ میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ لوگ کتنی آسانی سے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر کہہ دیتے ہیں کہ میں شرمندہ ہوں۔ اب ان لوگوں سے بندہ یہ پوچھے کہ کیا آپ کی اس شرمندگی سے دوسرے انسان پہ بیتی قیامت کا ازالہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟ اگر ہو سکتا ہے تو ٹھیک ہے میں آپ کو معاف کرتا ہوں، اور اگر نہیں ہو سکتا تو آئندہ مجھ سے اس بارے میں ——— بات مت کیجیے گا۔"

وہ غضب ناک لہجے میں کہتا ہوا جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا کے پیچھے ہٹ گیا۔

"لیکن قاسم پلیز! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں، وہ سب میں نے نہیں کیا تھا، مجھ سے کروایا گیا تھا، وہ سب قندیل آپی نے مجھے کہا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ مجھے وہاں خاموش رہنا ہے، حالانکہ میں یہ سب نہیں کرنا چاہتی تھی، میں بولنا چاہتی تھی، لیکن مجھے فورس کیا گیا تھا، انہوں نے زبردستی مجھے آمادہ کیا تھا، پتا نہیں وہ ایسا کیوں کرنا چاہتی تھیں [illegible] آگئی تھیں، میں تو اس وقت میں ہمت کر رہی تھی کہ میں آپ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہوں لیکن اس طرح تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا، یہ سب ان کا کیا دھرا تھا۔"

"لیکن میری نظر میں آپ دونوں اس وقت برابر ہو چکی تھیں اور میری نظر میں آج بھی آپ دونوں برابر ہی ہیں۔" وہ کافی چبا کر بولا تھا۔

"قاسم پلیز! خدا کے لیے مجھے اتنی کڑی سزا مت دیں۔" وہ روہانسی ہو گئی۔

"جائیے! جا کر دادا صاحب سے پوچھیے کہ جو کچھ آپ نے اور آپ کی کزن نے میرے ساتھ کیا تھا، اس کے بعد یہ سزا کڑی ہے یا نہیں؟" اس کا لفظ لفظ سرد اور لہجہ سپاٹ تھا۔

"قاسم...!" وہ بے بسی سے رو پڑی۔ قاسم علی کمرے سے باہر نکل گیا۔ رات کے اس پہر بھی اس کے دل و دماغ میں آگ جل رہی تھی اسے یوں لگ رہا تھا وہ بھانبھڑ کی طرح جلتے شعلوں میں کھڑا ہو۔ زرنگاہ کی شرمندگی کے اظہار نے اسے بلبلا کے رکھ دیا تھا۔ اس کی ذات پہ کیا کچھ بیت گیا تھا اور وہ محض اپنے کیے پہ شرمندہ ہو رہی تھی۔ وہ لان میں ٹہلتا سلگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایک سال چھ ماہ بیت چکے تھے۔ عدالت نے فیصلہ زرنگاہ کے حق میں سنا دیا تھا۔

ملک امتیاز احمد کو حویلی خالی کرنے کا اور گاؤں چھوڑنے کا حکم ملا تھا، حالانکہ زرنگاہ چاہتی تو انہیں سخت سے سخت سزا دلوا سکتی تھی لیکن اس نے صرف اپنا حق مانگا تھا اور باقی ساری خطائیں اور سارے گناہ انہیں معاف کر دیے تھے، کیونکہ ملک امتیاز احمد کے لیے ان کی اپنی اولاد ہی سزا بن گئی تھی۔ قندیل کی دو بار شادی ہوئی تھی اور دونوں بار ہی اسے شوہر نے طلاق دے کر گھر بھیج دیا تھا۔ وہ بہت عرصے سے طلاق کا لیبل ماتھے پہ سجائے گھر میں بیٹھی ہوئی تھی۔ دو ماہ پہلے وہ کسی ملازم کے ساتھ قابل اعتراض اور شرمناک حالت میں پکڑی گئی تھی جس پہ ملک امتیاز احمد جیتے جی مر گئے تھے۔

کوکب نے گھر سے بھاگ کے کسی سے شادی کر لی تھی۔ ان کا چھوٹا بیٹا ملک سمیر احمد امریکا میں چرس اور ہیروئن کے غیر قانونی لین دین میں پکڑا گیا تھا اور اب ڈیڑھ سال سے وہاں جیل میں سڑ رہا تھا اور ملک توقیر احمد پہلے ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے بھاگ گیا تھا۔

ایسے میں زرنگاہ انہیں اور کیا سزا دلواتی؟ اس نے ساری سزائیں، سارا انصاف اپنے رب پہ چھوڑ دیا تھا، البتہ صرف یہ کیا تھا کہ اپنا حصہ اور اپنی حویلی الگ کروالی تھی اور آج ملک امتیاز احمد حویلی چھوڑ گئے تھے یہ خبر ابھی ملی تھی۔

"مبارک ہو بیٹا! تمہیں تمہارا حق مل گیا۔" مولوی صاحب نے زرنگاہ کا سر تھپکتے ہوئے کہا۔ وہ سب

ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ زرنگاہ ان کے لیے چائے لے کر آئی تھی لیکن ان کی بات پہ ٹھہر سی گئی۔ اس کی بے ساختہ نظر قاسم علی کی سمت اٹھی تھی اور چائے کا گھونٹ لیتے قاسم علی نے بھی بے ساختہ اسے ہی دیکھا تھا۔

"دادا صاحب! کاش کہ حق تلفی کرنے والے کبھی انجام کا بھی سوچ لیں۔"

وہ ٹرے ٹیبل پہ رکھتے ہوئے افسردگی سے بولی اور ان کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔

"بیٹا! انجام کا کون سوچے۔۔۔؟ کیونکہ وہی کسی کا حق تلف کرتا ہے جو ایمان کا ہلکا ہوتا ہے' اور جو ایمان کا ہلکا (کمزور) ہوتا ہے' وہ اللہ سے دور ہوتا ہے۔" دادا صاحب کے جواب پہ قاسم علی کو جیسے اچھو لگ گیا وہ بمشکل اپنا کپ سنبھالتے ہوئے سیدھا ہو کے بیٹھا تھا۔

"خیر! چھوڑیے اس بات کو' آپ یہ بتایئے کہ ہم لوگ گاؤں کب جا رہے ہیں؟" زرنگاہ اسے دیکھتے ہوئے بات بدل گئی تھی۔

"ارے بیٹا! ہمارا تو دل چاہ رہا ہے کہ ہم ابھی کے ابھی چلے جائیں۔ گیارہ بارہ سال ہو گئے ہیں گاؤں سے نکلے ہوئے؟" انہوں نے آہ بھری زرنگاہ چپ سی ہو گئی۔

"کیوں بیٹا؟ تمہارا کیا ارادہ ہے؟ کب لے کر چل رہے ہو ہمیں؟" انہوں نے قاسم علی کو مخاطب کیا تھا۔

"آپ کو جب جانا ہو مجھے بتا دیجیے گا۔ ڈرائیور آپ لوگوں کو چھوڑ آئے گا۔" وہ کہہ کے وہاں سے اٹھ کر چلا گیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی سمت دیکھ کے رہ گئے تھے۔

"وہ گاؤں نہیں جائیں گے تو میں بھی نہیں جاؤں گی۔" زرنگاہ نے بھی فیصلہ سنا دیا تھا اور وہاں سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

چن سجناں وے نیڑے نیڑے ہو
ڈھول جانیاں وی نیڑے نیڑے ہو
دور دور رہنی آں تے اکھ پھڑکے
تیرے کول آنی آں تے دل دھڑکے
ساواں وچوں آوے مینوں تیری خوشبو

قاسم علی نے جیسے ہی اپنے بیڈ روم میں قدم رکھا' اس کی سماعتوں پہ یہ گانا ایک یاد کی طرح بجا تھا' اس کا ذہن سیکنڈوں میں بہت پیچھے چلا گیا تھا۔ آج سے ساڑھے گیارہ سال پہلے جب وہ پہلی بار اسے پڑھانے کے لیے حویلی گیا تھا تو وہ حویلی کی چھت پہ کھڑی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتی اسی گانے پہ مسرور ہو رہی تھی۔ یہ گانا اسے واقعی بہت پسند تھا۔ وہ جب کبھی اسے سنتی تھی فل والیوم سے سنتی تھی۔ وہ بیڈ پہ بیٹھی بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں بند کیے گانا سن رہی تھی جب قاسم علی نے آگے بڑھ کے ڈیک کا سوئچ آف کر دیا' لیکن زرنگاہ اس کی اس حرکت پہ چونکی نہیں تھی اور نہ ہی فوراً" آنکھیں کھول کے دیکھا تھا' بلکہ وہ ہنوز ایک ہی حالت میں پلکیں موندے بیٹھی رہی۔ اس کا انداز قدرے نیم دراز سا تھا۔ قاسم علی کپڑے تبدیل کر کے بستر پہ آگیا بستر پہ بیٹھتے ہوئے اس کی نگاہ اس کے رخساروں پہ جا ٹھہری تھی جو بھیگے ہوئے لگ رہے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ وہ آنکھیں بند کیے محض گانا ہی نہیں سن رہی تھی بلکہ رو بھی رہی تھی اور پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ قاسم علی کو کچھ کچھ ہوا تھا' اس کے دل کو آنچ سی لگی تھی' وہ ذرا سا تڑپا تھا' اور اسے زرنگاہ کی سزا کا احساس ہوا تھا۔ لیکن یہ احساس اسے غلط وقت پہ ہوا تھا۔ اچانک اس کا موبائل بج اٹھا۔ آئی جی کی کال تھی' انہوں نے اسے کسی آپریشن کے لیے طلب کیا تھا اور اس کا پہنچنا ضروری تھا اس نے فوراً" اٹھ کر وردی پہنی اور جانے کے لیے تیار ہو گیا اور ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ گھر سے باہر آ کر بھی اس کے ذہن میں زرنگاہ کا چہرہ ہی چکرا رہا تھا۔ وہ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی اسے ہی سوچتا آیا تھا۔ اور آئی جی کے سامنے بیٹھ کر بریفنگ کے دوران بھی وہ اسے ہی سوچ رہا تھا۔

وہ اس کے ڈیڑھ سال کے صبر' ہمت' حوصلے اور اس کی خدمت سے نظریں نہیں چرا پا رہا تھا۔ اس کی خفگی' ناراضی اور لاتعلقی کے باوجود اس نے ہر کام احسن طریقے سے نبھایا تھا۔ اس کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کیا تھا۔ دادی' دادا کی دن رات خدمت کی تھی۔ پورے گھر کو اچھی' نیک اور سگھڑ بیویوں کی طرح سنبھال رکھا تھا اور ڈیڑھ سال سے سب کچھ وہی چلا رہی تھی۔ دادی صاحبہ نے ہاتھ ہٹا لیا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا' لیکن اس کے باوجود قاسم علی نے اپنی لاتعلقی ختم نہیں کی تھی۔ کبھی اسے خود سے مخاطب نہیں کیا تھا۔ کبھی بیویوں والا درجہ نہیں دیا تھا۔ کبھی سیدھے منہ اس سے بات تک نہیں کی تھی لیکن پھر بھی سب کچھ نباہ رہی تھی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ گھٹ کے جی رہی تھی۔ قاسم علی کی لاتعلقی اسے دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ قاسم علی سے محبت کا جذبہ پال بیٹھی تھی اور آج یہی جذبہ اس کے رخساروں کو بھگو رہا تھا اور قاسم علی کی روح میں بے چینیاں بھر گیا تھا۔

"ایس پی قاسم علی! آپ کا دھیان کہاں ہے اس وقت؟" آئی جی سلطان لغاری کی آواز پہ قاسم علی سٹپٹا گیا۔

"ایم سوری سر!" اس نے ان کی سمت توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ایس پی قاسم علی! آپ اگر مینٹلی یا فزیکلی ڈسٹرب ہیں تو آپ واپس گھر جا سکتے ہیں۔" انہوں نے نرمی سے لیکن نپے تلے سے لہجے میں کہا تھا۔

"نو سر! اٹس آل رائٹ میں فٹ ہوں' میں سب سن رہا ہوں۔"

آئی جی سلطان لغاری کی تسلی ہوئی تھی۔ وہ دوبارہ سے بریفنگ کا سلسلہ جوڑ چکے تھے۔ یہ اور بات تھی کہ قاسم علی کے دل و دماغ سے زرنگاہ کا خیال اب بھی نہیں نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات بھر کے ایک اہم آپریشن کے بعد دن کے بارہ بجے وہ گھر میں داخل ہوا تھا۔ رات بھر کی سوچوں اور رت جگے سے وہ کافی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ وہ سست روی سے چلتا ہوا سیڑھیوں کی سمت بڑھ رہا تھا جب اچانک ٹھٹک کے رک گیا۔ کیونکہ ڈرائنگ روم میں غیر معمولی سرگرمیاں دیکھنے میں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے آگے بڑھ کے حیرت سے پوچھا۔ دادی' دادا نے چونک کر اسے دیکھا تھا جبکہ زرنگاہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"ہم لوگ گاؤں جا رہے ہیں۔" دادا صاحب نے اپنی تسبیح اور عطر وغیرہ اپنی پیٹی میں رکھتے ہوئے کہا۔ دادی صاحبہ' دادا صاحب کے اور اپنے کپڑے تہہ کر کے رکھ رہی تھیں۔

"گاؤں۔۔۔ مگر کب؟" قاسم علی کو ان کے اس اچانک فیصلے پہ کافی شاک لگا تھا۔

"آج ابھی تھوڑی دیر بعد۔۔۔ تم ڈرائیور سے کہہ دو! ہمیں چھوڑ آئے۔"

دادا صاحب کافی لاپروائی سے بات کر رہے تھے اور قاسم علی کا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد اگر وہ واپس لوٹ رہا تھا تو وہ وہاں سے جا رہی تھی وہ تو رات سے نجانے کیا سے کیا سوچ آیا تھا اور وہ لوگ۔۔۔ قاسم علی کا دل چاہا وہ یونہی کھڑے کھڑے دیوار پہ سر دے مارے۔ دادا صاحب کی انہی عجلت پسندیوں نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ ہر کام کے لیے' ہر بات کے لیے اتاؤلے ہو جاتے تھے۔

"کون کون جا رہا ہے؟" قاسم علی نے بمشکل اپنے اعصاب ڈھیلے چھوڑے تھے' ورنہ اس کے دل میں ابال اٹھ رہے تھے۔

"تمہاری دادی' تمہاری دلہن اور میں۔۔۔" وہ اب بھی لاپروا سے تھے۔

"کیا آج جانا ضروری ہے؟" قاسم علی نے سوال دادا صاحب سے کیا تھا لیکن دیکھا زرنگاہ کو تھا' مگر وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی۔

"ہاں! ضروری ہے۔ آج ملک صاحب کی برسی بھی ہے' اس لیے دلہن ان کی قبروں پہ فاتحہ خوانی کے لیے

جانا چاہتی ہے۔ ہم نے سوچا‘ کل بھی تو جانا ہے‘ بہتر ہے آج ہی چلے جائیں‘ اس کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہو جائے گا‘ اور تمہارا کیا ہے‘ تم پتا نہیں جاؤ گے بھی یا نہیں‘ اس لیے انتظار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“
گویا دادا صاحب اسے اس کے حال پہ چھوڑ چکے تھے۔ قاسم علی ان کی بات پہ خاموش ہو گیا تھا۔
”بیٹا! تم نے پیکنگ کرلی۔؟“ انہوں نے زرنگاہ کو مخاطب کیا۔
”جی! کرلی ہے۔“ وہ دھیمے سے بولی تھی اور پھر ان کی روانگی تک زرنگاہ انہی کے پاس بیٹھی رہی تھی۔ قاسم علی کچھ کہنے کی خواہش دل میں ہی دبا کے رہ گیا تھا اور وہ اس سے نظر ملائے بغیر ہی ان کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ قاسم علی نے ڈرائیور کو ساتھ بھیجا تھا لیکن ان کو بھیج کر وہ خالی خالی اور ویران سا بیٹھا رہ گیا تھا۔ خالی گھر تھا کہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا اور خالی بیڈ الگ بے چین کر رہا تھا۔ ڈیڑھ سال وہ اس کے ساتھ اس بیڈ پہ سوئی تھی اور آج یہ بیڈ خالی دیکھ کر اسے عجیب سا لگ رہا تھا۔ اس کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان لوگوں کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا گاؤں آئے ہوئے اور قاسم علی تھا کہ اس نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی۔
زرنگاہ اب بجھی بجھی سی رہنے لگی تھی۔ صبح اٹھتی تھی اور گھر کے کام کاج میں لگ جاتی تھی اور عشاء کی نماز کے بعد سر شام ہی سونے کے لیے لیٹ جاتی تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ اسے نیند رات گئے تک نہیں آتی تھی۔ اس کا بسیرا قاسم علی کے کمرے میں ہی تھا‘ ساتھ والے کمرے میں دادا‘ دادی ہوتے تھے اور وہ اکیلی قاسم علی کی بے رخی پہ جلتی کڑھتی رہتی۔ اکثر گھر کے کام کرتے ہوئے بھی اس کا یہی حال ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہ روٹیاں بنا رہی تھی اور اپنی ہی سوچوں میں گیلی لکڑی کی طرح سلگ رہی تھی جب اچانک دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔
اس نے چونک کر دیکھا تھا‘ لیکن پھر بجھ سی گئی۔ یہ دستک دادا صاحب کی بھی ہو سکتی تھی‘ کیونکہ وہ مغرب کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد گئے ہوئے تھے‘ اور یہ دستک دادی صاحبہ کی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ ساتھ والے گھر میں کسی ہمسائی کے بچے کی عیادت کے لیے گئی ہوئی تھیں۔ قاسم علی کے آنے کا وہ سوچ تک نہیں سکتی تھی کیونکہ وہ خود سے آنے والا نہیں تھا۔ اس نے روٹی کو توے پہ پلٹ دیا اور اٹھ کر یونہی باورچی خانے سے باہر نکل آئی تھی۔
دروازے پہ تب تک تیسری دستک ہو رہی تھی۔
”کون ہے؟“ اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے احتیاطاً پوچھ لیا تھا۔
”ایس پی قاسم علی۔“ باہر سے جو آواز سنائی دی تھی‘ وہ زرنگاہ کے مردہ دل و جان میں روح پھونک گئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے وہ فل یونیفارم میں اپنی شخصیت کی تمام تر وجاہتوں سمیت سر اٹھائے کھڑا تھا۔
”آ... آپ...؟“ اسے قاسم علی کو دیکھ کر بھی یقین نہیں آیا تھا کہ وہ اس کے سامنے کھڑا ہے‘ وہ اتنے سالوں بعد اپنے گاؤں لوٹ کر آیا ہے‘ اس نے کتنے عرصے بعد اپنی گلی میں قدم رکھا تھا۔ اس کے اس طرح خود سے لوٹ آنے کا مطلب تھا کہ وہ سب کچھ پیچھے چھوڑ کے آیا ہے‘ سب بھلا آیا ہے‘ اپنے میلے دل دھو آیا ہے۔
”گھر پہ کوئی نہیں ہے؟“ وہ یوں پوچھ رہا تھا جیسے کسی اجنبی سے پوچھ رہا ہو۔
”میرے سوا کوئی بھی نہیں ہے‘ آپ بتایئے! آپ کو کس سے ملنا ہے؟“ زرنگاہ کا لہجہ لرز گیا تھا۔
”ایس پی قاسم علی کی بیوی سے ملنا ہے مجھے۔“ وہ کہتے ہوئے اندر آگیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ زرنگاہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔
”کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں آپ؟“ زرنگاہ کا دل اندرونی خوشی کے باعث جیسے بند ہو رہا تھا۔
”کچھ کہنا تھا ان سے۔“ وہ دو قدم اور آگے بڑھا

تھا۔
”کہیے؟ ایس پی قاسم علی کی بیوی سن رہی ہے۔“ وہ دو قدم اور پیچھے ہٹی تھی۔
”کچھ زیادہ نہیں کہنا۔ صرف اتنا کہنا ہے کہ...“ وہ کہتے ہوئے لمحہ بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔
”کہ...؟“ وہ سننے کو بے تاب ہوئی تھی۔
”کہ میں شرمندہ ہوں۔“ قاسم علی نے اسی کے الفاظ دہرائے تھے۔
”کیا آپ کا یہ چھوٹا سا لفظ‘ یہ ذرا سا شرمندگی کا اظہار میری اذیت کا ازالہ کر سکتا ہے؟“ اس کی آواز بھیگ گئی۔ وہ اپنے رخساروں پہ بہنے والے آنسوؤں کو چھپانے کی غرض سے رخ موڑ گئی۔
قاسم علی نے اپنے اور اس کے درمیان موجود دو قدم کا فاصلہ مٹاتے ہوئے کہا۔
”لیکن میری محبت کا اظہار تو آپ کی اذیت کا ازالہ کر سکتا ہے نا؟“
قاسم علی کی آواز اس کے کان کے بے حد قریب سنائی دی۔ اس کی گرم سانسیں زرنگاہ کی گردن کو آنچ دینے لگی تھیں۔
”آپ کو کیا پتا کہ محبت کیا ہوتی ہے؟“ وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔
”ہاں واقعی! پہلے مجھے بھی نہیں پتا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے؟ لیکن قاسم کی جان! ان آٹھ دنوں میں محبت نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ اتنا مجبور اور بے بس کر دیا کہ آج خود ہی بن بلائے مہمان کی طرح اپنے آفس سے اٹھ کر سیدھا یہاں آگیا ہوں۔“ اس نے گمبھیر آواز میں کہا۔
زرنگاہ کی جان مٹھی میں آگئی تھی۔ وہ آج کون کون سی قیامتیں ڈھا رہا تھا اس پہ۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کے اسے دیکھا‘ لیکن وہ اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پناہ وارفتگی تھی۔
”کیا دیکھ رہی ہیں؟“ قاسم علی نے اسے کلائی سے پکڑ کر اپنی سمت کھینچا تھا۔
”آ... آپ... قاسم علی ہیں ناں؟“ وہ اس کی گستاخی پہ بوکھلا گئی تھی۔ قاسم علی یکدم قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔
”آپ کا وہم اس طرح ختم نہیں ہوگا۔ دیکھیں! پھر یقین آئے گا۔“ قاسم علی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گرد لپیٹ لیے تھے اور اپنی بے خودی میں وہ دونوں ہی یہ نہیں دیکھ پائے تھے کہ اس کا صاف ستھرا یونیفارم زرنگاہ کے ہاتھوں پہ لگے آٹے کے سفید داغوں سے خراب ہو چکا ہے‘ اسی جلی ہوئی روٹی کی بو پورے گھر میں پھیلی تھی۔ قاسم علی کے سینے سے لگی زرنگاہ تڑپ کے پیچھے ہٹی تھی۔
”او میرے خدایا! روٹی جل گئی۔“ وہ سر پہ ہاتھ مارتی ہوئی باورچی خانے کی سمت لپکی لیکن قاسم علی نے اسے کھینچ لیا تھا۔
”اتنے سال ہم جلے ہیں‘ آج روٹی جل جائے تو کیا فرق پڑتا ہے؟“ اس نے زرنگاہ کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔
”لیکن قاسم! وہ روٹی...“ زرنگاہ کا لہجہ لرز گیا۔
”آج میں ان ہونٹوں سے کوئی اور لفظ نہیں‘ صرف قاسم سننا چاہتا ہوں‘ آپ جتنی بار پکاریں گی‘ میری رگوں میں دوڑتا خون سیروں اور بڑھے گا۔“
دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ وہ یکدم اس سے الگ ہوئی اور پھر باورچی خانے میں چلی گئی۔ قاسم علی نے پلٹ کر دروازہ کھول دیا۔
”السلام علیکم!“ دادا صاحب اسے دیکھ کر بری طرح چونک گئے۔
”قاسم علی! تم یہاں؟“ انہوں نے گھر میں داخل ہوتے ہوئے حیرانی کا اظہار کیا تھا۔
”جی...! وہ دراصل اتنے دنوں سے مجھے فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ آج تھوڑا فارغ ہوا تو سیدھا یہیں آگیا۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے کمرے میں رکھی چارپائی پہ آبیٹھا تھا۔ اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور ماحول میں خنکی بھی محسوس ہو رہی تھی۔
”اوہ! اچھا اچھا تو تمہیں فرصت نہیں تھی؟“ وہ بھی پاؤں سمیٹ کر اپنے بستر میں گھس گئے تھے۔
”جی...!“ اس نے آہستگی سے کہا۔

"چلو! شکر ہے کہ تمہیں فرصت تو مل گئی نا۔ میں تو یہاں آنے سے پہلے ہی دلہن کو کہہ رہا تھا کہ تم گاؤں چلو قاسم علی آئے گا' ضرور آئے گا' اسے ذرا تنہائی ملی تو اسے فرصت بھی مل جائے گی اور دیکھ لو! جیسے ہی دلہن نے اور ہم نے تمہیں تنہائی دی' تمہیں فرصت مل گئی۔" دادا صاحب اپنے اندازے اور تجربے پہ خوش ہو رہے تھے کیونکہ وہ کامیاب ہوئے تھے۔

"ہوں! آپ جو بھی کہتے ہیں' ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ یہ بھی ٹھیک ہی کہا تھا آپ نے۔" قاسم علی نے اپنی مسکراہٹ دباتے ہوئے سر جھکا لیا تھا مبادا وہ اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نہ دیکھ لیں۔

"کیونکہ ہم تمہاری رگ رگ سے واقف ہیں۔ پہلے ہماری بات سے انکار کرتے ہو پھر مان جاتے ہو۔" وہ مسکرائے۔

"اسی لیے آپ میری عادتوں کو کیش کرتے ہیں۔" وہ ہنسا۔

"کرنا چاہیے بیٹا جی! ہم نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟" دادا صاحب دل کھول کے ہنسے تھے۔ اتنے میں دادی صاحبہ بھی آگئی تھیں۔ انہوں نے اپنی بڑی سی چادر اتار کر رکھتے ہوئے قاسم علی کو حیرت سے دیکھا۔

"ارے قاسم علی! تم...؟" وہ حیرت اور خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی تھیں۔

"السلام علیکم دادی صاحبہ!" وہ انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"وعلیکم السلام! آج ہم غریبوں کی یاد کیسے آگئی؟" دادی صاحبہ نے شکوہ کیا۔ قاسم علی کی نظر کمرے میں داخل ہوتی زرنگاہ پہ ٹھہر گئی۔

"میں نے سوچا غریبوں کی حق تلفی نہ کروں' کیونکہ میں اپنے آپ کو کمزور ایمان والا نہیں کہلوانا چاہتا تھا' سو سب کے حق ادا کرنے اور حقوق پورے کرنے کے لیے آگیا ہوں۔" اس نے زرنگاہ کو جتایا تھا۔ وہ پہلے ہی شرم کے باعث نظریں چرائے ہوئے تھی۔

ماشاءاللہ' ماشاءاللہ' آئے کب ہو؟ دادی صاحبہ اس کے برابر ہی بیٹھ گئیں۔

"کافی دیر سے آیا ہوا ہوں۔ پہلے قبرستان گیا تھا۔ اماں ابا کی قبر پہ فاتحہ پڑھی ہے' پھر یہاں آیا ہوں۔ اتنے سالوں بعد اپنا گاؤں دیکھا ہے' اپنی گلیاں دیکھی ہیں' کافی کچھ بدل گیا ہے۔"

"تم بھی تو بدل گئے ہو ناں؟" دادا صاحب آج خوش دکھائی دے رہے تھے' اسی لیے بار بار ہنس رہے تھے۔

"ہاں جی! بدل گیا ہوں' کیا کوئی پرابلم ہے آپ کو؟" قاسم علی نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

"نہیں نہیں' ہمیں کوئی پرابلم نہیں ہے۔ بس یہ کہنا ہے کہ اگر بدل گئے ہو تو ٹھیک ہے لیکن عزت کا سوال ہے' آخر ایک ایس پی ہو تم' اپنی وردی صاف ستھری رکھا کرو' آٹے کے داغ لے کر پولیس اسٹیشن جاؤ گے تو عملے پہ کیا اثر پڑے گا؟ کچھ لوگ تو یہ بھی سمجھیں گے کہ شاید دلہن تم سے روٹیاں بنواتی ہے۔"

دادا صاحب کی اس اچانک چوٹ پہ قاسم علی نے جہاں چونک کر اپنی شرٹ کی سمت دیکھا تھا' وہیں زرنگاہ شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ خود بخود جھک گیا تھا اور ایسی ہی کچھ خفت قاسم علی کو بھی ہوئی تھی۔

"ہم لوگ جب آئے تھے تو احد ابا' تمہارے کچھ کپڑے ... تھے دلہن نے استری کر کے رکھے ہوئے ہیں' جا کر چینج کرو' پھر کھانا کھاتے ہیں۔" انہوں نے ساتھ ہی اسے ... تو اور قاسم علی فوراً" اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا تھا۔

"جی! ابھی آتا ہوں۔" وہ کہہ کے وہاں سے نکل آیا۔ دادی صاحبہ نے زرنگاہ کو بھی اس کے پیچھے بھیج دیا تھا کہ وہ اسے کپڑے نکال دے۔ وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی اس کے پیچھے آئی تھی۔ قاسم علی کمرے کے وسط میں کھڑا اپنے کمرے کو چاروں اطراف سے دیکھ رہا تھا۔ اتنے سالوں بعد اپنا کمرا دیکھا تھا تو قدم تھم گئے تھے' زرنگاہ نے کمرے کو کافی چمکا رکھا تھا۔ تھوڑی بہت سجاوٹ بھی کر دی تھی۔

"آپ! شرٹ اتار دیں' میں دھو کر خشک کر دیتی ہوں' استری سے جلدی خشک ہو جائے گی۔" زرنگاہ نے اسے آہستگی سے متوجہ کیا تھا۔ قاسم علی نے یکدم پیچھے پلٹ کر اسے دیکھا۔

"اس پہ بھی آپ کہیں گی کہ آپ شرمندہ ہیں؟" قاسم علی مسکرایا۔

"نہیں! اس پہ شرمندہ نہیں ہوں' کیونکہ یہ میرا حق ہے۔" اس نے قاسم علی کی شرٹ پہ ہاتھ پھیرا۔ سرمئی شرٹ پہ سفید داغ نمایاں نظر آرہے تھے اور یہ داغ قاسم علی کی شرٹ کے پیچھے بھی تھے اور سامنے سینے پہ بھی تھے۔

"تو پھر اس حق کو منانا اور چھپانا کیوں چاہتی ہیں آپ...؟" اس نے اپنی کیپ اٹھا کر زرنگاہ کو پہنا دی۔ وہ جھینپ گئی۔

"تاکہ کوئی ان کی وجہ سے آپ کا مذاق نہ اڑائے' آپ کی شخصیت کا وقار ہے' آپ کی عزت میری عزت ہے۔"

زرنگاہ کے لہجے میں آج اپنے اس رشتے کا مان اور استحقاق بول رہا تھا۔ قاسم علی کو اس کے ہونٹوں اور رخساروں پہ کھلے خوشی کے رنگ دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔

"اسی بات پہ ایک سیلوٹ ہونا چاہیے آپ کے لیے۔"

وہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی الماری کی سمت بڑھ گئی اور اس کے لیے کپڑے نکالنے لگی' لیکن قاسم علی کا والہانہ پن پھر بھی عروج پہ ہی تھا۔ زرنگاہ بمشکل جان چھڑا کے باہر آئی تھی کیونکہ دادا' دادی انتظار کر رہے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد بھی بہت دیر تک وہ دونوں دادا صاحب اور دادی صاحبہ کے پاس بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے اور انہی باتوں کے دوران یہ طے پایا تھا کہ دادا صاحب زرنگاہ کی حویلی کی حفاظت اور نگرانی کریں گے اور دن کے وقت بچوں کو وہیں سبق دیا کریں گے۔ اس چیز پہ دادا صاحب اتنے خوش نہیں تھے۔ لیکن زرنگاہ کے لیے انہیں ماننا ہی پڑا تھا اور وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس طرح اسے پتا تھا کہ حویلی میں رونق رہتی' کیونکہ وہ حویلی کو بند نہیں کرنا چاہتی تھی' آباد رکھنا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس نے ملازموں کو بھی نہیں نکالا تھا' بلکہ ان کی تنخواہیں مقرر کر دی تھیں اور اپنی جائیداد سے کافی سارا حصہ غریبوں میں بھی تقسیم کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔

"جزاک اللہ بیٹا! جزاک اللہ۔ اوپر والا اجر دے گا۔" انہوں نے زرنگاہ کا سر تھپکا۔

"ان شاءاللہ۔" اس نے دھیمے سے کہا۔

"اچھا دادا صاحب! مجھے اب اجازت دیجیے' دن بھر کا تھکا ہوا ہوں' اب نیند آرہی ہے۔" ان سے اجازت لیتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

"ہوں! کافی ٹائم ہو رہا ہے' جاؤ جا کر آرام کرو۔" انہوں نے اجازت دی۔ اور خود بھی لیٹ گئے۔ شب بخیر وہ کہتا ہوا چلا گیا زرنگاہ بھی اٹھ گئی۔ اس نے چائے والے خالی برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھے۔ سارا پھیلاوا سمیٹا اور دس پندرہ منٹ یونہی فضول سے کاموں میں ضائع کر دیے تھے۔ آج اسے اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بہت شرم آرہی تھی بہت عجیب لگ رہا تھا۔

باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے قدم کمرے کی سمت بڑھا دیے اس کا ایک ایک قدم من من بھر کا ہو رہا تھا۔ دل نے الگ سینے کے پنجرے میں اتھل پتھل مچا رکھی تھی۔ دھڑک دھڑک کر دیوانہ ہو چکا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے دروازے پہ دباؤ ڈالا تھا اور دروازہ کھلتا چلا گیا۔

لمحہ بہ لمحہ بھیگتی رات ان کے لیے امر ہو رہی تھی۔ ان کی خوشی کی یہ گھڑیاں ان کے لیے زندگی بھر کا سرمایہ تھیں۔ صبر دونوں نے کیا تھا اور اجر دونوں نے ہی پالیا تھا' کیونکہ اوپر والا عادل تھا' انصاف پسند' کسی ایک کا دوسرے کی طرف ادھار یا بدلہ نہیں رہنے دیتا تھا۔ سب کچھ برابر کر دیتا تھا' کیونکہ یہی اس کے اصول تھے اور یہی اس کا انصاف تھا۔

☆

پگڈنڈی پر بکھرے زرد پتے خاموشی اور اداسی میں لپٹے دور تک بچھے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے فاروق ہمدانی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ اس کے دل کی شاہراہ ہو اور اس پر سعدیہ خان کی یادوں کے خشک پتے دور تک بکھرے تھے۔ کبھی یہ پتے سبز تھے، تازگی سے بھرپور، خاموش محبت کی انوکھی اور البیلی سی چمک اور مہک ان میں موجود تھی۔ پھر رخش وقت پر سوار کتنے ہی موسم یہاں سے گزرے۔ محبت کی مہک تو وہی رہی مگر بس وہ یادوں کی تازگی اور نرمی، زردی میں بدل گئی۔ یہاں سے وہاں یہ خشک پتے سفر کرتے رہتے ہیں، بالکل فاروق ہمدانی کی طرح.....

آج چھٹی کا دن تھا۔ اپنے سب کام سمیٹ کر وہ سرشام اپنے گھر سے نکل پڑے تھے۔ درختوں، پودوں اور پھولوں کے درمیان وقت گزارنا اور فطرت سے ہمکلام ہونا، ان کا مشغلہ نہیں، شوق بھی نہیں، جنون تھا۔ سعدیہ کو بھی یہی جنون تھا۔ انہوں نے کئی بار اس کی گفتگو میں اس جنون کی جھلک محسوس کی تھی۔ وہ درختوں کی، پھولوں کی، بادلوں کی اور تتلیوں کی باتیں کرتی تو اس کے چہرے پہ ویسی ہی نرمی اور خوبصورت رنگوں کی دھنک بکھر جاتی تھی۔ فاروق کو یاد تھا، ایک بار باتوں باتوں میں اس نے کہا تھا کہ اسے خزاں کا موسم پسند ہے۔

"خزاں! تمہیں ٹنڈ منڈ درخت، خالی شاخیں اور پیلے سوکھے پتے پسند ہیں؟" ان کے گروپ کی فائزہ عادت کے مطابق زور سے چیخی تھی۔

"خزاں صرف اس ایک منظر کا موسم تھوڑی ہے، جو تم بیان کر رہی ہو۔ یہ تو امید کا، امکانات کا موسم ہے۔ یہ زرد پتے دراصل موسم گل کی آمد کے نقیب ہیں۔ یہ پت جھڑ، یہ اداسی، تنہائی در حقیقت اشجار کی زیب و زینت کی تیاریاں ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے دھیمے دھیمے بولتی سیدھی مخاطب کے دل میں اترتی چلی جاتی تھی۔

فاروق ہمدانی کے قدم راستے میں بکھرے پتوں پر اور دل کے قدم ماضی کی شاہراہوں پر پڑ رہے تھے۔

انہیں وہ پیاری سی کامنی سی، سلجھی ہوئی لڑکی بہت اچھی لگنے لگی تھی۔ جس کی آنکھوں میں کبھی کبھی انہیں وہ خوبصورت رنگ نظر آتے، جو ان کی اپنی آنکھوں اور دل میں تھے۔ وہ دل ہی دل میں ہنس پڑتے۔

"محبت میں انسان کو یہ وہم ضرور ہو جاتا ہے کہ فریق ثانی بھی اس کی محبت میں مبتلا ہے۔" یہ قول زاہد احمد کا تھا۔ ان کے گروپ کا سب سے چلبلا مگر ذہین طالب علم۔ اس کے اس فلسفے پر فاروق اکثر سوچنے پر مجبور ہو جاتے کہ سعدیہ کے چہرے اور آنکھوں میں نظر آنے والے رنگ واقعی ایک حقیقت ہیں یا محض ان کا گمان۔ اسی ہچکچاہٹ اور تذبذب میں دن گزرے کہ اظہار کی ہمت کرتے کرتے جدائی کے دن آ پہنچے۔

"اور میں بھی ان دنوں کتنا بے وقوف ہوا کرتا تھا۔ دل کی بات کہنے میں بھلا کیا حرج تھا۔ پذیرائی ملتی یا نہ ملتی۔ وہ میرا نصیب ہوتا مگر آج اتنے سالوں تک یہ خلش تو ساتھ ساتھ نہ ہوتی کہ اس کومل سی لڑکی کو بتا ہی دیتا، میں اسے کتنا پسند کرتا ہوں۔

دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں گھسائے، وہ اس راستے پہ چلتے چلے جا رہے تھے اور سوچے چلے جا رہے تھے۔ ان کے ہم راز، ان کے ہم ساز اور ان کے ہم قدم وہ خزاں رسیدہ برگ تھے، جو پاؤں تلے چرچرانے پر احتجاجی صدا بلند کرتے اور خاموش ہو جاتے۔

"شاید میرے مقدر میں یہی تھا۔ یہ اداسی، یہ دوری، یہ تنہائی..." وہ بے بسی سے مسکرائے۔

زرد پتوں سے بھرے رستے ہیں

اور ان رستوں پر

دور تک تنہائی ہے.....

طویل راستہ ایک موڑ پر ختم ہوا اور موڑ مڑتے ہی سامنے کا منظر دیکھ کر مبہوت رہ گئے۔ پچھلے چند دنوں سے وہ یہ مسحور کن منظر ہر ستمبر اکتوبر کے مہینوں میں دیکھتے تھے۔ اتنے حسین رنگوں میں ڈوبی خزاں کے آگے خوش رنگ ترو تازہ بہار بھی چند لمحوں کے لیے ماند پڑ جاتی تھی۔ یہاں اشجار پر پتوں نے مختلف رنگوں کی اوڑھنیاں اوڑھ رکھی تھیں۔ کوئی زرد، کوئی سواری، کوئی عنابی، کوئی قرمزی تو کوئی نارنجی رنگ پہنے پت جھڑ کے موسم کو بھی ایک رعنائی اور دلکشی عطا کر رہے تھے۔

فاروق وہیں ایک پتھر پر ٹک گئے۔ ان کی نظروں کے سامنے نیلگوں شفاف پانی کی وہ جھیل تھی جس کا پانی منجمد ہوتا جا رہا تھا۔ جس کے کنارے تانبے کے رنگ سے پتوں نے ایک آگ سی دہکائی ہوئی تھی۔ وہ طلسم میں گرفتار گھنٹوں وہیں بیٹھے رہتے۔ "جب خزاں اتنی خوبصورت ہے تو بہار کیسی ہوگی۔" وہ اس یخ بستہ جھیل اور اس کے کنارے پت جھڑ کے رنگوں کی بہار دیکھ کر سوچتے، پھر وہ غور سے ان جھاڑیوں اور درختوں کو دیکھنے لگے۔

"مختلف رنگوں کے پیراہن تبدیل کر کے یہ پتے درختوں کے گو ہاتھ سے ہاتھ چھڑا کر بے سمت کہیں گر پڑیں گے۔ ہوا اپنے دامن میں انہیں سمیٹے کسی انجان سفر پہ لے جائے گی، میری طرح۔ میں بھی تو یونہی اجاڑ راستوں اور خاموش تنہائیوں کے ساتھ بھٹک رہا ہوں۔"

وہ آج پھر خود ترسی اور خود فراموشی میں مبتلا ہو رہے تھے۔

واپسی کا سفر بہت اداس اور تھکا دینے والا تھا۔ گھر جا کر انہوں نے اپنے لیے کافی بنائی اور گھونٹ گھونٹ پینے لگے۔ آج دل کا درد کچھ سوا تھا۔ آج سعدیہ کی یاد بہت آ رہی تھی۔ وہ اسی ملک اسی شہر میں ہے جن ہواؤں میں وہ سانس لیتی ہے، میں بھی انہی میں لیتا

ہوں، جس نیلے فلک تلے وہ روز و شب گزار رہی ہے، میں بھی اسی مہربان سائے میں ہوں، پھر کیا بات ہے کہ ہواؤں نے نہ اس کی خوشبو مجھ تک پہنچائی، نہ میری خوشبو اس تک۔

کون جانے وہ کہاں، کس حال میں ہو گی؟ یقیناً اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ایک خوش و خرم، بھرپور زندگی گزار رہی ہوگی۔ اپنا ایک کلاس فیلو، محض ایک نام کی صورت یاد ہو، تو ہو اور بس۔ عمر کے کسی موڑ پر اگر ملاقات ہو بھی گئی تو میرے پاس کہنے کے لیے چاہے بہت کچھ ہو مگر اسے یہ سب سننے کا اختیار اور فرصت کہاں ہوگی۔ وہ قیاس آرائیوں کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ باہر قطرہ قطرہ رات بھیگتی جا رہی تھی، اور وہ سوچ کی گہرائیوں میں ڈوبتے ابھرتے جا رہے تھے۔

زندگی کتنی عجیب ہے، یا شاید ہم انسان ہی عجیب ہوتے ہیں۔ محبت اور یاد کی ڈور سے خود کو باندھ لیتے ہیں۔ اس کی قید میں رہیں تو بے چین، بے قرار مگر قید سے رہائی بھی گوارا نہیں۔ وہ بے بسی سے مسکرا دیے۔ بہنوں اور بھابھیوں نے کیسی کیسی لڑکیاں نہ دکھائیں، اعلا تعلیم یافتہ بھی، سادہ گھریلو بھی، بہت خوب صورت، شوخ و چنچل بھی اور سیدھی سادی قبول صورت بھی۔

"کسی کو تو پسند کر لو شادی کے لیے۔ یوں اکیلے کیسے اور کب تک زندگی گزارو گے۔ لوگ ہمیں نام دھریں گے کہ ماں، باپ نہیں رہے تو بہنیں، بھابھیاں اپنی اپنی زندگیوں میں مگن ہو کر چھوٹے بھائی کو بھول گئیں۔"

"کچھ تو بتاؤ میرے بھائی! کیسی لڑکی چاہیے تمہیں؟ کوئی پسند ہے تو بتا دو ہم رشتہ لے کر چلے جائیں گے۔"

بڑی آپا سمجھاتے سمجھاتے منتوں پر اتر آتیں اور فاروق ایک مسکراہٹ سے انہیں ٹال دیتے۔

چند سال یونہی گزرے تھے پھر ایک روز زوار انہیں ملا۔ دور طالب علمی کی اور یونیورسٹی کی کتنی ہی یادیں اور باتیں تازہ ہو گئیں۔ بہت سے ساتھیوں کے بارے میں بتاتے بتاتے اس نے سعدیہ کا ذکر بھی کیا۔

"وہ تو کینیڈا چلی گئی ہے۔" سرسری سا فقط ایک جملہ کہہ کر وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ فاروق منتظر ہی رہے کہ وہ سعدیہ کے بارے میں کچھ اور بتائے مگر انتظار، انتظار ہی رہا۔ زوار چلا گیا اور وہ ادھوری باتوں کو خود ہی معنی پہناتے رہے، مگر خود سے اخذ کیا گیا مطلب اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا ہی تھا۔

گھر والوں کے تقاضے بڑھتے جا رہے تھے۔ بالآخر آپا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"بس بہت ہو گئی تمہاری من مانی۔ میں نے لڑکی فائنل کر دی ہے تمہارے لیے۔ اب میں کوئی بات نہیں سنوں گی۔"

"ارے آپا! میری پیاری آپا! یہ کیا غضب کر رہی ہیں آپ؟" وہ سچ مچ بوکھلا گئے۔

"بات کیا ہے آخر؟" انہوں نے کڑے تیوروں سے اپنے راج دلارے بھائی کو گھورا، جو ان سمیت سب کو ہی بے حد عزیز تھا۔

"بات یہ ہے آپا کہ۔۔۔" وہ ہچکچاتے ہوئے شروع ہوئے۔

"کوئی انقلابی یا طوفانی قسم کا عشق نہیں ہے مگر بس، کسی اور کے لیے ابھی دل نہیں مانتا، آپ پلیز تھوڑا انتظار کریں، جب میں یہ سمجھوں گا کہ مجھے کسی سے بھی شادی کر لینی چاہیے، میں خود ہی بتا دوں گا۔" حال دل مختصراً بتا کر وہ آخر میں ملتجیانہ سے لہجے میں بولے۔

"جب کسی سے کچھ کہا نہیں، سنا نہیں، تو یوں جوگ لینے کا کیا مطلب؟" آپا نے اعتراض اٹھایا۔

"جوگ بجوگ کیسا آپا! بس شاید کسی معجزے کا انتظار ہے، اگر ہو گیا تو ٹھیک؟ نہیں ہوا تو میرا نصیب۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیے۔

آپا خاموش ہو گئیں اور فاروق جو کسی معجزے کے انتظار میں شب و روز گزار رہے تھے، ایک روز دلبرداشتہ ہو کر کینیڈا پہنچ گئے۔ ملازمت کے سلسلے میں انہیں کینیڈا جانے کی پیش کش ہوئی تو انہوں نے وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔

"شادی کر کے چلے جاؤ فاروق! کیا بڑھاپے میں سہرے کے پھول کھلاؤ گے؟" آپا نے ایک بار پھر اصرار کیا۔

بہنیں اور بھابھیاں پھر لڑکی کی تلاش مہم پر نکلنے کو تیار تھیں مگر انہوں نے اس بار بھی دامن بچا لیا۔

"تھوڑا سا وقت اور دے دیں آپا! کیا خبر وہاں جانا ہی کسی معجزے کی شروعات ہو۔" ان کی آنکھوں میں امید کی جوت جگمگا رہی تھی۔

"سعدیہ وہاں ہوئی تو تمہارا کیا خیال ہے تمہارا انتظار کر رہی ہوگی؟ وہ وہاں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوگی۔ کیا ضرورت ہے کسی سراب کے پیچھے بھاگنے کی۔" آپا نے انہیں حقیقت کا آئینہ دکھانے کی کوشش کی۔

"میں تو بس اک خواب کے پیچھے ہوں، تعبیر ملے نہ ملے۔ چلیں، کبھی ملاقات ہوئی تو اپنے رقیب کو ہی دیکھ لیں گے، ہم سے بہتر کوئی ملا ہے یا نہیں۔" وہ مسکرائے۔

"پاگل ہو بالکل۔"

"جبھی کبھی مجھے بھی یہی لگتا ہے۔" انہوں نے بڑی خندہ پیشانی سے تسلیم کیا۔

✡ ✡ ✡

پھر وہ کینیڈا آ گئے۔ وقت گزرتا رہا اور موسم کوئی بھی ہو، سعدیہ کے خیال اور یادوں سے دل کا دامن کبھی خالی نہیں رہا۔ مگر اب کبھی کبھی انہیں لگتا کہ وہ تھک گئے ہیں، اسے یاد کرتے کرتے، اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے۔ ان پر مایوسی طاری ہونے لگی تھی۔

"شاید ہمارے مقدر کے ستارے الگ الگ ہی ہوتے ہیں۔ ان کا ملاپ آسمانوں میں کہیں لکھا نہیں تو بھلا تقدیر سے کون لڑ سکتا ہے۔"

"پھر وہ خواب!" ان کے دل نے بے حد اداسی سے پوچھا۔

"اک اک کر کے وہ بھی مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں جیسے شجر سے گرتے برگ۔" انہیں ایملی ڈکنسن کی ایک نظم کی چند لائنیں یاد آ رہی تھیں۔

"میرا دل زرد رو گداس اور تنہا ہے
کیوں کہ خزاں کے زرد پتوں کی طرح
میرے دل کے خواب بھی رخصت ہو چکے ہیں۔"

رات کو وہ سونے کے لیے لیٹے تو دیر تک کروٹیں بدلنے پر بھی نیند نہیں آئی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور سگریٹ سلگا لی۔

"تو زندگی اب ایک نئے موڑ پر گامزن ہونے کو ہے۔" انہوں نے فضا میں پھیلتے دھوئیں کو غور سے دیکھا۔

آپا کا فون آیا تھا۔

"ایک آدھ مہینے میں تمہارے لیے لڑکی فائنل کرنے والی ہوں میں، اور اب کوئی عذر، کوئی بہانہ نہیں سنوں گی۔ ان کی دھمکی، فیصلے میں بڑا مان اور محبت تھی۔ وہ بے بس ہو گئے، ویسے بھی ان کے اختیار میں تھا ہی کیا۔

"شاید آپا ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ ایک سراب نما خواب کے پیچھے بھاگنا کب تک؟" انہوں نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسلا۔

فاروق ہمدانی نے اپنے خوابوں کے سفر سے واپسی کا قصد کر لیا تھا تو اچانک ہی اک روز وہ گروسری اسٹور میں نظر آ گئی۔

"شاید یہ میرا وہم ہے یا تصور!" فاروق نے آنکھیں جھپک کر اس طرف دیکھا، جہاں وہ شیلف کے ساتھ کھڑی تھی۔ گزرے بارہ سالوں کے سارے موسم اسے بس چھو کر گزر گئے تھے، کسی خاص تغیر اور تبدیلی کے بغیر وہ اب بھی ویسی ہی موہنی اور دلکش تھی جیسی یونیورسٹی کے دنوں میں ہوا کرتی تھی۔ اسے دیکھتے دیکھتے فاروق بے اختیار اسی طرف بڑھ گئے۔

"سعدیہ خان!" اس کے سامنے کھڑے ہو کر فاروق نے بے حد یقین سے اسے مخاطب کیا، وہ چونک

پڑی۔ چند لمحے وہ خاموشی سے فاروق کو دیکھتے چلی گئی' پھر یکایک مسکرادی۔

"فاروق ہمدانی!"

"پہچان لیا؟" فاروق کو ایک ناقابل بیان مسرت نے آن گھیرا۔

"آپ نے بھی تو مجھے پہچان لیا اتنے سالوں بعد۔" سعدیہ کی مسکراہٹ آج بھی ویسی ہی مدھر تھی۔

"میں نے نہ پہچانتا۔ میں تو۔" فاروق کچھ بولتے بولتے یکدم سنبھل گئے۔

"اکیلی آئی ہیں؟" انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"ہاں کچھ ضروری پیپرز لینے تھے اس لیے میں اکیلی ہی آگئی۔" وہ شیلف سے کچھ سامان ٹرالی میں ڈالنے لگی۔

"اتنے سالوں بعد یوں ملاقات' کیسا حیرت انگیز اتفاق ہے۔ ہے نا۔" سعدیہ کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انہوں نے یونہی کہا۔

"معجزے اسی دنیا میں ہوا کرتے ہیں۔" سعدیہ کا جواب مختصر تھا مگر معنی خیز۔ فاروق کچھ ٹھٹک سے گئے۔

"اور کچھ بتایئے اپنے بارے میں۔ گزرے بارہ سالوں کی کیا کہانی رہی؟" فاروق نے بے تابی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔

"بارہ سالوں کی کہانی بارہ منٹوں میں کیسے سنائی جاسکتی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"آپ بتایئے! اپنے بارے میں۔" سعدیہ نے بھی یہی سوال کردیا۔

"چار سال ہوگئے یہاں آئے ہوئے۔ باقی وہی صبح شام کے چکر ہیں۔ روزگار کے کولہو میں پس کر زندگی تمام ہورہی ہے۔" فاروق نے دریا کو کوزے میں بند کردیا۔

"اگر تمہیں دیر نہ ہو رہی ہو تو ایک ایک کافی کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"چلیں۔" چند لمحے سوچنے کے بعد سعدیہ نے ہامی بھری۔

سامان گاڑی میں رکھ کر دونوں سامنے ہی واقع کافی شاپ میں جا بیٹھے۔ دونوں کی گفتگو کا موضوع یونیورسٹی کے بیتے ہوئے خوبصورت دن تھے اور پیارے دوست احباب اور ساتھی۔ سعدیہ سب کے بارے میں پوچھ رہی تھی اور فاروق اپنی یادداشت کھنگال کھنگال کر دستیاب معلومات فراہم کررہے تھے۔

"آپ کے گھر والے تو پریشان نہیں ہوں گے۔ بہت دیر ہوگئی نا؟" فاروق نے اچانک گھڑی دیکھی۔

"میرے گھر والے کہیں نہیں وہ قطعی پریشان نہیں ہوں گے۔" سعدیہ نے بے حد اطمینان سے جواب دیا۔

"اور آپ کے گھر والے؟"

"گھر میں کوئی ہوگا تو پریشان ہوگا' فی الحال تو میں اکیلا ہوں۔" فاروق مسکرائے۔

"آپ کی مسز اور بچے؟" سعدیہ نے جھجکتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

"ابھی تک تو میری مسز دریافت نہیں ہوئیں لہٰذا۔۔۔" فاروق نے جملہ ادھورا چھوڑا۔

"کیا مطلب' آپ نے شادی نہیں کی ابھی تک؟" سعدیہ نے چونک کر فاروق کو دیکھا۔

"ہاں ہاں!" فاروق نے ہنسی میں سرہلایا اور سعدیہ کی حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے۔

"تم ملوانا کسی روز اپنے شوہر سے۔"

"اگر میری ملاقات ہوگئی ان سے' تو آپ کو ضرور ملواؤں گی۔" سعدیہ نے بے ساختہ اٹھ آنے والی مسکراہٹ کو لبوں میں دبایا۔

"کیا مطلب' تمہاری شادی۔۔۔؟"

"میں یہاں بھائی بھابھی کے ساتھ رہتی ہوں۔ سات سال ہوگئے ہیں ہمیں یہاں آئے ہوئے۔" سعدیہ نے ایک گہری سانس لی۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا۔

"اگر برا نہ مانیں تو ایک ذاتی سوال کرلوں؟" خاموشی توڑنے میں سعدیہ نے ہی پہل کی۔

"مجھے خوشی ہوگی۔" فاروق کے لبوں کو مسکراہٹ نے چھوا۔

"آپ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"ایک لڑکی تھی جو دل میں بس گئی تھی' اس کے بعد دل کو کوئی اور جچا ہی نہیں۔" فاروق ہمدانی ذرا سنجیدہ ہوگئے۔

"وہ کون لڑکی تھی؟" سعدیہ کا سوال بے اختیاری اور انداز اضطراری تھا۔

"وہاں تو بے مرتبہ ملاپ ابھی ادھورا ہے۔" فاروق نے بے حد جرأت کا مظاہرہ کیا۔

"اگر اب نہیں تو پھر شاید کبھی نہیں۔" انہوں نے بے اختیار پہلو بدلا۔

"اور اگر یہی سوال میں پوچھوں تو؟" فاروق نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"میری شادی! میں شادی کیسے کرلیتی۔ جس کی آنکھوں میں کبھی اپنی تصویر نظر آئی تھی' اس نے نہ اظہار کیا نہ پروپوز۔"

سعدیہ کا جواب ان کی توقع کے بالکل خلاف تھا۔ وہ شاکڈ رہ گئے۔ کچھ دیر تک تو ان کے منہ سے ایک بھی لفظ نہیں نکلا۔

"بابا کے انتقال کے بعد امی کی شدید خواہش تھی کہ اپنی زندگی میں میرا گھر بستا ہوا دیکھ لیں مگر جانے کیا بات تھی' نصیب کا پھیر کہ کئی جگہوں پر بات بنتے بنتے بگڑ جاتی' پھر امی بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ میرے لیے پھر دنیا میں جیسے کچھ بچا ہی نہیں۔ بھائی بھابھی کینیڈا شفٹ ہورہے تھے' مجھے بھی ساتھ لے آئے' بے چارے دونوں میرے لیے کوشش کرتے رہتے ہیں مگر ابھی تک ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔" وہ ہولے ہولے مزید بتا رہی تھی۔

"آؤ میں تمہیں گھر چھوڑ دوں۔" کافی کے پیسے ادا کرکے وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں تو واک کرتے ہوئے آگئی تھی' پندرہ بیس منٹ کا راستہ ہے' پیدل سفر کا بھی اپنا ہی مزا ہے۔ راستوں سے شناسائی کا احساس گہرا ہوجاتا ہے۔"

"تم آج بھی ورڈز ورتھ کی دیوانی ہو۔" فاروق ہنس پڑے۔

"میں آج بھی فطرت اور رنگینیوں کی دیوانی ہوں۔" چلتے چلتے سعدیہ نے راہ میں ایستادہ ان خاموش اور تناور درختوں کو دیکھا' جو اپنے زرد پتوں سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بیک وقت خوش بھی تھے اور اداس بھی۔ اداس اپنی شاخوں کو تنہا چھوڑ جانے والے پتوں کے لیے بھی اور خوشی اس بات کی' کہ انہی زرد پتوں میں بہار کے رنگ اور خوشبو کی آمد چھپی ہوئی تھی۔

اب ان ٹنڈ منڈ شاخوں پر نئے پھول کھلیں گے۔ تر و تازہ برگ و بار سے شاخوں کی یہ خالی بانہیں سج جائیں گی۔ پت جھڑ اب رخصتی کی تیاریوں میں مصروف ہے کہ سامنے بہار کھڑی مسکرا رہی ہے۔

سعدیہ کی ہمراہی میں قدم بڑھاتے ہوئے فاروق کچھ سوچ کر مسکرادیے۔

"اندر آیئے نا بھابھی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ دیار غیر میں کوئی اپنا مل جائے تو مجھ سے زیادہ وہ خوش ہوتی ہیں۔" گھر پہنچ کر سعدیہ نے اصرار کیا۔

بھابھی ان سے مل کر اور وہ بھابھی سے مل کر واقعی بہت خوش ہوئے۔ بھیا کسی کام سے گئے ہوئے تھے' ان کی واپسی تین چار گھنٹے سے پہلے متوقع نہیں تھی۔ بہت ہی اچھی خاطر داری کا ذائقہ لبوں پر اور اپنائیت کا احساس دل میں لیے وہ وہاں سے نکلے تو بہت خوش تھے اور کیوں نہ ہوتے' برسوں کے انتظار کے بعد بالآخر وہ معجزہ ہو ہی گیا تھا جس کی وہ آس لگائے بیٹھے تھے۔

وہ یہاں سے جا رہے تھے مگر دوبارہ آنے کے لیے اور سعدیہ کو اپنی زندگی میں شامل کرنے کے لیے کہ ہجر کی خزاں میں ملن کی جس بہار کی امید تھی' وہ بہار آنے کو تھی۔ پت جھڑ نے اپنے پنکھ سمیٹنے شروع کردیے تھے کہ بہار اس کی جگہ لینے کی منتظر تھی۔

☆

راحت جبیں

ساری بھول ہماری تھی

ناولٹ

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں۔ مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جٹھانی اپنے بچوں نعمان، ثوبان، فرید، فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں۔ بانو اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں۔ عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ، عادلہ اور حمیدہ کی نند ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال۔ جمال ملک سے باہر مگر اس کی بد مزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابرار جمیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے، باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چاچی کبریٰ کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ پڑواتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشریٰ کی ابرار سے شادی ہو جائے۔ مگر ابرار صاف انکار کر دیتا ہے۔ اصغر کو غصہ آتا ہے وہ ابرار پر ہاتھ اٹھا دیتا ہے۔ ابرار ناراض ہو کر چھوڑ دیتا ہے اور شہر آجاتا ہے۔

طیبہ کی مسلسل بدتمیزی سے عاجز آکر نبیلہ جمال سے طیبہ کو ساتھ لے جانے کا کہہ دیتی ہیں۔ نبیلہ محسن کے لیے ... کا رشتہ مانگتی ہیں۔ حمیداں کے اعتراض کے باوجود رشتہ پکا ہو جاتا ہے۔

نعمان اپنے اسٹور سے سودا لینے والے ماسٹر صاحب کی بیٹی عائشہ کو پسند کرنے لگتا ہے۔ وہ گورنمنٹ ٹیچر ہے۔ نعمان عائشہ کی ماں سے رشتے کی بات کرتا ہے اور ان سے فاطمہ کی شادی تک انتظار کرنے کو کہتا ہے کیونکہ حمیداں کا ... بیٹیوں سے پہلے بیٹوں کی شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا۔ عائشہ اور اس کے گھر والے تھوڑی سی حیل حجت کے بعد مان جاتے ہیں۔

... نبیلہ کے کہنے پر بچت کر کے عریشہ کے لیے سونے کا سیٹ بنواتی ہیں۔ عادلہ کے منع کرنے کے باوجود عریشہ ... کو وہ سیٹ دکھا دیتی ہے۔ حمیداں کی عریشہ سے لگاوٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۳ تیسری قسط

حمیداں کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ جو کچھ دیکھا تھا، کسی صورت قابل قبول نہیں تھا۔ نعمان اپنی دھن میں سرشار آگے چلا گیا تھا، انہیں لگا ... دور نہیں جا رہا، ان کے ہاتھوں سے نکل رہا ہے ... انہوں نے شرربار نگاہوں سے ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف دیکھا۔ دل میں ابلتے غبار پر قابو پانا ان کی فطرت نہ تھی۔ مگر بروقت عقل نے ہاتھ تھام لیا ... تب ہی کچھ سوچ کر خاموشی سے گھر آگئیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ یتیم خانہ ہے نہ مسافر خانہ۔ کہاں ٹھہرے گا، جگہ ہے اس ڈبے جیسے گھر میں؟"

حمیداں کی پاٹ دار آواز ڈیوڑھی میں گونج رہی تھی۔ عریشہ نے ذرا سا جھانک کر دیکھا۔ تایا اور تائی دونوں چونچیں لڑا رہے تھے۔ تایا نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے۔

"یا اللہ! اس عورت کو سب کچھ دیا تھا۔ ایک زبان نہ دیتا تو کیا ہو جاتا۔"

"اب کاٹ دو ... تمہاری بھی تو زبان کی جگہ تلوار ہی فٹ ہے۔"

"اب وہ رات کو آگیا تھا تو میں کیا گھر سے نکال دیتا۔ میری سگی، چچا زاد بہن کا بیٹا ہے۔"

"ساری زندگی تو اس بہن کا نام نہیں سنا، اب یہ بیٹا ٹپک گیا ... عادلہ کی طرف بھجوا دو ... ادھر کمرے ...

"کیسے بھجوا دوں، گھر میں مرد نہیں، جوان لڑکی۔" وہ بڑبڑائے۔

"میرے گھر میں دو دو جوان لڑکیاں ہیں۔ بڑھاپے میں تمہارا دماغ بالکل ہی کھسک گیا ہے۔"

"ہاں تو تو ابھی بھی سولہ سال کی چھمک چھلو ہے۔ کہہ دیا میں نے اب آگیا ہے تو یہیں رہے گا۔" تایا نے دوٹوک لہجے میں کہا۔ ایسا لہجہ جس کے بعد حمیداں کی بولتی بند ہو جاتی تھی۔

عریشہ کچھ سمجھی، کچھ نہ سمجھی۔ بس خاموشی سے کھسک لی۔ دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئی۔ کمرا خالی تھا، باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ وہ رائٹنگ ٹیبل کے پاس آگئی۔ کمپیوٹر کے پاس رکھے جرنل کے صفحات ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ عریشہ کو شرارت سوجھی۔ اس نے ہولڈر سے پین نکالا اور نچلا لب دباتے ہوئے لکھنے لگی۔ لکھ کر پین درمیان میں رکھ کر جرنل بند کر دیا۔ کچھ دیر کمپیوٹر کو چھیڑتی رہی پھر اکتا کر واش روم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ غالباً ثوبان نہا رہا تھا اور وہ نہانے میں کتنی دیر لگاتا ہے، عریشہ اچھی طرح جانتی تھی تب ہی مایوس ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

پانچ منٹ کے بعد ابرار تولیے سے سر رگڑتا باہر نکلا۔ نہا کر طبیعت ہلکی پھلکی ہو گئی تھی، ورنہ پوری رات طبیعت بے چین اور سر بوجھل رہا۔ بار بار ایک ہی سوال بے چین کر رہا تھا۔ وہ جس طرح وہاں سے نکلا ... جس طرح ماں کو تنہا چھوڑ آیا تھا۔ کیا وہ ٹھیک تھا۔ دل بے چین تھا مگر دماغ کہتا تھا یہی وقت کا تقاضا تھا۔

اس نے تولیہ کرسی پر پھیلایا۔ بال بنا کر کمپیوٹر کے سامنے آبیٹھا۔ اسے ایڈمیشن کے سلسلے میں مختلف کالجز اور یونیورسٹی کی معلومات درکار تھیں۔ اس نے کمپیوٹر آن کیا اور سامنے پڑا جرنل کھولا تو چونک گیا۔

"جب بات نہیں ہوتی کسی دن جانم
ایسے چپ چاپ گزرتا ہے یہ سنسان سا دن
ایک سیدھی سی بڑی لمبی سڑک پر جیسے
ساتھ چلتا ہوا روٹھا ہوا ساتھی کوئی
منہ پھلائے ہوئے ناراض سا، خاموش، اداس
اور جب ملتا ہوں ہنس پڑتا ہے یہ روٹھا دن
گدگدا کر مجھے کہتا ہے "کہو کیسے ہو؟"

ثوبان عجلت میں اندر آیا۔

"ابرار! پھر میرے ساتھ چل رہے ہو؟" ابرار نے چونک کر ثوبان کو دیکھا

"جی میں آپ کے ساتھ ہی چل رہا ہوں۔" وہ کھڑا ہوا پھر مسکرا کر رک گیا۔

"لیکن پہلے کسی کو اپنا حال تو بتا دیں ..."

اپنی چیزیں اٹھاتے ہوئے ثوبان نے اسے دیکھا۔ ابرار نے شرارت سے جرنل پر انگلی بجائی۔

"یقیناً" یہ نظم میرے لیے نہیں ہے۔ مجھے تو یہاں آئے ایک ہی رات ہوئی ہے اور پہلے یہ نظم یہاں نہیں تھی۔"

ثوبان نے آگے بڑھ کر وہ نظم کو پڑھی اور مسکرا دیا۔

"ہاں ہے اک خبطی سی لڑکی۔"

"صرف آپ کے لیے خبطی ہے یا آپ بھی ہیں؟"

ثوبان نے بھنویں اچکا کر اسے دیکھا تو اس نے معذرت خواہ انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔

"سوری! میں کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گیا۔"

"تمہاری زندگی میں کوئی لڑکی ہے؟" ثوبان اپنا جواب گول کر گیا۔

"چھوڑیں ثوبان بھائی ابھی تو غم روزگار میں الجھنے کے دن ہیں۔" ابرار نے جھینپ کر سر جھٹکا ثوبان بے ساختہ ہنسا۔

"چلو پھر نکلتے ہیں۔"

ابرار نے جرنل بند کیا۔ دونوں ایک ساتھ باہر نکل گئے۔

☆ ☆ ☆

برکت حسین وضو کر کے باہر نکلے تو چارپائی پر لیٹی حمیداں کو دیکھ کر ذرا سے چونک گئے۔ وہ صحن میں بچھی چارپائی پر منہ پر دوپٹہ ڈالے لیٹی تھیں۔

"مریم ... مریم!"

مریم اندر سے دوپٹہ سر پر لیتی تیزی سے نکلی۔ "جی ابا!"

"یہ اپنی ماں کو دیکھنا ... زندہ تو ہے۔" وہ آستین نیچی کرتے عام سے انداز میں بولے۔

"جی ..." مریم ہکا بکا ان کا منہ دیکھنے لگی۔

"کافی دیر سے اس کی آواز نہیں سنی۔ اس لیے پوچھ رہا ہوں۔" وضاحت کی گئی۔

مریم مسکراہٹ دباتی دوبارہ اندر گھس گئی۔ حمیداں بیگم دوپٹے کے نیچے کچھ بڑبڑائی ہوں تو بظاہر ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ برکت حسین کو تشویش ہونے لگی۔ تب ہی پاس آکر پوچھنے لگے۔

"تیری کیا قینچی گم ہو گئی ہے؟"

"گم کہاں ہونی ہے مشین میں پڑی ہو گی۔" حمیداں سمجھ تو گئیں، مگر آج کچھ اور ہی موڈ میں تھیں۔

"میں نے کہا طبیعت تو ٹھیک ہے۔" وہ کچھ اور بے چین ہو گئے۔ حمیداں نے منہ سے دوپٹہ ہٹا کر خشمگیں نگاہ سے شوہر کو گھورا۔

"میں نے کہا برکت حسین جا۔۔۔ مسجد جا کے اللہ کے سامنے معافی مانگ۔۔۔ تیرے بھی کوئی گناہ بخشے جائیں۔"

"جا رہا ہوں۔ تجھے میرے گناہوں کی بڑی فکر ہے۔ شوہر کے آگے زبان چلانے والی عورت جہنمی ہوتی ہے۔"

حمیداں نے دوبارہ پلّو منہ پر ڈال لیا۔ وہ بڑبڑاتے چلے گئے۔ اوپر سے ابرار سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا۔ حمیداں اس کی آہٹ پر بدک کر اٹھیں۔

"کہیں جا رہے ہو؟"

"جی۔" ابرار کو حمیداں اور کبریٰ کے رویے میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ ان کو اس کا یہاں رکنا برا لگا ہے مگر کچھ عرصہ تک رہنا ابرار کی مجبوری تھی۔

"یہ بچے بیس روپے کا دہی بھی لا دے۔" حمیداں نے پلّو سے پیسے کھول کر اسے تھمائے۔

"جی۔۔۔؟"

"ٹھہر جا کٹوری لا کر دیتی ہوں۔" وہ بھاری وجود سنبھالتے اٹھیں۔ کچن سے لا کر کٹوری بھی اسے تھما دی۔ وہ بے چارہ جزبز ہو کر مڑا گلی میں کھیلتے بچے کو بھیج کر دہی منگوائی۔ واپس آیا تو حمیداں نہیں تھی۔

"مامی!" اس نے صحن ہی سے آواز دی اندر جانا مناسب نہ سمجھا کٹوری چارپائی پر رکھنے کا سوچا تو دیوار پر بیٹھی بلی کو دیکھ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

"مامی، یہ دہی۔۔۔"

اندر سے عرشہ نکلی۔ اجنبی صورت کو صحن میں کھڑے دیکھ کر ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"کیا بات ہے۔"

"مامی نے دہی منگوایا تھا۔"

"تو اندر آنے کی کیا ضرورت تھی، دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتے تھے۔" شہابی رنگت والی لڑکی نے تنک کر کہا۔ ابرار کو اس کے لہجے پر تاؤ ہی آ گیا۔ اس نے کٹوری چارپائی پر پٹخی۔

"مامی کو دے دیجیے گا۔" کہہ کر باہر نکل گیا۔

"ارے، کس قدر بدتمیز لڑکا تھا۔" وہ بڑبڑاتی کٹوری اٹھا کر کچن میں رکھ آئی۔ اندر فاطمہ نماز پڑھ رہی تھی۔ مریم نے واک مین کانوں سے لگایا تھا۔

"کچھ فاطمہ آپی سے ہی سیکھ لو، یہ تو چلی جائیں گی تمہارا کیا بنے گا۔" عرشہ نے واک مین کھینچا۔

"وہی جو تمہارا بنے گا۔" مریم نے دوبارہ واک مین پکڑا۔

"مریم! میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔"

"اوکے، چھت پر چلتے ہیں۔۔۔" مریم فوراً اٹھی۔

☼ ☼ ☼

نبیلہ شادی کی تاریخ طے کرنے آئی تھیں۔ حسب عادت حمیداں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"اتنی جلدی ہماری تو ابھی تیاری ہی نہیں۔"

"تیاری کیا کرنی ہے گھر کی بات ہے۔ میں یوں بھی اپنے بھائی پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی۔ جہیز کی تو ضرورت ہی نہیں۔ گھر میں جو کچھ ہے، انہی نے استعمال کرنا ہے۔"

"پھر بھی اب خالی ہاتھ تو لڑکی کو نہیں بھیجیں گے۔"

"ہاں تو کپڑا لتا بنا لو۔۔۔ بس اتنے دنوں میں اتنا تو ہو ہی جائے گا۔"

"ہاں ہاں۔۔۔" برکت حسین نے فوراً "ہاں" میں ہاں ملائی۔ "ٹھیک کہہ رہی ہے نبیلہ! ہم نے کون سا دھوم دھڑکا کرنا ہے۔ سادگی سے نکاح اور رخصتی کر دیں۔۔۔ یہی سنت ہے۔"

حمیداں نے کھا جانے والی نظروں سے شوہر کو دیکھا۔

"آپ کیوں فکر کر رہی ہیں بھابھی! ان شاء اللہ سب کچھ ہو جائے گا۔ آپ بس بسم اللہ کر کے تاریخ دے دیں۔" عادلہ نے رسانیت سے کہا۔

"ارے میں تین کپڑوں میں لڑکی کیسے رخصت کر دوں۔"

"اس کی الٹی کھوپڑی ہے۔ اچھا بھلا خرچہ بچ رہا ہے یہ ہے کہ۔۔۔"

برکت حسین دل ہی دل میں تلملا کر رہ گئے۔

"جمال آ رہا ہے، واپسی پر طیبہ اس کے ساتھ چلی جائے گی۔ اس لیے میں چاہتی ہوں یہ شادی ان کی موجودگی میں ہو جائے، پھر نجانے کب ان کا آنا ہو، میں بھی گھر میں اکیلی رہتی ہوں محسن تو سارا دن آفس میں ہوتا ہے۔"

"ہاں تو بس ٹھیک ہے۔ جب تمہیں مناسب لگے بارات لے آنا، بعد میں بھلے ولیمہ دھوم دھام سے کر لینا۔ یہی سنت ہے۔"

برکت صاحب نے آرام سے بات ختم کر دی۔

"چلیں، اللہ مبارک کرے۔ میں مٹھائی لے کر آتی ہوں۔" عادلہ مسکراتی ہوئی اٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں شادی کی تیاریاں کیا شروع ہوئیں۔ حمیداں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ "کیا ہو گا، کیسے ہو گا۔۔۔" آتے جاتے نعمان سے جھگڑا کہ "پیسے اور دو۔"

وہ جھنجلا گیا۔

"میں کہاں سے لاؤں اتنے روپے۔ ذرا ہاتھ روک کر خرچ کریں۔"

"کیسے ہاتھ روکوں، مہنگائی دیکھی ہے۔ تم تو چاہتے ہو، بہن کو شربت کے پیالے پر رخصت کر دو۔" وہ

"جتنا بس میں ہو، اتنا کریں نا۔ پھپھو بار بار کہہ رہی ہیں کہ کچھ نہیں کرنا، فرنیچر کراکری سب کچھ ہے تو پھر کیا ضرورت ہے۔"

"یہ عورت ہم سب کو کنگال کرے گی۔ احمق! فاطمہ میری بہن کے گھر جا رہی ہے۔ تیرے کنگلے خاندان میں نہیں، جو اس طرح پاگل ہو رہی ہے۔"

برکت حسین نے للکارا۔

"ہاں پاگل ہو رہی ہوں۔ تیری اولاد کے لیے کر رہی ہوں۔ یہی پھپھو کل کو ساس بن کر طعنے دے گی کہ بھتیجی خالی ہاتھ آ گئی۔"

"اماں! تمہیں تو عادت ہو گئی ہے، ہر بات کو بڑھا چڑھا کر کرنے کی۔ کھانا جتنا ہو سکے گا، کر دیں گے۔" نعمان نے جھنجلا کر بات ختم کرنے کی سعی کی۔

"پتا ہے مجھے جو مروڑ تیرے دل میں اٹھ رہے ہیں۔۔۔ اس کی [illegible] خرچ کرتے جان نکل رہی ہے۔۔۔ [illegible] چا کر رکھ رہا ہے؟"

"کہاں سے [illegible] جو کما رہا ہوں گھر میں ہی لا رہا ہوں۔۔۔ پر یہاں کسی کو کیا قدر۔۔۔ بس نوٹوں کی گڈیاں پکڑاتے رہو، سب راضی۔۔۔ ذرا اونچ نیچ ہو جائے تو گلے سے پکڑ لیتے ہیں۔ اس گھر میں بندے کی نہیں، نوٹوں کی قدر ہے۔" وہ غصے سے بولتا باہر نکل گیا۔

"اب خوش ہے۔۔۔" برکت حسین نے طنز سے پوچھا تو وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگیں۔ "سب جانتی ہوں۔۔۔ اس کو پتنگے کیوں لگ رہے ہیں۔ فاطمہ کی شادی ہو جائے تو کرتی ہوں اس کا بھی بندوبست۔"

☼ ☼ ☼

جمیلاں کسل مندی سے منہ پر دوپٹہ ڈالے چارپائی پر لیٹی تھی۔ جب سے ابرار گیا تھا، اس نے گویا ہر کام سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ کرتی بھی تو مارے باندھے۔۔۔ سرِشام جسم بخار زدہ ہو جاتا۔ جوڑوں میں خوامخواہ درد رہنے لگا۔ ابھی چند دن پہلے کیسے گھوڑے کی طرح چاق و چوبند تھی۔ اب جیسے جسم سے ساری توانائی نچڑ گئی ہو۔

کبریٰ نے اسے یوں لیٹے دیکھا تو دودھ کی بالٹیاں زور سے پٹخیں۔

کچھ دیر پہلے جمیلاں اٹھی تھی اور صرف بھینس کا دودھ دوہ کر واپس آ لیٹی۔ بالٹیوں کے کھڑاک پر بھی

جب جمیلاں نے سر نہ اٹھایا تو کبریٰ اس کے سر پر آ کھڑی ہوئی۔

"میں نے کہا' کب تک یہ ناٹک چلے گا..... اس کے دفع ہو جانے سے اس گھر کے کام تو نہیں رکنے لگے۔ میں اکیلی کیا کیا دیکھوں۔"

کبریٰ کی کرخت آواز پر جمیلاں نے دوپٹہ منہ سے ہٹایا۔ اس کی آنکھیں پانیوں سے بھری تھیں۔

"میری طاقت میرا بلو تھا کبریٰ! اسی کے لیے بھاگی پھرتی تھی۔ وہ گیا ہے..... تو لگتا ہے' جسم سے ساری جان نچڑ گئی ہے..... دو پیر چلتی ہوں تو سر چکرانے لگتا ہے۔ اللہ جانے کس حال میں ہو گا..... کہاں رہتا ہو گا' کیا کھاتا ہو گا۔"

"میرے سامنے تو اس حرام خور کا نام نہ لیا کر..... ناں! کیا کمی تھی میری بیٹی میں..... خوب صورت ہے' زمین جائیداد والی ہے..... اسے رشتوں کی کمی نہیں ہے..... وہ تو ہم نے سوچا چلو گھر کا لڑکا ہے' بیٹی بھی نظروں کے سامنے رہے گی..... تمہارا بھی ٹھاہ ٹھکانا بنا رہے گا' پر نہیں۔ عزت راس نہ آئی تم ماں بیٹے کو۔" کبریٰ چمک کر بولی۔

"تیرا طریقہ غلط تھا کبریٰ! میرا پتر جی آن والا ہے۔ نظر جھکا کے چلتا ہے' پر نہیں۔ تو نے تو اسے خریدنا چاہا۔ ان چند روٹیوں کے بدلے' جو وہ اس گھر میں کھاتا رہا۔ اتنا سستا نہیں تھا میرا ابرار....."

"چل..... اب دیکھ لیں گے۔ چار پیسے کے بغیر کون سا تیر مارے گا۔ چار دن میں دھکے کھا کر واپس نہ آیا تو میرا نام بھی کبریٰ نہیں۔ اب اٹھ کر تندور گرم کر..... بہت ہو گیا آرام..... بیٹا بھی ہڈ حرام تھا..... اب ماں بھی....."

وہ بکتی جھکتی اندر چلی گئی۔

"تیری ہی زبان ہے کبریٰ! جس سے بلو بھاگا ہے۔ اب اللہ جانے کہاں دھکے کھاتا ہو گا۔ اللہ کرے اسے برکت بھائی کا گھر مل گیا ہو۔ برسوں سے کوئی خیر خبر نہیں۔ یہ نہ ہو کہ گھر بدل لیا ہو۔" وہ اٹھ کر سست روی سے تندور میں لکڑیاں ڈالنے لگی۔ دھیان سارا بلو کی طرف تھا۔ اصغر نے اس دن سے جمیلاں سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ کبریٰ تو کبریٰ بشریٰ بھی ہر وقت انگارے چباتی۔

"ماسٹر صاحب کی طرف جاؤں گی۔ شاید کوئی فون آیا ہو۔"

اس نے چولہے سے سلگتا اپلا چمٹے سے اٹھا کر تندور میں پھینکا۔

✲ ✲ ✲

"یہ کیا کہہ رہی ہیں بھابھی!" عادلہ ہکا بکا رہ گئیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ حمیداں ان سے ایسی بات کر سکتی ہیں۔

"تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ فاطمہ تمہاری بیٹی نہیں ہے؟" مٹر چھیلتی حمیداں نے لاپروائی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر....." عادلہ ابھی بھی شاک میں تھیں۔

"اگر مگر چھوڑو۔ سیدھی بات کرو۔"

"میں نے وہ عریشہ کے لیے....."

"تو میں کون سا مفت مانگ رہی ہوں بی بی! ادھار مانگ رہی ہوں۔ کل کو عریشہ کی شادی ہو گی تو واپس کر دیں گے..... تب تک ثوبان کی بھی نوکری ہو جائے گی' عریشہ نے کون سا کہاں جانا ہے۔ یہیں رہنا ہے ہمارے پاس۔"

"آپ....." عادلہ بے چین ہو کر کھڑی ہو گئیں۔ "سارے فیصلے خود ہی کرتی جا رہی ہیں۔"

"میں نے کیا الٹا کہہ دیا۔ تم نے بیٹی نہیں بیاہنی' پھر پہلا حق تو ہمارا ہوا نا۔"

"جب وقت آئے گا' دیکھا جائے گا۔"

"استانی صاحبہ! وہ اس خاندان کا خون ہے یہ مت بھولنا' پھر میرے ثوبان میں کمی کیا ہے؟" حمیداں نے تنک کر پوچھا۔

"میں نے کہا نا جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔" عادلہ نے قطعی انداز میں کہا۔ "اور جہاں تک بات ہے زیور کی تو وہ میں نے عریشہ کے لیے بنوایا ہے۔ باقی

میرے لیے' جو مجھ سے بن پڑا..... میں کروں گی۔" مضبوط لہجے میں کہہ کر عادلہ اپنے گھر چلی گئیں۔

حمیداں کو پتنگے لگ گئے۔ سبزی کی ٹوکری ایک طرف پٹخ دی۔ اندر کا ابال اس وقت نکلا جب عریشہ' مریم اور فاطمہ بازار سے آئیں۔

"امی! کیا ہوا ایسے کیوں لیٹی ہیں؟ سبزی بھی نہیں بنائی۔" فاطمہ نے انہیں یوں لیٹے دیکھ کر حیران ہو کر پوچھا۔ حمیداں نے اپنی گیلی آنکھیں دوپٹے سے صاف کیں اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"تائی جان! آپ رو رہی ہیں۔" حیران حیران سی عریشہ ان کے پاس بیٹھی تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔

"ہاں اب میری یہی اوقات ہے کہ تمہاری ماں یوں میری بے عزتی کر جائے۔ وہ پڑھی لکھی عقل مند عورت' میں جاہل ان پڑھ..... میرا اس کا مقابلہ کیا؟"

مریم نے طویل سانس لے کر شاپر اٹھائے اور اندر رکھنے چلی گئی۔ اسے ماں کے واویلے سے کوئی مطلب نہ تھا۔

"پتا تھا کہ بیٹی بیاہنی ہے۔ پر گھر کے خرچوں نے سر ہی کہاں اٹھانے دیا۔"

"آخر ہوا کیا؟ امی نے آپ سے کچھ کہا....." عریشہ ان کے گرد بازو لپیٹ کر پوچھنے لگی۔

"اس نے کیا کہنا ہے' غلطی میری تھی۔ جو اپنا سمجھ کر اس سے مدد مانگنے بیٹھ گئی۔ اتنا ہی تو کہا تھا کہ عریشہ کے لیے بنایا زیور فاطمہ کو دے دو۔ ثوبان نے کہا تھا۔ جب عریشہ کی باری آئے گی تو ہم اتنا ہی بنوا دیں گے۔ بس! ماتھے سے اکھڑ گئی کہ آپ نے یہ بات کی تو کی کیوں؟"

ان کے آنسو عریشہ شرمندہ شرمندہ سی اپنے دوپٹے سے صاف کرنے لگی جبکہ فاطمہ کو ماں کی اس حرکت پر غصہ آ گیا تھا۔

"آپ کو کیا ضرورت تھی چچی سے یہ بات کرنے کی..... جو ہے' جتنا ہے کافی ہے۔ یوں مانگ مانگ کر تو رخصت نہ کریں۔" فاطمہ کو ماں کی حرص و ہوس سے بخوبی آگاہی تھی' تب ہی ان سے الجھنے لگی۔

"فاطمہ آپی! اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ امی کو یوں انکار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ زیور آپ نے پہنا یا میں نے' کیا فرق پڑتا ہے۔" عریشہ نے آہستگی سے کہا۔ اس سے حمیداں کے آنسو برداشت نہیں ہو رہے تھے۔

"عریشہ! یہ بات نہیں ہے۔ چچی نے ہمیشہ ہمارے لیے بہت کیا ہے۔ مگر اس....."

"تو چپ رہ فاطمہ! میری بچی....." حمیداں نے عریشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "آخر اپنا خون اپنا ہی ہوتا ہے..... پر کیا کریں۔ ہمارے نصیب ہی ایسے ہیں۔ نبیلہ ہی سال بھر ٹھہر جاتی تو ہم بھی کچھ نہ کچھ بنا لیتے۔"

"آپ فکر نہ کریں تائی امی! میں امی سے خود بات کروں گی۔ وہ میری بات کبھی نہیں ٹالیں گی۔ آخر وہ زیور میرا ہی ہے۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں عرشی! امی تو خوامخواہ جذباتی ہو رہی ہیں۔ عادلہ چچی نے وہ زیور نہ بنایا ہوتا' تب بھی میری شادی ہونا ہی تھی۔" فاطمہ نے قطعی انداز میں کہا اور باقی شاپنگ بیگ اٹھانے لگی جو مریم چھوڑ گئی تھی..... ساتھ ہی موضوع بدلا۔

"آئیں امی! آپ کو شاپنگ دکھاؤں۔"

"میں گھر جاتی ہوں۔" عریشہ کھڑی ہو گئی۔ حمیداں نے چور نظروں سے فاطمہ کو دیکھا۔ اس کے اندر جانے کے بعد چپکے سے بولیں۔

"تم بات ضرور کرنا۔"

"جی! آپ فکر نہ کریں۔" عریشہ نے تسلی دی۔

گھر آئی تو عادلہ بھی منہ سر لپیٹے پڑی تھیں۔ سوئی ہوئی تھیں یا یونہی لیٹی تھیں۔ عریشہ نے بھی بات نہیں کی۔ بس ادھر ادھر پھرتی رہی۔ عادلہ نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ یونہی کروٹ پر کروٹ بدلتی رہیں۔ عریشہ کی اپنی بھوک مر گئی تھی۔ عشاء کی اذان سے ذرا پہلے وہ اٹھیں۔

"تم نے کھانا کھایا؟"

"بھوک نہیں ہے۔" وہ کھلی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔ جہاں چاند دھیرے دھیرے بادلوں میں چھپتا جارہا تھا۔ روئی کی سفید پھٹکیوں جیسے بادل سیاہ آسمان پر پھسلتے جارہے تھے۔ ہوا میں نمی اور خنکی بڑھ رہی تھی۔

"میں نے دوپہر میں بھی نہیں کھایا تھا۔ جاؤ' چاول گرم کرکے لے آؤ۔" انہوں نے نرمی سے کہا تو وہ دل ہی دل میں جھنجلاتے ہوئے کچن میں گئی۔۔۔ چاول گرم کرکے لے آئی۔ حسب عادت نہ رائتہ بنایا' نہ سلاد۔

"تمہاری تائی نے بہت ہی عجیب بات کی۔ روپیہ پیسہ' کپڑے' جوتے لے کر دینا اور بات ہے مگر اس لیے۔۔۔ کیسے ہوسکتا ہے۔" وہ ابھی ابھی خود کلامی کی۔

"امی! اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔" عریشہ نے آہستگی سے کہا۔

عادلہ نے چونک کر بیٹی کا منہ دیکھا اور چمچ پلیٹ میں رکھ دیا۔

"ابو کی ڈیتھ کے بعد ہر مشکل گھڑی میں انہوں نے ہمارا ساتھ دیا ہے۔"

"عریشہ! تم کچھ نہیں جانتیں۔۔۔ صرف اس لیے کہ میں نے کبھی تمہیں بٹھا کر وہ سب نہیں بتایا جو مجھ پر بیتا۔ تمہارے ابو کی ڈیتھ سے پہلے اور بعد میں جو کٹھن وقت میں نے گزارا۔۔۔ یہ میں ہی جانتی ہوں۔۔۔ لیکن میں نے تمہیں ان گھریلو سیاستوں سے دور رکھا۔۔۔ صرف اس لیے کہ تم سگے رشتوں سے نفرت محسوس نہ کرنے لگو۔۔۔ میں نے ان سب کے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن اب میرے پاس کچھ نہیں بچا۔ میں زیور دے کر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں تڑوا سکتی۔ مجھے تمہاری شادی بھی کرنا ہے۔۔۔ اور میرے پاس کوئی قارون کا خزانہ نہیں۔" عادلہ بولتی چلی گئیں۔

"امی! مجھے اس زیور کی ضرورت نہیں۔ بس آپ فاطمہ آپی کو دے دیں۔"

عادلہ کچھ لمحے بول ہی نہ سکیں۔ انہیں اپنا احساس ہوا ان سے بھول ہوگئی ہے۔ انہیں عریشہ کو ان تمام حالات سے بے خبر نہیں رکھنا چاہیے تھا اب وہ اسے کچھ بتاتیں تو وہ کبھی یقین نہ کرتی۔

"تمہیں اس معاملے میں بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں جس طرح مناسب سمجھوں گی۔ نپٹ لوں گی۔"

"امی! آپ۔۔۔ آپ بہت سنگدل ہیں۔"

وہ غصے سے کہہ کر چلی گئی اور۔۔۔ عادلہ بس بیٹی کو زرد دیکھتی رہ گئیں۔ وہ ان کی اکلوتی اولاد تھی اور اسے بھی ماں سے زیادہ دوسروں کا خیال تھا۔ ان کا کھانے سے دل اچاٹ ہوگیا۔ اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ پلیٹیں اٹھا کر کچن میں رکھ آئیں۔۔۔ ایک طرف کرکے وہیں لیٹ گئیں۔ انہیں وہ سارے تلخ لمحے یاد آنے لگے جو اس گھر میں گزرے تھے۔ حمیداں پہلی بہو اور ان کے خاندان کی تھیں۔۔۔ سو معتبر ٹھہریں۔۔۔ اور عادلہ کی تعلیم' ذہانت اور سلیقہ ہی ان کے لیے طعنہ بن گیا۔ حسد کی آگ میں وہ لوگ خود ہی نہیں جلے' عادلہ کو بھی جلا ڈالا۔۔۔ آخر عریشہ کے ابو کو ہی احساس ہوا تو گھر دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔

یہ قصور بھی عادلہ کے کھاتے میں ڈالا گیا۔ جب تک ساس سسر زندہ رہے۔ زور زبردستی سے ان کی تنخواہ نکلوالیتے۔۔۔ جب نہیں رہے تو حمیداں نے پینترا بدلا۔ اب وہ یہی کام مختلف طریقوں سے کرنے لگی تھیں۔ عادلہ ان سب کی خود غرض اور مطلب پرست فطرت سے بخوبی آگاہ تھیں تب ہی عریشہ کو ان کے حوالے کرنے سے ڈرتی تھیں۔

ثوبان اچھا لڑکا تھا مگر عادلہ کو اس کی شارٹ کٹ استعمال کرنے کی عادت بری لگتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے فائدے کے لیے دوسروں کو دھوکا دے کر راستے میں چھوڑ جایا کرتے ہیں۔ وہ اکثر عادلہ کے پاس بیٹھ کر اپنے مستقبل کی پلاننگ کرتا اور اس کے خواب اتنے اونچے تھے کہ عادلہ کو خوف آنے لگتا۔ وہ بہت

بہت جلد پانے کی خواہش رکھتا تھا اور عادلہ سمجھتی تھیں ایسے لوگ منزل پر پہنچ کر بھی ناآسودہ ہی رہتے ہیں۔

"یااللہ! ہمیں صحیح اور غلط کا شعور عطا فرما۔"

☼ ☼ ☼

عریشہ ماں کے پاس سے اٹھ کر تائی کی طرف چلی آئی۔ کمرے میں ٹی وی چل رہا تھا سب اندر تھے بیٹھک کا دروازہ بھی بند تھا اور اوپر کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اوپر چلی گئی۔ ثوبان سے بات کرکے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی تھی۔ اپنی دھن میں اندر آئی مگر ٹھٹک کر رکنا پڑا۔۔۔ کمپیوٹر کے سامنے بیٹھے ابرار کو دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ ساتھ پریشان بھی ہوئی۔۔۔ یہ تو پتا تھا کہ کوئی مہمان بیٹھک میں تایا کے پاس ٹھہرا ہے مگر یہ نہیں پتا تھا کہ وہ بھی کبھی کمپیوٹر استعمال کرنے کے لیے ثوبان کے کمرے میں بھی آجاتا ہے۔ ابرار بھی گڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔

"آپ۔۔۔"

"ثوبان کہاں ہے؟" عریشہ کو بھی یوں منہ اٹھا کر چلے آنے پر ندامت سی ہوئی۔

"پتا نہیں۔" ابرار نے کہا تو وہ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

"تو یہ ہے؟ وہ خبطی سی لڑکی۔ مگر یوں رات کو اس طرح کسی لڑکے کے کمرے میں آنا تو مناسب بات نہیں۔"

وہ سوچتا ہوا دوبارہ بیٹھ گیا۔

☼ ☼ ☼

ثوبان فریج سے پانی کی بوتل نکال رہا تھا۔ روٹیاں پکاتی حمیداں بڑبڑانے لگیں۔

"کچھ زیادہ ہی دماغ اونچا ہے اس عادلہ کا۔۔۔ کمی کیا ہے میرے بیٹے میں مگر اس کی تو اڑانیں ہی کچھ اور ہیں۔"

"کیا ہوا اماں؟" اس نے ریک سے گلاس اٹھاتے

پوچھا۔

"ہونا کیا ہے؟ عادلہ نے عریشہ کے لیے تیرے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔" حمیداں کا انداز ہی ایسا لٹھ مار ہوتا تھا کہ اگلا بندہ ایک بار تو ضرور ہی تاؤ کھا جائے ۔۔۔ ثوبان بھی حیران ہو کر ماں کا منہ دیکھنے لگا۔

"ہاں تو کیوں نہ کرے گی۔ گھر عریشہ کا' دکان عریشہ کی' وہ تو جائیداد والی ہے ۔۔۔ اس کے لیے کوئی اونچا رشتہ ہی ڈھونڈے گی۔ ہمیں تو ویسے ہی کسی کھاتے میں نہیں رکھتی۔ ہم تو اسے جاہل دکھتے ہیں پر ثوبان! تجھ میں کیا کمی تھی ۔۔۔ تیرے جتنی جماعتیں تو اس پورے خاندان میں کسی نے نہیں پڑھیں۔"

"اماں! تمہیں ضرورت کیا تھی ابھی رشتے کی بات کرنے کی۔" ثوبان نے جز بز ہو کر کہا اور مجھے کوئی لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے ۔۔۔ میرے ڈپارٹمنٹ کی ایک سے ایک لڑکی مجھ سے شادی کے خواب دیکھ رہی ہے۔"

"ہاں تو کیوں نہ دیکھے' میرا بیٹا شہزادہ ہے شہزادہ۔ عادلہ تو ناشکری ہے۔ اس کی اولاد ہے' اس کی مرضی مگر مجھے تو عریشہ کا خیال تھا ۔۔۔ بے چاری لڑکی۔" حمیداں نے تاسف سے روٹی توے سے اتاری۔

"اچھا چھوڑ۔ یہ اس لڑکے کے لیے بھی روٹی لے جانا۔ یہ مفت کی مصیبت نجانے کب تک گلے پڑی رہے گی۔"

"خود ہی دے دینا ۔۔۔ میں جا رہا ہوں۔" وہ بیزاری سے بوتل اور گلاس لے کر اوپر چلا گیا۔

"ہاں میں نوکر لگی ہوں ۔۔۔ مریم او مریم۔!" وہ بڑبڑاتی ہوئیں مریم کو آوازیں دینے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"اتنی محنت کرو گے تو پاگل ہو جاؤ گے ۔۔۔ سارا دن نوکریاں کرتے ہو' رات رات بھر پڑھائیاں کرتے ہو ۔۔۔ انسان ہو یا جن ۔۔۔ تمہیں نیند نہیں آتی ۔۔۔"

ثوبان الجھ کر پوچھ رہا تھا۔ ابرار نے کتاب بند کر کے اپنے اکڑے ہوئے وجود کو ڈھیلا چھوڑا۔

"مجبوری ہے ثوبان بھائی! اب گاؤں میں میرے ابا تو بیٹھے نہیں' جو میری فیسیں بھریں گے۔ خود مجھے ہی پیسے جمع کرنے ہیں۔"

"چچا تو ہے نا ۔۔۔ ان ہی کو قابو کر لیا ہوتا۔" ابرار ہنس دیا۔

"اس کی پاداش میں مجھے ان کی بیٹی سے شادی کرنا پڑتی۔"

"تو کر لیتے ۔۔۔" ثوبان نے لاپروائی سے کہا۔

"جی' اور ایک بدزبان لڑکی کو ساری عمر کے لیے گلے کا ہار بنا لیتا۔"

"ساری عمر کے لیے نہ بناتے' وقتی طور پر سہی۔"

"کیا مطلب؟" ابرار نے الجھ کر ثوبان کو دیکھا۔

"او بے وقوف لڑکے ۔۔۔ یہ زندگی ہے' یہاں سیدھے رستے پر چلو تو منزل دور بہت دور چلی جاتی ہے یار! شارٹ کٹ مارنا سیکھ لو۔ شادی کر لو اس سے' چچا تمہیں جی بھر کر سپورٹ کریں گے۔ جب جاب مل گئی کسی منزل پر پہنچ گئے تو اپنی مرضی سے شادی کر لینا۔"

"اچھا پھر اس لڑکی کا کیا ہو گا؟"

"طلاق دے دینا ۔۔۔ یا وہیں گاؤں میں چھوڑ دینا سمپل۔ یار! تم بہت بے وقوف ہوتے ہیں۔ ذرا پیار کا جھانسا دو ۔۔۔ یوں۔" اس نے چٹکی بجائی۔ "یوں مٹھی میں آ جاتی ہیں ۔۔۔ بس بندے کو فائدہ اٹھانے کا ہنر آنا چاہیے۔"

ابرار نے بے حد افسوس اور دکھ سے ثوبان کو دیکھا۔ اسے لگا تھا ثوبان باقی گھر والوں سے مختلف انسان ہے۔

"اپنے فائدے کے لیے کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنا ۔۔۔ اس کے احساسات و جذبات سے کھیلنا خود غرضی نہیں ہے؟"

"اب اپنا مقصد پانے کے لیے اتنی سی خود غرضی تو جائز ہے۔"

"میرے نزدیک تو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔"

"تو بیٹا! پڑا رہ پھر گناہ ثواب کے چکروں میں۔" ثوبان نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "تم جیسے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔"

"شاید ۔۔۔" ابرار نے کندھے اچکا دیے۔ اس کا دل چاہا' وہ ثوبان سے پوچھے کیا وہ عریشہ کو بھی استعمال کر رہا ہے' مگر جھجک گیا۔ وہ برا بھی مان سکتا تھا۔ ثوبان وہاں سے نکل کر صحن میں ٹہلنے لگا تھا۔

ابرار کا دل بدمزگی سے اچاٹ سا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"کیسا ہے یار! تو ٹھیک تو ہے' گھر والے تیرا خیال تو رکھتے ہیں۔" جملاں بلو کی آواز سن کر رونے ہی لگی۔ ماسٹر صاحب نے دلسوزی سے اسے دیکھا اور باہر نکل گئے تاکہ وہ کھل کر بات کر سکے۔

"جی اماں! میں بالکل ٹھیک ہوں ۔۔۔ کیوں فکر کر رہی ہیں ۔۔۔ نہ یہ شہر میرے لیے اجنبی ہے' نہ میں شہر والوں کے لیے۔" وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی نے ماں کے جلتے بلتے دل پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ڈال دیے۔

"مجھے ایک جگہ نوکری بھی مل گئی ہے اور کچھ ٹیوشنز بھی۔"

"تو پھر پڑھتا کس وقت ہے؟"

"رات کو۔"

"اتنی مشکل پڑھائی راتوں کو جاگ جاگ کر کیسے کرتا ہے۔" جملاں کے دل پر گھونسا پڑا۔

"اماں! آپ میری فکر نہ کریں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس اپنا خیال رکھا کریں ۔۔۔ چاچی کی باتوں کو زیادہ دل پر نہ لینا' بس پانچ سال کی بات ہے' پھر ہم شہر میں اپنا گھر بنائیں گے۔"

"اچھا برکت بھائی کو میرا سلام دینا اور بھرجائی حمیداں کو بھی۔"

"جی اماں ۔۔۔ دے دوں گا۔"

جملاں نے بجھے بجھے دل سے فون رکھا اور وہیں بیٹھ گئی۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر صاحب کھنکارتے ہوئے اندر آئے تو وہ دوپٹے سے آنکھیں خشک کر رہی تھی۔ انہیں دیکھ کر کھڑی ہو گئی۔

"چلتی ہوں ماسٹر صاحب!" ماسٹر صاحب نے آہستگی سے اپنا ہاتھ جملاں کے سر پر رکھا۔

"تیرے آنسو اس کا رستہ کھوٹا کریں گے' اس کے لیے دعا کیا کر۔ دعائیں رب کی مہربانی سے تاریک رستوں کو بھی روشن کر دیتی ہیں۔"

"دکھ اسی بات کا ہے ماسٹر جی! اس کے باپ کے حصے میں اتنی زمین تو آتی تھی کہ اس کا پتر سکون سے پڑھ سکتا ۔۔۔ اب بیچارہ غیروں کے گھروں میں دھکے کھاتا پھر رہا ہے۔"

"میں نے اصغر کو سمجھانے کی کوشش کی تھی ۔۔۔ پر وہ۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس بھر کے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اصغر کے منہ میں کبری کی زبان ہے اور وہ تو یہی چاہے گی کہ بلو بس دھکے ہی کھاتا رہے۔"

"ابرار میں بڑا حوصلہ اور مستقل مزاجی ہے۔ تم دیکھنا بہت آگے جائے گا۔ بس اللہ اسے سیدھے رستے پر رکھے۔"

"آمین ۔۔۔" وہ بوجھل دل کے ساتھ باہر نکل گئی۔ گاؤں کی اداس' سنسان گلیوں سے گزرتے اس کا دل بھی خالی ہوتا جا رہا تھا۔ اسے لگا' وہ بھری دنیا میں اکیلی رہ گئی ہے۔ گھر بھی وہ کہ جس کی طرف قدم ہی نہ اٹھتے تھے۔

وہ اپنے تھکے ہارے وجود کو لے کر ایک گھر کی ٹوٹی ہوئی دیوار کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"یا اللہ! سر کا سائیں سر پر نہ رہے تو عورت اتنی بے سہارا کیوں ہو جاتی ہے۔"

دوسرے پل اس نے خود ہی اپنے خیالات پر لعنت بھیجی۔

"بے سہارا کیوں؟ میرے پاس میرا بلو جو ہے ۔۔۔ ابھی تو میرے جینے کی آس باقی ہے ۔۔۔ پھر میں کیوں حوصلہ چھوڑ رہی ہوں۔ بلو گھر بنائے گا' شادی کرے گا۔ اس کے بچے ہوں گے ۔۔۔ یا اللہ! میرے بلو کو اپنی

حفاظت میں رکھنا۔ اس کے سارے خواب پورے کرنا۔"

وہ پھر سے بہل گئی۔

خالی ہوتا دل پھر سے امنگوں اور خواہشوں سے بھر گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

دیوار کی دوسری طرف ثوبان کی آواز اتنی بلند تھی کہ صحن میں ٹیسٹ کی تیاری کرتی عریشہ نے چونک کر ماں کو دیکھا۔

"اتنا مبارک کام ہے مگر ہماری بے جا خواہشوں اور نمائش کی عادت نے اسے زحمت بنا دیا ہے۔"

بیزاری سے کہہ کر سبزی کی ٹوکری اٹھا کر اندر چلی گئیں۔ عریشہ نے پہلی بار ثوبان کی اتنی اونچی آواز سنی تھی ورنہ وہ ہمیشہ بہت سبھاؤ اور تحمل سے بات کرتا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور درمیان والا دروازہ عبور کر گئی۔ ثوبان ماں سے الجھ رہا تھا۔

"آپ یہ کیسے کر سکتی ہیں.... مجھے وہ پیسے ابھی چاہئیں۔"

"کہہ دیا نا.... کوئی پیسہ نہیں جو تھا سنیارے کو دے آئی ہوں۔" حمیداں نے بے نیازی سے ہاتھ ہلایا۔ گویا ثوبان کی ناراضی یا غصے کا ان پر کوئی اثر نہیں۔ وہ بڑے اطمینان سے بال کھولے، تیل کی شیشی ہاتھ میں پکڑے سر میں مالش کی تیاری کر رہی تھیں۔

"آپ کو پتا تھا.... وہ پیسے میرے فائنل سمسٹر کی فیس کے تھے۔"

"تو میں کیا کروں.... بس پندرہ دن رہ گئے ہیں شادی میں.... اب جہاں سے بندوبست ہوتا ہے کر لے۔"

"کہاں سے کرلوں، چوری کروں، ڈاکہ ڈالوں؟ اس منحوس زیور کے بغیر فاطمہ کی شادی نہ ہونا تھی۔"

"جو مرضی آئے کر.... میں نے لڑکی کو خالی ہاتھ رخصت نہیں کرنا۔"

"میں خودکشی کرلوں گا۔"

"دشمنوں کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جائے گی۔ خزانے دبا کر بیٹھے ہیں۔ پر برے وقت میں کسی کی مدد نہیں کریں گے۔ کھا نہ جاتی.... تیری چچی سے ادھار مانگا تھا۔ ٹکا سا جواب دے کر چلتی بنی۔ لو اور سنو! لڑکی بھی گھر کی، زیور بھی گھر کا ہم دو کپڑوں میں نکاح کر لیتے پر...

"اماں! میں کچھ نہیں جانتا، مجھے میرے پیسے چاہئیں۔" وہ غضب ناک ہوا۔

"ناں تو کما کر لایا تھا؟" حمیداں نے ہاتھ نچایا۔

"میں دیکھ لوں گا.... اس شادی میں نہیں آؤں گا۔" ثوبان غصے سے کہہ کر پلٹا۔ سامنے کھڑی عریشہ کو دیکھ کر ٹھٹکا، پھر تیزی سے باہر نکل گیا.... اس کی آخری شکوہ بھری نگاہ عریشہ کے اندر گڑ کر رہ گئی۔

حمیداں نے عریشہ کو دیکھا، پھر تیل کی شیشی نیچے رکھ دی۔

"اب کھڑی کیا دیکھ رہی ہے عرشی! جا اپنی ماں سے کہہ دے.... اگر میرے بیٹے نے کچھ کر لیا تو اس کا ذمہ عادلہ کے سر ہوگا۔"

عریشہ نے دہل کر سینے پر ہاتھ رکھا۔

دوسری طرف صحن میں کھڑی عادلہ نے بھی ایک ایک حرف سنا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا ان کی چیز ہے وہ دیں نہ دیں۔ اس میں انہیں اتنا مجبور کیوں کیا جا رہا ہے۔

"کاش میں زیور نبیلہ کے پاس رکھوا دیتی یا ہوتا ہی نہیں.... نبیلہ نے منع بھی کیا تھا کہ بڑی بھابی کو خبر نہ ہونے دینا۔"

عریشہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ ماں بیٹی کی نظریں ٹکرائیں۔ عادلہ کو بیٹی کی نگاہوں میں شکوہ ہی شکوہ دکھائی دیا۔ عریشہ بنا کوئی بات کیے اندر چلی گئی۔ عادلہ دل مسوس کر رہ گئیں۔

عریشہ کی سماعتیں ساری رات گھر کی دہلیز پر پہرہ دیتی رہیں مگر ثوبان واپس نہیں آیا۔ وہی رات نہیں وہ اگلے دو دن تک گھر نہیں آیا تھا۔ حمیداں اٹھتے بیٹھتے آہیں بھرتیں جسے سن سن کر عریشہ ذہنی طور پر سخت اپ سیٹ ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ساری ساری رات پڑھتا رہتا ہے۔ کبھی آنکھ بھی جھپک لیا کر۔" برکت حسین سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابرار کو دیکھ کر ٹوکے بنا نہ رہ سکے۔ چند دنوں میں انہیں اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ لڑکا بہت ذہین اور محنتی ہے۔

ابرار نے کتابوں سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور مسکرا دیا۔

"دن بھر کہاں غائب رہتے ہو؟"

"ایک کمپنی میں جاب کر رہا ہوں۔ ایک دو ٹیوشنز بھی شروع کی ہیں۔"

"کیا تمہارے چاچا نے اب بالکل ہی ہاتھ کھینچ لیا ہے۔" انہوں نے ٹانگوں پر کمبل کر لیا۔

"وہ اب میری مدد کیوں کریں گے؟" ابرار آہستگی سے ہنسا۔

"اچھا.... چل ٹھیک ہے، ماں کی خیر خبر تو لیتا رہتا ہے نا؟"

"جی۔" ابرار نے مختصر کہا۔ اس نے ایک دو بار ماسٹر صاحب کو فون کر کے ماں کا پوچھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے وعدہ کیا تھا۔ جب بھی جمیلہ آئی وہ اس کی بات کروا دیں گے

ابرار اب اسی فکر میں تھا کہ کچھ پیسے ہاتھ لگیں تو اک سستا سا موبائل ہی خرید لے۔ ایک بار کے بعد ماں سے بات ہی نہ ہوئی تھی۔

"اوپر ثوبان کے کمرے میں بیٹھ کر پڑھ لیا کر، خالی ہی ہوتا ہے۔"

وہ شاید لائٹ سے ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ ابرار خاموش ہو گیا۔ ثوبان کا مزاج وہ سمجھ گیا۔ موڈ اچھا ہوتا تو اس سے دوستوں کی طرح برتاؤ کرتا، نہ ہوتا تو اکھڑ مزاج ہو جاتا.... ابرار سب رویے سمجھتا مگر نظر انداز کر رہا تھا کہ وہ فی الحال ہاسٹل کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف یونیورسٹی کی فیسوں نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔

وہ خالی ہاتھ تھا، ناامید نہیں....

مشکل تھا، ناممکن نہیں۔

اگر اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سبب ضرور بنا دے گا۔

یہ اس کا یقین تھا۔

اپنی سوچوں میں گم ابرار کو لگا، دروازے کے پاس سے کوئی سایہ سا گزرا ہے۔ اس نے برکت حسین کو دیکھا، وہ آنکھیں موندے لیٹے تھے۔ کسی خیال کے تحت وہ باہر نکل آیا۔

سیڑھیاں چڑھتی عریشہ کو دیکھ کر اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

"یہ لڑکی کس راہ پر چل رہی ہے۔"

اس نے ڈیوڑھی کے کھلے دروازے پر نگاہ دوڑائی۔

"کیا اس کی ماں اتنی ہی بے خبر ہے۔"

دل بوجھل سا ہو گیا۔ اس نے واپس آکر کتابیں کھول لیں، مگر دھیان سیڑھیوں کے آس پاس بھٹک رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ثوبان اوندھا لیٹا جاگ رہا تھا۔ اس کے قریب میز پر کھانا جوں کا توں پڑا تھا.... آج وہ پورے تین دن کے بعد گھر لوٹا تھا۔

"ثوبان...." عریشہ کی آواز پر وہ چونکا، مگر سیدھا نہیں ہوا۔ بلکہ بیزاری سے پوچھنے لگا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟"

"یہ پوچھنے آئی ہو؟" وہ سیدھا ہوا۔

"اتنے دنوں سے کہاں تھے؟"

"عرشی! پلیز جاؤ، میں اس وقت کسی سوال جواب کے موڈ میں نہیں۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"آپ پریشان ہیں۔"

"ہاں.... ہوں.... تو.... تو کیا کر سکتی ہیں مس عریشہ آپ میرے لیے؟" اس کے لہجے سے چھلکتا طنز عریشہ کو شرمندہ کر گیا۔

"کچھ نہیں.... سو پلیز لیو می الون.... یہ سوال

جواب کر کے مجھے پریشان نہ کرو۔"
"میں تو صرف۔۔۔" ثوبان کے لہجے نے اسے بری طرح مجروح کیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
"فار گاڈ سیک عریشہ!" وہ جھٹکے سے کھڑا ہوا۔ "اب یہ ڈراما مت شروع کر دینا۔ میری جان پر بنی ہے۔ میرا کیریر داؤ پر لگا ہے۔ چار دن میں پیسوں کا بندوبست نہ ہوا تو میری برسوں کی محنت ضائع جائے گی۔ میرے خواب ملیامیٹ ہو جائیں گے مگر کسی کو کیا پروا۔ یہاں سب اپنی اپنی غرض کے بندے ہیں۔ اماں کو اپنی بیٹی پیاری ہے اور تمہیں اپنا نازیوں۔۔۔"
عریشہ دنگ رہ گئی۔
"مجھے آپ کی پرواہ ہے ثوبان!"
"جاؤ عریشہ۔۔۔ پلیز۔ خالی خولی دعوے مت کرو۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"
ثوبان نے بیزاری سے ہاتھ اٹھایا۔ عریشہ نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"میری محبت صرف دعوا نہیں ہے ثوبان!"
"رئیلی؟" ثوبان استہزائیہ انداز میں ہنسا۔
"ہاں۔۔۔ اور یہ میں ثابت بھی کر دوں گی۔"
وہ کہہ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہونے کی آواز پر ابرار نے بے اختیار سکون کا سانس لیا۔

☼ ☼ ☼

عادلہ نے سخت نگاہوں سے بیٹی کو دیکھا۔
"کہاں تھیں؟"
"کہاں ہوں گی۔ تائی کے پاس تھی۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر اپنے بستر پر بیٹھی۔
"اس وقت؟"
"اب وہاں جانے کے لیے بھی مجھے وقت دیکھنا پڑے گا۔" اس کے لہجے سے چھلکتی بدتمیزی نے عادلہ کو ایک لمحے کے لیے گنگ سا کر دیا۔
"یقیناً"۔
"آپ نے پہلے تو کبھی نہیں روکا۔"
"غلطی کی۔۔۔ مجھے روکنا چاہیے تھا۔"
"اب دیر ہو گئی ہے۔" عریشہ لیٹ گئی۔
"عرشی! میری بات سنو۔" عادلہ نے سختی سے کہا۔
"مجھے نیند آ رہی ہے۔" وہ کروٹ بدل گئی۔
عادلہ کچھ لمحے اسے غصے اور بے بسی سے دیکھتی رہیں، پھر اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں ڈھولک رکھ لی گئی تھی۔ بانو اور ساجدہ بھی اپنی آل اولاد کے ساتھ آ گئیں۔ آنے بہانے جو نچیں لڑاتی رنجیں۔ وجہ کا ہونا ضروری نہیں تھا۔ حمیداں کا موڈ بڑا خوشگوار تھا اور عادلہ کے ساتھ رویہ شہد بھرا۔
"شکر ہے۔ ان کا دھیان تو ہٹا۔ اللہ جانے کس نے سمجھایا ہے۔"
عادلہ کی بات پر عریشہ نظریں چرا جاتی۔
درمیان کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا۔ بانو ساجدہ کے بچے دونوں صحنوں میں دڑکیاں لگاتے رہتے۔ مریم بڑبڑاتی رہتی۔
"ضرورت کیا تھی اتنے دن پہلے آنے کی۔"
"خاموش رہو۔ آپا سن لیں گی۔" عادلہ نے ٹوکا۔
اس کا آج کل پڑھنے میں جانا بند تھا۔ سارا بوجھ مریم پر آ گیا تھا سو وہ جھنجھلائی رہتی۔
"تو سن لیں۔ وہاں پکار پکا کے میری کمر رہ گئی۔ اب بیسن کے حلوے کی فرمائش۔ گویا اپنے گھروں سے فاقے کرتی آئی ہیں۔ میں تو صاف انکار کر کے آ گئی۔"
"اچھا اسی لیے بانو آپی کا موڈ خراب ہے۔" عریشہ نے اندر آتے ہوئے کہا۔
"ہوتا رہے۔" وہ آرام سے لیٹ گئی۔
"فاطمہ آپی! آپ تیار ہو جائیں، ہمیں پارلر جانا ہے۔ پھپھو نے سارا انتظام کروا دیا ہے۔ ان کی گاڑی ہمیں لینے آ رہی ہے۔"
"میں بھی فیشل کرواؤں گی۔"
"ہاں۔۔۔ مگر اپنے خرچے پر۔" عریشہ آرام سے کہہ کر کچن میں آ گئی۔ جہاں حمیداں بیسن کا حلوہ بھون

رہی تھیں۔
"آ گئی میری بیٹی۔"
"حلوے کی خوشبو کھینچ لائی۔" وہ ہنستے ہوئے پاس بیٹھی۔
"ڈھیر سارا میوہ بھی ڈالا ہے۔ لے ذرا چکھ۔" انہوں نے پلیٹ میں تھوڑا سا نکالا۔
"تائی امی! میری عادتیں خراب مت کریں۔"
"سو واری صدقے، جس گھر میں تیرے جیسی بیٹی ہو۔ اس گھر کے نصیب ہی سنور جائیں گے۔۔۔"
"اچھا ایسا کر، یہ اوپر ثوبان کو بھی دے آ۔ ورنہ یہ بچے ابھی سارا چٹ کر جائیں گے۔"
"اماں! ساری فکریں ثوبان کی کرنا۔ تجھے کبھی میرا خیال نہیں آیا۔" نعمان نے اندر آتے ہوئے کہا تو عریشہ ہنس دی۔
"تو اپنا خیال خود جو رکھنے لگا ہے۔" حمیداں نے طنز سے کہا۔
"خیر ہے اماں! آج کل مجھ پر بڑا غصہ ہے تجھے۔"
عریشہ پلیٹ اٹھا کر باہر آ گئی۔ نعمان کا سارے گھر پر ہی رعب تھا۔ عریشہ نے بھی کبھی اس سے کھل کر بات نہیں کی تھی۔
ثوبان اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا خود پر پرفیوم چھڑک رہا تھا۔ گویا کہیں جانے کی تیاری تھی۔ وہ مڑا اور ہلکا سا اسپرے اس پر بھی کر دیا۔
"میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"
"ضروری تو نہیں، میں اوپر آتی۔" وہ ناز سے مسکرائی۔
"محترمہ! ہم آپ کی رگ رگ سے واقف ہیں۔"
"وہ تو تائی امی نے حلوہ دے دیا کہ آپ کو دے آؤں۔"
"ہاں! ورنہ آپ نے کہاں اوپر آنا تھا۔"
دونوں ایک ساتھ ہنس دیے۔ ثوبان نے پلیٹ ایک طرف رکھ دی۔
"مجھے یہ ہیوی چیزیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔"
"اسی لیے اتنے اسمارٹ ہیں۔" وہ کہہ کر مڑنے لگی۔ ثوبان نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔
"یہ بات میری طرف دیکھ کر کہو۔"
"جی نہیں۔" اسے شرم سی آنے لگی۔ ثوبان نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔
"عریشہ! تم بہت اچھی ہو۔ بہت پیاری۔ اور بہت کیئرنگ بھی۔"
"اور؟"
"اچھا تو اپنی تعریفیں سننے کا موڈ ہو رہا ہے۔" ثوبان نے چھیڑا۔
"جی نہیں۔" وہ جھل ہو کر ہاتھ چھڑانے لگی۔
"ثوبان بھائی! آپ کو۔۔۔" ابرار ٹھٹک کر دروازے میں رکا۔
ثوبان نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ عریشہ شرمندہ سی ہو کر تیزی سے باہر نکل گئی۔
"ماموں بلا رہے ہیں۔" ابرار نے سنجیدگی سے پیغام دیا اور پلٹ گیا۔
ثوبان نے کچھ زیادہ محسوس نہیں تھا۔ جبکہ عریشہ نیچے جا کر بھی بہت دیر تک اپنی شرمندگی کو تلملاہٹ میں چھپاتی رہی۔۔۔ یہاں تک کہ پھپھو کی گاڑی آ گئی اور اسے فاطمہ کے ساتھ پارلر جانا پڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

نبیلہ کو جب ابرار کے بارے میں پتا چلا تو بہت اصرار سے اسے کھانے پر بلایا تھا۔ اب کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے اس کے ساتھ اپنی پرانی یادیں تازہ کر رہی تھیں۔
"جب ہم لوگ گاؤں میں تھے تو میری اور جمیلہ کی بہت دوستی ہوتی تھی۔ پھر ہم لوگ تو جلد ہی شہر میں شفٹ ہو گئے۔ بہت روئی تھی، میں بھی اور جمیلہ بھی۔" ماں کے ذکر پر ابرار مسکرا دیا۔
"تمہاری طرح اسے بھی پڑھائی کا بہت شوق تھا۔ بلکہ مجھے تو لگتا ہے اس نے اپنا شوق تمہارے اندر منتقل کر دیا ہے۔"
"اس میں کوئی شک نہیں۔ اسٹڈیز کے معاملے

میں جتنی سپورٹ اماں کی طرف سے ملی' ابا کی طرف سے بھی نہیں تھی۔ ماسٹر صاحب کے گھر بھیجنے کے بعد خود چیک کرنے آتیں کہ میں بیٹھا پڑھ رہا ہوں۔ کہیں گاؤں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے تو نہیں نکل گیا۔"

"بس بیٹا! اس وقت ماحول ہی ایسا تھا۔ لڑکیوں کی پڑھائی کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ میرے پڑھنے پر جو جو باتیں بنیں میں بتا نہیں سکتی۔ اور چائے لاؤں؟"

"نہیں۔ بہت شکریہ۔ بہت اچھا لگا' آپ سے مل کر باتیں کر کے۔" ابرار کو وہ سلجھی ہوئی خاتون بہت اچھی لگی تھیں۔

"بس وہاں بھائی صاحب کے گھر کوئی پرابلم تو نہیں ہے' میرا مطلب۔ ہے تم یہاں کیوں نہیں شفٹ ہو جاتے؟"

"جی شکریہ آنٹی! میں جلد ہی دوستوں کے ساتھ فلیٹ شیئر کر رہا ہوں۔ بس کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔"

"پھر بھی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو۔ بالکل جھجکنا نہیں۔ خالہ سمجھ کر میرے پاس آنا۔ بلکہ مجھے بہت گلہ ہے کہ تم اتنا عرصہ شہر میں آتے رہے' لیکن کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئے۔" ان کے لہجے سے چھلکتا خلوص ابرار کو متاثر کر گیا۔

"یہ میری کوتاہی ہے۔ ورنہ اماں نے تو کئی بار کہا تھا۔"

"بیٹا! ہمت مت ہارنا' مشکل وقت گزر جانے کے لیے ہوتا ہے۔" انہوں نے رسانیت سے کہا۔ ابرار نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"میں نے محسن سے بھی کہا ہے۔ وہ تمہارے لیے کسی بہتر جاب کا بندوبست کر دے گا۔"

"جی۔" ابرار نے کہا اور سر جھکا کر سوچنے لگا۔ اگر دنیا میں پرخلوص لوگ نہ ہوں تو ہم جیسوں کا کیا بنے۔ یہ میری سگی خالہ نہیں مگر ان کے انداز میں کتنی اپنائیت محسوس ہو رہی ہے۔

"اب کے گاؤں گئے تو جمیلہ کو ساتھ ضرور لانا۔" نبیلہ کہہ رہی تھیں۔

"جی ضرور۔" ابرار نے کہا۔ وہ اک خوبصورت شام گزار کر ٹیوشن پڑھانے چلا گیا۔ نبیلہ سے ملاقات نے اس کا ذہن ہلکا پھلکا کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

دروازہ عائشہ نے کھولا تھا۔ نعمان کی بہت سی دعاؤں میں سے ایک دعا تو دروازے پہ ہی قبول ہو گئی۔

"السلام علیکم!" عائشہ مسکرائی تھی۔

"وعلیکم السلام! وہ خالہ ہیں گھر پر؟"

"اندر آجائیں۔" عائشہ نے دروازہ کھول دیا تو نعمان اندر آگیا۔ عائشہ نے دروازہ بند کیا۔

"آپ کیسی ہیں؟"

"اچھی ہوں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" نعمان کی زبان پھسلی۔ ساتھ ہی وہ خجل سا ہو کر گردن کھجانے لگا۔ عائشہ نے مسکراہٹ دبالی۔

"آپ اندر چلیں۔ میں چائے لاتی ہوں۔"

نعمان کو بیٹھک میں بٹھا کر ماں کو بتانے وہ کچن میں آگئی۔ چائے کے ساتھ بسکٹ اور گاجر کا حلوہ گرم کر کے لائی۔

"میں بھی کہوں تم نے اتنے دنوں سے چکر کیوں نہیں لگایا۔ بہن کی شادی میں مصروف تھے۔" آمنہ خاتون نے کہا۔ عائشہ نے چائے نعمان کے سامنے رکھی اور خود باہر جانے کے بجائے ماں کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"جی بس جمعے کو سادگی سے نکاح ہے! بس گھر کے لوگ ہوں گے۔" وہ سیاہ چپل میں مقید اس کے گندمی پیر دیکھ رہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔ خواہ مخواہ کی فضول خرچی کرنی بھی نہیں چاہیے۔ اتنی تو مہنگائی ہے۔"

"جی! فاطمہ کی رخصتی ہو جائے تو میں اماں سے بات کروں گا۔" آمنہ نے بیٹی کو دیکھا۔ وہ ماں کا اشارہ سمجھ کر اٹھ گئی۔ مگر دروازے میں ہی کھڑی ہو گئی۔

"اچھی بات ہے۔ بیٹا! میں بھی جلد از جلد عائشہ کی ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہتی ہوں۔"

"میں کتنا بے تاب ہوں۔ بتا نہیں سکتا۔" بس اس نے سوچا پر کہہ نہ سکا۔

"آپ فکر نہ کریں۔ میں عائشہ کو آپ کے پاس اپنی امانت سمجھتا ہوں۔" وہ مضبوط لہجے میں گویا ہوا۔ عائشہ خاموشی سے وہاں سے ہٹ گئی۔

فاطمہ کے لیے تو یہ اک یادگار دن تھا ہی۔ جب بن مانگے اس کی جھولی خوشیوں سے بھر گئی' مگر عریشہ نہیں جانتی تھی کہ یہ دن اس کے لیے بھی بے حد اہم ہو گا اتنا اہم کہ وہ اسے ساری زندگی نہ بھلا سکے گی۔ فاطمہ تیار ہونے کے لیے پارلر جا چکی تھی۔

عریشہ نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا۔ اانک نزاکت اور چوڑی دار پاجامے میں وہ مغلیہ شہزادی لگ رہی تھی۔ کھلے بالوں میں برش چلاتے اس نے خود کو کسی اور کی نگاہ سے دیکھا اور شرما گئی۔ تب ہی عادلہ اندر آئیں تو اسے دیکھ کر ٹھٹک گئیں۔ عریشہ کے چہرے پر اتنے رنگ تھے کہ نظر ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ سے چلتی اس کے قریب آئیں۔

"امی! میں ٹھیک لگ رہی ہوں؟" عادلہ نے منہ میں کچھ پڑھ کر اس پر دم کیا اور بے اختیار اس کی پیشانی چوم لی۔

"ارے' آج اتنا لاڈ کیوں؟" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"جتنی روشن تمہاری پیشانی ہے۔ خدا اتنا ہی روشن تمہارا نصیب کرے۔ گرم ہوا سے بھی بچائے۔" نجانے کیوں ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"کانوں میں یہ پہن لوں؟" عریشہ نے جیولری باکس سے ٹاپس اٹھائے۔

"نہیں۔ ایسا کرو سیٹ کے ساتھ کی جھمکیاں پہن لو۔" بے اختیار عادلہ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی۔ "میں ابھی نکال کر لاتی ہوں۔" عادلہ الماری کی طرف مڑیں۔ عریشہ نے جلدی سے ان کا بازو پکڑ لیا۔

"نہیں وہ بہت بھاری ہیں۔ میں یہی پہن لیتی ہوں۔" اس نے جلدی جلدی کانوں میں ٹاپس پہنے۔ باہر شور سا اٹھا تھا۔ "میرا خیال ہے فاطمہ آپی آگئیں۔ امی! آپ بھی جلدی سے آجائیں۔" وہ کہہ کر عجلت میں باہر بھاگی۔

"بچوں جیسی ایکسائٹمنٹ ہے۔" عادلہ ہنس دیں۔ ڈیوڑھی کا دروازہ عبور کرتے وہ بری طرح ابرار سے ٹکرائی۔

"افوہ! ایک تو تم ہمیشہ درمیان میں آجاتے ہو۔" وہ پیشانی مسلتے جھنجلائی۔

"میں درمیان میں آجاتا ہوں یا آپ خود ٹکریں مارتی پھر رہی ہیں۔" ابرار نے دلچسپی سے اس مغلیہ شہزادی کو دیکھا۔

عریشہ کوئی سخت جواب دینا چاہتی تھی' مگر عقب میں بیٹھک میں سے مردوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ سو اسے گھورتی اندر چلی گئی۔

"کوئی لڑکی اتنی خوبصورت بھی لگ سکتی ہے۔" ابرار نے چپکے سے سوچا۔

فاطمہ پارلر سے تیار ہو کر آگئی تھی۔ نکاح کے بعد نبیلہ نے فاطمہ کو گلے سے لگا کر پیار کیا تو چونک سی گئیں۔ انہوں نے مڑ کر عادلہ کو دیکھا۔ وہ محلے دار عورت سے باتیں کر رہی تھیں۔ نبیلہ کو اپنی طرف دیکھتے پایا تو سمجھیں کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ تب ہی معذرت کر کے نبیلہ کے پاس آگئیں۔

"بہت مبارک ہو نبیلہ!"

"تمہیں بھی۔ لیکن میں نے تمہیں منع کیا تھا' پھر تم نے عریشہ کا زیور فاطمہ کو کیوں دیا؟" انہوں نے دبی آواز میں کہا۔

"ارے نہیں' میں نے تو نہیں دیا۔"

"فاطمہ کا زیور دیکھو' وہی ڈیزائن نہیں۔ آخر ہم دونوں نے پسند کیا تھا۔ کیسے بھول سکتی ہوں۔"

عادلہ نے چونک کر فاطمہ کو دیکھا۔

"یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ان کی سرسراتی بے یقین آواز ابھری۔

"خود کو سنبھالو۔" نبیلہ نے دبی آواز میں کہا۔ عادلہ عقب میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"مریم! اپنی چچی کے لیے پانی لاؤ۔" نبیلہ نے پاس

سے گزرتی مریم کو پکارا تو دور کھڑی عریشہ نے گھبرا کر ماں کو دیکھا اور مضطرب سی ہو گئی۔ عادلہ نے دو گھونٹ پانی لے کر خود کو سنبھالنے کی سعی کی۔ انہیں فاطمہ کی رخصتی تک یہیں رکنا تھا۔ جیسے ہی رخصتی ہوئی وہ تیزی سے اپنے گھر آئیں۔ ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

پرس سے چابیاں لیتے، الماری کا لاک کھولتے، اندر سے زیور کا ڈبہ نکال کر وہ بیڈ پر بیٹھ گئیں۔ ڈبہ کھولنے تک انہوں نے کتنی ہی دعائیں کیں۔

"کاش یہ ان کا وہم ہو۔" مگر ڈبہ کھلتے ہی سارے وہم اندیشے ہو گئے۔ باقی رہی تو بے یقینی۔

عریشہ چپکے سے دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ انہوں نے سر اٹھا کر عریشہ کو دیکھا۔ وہ ہاتھ ملتی مضطرب سی ان کے قریب آئی۔

"امی! بیت..."

"تالا توڑے بغیر چوری ہو جائے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ کسی گھر والے کی کارروائی ہے۔"

عریشہ نے سر جھکا لیا۔ عادلہ کھڑی ہو گئیں۔

"کیوں عریشہ؟"

"امی! انہیں ضرورت تھی۔" وہ شرمندہ نہیں تھی۔

"کیوں عریشہ؟"

"امی! غیر نہیں ہمارے اپنے ہیں۔"

"کیوں عریشہ؟" ان کی آواز بلند ہوئی۔

"امی! میں ثوبان کو مشکل میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی فیس جانی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ میں..."

"میں تمہاری ماں تھی عرشی!" ان کا تھپڑ عریشہ کے گال پر پڑا۔

"تم نے اپنی ماں کو دھوکا دیا... اپنے ہی گھر میں چوری کی... ان لوگوں کے اکسانے پر۔"

"مجھے کسی نے نہیں اکسایا۔" وہ ایکدم چیخ اٹھی۔ "آپ خوامخواہ ان پر الزام مت لگائیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں آپ کی طرح خود غرض اور بے حس نہیں ہو سکتی۔ آپ نے ساری زندگی انہیں حقیر سمجھا، لیکن وہ میرے اپنے ہیں۔ میں ان سے نظریں نہیں پھیر سکتی۔"

ان کے گلے پر کوئی چھری بھی پھیر دیتا، انہیں تب بھی اتنی تکلیف نہ ہوتی، جتنی عریشہ کے الفاظ نے انہیں پہنچائی۔ وہ ماں ہو کر ایک پل میں غیر ہو گئی تھیں۔

"ثوبان کی وجہ سے؟" عادلہ کو اپنی آواز اک گہرے کنویں سے آتی سنائی دی۔

"جی... میں ثوبان سے محبت کرتی ہوں اور اسی سے شادی بھی کروں گی۔" عریشہ کے لب و لہجے سے لحاظ مروت، شرم و حیا سب کچھ غائب تھا۔

"اگر میں نہ کروں تو..."

"تو میں سمجھوں گی کہ تائی امی بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ آپ کو بیٹی اور اس کی خوشی نہیں، صرف اپنا احساس برتری عزیز ہے۔ لیکن مجھے صرف اور صرف ثوبان سے شادی کرنا ہے۔"

وہ اپنی بات کہہ کر رکی نہیں۔ چلی گئی تھی اور عادلہ...

انہیں لگا ان کا دل بند ہو گیا ہے۔

لگا نہیں۔ سچ مچ ان کا دل بند ہو گیا تھا۔

✡ ✡ ✡

"عریشہ! تم نے ایسا کیوں کیا؟"

نبیلہ کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر دیں۔

عریشہ ٹکر ٹکر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔ رو رو کر آنسو بھی خشک ہو گئے تھے۔ یوں بھی ہوتا ہے... اس طرح بھی ہو سکتا ہے...

ایک پل کے لیے بھی عریشہ کا ذہن اس حد تک نہیں گیا تھا۔ ماں ڈانٹے گی، پیٹے گی... پھر رو پیٹ کر چپ کر جائے گی، لیکن اس طرح خاموشی اوڑھ لے گی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

قدموں تلے زمین کا نکلنا کیا ہوتا ہے؟

قیامت کسے کہتے ہیں؟ ماں کا مردہ وجود دیکھ کر احساس ہوا۔

کیسی بے یقینی تھی ماں کی آنکھوں میں۔ زرد رنگت، بے کیف سا وجود۔

نبیلہ کو اس پر ترس نہیں آرہا تھا۔

"کوئی یوں ماں کا اعتبار کرچی کرچی کرتا ہے؟ کوئی اس طرح ماں کو دھوکا دیتا ہے۔ جس طرح تم نے دھوکا دیا۔ اس کا تمہارے سوا اور کون تھا؟... کیسے پیسہ پیسہ جوڑ کر تمہارے لیے وہ زیور بنایا تھا۔ میں نے ہی صلاح دی تھی کہ کچھ نہ کچھ عرشی کے لیے جوڑ لو۔ یہاں تو سب کے سب خود غرض ہیں۔ دکان، تھیلی، کبھی ایک پائی نہیں دی... ہر مہینے آنے بہانے اس سے رقم بٹور لی جاتی تھی۔ اور مہینے کے آخری دنوں میں وہ خالی ہاتھ ہوتی۔"

کمرے میں اندھیرا بہت بڑھ گیا تھا۔ نبیلہ کا چہرہ اسی تاریکی میں گم ہونے لگا۔

عریشہ کے لب باہم پیوست تھے۔

"وہ ہمیشہ کہتی، میری بیٹی بہت معصوم ہے، وہ نقاب کے پیچھے چھپے چہرے نہیں کھوج سکتی۔ دوسروں کی میٹھی میٹھی باتوں میں فوراً آجاتی ہے اور میں ہمیشہ اس سے کہتی کہ تم عریشہ سے ساری باتیں کیوں چھپاتی ہو، اسے بتایا کرو، سمجھایا کرو۔"

نبیلہ نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا۔

مگر وہ کہتی، میں نہیں چاہتی کہ وہ اپنے حقیقی رشتوں سے نفرت کرنا سیکھے... عریشہ! تم نے اپنی محبت کرنے والی ماں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟" عریشہ کے لبوں سے چیخ نکل گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نبیلہ نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"صبر سے کام لو... اب زندگی کو خود برتو گی تو احساس ہوگا۔ ہر وقت چھاؤں بن کر ساتھ رہنے والی ماں نہیں ہے۔ دعا ہی کر سکتی ہوں کہ خدا تمہارے اس گناہ کو معاف کر کے پرسکون زندگی عطا کرے۔"

حمیداں نے اندر جھانکا۔

نجانے اتنا وقت بھی کیسے صبر کیا تھا۔ عریشہ کو روتا دیکھ کر لپک کر اندر آئیں اور عریشہ کو بانہوں میں بھر لیا۔ نبیلہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔ عریشہ روتے روتے بے حال ہونے لگی۔

"اب بس بھی کرو۔ تم تو حد کرتی ہو نبیلہ!"

"میں کیا کر رہی ہوں۔ اسے اس کی غلطی کا احساس دلا رہی ہوں۔" نبیلہ نے بمشکل غصہ ضبط کیا۔

"کون سی غلطی؟" حمیداں چمک کر بولیں۔ "میری بچی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ہمارا احساس کیا۔ آخر خون کا رشتہ تھا۔ اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔ اب عادلہ نے زیادہ ہی دل پر لے لیا تو اس میں بچی کا کیا قصور..."

نبیلہ نے تاسف سے انہیں دیکھا، پھر کھڑی ہو گئیں۔ "چلتی ہوں... کل آؤں گی۔"

نبیلہ باہر نکل گئیں۔

"نہ رو میرا بچہ... نہ رو۔"

"میری امی مر گئیں۔"

"نہ ایسے نہ کہہ... میں ہوں نا۔" وہ اسے ساتھ لگائے پچکارے گئیں۔

✡ ✡ ✡

گہری تاریک قبر تھی۔ جس میں وہ دھنستی جا رہی تھی۔ سانس لیتی تو ریت حلق میں پھنسنے لگتی... کہیں کوئی روزن، روشنی کی کوئی کرن تک نہ تھی۔ اسے لگا، وہ دم گھٹنے سے مر جائے گی۔

وہ ہاتھ ہلانا چاہتی تھی مگر اس کے ہاتھ پاؤں جکڑے ہوئے تھے کسی نادیدہ شکنجے میں۔ وہی شکنجہ اس کے گلے میں پھنسنے لگا تھا۔

وہ پوری قوت سے چیخی۔ ساتھ سوئی فاطمہ ہڑبڑا کر جاگی اور چیختی ہوئی عریشہ کو جھنجوڑ دیا۔

"عرشی... عرشی کیا ہوا؟" وہ فاطمہ سے لپٹ گئی۔

"تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے، ہے نا۔"

وہ اس سے لپٹ کر بس روتی رہی۔

"اسی لیے کہتی ہوں یہاں مت سویا کرو۔ وہاں میرا پلنگ اب خالی ہو جائے گا۔ تم وہیں چلی جاؤ۔"

"اور آپ؟" وہ فاطمہ سے الگ ہوئی۔ "آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

"عریشہ! میری شادی ہو گئی ہے۔" فاطمہ نے گویا اسے یاد دلایا۔

"آپ چلی جائیں گی؟" عریشہ کو فاطمہ کا بہت آسرا تھا۔ مریم لاپروا سی لڑکی تھی۔ فاطمہ نے ہی اسے سنبھالا تھا۔ وہی اس کے ساتھ سوتی۔

"کل چچی کا چالیسواں ہو جائے گا تو میں چلی جاؤں گی۔" فاطمہ بولی۔

وہ کچھ لمحے۔۔۔ بے یقینی سے فاطمہ کو دیکھتی رہی، پھر دوبارہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"عریشہ!" فاطمہ۔۔۔ بے بس سی اسے دیکھ کر رہ گئی۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میری امی میری وجہ سے مریں۔"

"کب تک اس طرح روتی رہو گی عریشہ۔۔۔ ہمت کرو، حوصلہ کرو۔"

عریشہ روتے روتے اس کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ فاطمہ دھیرے دھیرے اس کی پشت تھپکنے لگی۔

"عریشہ! اگر ہمیں اپنی غلطیوں کے نتائج کا احساس پہلے سے ہونے لگے تو ہم وہ غلطی ہی کیوں کریں۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کبھی اپنے بڑوں کے فیصلوں کے خلاف نہ جائیں۔ تمہاری اس غلطی میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ چچی کی موت کی ذمہ دار صرف تم نہیں، ہم سب ہیں۔۔۔ ہماری چشم پوشی، ہماری خود غرضی ہے۔" فاطمہ نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

ساری رات وہ دونوں عادلہ کی باتیں کرتی رہیں۔

رات گزر گئی مگر عریشہ کا احساس جرم وہیں کا وہیں رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹی تھی۔ جب ایک آہٹ کے ساتھ موتیا کے پھولوں کی مدھر مہک اس کے چہار سو پھیل گئی۔ عریشہ نے آنکھوں سے بازو ہٹایا۔

وہ پھول اس کے سرہانے رکھ کر سیدھا ہو رہا تھا۔ سیدھا ہوا تو چاند اس کی پشت پر آنکھ مچولی کھیلنے لگا۔

عریشہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"لائٹ بھی نہیں جلائی، یوں تنہا اندھیرے گھر میں آکر کیوں لیٹ گئی ہو؟" ثوبان چارپائی کے کنارے ٹکا۔ "مریم بلانے آئی تھی، آئیں کیوں نہیں؟"

"یونہی، دل نہیں چاہا۔"

"کیوں؟"

"بس زندگی بے معنی سی لگنے لگی ہے۔ میں چاہوں تو بھی خود کو اس گلٹ سے آزاد نہیں کر سکتی کہ امی کی موت میری وجہ سے ہوئی۔"

آج بہت دنوں کے بعد وہ بہت فرصت سے اس کے پاس بیٹھا تھا۔ عریشہ کا دل چاہا۔ ہر بات اس سے شیئر کرے۔

"اس طرح تو تم مجھے شرمندہ کر رہی ہو۔ آخر یہ سب تم نے میری خاطر ہی تو کیا۔"

"نہیں، میں نے سب کچھ اپنی مرضی سے کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ انجام یہ ہوگا۔" وہ تاسف سے ہتھیلیاں مسلنے لگی۔

ثوبان نے ذرا سا مڑ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"نہیں عرشی! اگر اس دن میں اتنا جذباتی نہ ہوتا۔۔۔ تم سے وہ سب نہ کہتا تو تم یہ قدم کبھی نہ اٹھاتیں۔ میں اس کے لیے خود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا اور اس پر جب تمہیں یوں گم صم، چپ چاپ، اکیلے بیٹھا دیکھتا ہوں تو میرا دل کڑھتا ہے۔۔۔ عرشی! اس خول سے تو نکلو۔۔۔ باہر نکلو، کالج جایا کرو، یوں تو ختم ہو جاؤ گی۔۔۔ دیکھو! تم مجھے بہت پیاری ہو۔ میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔"

وہ اس کی آواز کی گمبھیرتا میں کھوتی چلی گئی۔

اس کی آواز کی لہروں میں بہتے بہتے دور نکلنے لگی۔

ہر دکھ، ہر غم اور ہر احساس ندامت دھلتا چلا گیا۔

"سنو عرشی! اپنے اندر کے ہر احساس ندامت کو اسی رات کے حوالے کر دو۔ مجھے اس رات کے بعد وہی عریشہ چاہیے۔ ہنستی مسکراتی، پراعتماد، پیاری سی عرشی۔۔۔ ہوں۔"

عریشہ کی گردن لاشعوری طور پر اثبات میں ہلی۔

"اب اٹھو، سب لوگ انتظار کر رہے ہیں۔" وہ کھڑا ہوا۔

عریشہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

ٹھیک تو کہتا ہے ثوبان۔ میرے ٹھہر جانے سے کیا ہوگا۔ زندگی تو آگے ہی آگے چلتی جائے گی۔ دنیا کے کام تھوڑی رکیں گے۔ یہ نقصان عظیم صرف میرا ہے۔ فاطمہ آپی چھ دن رکیں، سسرال چلی گئیں۔ مریم بدستور کالج جاتی ہے۔ میرے یوں خود کو تنہا کر لینے سے امی تو واپس نہیں آئیں گی۔

"عریشہ! اس طرح تم چچی کی روح کو بھی تکلیف دے رہی ہو۔" ثوبان نے اپنا ہاتھ پھیلایا۔

عریشہ نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور سہارے سے کھڑی ہو گئی۔

دونوں ساتھ ساتھ چلتے حمیداں کے پاس آگئے۔

☼ ☼ ☼

صبح وہ کالج جانے کے لیے تیار ہو کر کچن میں آئی تو پراٹھے بناتی تائی کے ساتھ ساتھ مریم نے بھی حیرت سے اسے دیکھا۔

"تائی امی! مجھے بھی ناشتا دیں۔" وہ خود کو بشاش ظاہر کر رہی تھی۔

"پر عریشہ! تمہارا تو نام بھی کٹ گیا ہے۔" مریم نے کہا۔

"پرنسپل سے بات کروں گی، شاید کوئی رستہ نکل آئے۔" وہ پیڑھی کھینچ کر بیٹھی۔

"اچھا۔۔۔ اچھا جیسے تمہارا دل مانے۔ میں تو سوچا تھا کہ تم گھر پر ہوگی تو کچھ میرا بھی ہاتھ بٹا دیا کرو گی۔ چلو اچھا۔" نجانے کیوں وہ مایوس سی ہو گئی تھیں۔ نعمان نے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا۔

"چلو اچھا ہے، تمہارا دل بھی بہل جائے گا۔"

ناشتا کر رہی تھی۔ جب وین آگئی۔ وہ مریم کے ساتھ دوپٹہ اوڑھتی ڈیوڑھی سے گزری تو ابرار نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آج وہ بہت دنوں کے بعد نظر آئی تھی۔

"آج مجھے بھی ناشتا ملے گا یا خود ہی ٹھونستی رہو گی۔" برکت حسین کی آواز پر وہ بری طرح چونکا۔ عریشہ جا چکی تھی۔

"ہاں! میں نوکر لگی ہوں، صبح سے شام تک روٹیاں پکا کر تمہارا دوزخ بھرتی رہوں اور کسی کو تو ہاتھ ہلانا بھی گوارا نہیں۔" حمیداں چلائیں۔ انہیں نجانے کس بات پر غصہ آرہا تھا۔ ناشتا کرتے نعمان نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔

"سارے ٹبر کو کھلا دے گی۔ جہاں میری باری آئی۔ وہیں نخرے شروع۔ ناشتا لاتی ہو، یا کردوں چولہے میں سر۔" وہ حلق کے بل چلائے۔

"بڑا آیا میرا سر چولہے میں دینے والا۔"

"اماں! میرا خیال ہے اب تم سے کام نہیں ہوتا۔" نعمان نے کہا۔

"ساری زندگی ہڈیاں گھسائی ہیں۔ اب اس عمر میں بھی آرام نہیں۔" حمیداں نے غصے سے پیڑا پرات میں پٹخا۔

"جب تک فاطمہ تھی، کسی بات کی فکر ہی نہ تھی۔ دوسری تو بس دشمن اناج کی ہے۔"

"تو لے آؤ نا فاطمہ جیسی ہاتھ بٹانے والی۔" وہ دھیرے سے اپنی مطلب کی بات کرنے لگا۔ حمیداں کی چھٹی حس بول اٹھی۔

"کیا مطلب؟"

"ارے بھئی! بھولے آؤ۔ ویسے بھی اماں! اب تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" وہ ہنسا۔

"تجھے اپنی شادی کی بڑی فکر ہے۔"

"میں تو تمہاری وجہ سے کہہ رہا تھا۔"

"کر دوں گی۔ کنوارا نہیں رکھوں گی۔ اتنا اتاولا نہ ہو۔"

نعمان جز بز ہو کر رہ گیا۔ دنیا جہان کی ماؤں کو بیٹوں کی شادی کا ارمان ہوتا ہے۔ یہاں الٹا چکر چل رہا تھا۔ وہ بددل ہو کر ناشتا ادھورا چھوڑ کر اٹھ گیا۔

"ہونہہ! خوب سمجھتی ہوں تیرے ارادے۔" وہ

استانی بیاہ لاؤں۔ مجھے کیا بٹھا کر کھلائے 'خود اسی کو پکا کر دینا پڑے گا۔"

"میں نے کہا۔"

"ارے لاتی ہوں۔ ذرا صبر تو کرو۔" حمیداں نے جھنجلا کر برکت حسین کی دھاڑ کو درمیان میں ہی روک دیا۔

"اماں! آپ ہی سے اتنا لڑ کیسے لیتے ہیں؟" ابرار ہنستے ہوئے کھڑا ہو گیا۔

"اب تو عادت ہو گئی ہے۔" وہ لاپرواہی سے بولے۔ "تم ناشتا نہیں کرو گے؟"

"نہیں! مجھے دیر ہو رہی ہے۔" وہ سنجیدگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ اس کی کوشش تھی۔ وہ ان لوگوں پر کم سے کم بوجھ بنے۔

"مرضی تمہاری۔ لگتا ہے خود ہی لینا پڑے گا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گئے۔

☼ ☼ ☼
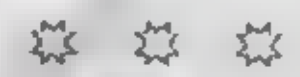
فاطمہ نے آتے ہی گھر سنبھال لیا تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح محسن چاہتا تھا۔ طیبہ اور جمال بھی ابھی یہیں تھے۔ نبیلہ نے پہلے ہی جمال کو سمجھا دیا تھا۔

"میں طیبہ کے منہ سے محسن اور فاطمہ کے حوالے سے کوئی فضول بات نہ سنوں۔ یہ خالصتاً میرا فیصلہ ہے' جسے محسن نے بخوشی قبول کیا۔ اب جتنے دن تم اور طیبہ یہاں ہو اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔"

اور جمال نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ سو دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے کے سوا ابھی تک اس کی زبان بند ہی تھی' مگر کبھی کبھی ان سب کو ہنستے بولتے دیکھ کر اسے جلن سی ہونے لگتی۔ اپنا آپ پرایا سا لگتا۔

طیبہ کچن میں آئی تو فاطمہ ہولے ہولے گنگناتے ہوئے بریانی بنانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہمیشہ سیدھی مانگ نکال کر سادہ سی چوٹی بنانے والی فاطمہ کی وضع قطع ہی بدل گئی۔ میرون کڑھائی والے سوٹ میں ہلکے پھلکے میک اپ کے ساتھ' سیدھے بالوں کی بھی ہلکی سی کٹنگ کروائی گئی تھی۔ اندرونی خوشی نے جو چمک فاطمہ کے چہرے کو عطا کی تھی۔ اس کا مقابلہ طیبہ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ فاطمہ آہٹ پر مڑی۔

"کچھ چاہیے بھابھی!"

"مجھے کچھ چاہیے ہو گا تو میں خود لے لوں گی۔ جتنا یہ تمہارا گھر ہے' اتنا ہی میرا بھی ہے۔ بلکہ تم سے زیادہ میرا حق بنتا ہے۔ آخر میں اس گھر کی بڑی بہو ہوں۔"

"جی! میں نے تو یونہی پوچھ لیا تھا۔" فاطمہ خجل سی ہو گئی۔

"ویسے طیبہ بھابھی!" اندر آتے محسن نے ان کی بات سن لی تھی۔ "کیسی عجیب سی بات ہے۔ دوسروں کے ساتھ ساتھ آپ کو خود کو بھی یاد دلانا پڑتا ہے کہ آپ اس گھر کی بڑی بہو ہیں۔"

فاطمہ نے مسکراہٹ چھپانے کو رخ موڑ لیا۔ طیبہ کا مقابلہ بھی اس گھر میں صرف محسن ہی کر سکتا تھا۔

"ویسے لوگ اتنا ڈھونگ کیوں رچاتے ہیں؟"

"کیسا ڈھونگ؟"

"یہی 'سب کو یہ تاثر دیتے ہو کہ یہ ارینج میرج ہے' حالانکہ تم دونوں کو دیکھ کر لگتا تو نہیں۔" طیبہ نے طنز سے کہا۔ فاطمہ نے گھبرا کر محسن کو دیکھا۔

محسن ایک بازو فاطمہ کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے ہنس دیا۔

"ہے تو یہ ارینج میرج ہی۔ لیکن آپ چاہیں تو اپنے دل کی تسلی کے لیے اسے ایک خوبصورت سی لو اسٹوری میں بدل دیں۔ آپ تو یوں بھی ان کاموں میں ماہر ہیں۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے۔" طیبہ کو غصہ آ گیا۔

"ارے' میں تو بتانا بھول گیا۔ آپ کو جمال بھائی بلا رہے ہیں۔"

طیبہ دونوں کو گھور کے چلی گئی۔

"یہ پھاپھا کٹنیوں والی عادتیں کہاں سے لی ہیں آپ نے۔" فاطمہ نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"محترمہ! جو جیسا ہو' اس کے ساتھ ویسا ہی بی ہیو کرنا چاہیے۔"

"جی نہیں' برائی کا بدلہ ہمیشہ نیکی سے دیتے ہیں۔ اس سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔"

"اچھا۔ تو یہ میری کس برائی کا بدلہ ملا ہے۔" وہ اس کی ناک چھو کر شرارت سے پوچھنے لگا۔

"فضول مت بولیں۔" فاطمہ رخ بدل گئی۔

"فاطمہ' تم خوش ہو؟"

"بہت۔" فاطمہ نے بلا جھجک کہا۔

"ہم سے کوئی شکایت تو نہیں؟"

"نہیں بس ایک ہلکی سی الجھن ہے۔"

"کیسی الجھن؟"

"یونہی' کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے' جیسے چھپی ہوئے دل میں کوئی بات ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ روایتی ساس بنتی جا رہی ہیں؟" محسن سنجیدہ ہوا۔

"ارے نہیں! وہ تو بہت اچھی ہیں۔ بس یونہی لگتا ہے جیسے ان کے دل میں کوئی گرہ ہے۔ وہ کہتی تو نہیں ہیں۔ بس فیل ہوتا ہے۔" وہ الجھ کر بولی۔

"امی کے دل میں اگر کوئی بات ہو تو وہ دل میں نہیں رکھتیں۔ بہت اچھے طریقے سے شیئر کر لیتی ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتی ہیں کہ بدگمانی اور غلط فہمی چھوٹے چھوٹے سنپولیے ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم اپنے اندر پالتے رہیں تو وہ اژدھے بن کر ہماری ساری خوشیوں کو اور خوبصورت رشتوں کو نگل لیتے ہیں۔ اس لیے ڈونٹ وری! ان کے دل میں اگر تمہارے حوالے سے کوئی بات ہوئی تو وہ تم سے ضرور شیئر کریں گی۔" محسن نے تسلی دی۔

"نہیں' یونہی بس فیل ہوا تو میں نے کہہ دیا۔" فاطمہ شرمندہ ہو گئی۔

"تم نے بالکل ٹھیک فیل کیا ہے فاطمہ!" نبیلہ کی آواز پر وہ دونوں ایک ساتھ پلٹے۔

☼ ☼ ☼

جمیلہ کو کسی کروٹ چین نہیں تھا۔ اس کا بیٹا دوسروں کے گھر میں رہ رہا تھا۔ چھوٹی موٹی نوکریوں کے لیے دھکے کھاتا پھر رہا تھا۔ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے دن میں ٹیوشن پڑھاتا تھا اور رات کو جاگ جاگ کر اپنی پڑھائی کرتا تھا۔

اور جمیلاں کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں سے اتنے پیسے لے آئے کہ اس کا بیٹا اپنی فیسیں آرام سے بھر سکے۔ بہت سوچ کر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئی۔

اصغر دوپہر کی روٹی کھا کر واپس زمینوں پر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"بھائی! میری بات سن کر جانا۔" وہ اس کے کمرے کے دروازے پر آ کھڑی ہوئی۔ لسی ڈالتی کبریٰ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ابھی کون سا نانا باقی رہتا ہے؟" وہ تنک کر بولی تھی۔

"میں نے اپنی بھینس بیچنی ہے۔ اگر تم نے رکھنی ہے تو اس کی قیمت لگوا لو۔ نہیں تو کسی اور سے بات کر لوں۔" کبریٰ کی بات نظر انداز کر کے جمیلاں نے کہا۔

کبریٰ اور اصغر کی نظریں آپس میں ٹکرائیں۔

"بھینس کیوں بیچنی ہے؟" کبریٰ نے سوال کیا۔

"بلو کو کالج کی فیس دینی ہے۔ جو ہزاروں میں ہے۔"

"ایک بار بھینس بیچے گی۔ بعد میں کیا کرے گی؟" اصغر نے طنز سے پوچھا۔

"بعد کا اللہ مالک ہے۔ ویسے تمہیں بھی پتا ہے۔ چھ ماہ پہلے اس کی قیمت ایک لاکھ پینتیس ہزار لگی تھی۔ آگے تو خود دیکھ لے۔" جمیلاں کہہ کر باہر نکل گئی۔

"میرا خیال ہے' خود ہی رکھ لیتے ہیں۔ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔ بڑی نسل کی بھینس ہے۔" اصغر نے کبریٰ سے رائے مانگی۔

"اس کا بس چلے تو بیٹے کی پڑھائی کے پیچھے خود کو بھی بیچ دے۔"

کبریٰ نے جل کر گلاس پٹخا۔

☼ ☼ ☼

"اماں!" مریم اندر آئی۔ وہ نعمان کے ساتھ کچھ

حساب کتاب کررہی تھیں۔

"وہ ماسٹر صاحب کے گھر سے آمنہ خالہ آئی ہیں۔"

"اے لو۔۔۔ خود ہی رشتہ لے کر آگئی۔"

حمیداں نے حسب فطرت سوچا۔ جبکہ نعمان سب حساب کتاب چھوڑ کر کھڑا ہوگیا۔

"وہ کیلی آئی ہیں؟" اس کے سوال پر حمیداں نے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"اور کیا پورے ٹبر کو اٹھا کر ساتھ لے آتی؟"

"نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے۔" وہ گڑبڑایا پھر غصے سے مریم سے بولا۔ "انہیں باہر کیوں کھڑا کیا ہے؟ اندر لے آؤ۔"

"باہر کہاں کھڑا کروں گی۔۔۔ میں نے کمرے میں بٹھا دیا ہے۔"

حمیداں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی دوسرے کمرے میں آئیں۔ اتنے تپاک سے حمیداں نہیں ملی۔ جتنے تپاک سے نعمان نے ان کی خیر خیریت دریافت کی۔ بلکہ وہیں براجمان ہوگیا۔

"عادلہ بہن کا پتا چلا تھا۔ میں تب ہی آنا چاہتی تھی' مگر ان دنوں میری طبیعت بہت خراب تھی۔ ہسپتال رہنا پڑا۔" انہوں نے متانت اور سادگی سے کہا۔

[illegible] حمیداں کا [illegible]

"اور آپ دوائیاں تو اچھی طرح لے رہی ہیں ناں؟" نعمان نے پوچھا۔

حمیداں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائیں۔

"ہاں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے۔ اب تو میں ٹھیک ہوں۔" نعمان کو جواب دے کر وہ پھر سے حمیداں کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"ماشاء اللہ! سمجھ دار اور نیک بیٹا ہے آپ کا' مشکل کی گھڑی میں ہمارا بہت ساتھ دیا۔"

"اچھا؟ اس نے تو کبھی نہیں بتایا کہ اس کا آپ کے گھر اتنا آنا جانا ہے۔" حمیداں نے طنز سے کہا۔

"اتنا تو نہیں۔۔۔ بس کبھی کبھار ہی۔" نعمان جز بز ہو کر کھڑا ہوا۔

"میں چائے کا کہہ دوں۔" وہ وہاں سے ہٹا۔ مریم پہلے ہی چائے بنا رہی تھی۔ اسے روک کر کہ میں بیکری سے کچھ سامان لے آؤں' پھر چائے بنانا کہہ کر چلا گیا۔

"بیٹی کی شادی اچھے طریقے سے ہوگئی؟" گفتگو تعزیتی کلمات سے نکل کر روز مرہ پر آگئی۔

"ہاں۔۔۔ ہوگئی۔۔۔ آپ کی تو ایک ہی بیٹی ہے نا۔ کیا کرتی ہے۔" حمیداں نے یکسر انجان بن کر پوچھا۔

"جی۔۔۔ اسکول میں پڑھاتی ہے۔ گورنمنٹ جاب ہے۔"

"ایک تو یہ آج کل کی لڑکیوں کو نوکری کی پڑ جاتی ہے۔۔۔ چار جماعتیں پڑھی نہیں کہ گھر سے نکلنے کی پڑ گئی۔ اللہ بخشے عادلہ بھی پڑھاتی تھی۔ اپنی چھوٹی سی بچی کو میری گود میں پھینک کر خود اسکول کو نکل جاتی۔ سچی بات ہے' ایسی عورتوں کے بچے تو پھر میری تیری گود میں ہی پلتے ہیں۔"

حمیداں کا لہجہ و انداز اس پر یہ نادر خیالات۔ آمنہ اگلی بات کرنا بھی بھول گئیں۔

"کہیں رشتہ کیا لڑکی کا؟"

"نہیں۔۔۔ بس دیکھ رہی رہے ہیں۔" ان کا لہجہ خود بخود مدھم ہوگیا۔

"دیکھنے میں ہی وقت نہ نکال دینا۔۔۔ ورنہ لڑکیاں گھر بیٹھے ہی بوڑھی ہوجاتی ہیں۔ میں نے تو وقت پر فاطمہ کو رخصت کردیا۔۔۔ اب جیسے ہی مریم کا رشتہ جڑا' اس کا بھی کردوں گی۔۔۔ باقی رہ گئے لڑکے' تو ان کی مجھے فکر نہیں۔۔۔ آج کل تو ویسے ہی ماں باپ نے اپنی آنکھیں بند کر کے اپنی لڑکیوں کو آگے کر رکھا ہے کہ لو خود ہی بر ڈھونڈ لو۔ اور لڑکیاں آگے پیچھے پھر کر خود ہی سارا معاملہ سیٹ کرلیتی ہیں۔"

آمنہ خاتون کی رنگت زرد پڑ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحت اشتیاق

شہریار خان معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھنے والے بے مثال ذہانت اور سحر انگیز شخصیت کے مالک ایک مغرور شخص ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہیں اور بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔ ان کی بیوی آمنہ خوب صورت اور ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہیں مگر گھریلو زندگی گزار رہی ہیں۔ سکندر اور زین ان کے دو بیٹے ہیں۔ سکندر اپنے باپ کا عکس ہے اس لیے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ زین ذہانت میں سکندر سے کم ہے۔ باپ کے امتیازی سلوک کی وجہ سے سکندر سے خائف رہتا ہے۔

محمود خالد نے عیسائی عورت وٹوریا سے شادی کی مگر دونوں میں نبھ نہ سکی اور لیزا اور سیم کی پیدائش کے بعد دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ سیم اپنے باپ کی طرح ذہین اور خوب صورت تھی۔ علیحدگی کی صورت میں اسے اپنی ماں کے ساتھ رہنا پڑا۔ لیزا ذہانت و خوب صورتی میں درمیانے درجے کی تھی۔ وہ محمود خالد کے پاس رہی۔ وٹوریا نے اربن بزنس مین سے دوسری شادی کی اور میلان چلی گئی۔ نشے کی حالت میں وٹوریا کا دوسرا شوہر سیم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد لیزا کو اپنے والدین سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ محمود خالد کو چھوڑ کر اپنی نینی کے ساتھ روم شفٹ ہو جاتی ہے۔ محمود خالد عائشہ سے دوسری شادی کر کے پاکستان شفٹ ہو جاتے ہیں۔ محمود خالد اپنا کاروبار بچانے کے لیے سیم کی شادی اس سے پندرہ سال بڑے ہاشم اسعد سے کروا دیتے ہیں۔ لیزا کو اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے پاکستانی مردوں سے نفرت ہو جاتی ہے۔ لیزا ایک مصورہ ہے۔ روم میں ملازمت کے سلسلے میں آئے ہوئے سکندر سے اس کی ملاقات ہوتی ہے۔ وہ

مکمل ناول

سکندر کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوتی ہے اور اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے مگر سکندر انکار کر دیتا ہے۔

زین کی زندگی میں ذہین اور حسین ام مریم آتی ہے۔ زین اسے پرپوز کرتا ہے۔ شہریار خان بھی راضی ہو جاتے ہیں یوں ان دونوں کی منگنی ہو جاتی ہے۔ منگنی کے بعد زین ام مریم کو لے کر اپنے والدین کے پاس آتا ہے۔ وہاں ام مریم کی سکندر سے ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور احترام سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس بات پر زین، سکندر سے مزید برگشتہ ہو جاتا ہے۔ اسی دوران گھر والوں کی عدم موجودگی میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے مگر بروقت زین اور شہریار خان کی آمد سے ام مریم بچ جاتی ہے۔

ام مریم پر مجرمانہ حملہ کرنے پر شہریار سکندر کو اپنے گھر سے نکال دیتے ہیں اور اس سے ہر تعلق توڑ دیتے ہیں مگر بی بی جان شہریار، سکندر کو فون کر لیتی ہیں۔ زین کی شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بیٹا علی ہے۔

سکندر کو احساس ہو جاتا ہے کہ لیزا بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ اسے اپنا پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ تصویر بنانے کے دوران دو مقامی لڑکے ان دونوں کو لوٹنے کی کوشش کرتے ہیں مگر سکندر ان سے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگاتا ہے۔ لیزا آہستہ آہستہ اس سے محبت کرنے لگتی ہے۔ سکندر روم سے ہمیشہ کے لیے چلا آتا ہے۔ آخری بار وہ لیزا کے گھر دعوت میں جاتا ہے۔ لیزا اس کے چلے جانے سے بہت غمگین ہو جاتی ہے۔ نینی کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پاکستانی مردوں سے نفرت کرنے کے باوجود لیزا سکندر سے محبت کرنے لگی ہے۔ لیزا سیم کو فون کر کے اپنی ناکام محبت کے بارے میں بتا دیتی ہے۔

چھٹی قسط

"تمہارا کوئی قصور نہیں ہے زین! تم مجھ سے معافی مت مانگو۔" مریم کی رندھی آواز اس نے سر جھکائے ہوئے ہی سنی۔ چند سیکنڈز کے لیے ان کے درمیان پھر خاموشی حائل ہوئی تھی۔

"میں آج واپس جا رہی ہوں زین!" مریم کے اس جملے نے اسے بے اختیار نظریں اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ مریم کے چہرے پر بکھرے آنسو دیکھ کر اس کا دل تڑپ کر رہ گیا تھا۔ یہ آنسو اس لڑکی کو زین شہریار کے گھر پر زین شہریار کے بھائی ہی نے دیے تھے، وہ کس منہ سے ان آنسوؤں کو صاف کر پاتا؟؟

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں مریم!" ایک پل اس کے چہرے کو دیکھتے رہنے کے بعد وہ آہستگی سے بولا۔

"نہیں زین! میں تمہارے ساتھ نہیں جا پاؤں گی۔" ام مریم کا لہجہ دکھ بھرا تھا۔

"کیوں مریم؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔ مریم نے دکھ بھری نظریں اس پر سے ہٹائی تھیں۔ وہ اپنی انگلی سے منگنی کی انگوٹھی اتار رہی تھی۔

"تم میری پہلی اور آخری محبت ہو زین! میں ساری زندگی تم سے محبت کرتی رہوں گی مگر کل شام جو ہوا، اس کے بعد اب میں خود میں اتنا حوصلہ نہیں پاتی کہ اس رشتے کو برقرار رکھ سکوں، اس گھرانے کی بہو بن سکوں۔ مجھے معاف کر دینا زین! مگر میں تمہارے ساتھ اپنے رشتے کو قائم نہیں رکھ سکوں گی۔" ام مریم نے دکھ سے اسے دیکھتے ہوئے انگوٹھی بیڈ پر ان دونوں کے درمیان خالی جگہ پر رکھ دی تھی۔ وہ صدمے سے گنگ چپ چاپ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھی، وہ غلط نہیں کر رہی تھی۔ اتنا سب کچھ ہو جانے کے بعد کوئی عزت دار لڑکی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس فیملی کا حصہ بنے جہاں کوئی اس پر بری نظر رکھتا ہے۔

"مریم! مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے ہی گھر پر تمہیں تحفظ نہ دے سکا، پلیز مجھے معاف کر دو۔" وہ بھرائی آواز میں بولا۔

"تم خود کو کوئی الزام مت دو زین! تمہاری کوئی غلطی نہیں ہے۔ تم بہت اچھے ہو زین! میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں کہ تم اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔"

"جب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے تو پھر مجھے چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو مریم؟ میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔ کیا اب کیمپس میں بھی اجنبیوں کی طرح ملا کرو گی؟"

وہ اور صدمے سے اس کی آواز قدرے بلند ہوئی تھی۔ ام مریم نے دکھ سے بھری ایک گہری سانس لی تھی۔ وہ اپنے گالوں پر بکھرے آنسو صاف کر رہی تھی۔

"میں لاس اینجلس نہیں جا رہی۔ میں اپنے بابا کے پاس واپس جا رہی ہوں۔ میں ٹوٹ گئی ہوں زین! ابھی بہت عرصہ لگے گا مجھے خود کو سنبھالنے میں۔ میرے خواب بکھر گئے ہیں۔ پتا نہیں میں اپنی اسٹڈیز پھر سے بھی شروع کر بھی پاؤں گی کہ نہیں۔"

وہ لاس اینجلس نہیں جا رہی تھی، وہ تو ہمیشہ کے لیے جدا ہونے کی بات کر رہی تھی۔ خدایا وہ اسے کیسے روکے؟ کیا کہے؟

ام مریم اس کے پاس سے اٹھ گئی تھی۔ "آئی لو یو زین!" سرگوشی کی طرح اس کی یہ آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"مت جاؤ مریم! پلیز مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔ میں تمہارے بغیر جی نہیں پاؤں گا۔"

وہ یک دم ہی اٹھا تھا، اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ خود پر سے اختیار کھوتی ام مریم اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔

"زین! ہماری قسمت میں جدائی لکھی ہے۔ میں یہ کبھی بھی نہیں چاہوں گی کہ تم میری خاطر اپنے ماں باپ اور بھائی کو چھوڑ دو اور میری مجبوری یہ ہے زین کہ میں اب تمہاری فیملی کا حصہ نہیں بن پاؤں گی۔ میں اس گھر کی بہو نہیں بن سکتی جہاں میری عزت۔" وہ ہونٹ بھینچ کر چپ ہوئی۔

"پلیز مجھے مت روکو۔ پلیز مجھے مجبور مت کرو ورنہ میں اس طرح ٹوٹوں گی کہ پھر زندگی بھر خود کو جوڑ نہیں پاؤں گی۔" وہ بھرائی آواز میں جیسے شدید تکلیف سے بول رہی تھی۔ وہ بالکل بے دم سا ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈز اس کے گلے لگ کر روتے رہنے کے بعد ام مریم اس سے الگ ہوئی تھی۔ اس نے اپنے آنسو خشک کیے تھے، وہ جیسے کوشش کر کے خود کو مضبوط بنا رہی تھی۔ پھر جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مضبوط تھا، اٹل تھا، فیصلہ کن تھا۔

"اگر تم بھی مجھ سے اسی طرح سچی محبت کرتے ہو زین! جس طرح میں تم سے کرتی ہوں تو مجھے مت روکو مجھے جانے دو۔ یہ فیصلہ آسان فیصلہ نہیں ہے زین! پلیز اس جدائی کو میرے لیے مزید کٹھن مت بناؤ۔"

وہ کرب سے اپنے لب کچلتی اسے اور خود کو جدائی کی سزا سنا رہی تھی۔

وہ درد اور غم سے نڈھال دیکھتا رہ گیا تھا اور بے آواز آنسو بہاتی ام مریم اس کے گھر سے چلی گئی تھی، اس کی زندگی سے چلی گئی تھی۔ اپنے کمرے کی بالکونی سے اس نے اسے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ سخت سردی میں بالکونی میں کھڑا تھا۔ اسے وہاں اسی طرح ساکت کھڑے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ اس کی پتھرائی ہوئی نظریں اپنے گیٹ پر اسی جگہ جمی تھیں جہاں سے باہر نکلتے اس نے ام مریم کو آخری بار دیکھا تھا۔

کل شام کے بعد سے اس نے اپنے ماں اور باپ کو نہیں دیکھا تھا۔ کل شام سے امو جان اپنے کمرے میں اور شہریار خان اپنی اسٹڈی میں بند تھے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ام مریم نے ان دونوں سے جا کر جب اپنے جانے کا کہا ہو گا تو انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کیا کہا ہو گا یا وہ دونوں بھی اس کی طرح کچھ بھی کہہ نہیں پائے ہوں گے؟

شاید سہ پہر ہو چلی تھی جب اس نے اپنے ملازم کو بھاگ کر آتے گیٹ کھولتے ہوئے دیکھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہونے والے کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

وہ سکندر تھا۔ اس سے اس کا سب کچھ چھین لینے

کے بعد وہ پھر یہاں موجود تھا؟ اسے ملازم اور سکندر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ملازم اسے وہیں رکنے کا کہہ کر اندر بھاگا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ شہر یار خان کو بلانے گیا ہے۔ شاید انہوں نے ملازمین کو کوئی ہدایت کر رکھی تھی کہ سکندر کو گھر میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ مگر کیا جو شہریار خان نے کل کہا تھا وہ آج بھی اس پر کاربند رہیں گے؟ یا آج اپنے چہیتے بیٹے کو ان بکھرے حالوں میں دیکھ کر ان کی پدرانہ شفقت جوش مارے گی اور وہ سکندر کے تمام گناہ معاف کر کے اسے پھر گلے سے لگا لیں گے؟ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا۔ اس بے غیرت انسان کی ہمت کیسے ہوئی تھی پھر سے یہاں آنے کی؟ اسی کی وجہ سے ام مریم اس کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ ام مریم کو یہ یقین نہیں دلا سکا تھا کہ جس گھر میں وہ اور مریم رہیں گے۔ وہاں سکندر شہریار کا وجود تو کیا اس کا نام و نشان تک نہ ہو گا۔ مگر اپنے باپ سے وہ یہ یقین مانگنا چاہتا تھا۔

وہ بغیر کسی ڈر اور ہچکچاہٹ کے نیچے جا رہا تھا۔ اگر اس کا باپ سکندر کو گھر میں داخل ہونے دیتا ہے تو باپ سے وہ دو بدو بات کرنے آن سے یہ کہنے کہ سکندر کے لیے ان کا غصہ بس ایک دن کے لیے تھا؟ اتنی آسانی سے انہوں نے اپنے ولی عہد کو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر واپس گھر میں داخلے کی اجازت دے دی؟ ساری زندگی انہوں نے اس میں اور سکندر میں فرق رکھا ہے اور آج بھی رکھ رہے ہیں۔ اگر انہوں نے سکندر کو واپس آنے دیا تو وہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ شہریار خان فیصلہ کر لیں کہ ان کے لیے ان کا کون سا بیٹا زیادہ اہم ہے۔ وہ جس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا وہ جو گناہ گار ہے۔

وہ لونگ روم کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس سے پہلے شہریار خان وہاں پہنچ چکے تھے۔ وہ سکندر کے بالکل سامنے کھڑے تھے۔ وہ پیچھے ہی رک گیا تھا۔

"کیوں آئے ہو تم یہاں؟ کیا کل میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی تھی؟" اس نے اپنے باپ کو چلاتے سنا۔

"میں بے گناہ ہوں پاپا! اس لڑکی کا مجھ پر لگایا ہر الزام جھوٹا ہے۔ وہ ایک بد کردار لڑکی ہے۔ وہ میرے پیچھے پڑی تھی۔ میں نے اس کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس بات کا اس نے مجھ سے انتقام لیا ہے۔ زین ایک بیچ لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کرنے جا رہا تھا پاپا۔"

"اب تو وہ چلی بھی گئی ہے سکندر شہریار! اب تو جھوٹ بولنا اس معصوم پر بہتان باندھنا چھوڑ دو۔ وہ اپنی صفائی دینے یہاں رکی تک نہیں۔ اب کیوں کر رہے ہو اس کے خلاف یہ گھٹیا الزام تراشی؟ بھائی ایسے ہوتے ہیں؟ مجھے تو بھائی کے نام سے اس رشتے ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔" اس کے اندر سسکتی محبت شدت سے رو پڑی تھی۔ وہ شدید ترین نفرت کے عالم میں سکندر کو جھوٹ پر جھوٹ اور بکواس پر بکواس کرتے سن رہا تھا۔

"کہہ چکے تم؟" شہریار خان نے سخت اور بے لچک لہجے میں اس سے پوچھا۔

ان کے چہرے کی سختی سے اسے یہ اطمینان ملا تھا کہ وہ اپنے کل کے فیصلے پر قائم ہیں۔

"میرا فیصلہ آج بھی وہی ہے جو کل شام تھا۔ بہت امیدیں وابستہ کی تھیں میں نے تم سے بہت خواب دیکھے تھے تمہارے لیے۔ مگر اپنی ہونے والی بھابھی کی عزت پر ہاتھ ڈال کر تم میری نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گر چکے ہو سکندر! میرے دل اور میرے گھر میں اب تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں تمہیں عاق کر چکا ہوں۔ اب تمہارا جہاں دل چاہتا ہے جاؤ۔ جتنی دل چاہتا ہے عیاشیاں کرو۔ مگر اپنے پیسے سے اپنے بل بوتے پر۔ میں نے ساری زندگی اصولوں کی بات کی ہے اور میرے اصول یہ کہتے ہیں کہ میں ایک rapist اور رشتوں کی دھجیاں بکھیرنے والے کو اپنے گھر میں جگہ نہ دوں۔ میرے اصول' میری خاندانی عزت و نجابت مجھے اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتی کہ میں تم جیسے بد کردار اور عیاش کو اپنے گھر کی دہلیز بھی پار کرنے دوں۔ اگر تم واقعی میرا خون ہو' ذرا سی بھی غیرت تم میں باقی بچی ہے تو آج کے بعد مجھے اپنی منحوس شکل کبھی مت دکھانا۔"

شہریار خان حلق کے بل پوری قوت سے گرج رہے تھے۔ سکندر کو اپنے سامنے دیکھ کر ان کا غصہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کا باپ وہ کہہ رہا تھا جو وہ سننا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے پیچھے لونگ روم کا دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔

اس نے گردن گھما کر دیکھا۔ بغیر گرم شال اور بغیر سلیپرز کے امو جان اندر سے بھاگتی ہوئی باہر نکلی تھیں۔ شاید شہریار خان کے چلانے کی آواز انہیں کمرے تک سنائی دے گئی تھی۔ تڑپ کر روتی وہ اسے نظر انداز کر کے شہریار خان اور سکندر کے پاس چلی گئی تھیں۔ وہ پیچھے اسی طرح الٹ تنگ کھڑا تھا۔

"سنا نہیں تم نے؟ دفع ہو جاؤ یہاں سے نکل جاؤ میرے گھر سے۔" شہریار خان سکندر کو وہیں کھڑا دیکھ کر غصے سے دھاڑے تھے۔

"شہریار پلیز' ایسا مت کریں۔ سکندر کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ رہی ہوں۔ پلیز میرے بچے کو گھر سے مت نکالیں۔"

امو جان نے روتے ہوئے التجا کی تھی شہریار خان سے۔ ماں کے آنسوؤں سے اسے تکلیف پہنچی تھی مگر اس سے بھی زیادہ تکلیف ماں کے منہ سے نکلے سکندر کی حمایت لیے جملوں سے پہنچی تھی۔ جو غلط تھا گناہ گار تھا' اس کی ماں اس کی طرف داری کر رہی تھی؟ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

شہریار خان نے انہیں غیض و غضب سے گھورا تھا "کوئی ضرورت نہیں ہے ایک زانی کے لیے رونے اور اس کی طرف داری کرنے کی۔ خبردار جو میرے گھر میں اس Rapist کے لیے ایک آنسو بھی بہایا گیا یا اس کی حمایت میں ایک لفظ بھی بولا گیا۔"

انگلی اٹھا کر وہ سکندر کی طرف نفرت اور حقارت سے اشارہ کر رہے تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار اپنے باپ کی اصول پسندی اچھی لگی تھی۔

"ٹھیک ہے' اس سے غلطی ہو گئی ہے شہریار! مگر ابھی بچہ ہے۔ آپ اس سے بات چیت بند کر دیں' اس

پر سختی کریں‘ اسے ماریں پیٹیں‘ ہر آسائش اور ہر سہولت اس سے واپس لے لیں مگر پلیز! اسے یوں گھر سے نہ نکالیں۔“ امو جان نے روتے ہوئے سکندر کو اپنے ساتھ لگایا تھا‘ وہ شہریار خان سے التجا کر رہی تھیں۔

”آمنہ! میں تمہاری بکواس بہت برداشت کر رہا ہوں۔ تو اس بے غیرت کے پاس سے۔ کوئی تمغہ جیت کر نہیں لایا ہے یہ ہمارے لیے جو اسے گلے لگائے کھڑی ہو۔“ شہریار خان ان کے اوپر دھاڑے تھے۔

”شہریار! ایسا مت کریں۔ پلیز اسے اندر آنے دیں۔“

”اب تم مجھے بتاؤ گی کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ بیوی ہو‘ بیوی بن کر اپنی اوقات میں رہو۔“ شہریار خان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ شدید ترین اشتعال میں تھے۔

”بیوی کے ساتھ ماں بھی تو ہوں۔ میرا بچہ پتا نہیں کل سارا دن کہاں کہاں بھٹکتا رہا ہے۔ ذرا حالت دیکھیں اس کی شہریار! اس کے جسم پر کوئی گرم کپڑا تک نہیں ہے۔ پتا نہیں اس نے کل سے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں؟ پتا نہیں میرا بچہ کل رات ٹھنڈ میں کہاں سویا ہوگا؟ ابھی یہ بہت چھوٹا ہے شہریار۔ بیس سال اور گیارہ ماہ کی عمر اتنی سخت سزا دی جانے والی عمر تو نہیں ہوتی ہے۔ پلیز اسے اندر آنے دیں۔ اس کی غلطی معاف کر دیں۔ میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔“

امو جان نے زار و قطار روتے ہوئے شہریار خان کے سامنے حقیقتاً اپنے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

”یہ اس گھر میں میرے جیتے جی واپس نہیں آئے گا۔ جب میں مر جاؤں‘ تب تم اسے شوق سے واپس بلا لینا۔“ شہریار خان سخت اور بے لچک انداز میں بولے تھے۔ وہ غصے سے امو جان اور سکندر کو دیکھ رہے تھے۔

”کیسے باپ ہیں آپ شہریار! کیسے باپ ہیں آپ؟ اتنی سنگ دلی؟ اتنی سختی؟ کوئی اپنی اولاد کو اتنی سخت سزا بھی دیا کرتا ہے وہ بھی اتنی کم عمری میں؟ کم عمری کی اس کی اس ایک غلطی کو ایک بھول‘ ایک نادانی سمجھ کر معاف بھی تو کیا جا سکتا ہے۔“

امو جان روتے ہوئے شہریار خان سے لڑ پڑی تھیں۔ ان کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی‘ وہ سخت جذباتی اور برہم نظر آ رہی تھیں۔

”آپ کسی اور کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو کیوں دے رہے ہیں؟ میرا بیٹا ابھی بہت چھوٹا ہے‘ بہت معصوم ہے۔ اپنے باپ کے گناہوں کی سزا میرے بیٹے کو مت دیں شہریار۔ جو آپ کے باپ نے کیا۔“

”زبان بند کرو ذلیل عورت!“ شہریار خان غصے سے بالکل بے قابو ہوتے امو جان کی طرف بڑھے تھے۔ انہوں نے امو جان کو ان کی بات پوری نہیں کرنے دی تھی‘ انہوں نے کھینچ کر ایک تھپڑ امو جان کے منہ پر مارا تھا۔ ان کے دونوں بیٹے وہاں موجود ہیں‘ اس بات کی پروا کیے بغیر انہوں نے بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ بالکل پاگل اور جنونی سے لگ رہے تھے۔

وہ امو جان کو دوسرا تھپڑ مارنے آگے بڑھے تھے مگر ان کے اور امو جان کے بیچ سکندر آ گیا تھا‘ وہ تھپڑ جو شہریار خان امو جان کو مارنے والے تھے سکندر کے منہ پر جا کر لگا تھا۔ غصے میں بپھرے شہریار خان نے سکندر کو غیظ و غضب سے دیکھا تھا۔

”امو جان کو کچھ مت کہیں پاپا! پلیز میری ماں پر ہاتھ مت اٹھائیں۔ میں جا رہا ہوں یہاں سے۔“

اس نے دیکھا کہ سکندر کی آنکھوں میں آنسو تھے‘ وہ بھرائے لہجے میں یہ بات کہہ کر ماں اور باپ کے درمیان سے ہٹ گیا تھا۔

وہ سر جھکائے گیٹ سے باہر نکل رہا تھا۔ امو جان شہریار خان کا تھپڑ کھانے کے بعد بالکل ساکت کھڑی تھیں۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے سکندر کو گیٹ سے جاتا دیکھ رہی تھیں۔ شہریار خان‘ امو جان اور سکندر کو تھپڑ مارنے کے بعد بھی اسی طرح بپھرے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے گھر میں بچپن سے باپ کی سخت مزاجی اور حاکمیت دیکھی تھی۔ ماں کو سر جھکائے ان کے احکامات کی تعمیل کرتے دیکھا تھا مگر باپ کو کبھی ماں پر ہاتھ اٹھاتے یا گالی دیتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ ہمیشہ ایک سرد‘ حکمیہ نظر بیوی پر ڈالتے اور وہ ان کے حکم کی تعمیل کر دیتیں۔ آج انہوں نے زندگی میں پہلی بار امو جان پر ہاتھ اٹھایا تھا‘ انہیں گالی دی تھی اس بے غیرت انسان کی وجہ سے۔ بھائی کی زندگی برباد کی‘ ماں کو ذلیل اور بے عزت کروا دیا‘ باپ نے ماں پر ہاتھ تک اٹھا لیا۔ آخر یہ شخص چاہتا کیا تھا؟ کیا یہ اندر شہریار ان سب کو تباہ و برباد کر کے ہی ان کی جان چھوڑے گا؟ باپ کے جاہ و جلال اور شدید ترین اشتعال نے اس کے پیروں کو منجمد کر دیا تھا‘ وہ تھپڑ کھانے کے بعد روتی ہوئی ماں کو سہارا دینے ان کے پاس جانے کی ہمت نہیں کر پا رہا تھا۔ بہت سہما ہوا وہ اسی طرح پیچھے کھڑا تھا۔ امو جان اب بالکل خاموش تھیں‘ بے آواز آنسو گر رہے تھے ان کی آنکھوں سے‘ شہریار خان ان کے اوپر چنگھاڑ رہے تھے‘ بلند آواز میں بول رہے تھے۔

”آج تم نے میرے سامنے آواز اونچی کی ہے اور میں نے برداشت کیا ہے۔ آج کے بعد میرے آگے زبان کھولنے کی کوشش کی تو اسی وقت طلاق دے کر گھر سے نکال دوں گا۔ اگر اس گھر میں میری بیوی کی حیثیت سے رہنا چاہتی ہو تو اپنی اوقات پہچان کر رہو۔ اس گھر میں کیا ہوگا اور کون یہاں رہے گا‘ یہ فیصلہ میں کروں گا۔ تمہارا کام میرے فیصلوں کی تعمیل کرنا ہے۔ اگر یہ کام مشکل لگ رہا ہے تو شوق سے اپنے باپ کے گھر واپس چلی جاؤ۔ طلاق نامہ میں تمہیں وہیں بھجوا دوں گا۔“

آخری جملے ادا کرتے وقت ان کا لہجہ بہت سرد اور سخت ہو گیا تھا۔ امو جان منہ پر ہاتھ رکھے ایک ٹک شوہر کو دیکھ رہی تھیں۔ ان کا بیٹا وہاں موجود ہے‘ اس بات سے شہریار خان کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

اسے ایسا لگا تھا جیسے امو جان کا دادا جی کا نام لینا شہریار خان کو اس قدر بھڑکا گیا تھا۔ دادا جی کا نام اس نے ہمیشہ اپنے گھر میں اس طرح لیے جاتے سنا تھا جیسے وہ کوئی آسمانی مخلوق تھے‘ شہریار خان ان دونوں بھائیوں کو ان کے دادا کی غیر معمولی اچھائیاں اور خوبیاں ہمیشہ بہت فخریہ انداز میں سنایا کرتے تھے پھر آج امو جان نے دادا جی کے متعلق اس طرح کیوں کہا تھا اور شہریار خان اس پر اس طرح کیوں بھڑکے تھے؟ وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

شہریار خان وہاں سے پیر پٹختے شدید غصے کے عالم میں چلے گئے تھے۔ وہ بھی وہاں سے بالکل خاموشی سے لوٹ گیا تھا۔ وہ ماں کو تسلی دینا چاہتا تھا‘ انہیں یہ بتا کر کہ ان کی تذلیل ہوتے ہوئے اس نے بھی دیکھی ہے۔ اگرچہ وہ اس کی ماں اس بدکردار اور بدکردار کی حمایت میں بولتے ہوئے اس کے باپ کے ہاتھوں بے عزت ہوئی تھی جس سے وہ مرتے دم تک نفرت کرتا رہے گا مگر پھر بھی ماں کی اس تحقیر‘ اس بے عزتی پر اسے شدید تکلیف ہوئی تھی‘ بہت رنج ہوا تھا۔

ماں پر ہاتھ اٹھاتے اور چلاتے وقت اسے اپنا باپ ایک اعلا تعلیم یافتہ مرد نہیں بلکہ ایک جاہل آدمی لگا تھا۔ بیوی کی تحقیر کرتا اپنا باپ اسے بہت گھٹیا آدمی لگا تھا۔ کہیں سے بھی نہیں لگا تھا کہ اس کا باپ ہارورڈ کا فارغ التحصیل ہے‘ وہاں سے گولڈ میڈلسٹ اور ورلڈ بینک میں بہت اونچے مرتبے پر فائز شخص ہے۔ ایسا لگا تھا‘ اس کا باپ ـــــ ایک بہت ہی روایتی جاہل مرد ہے‘ جو بیوی کو پیر کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔

☼ ☼ ☼

اور اس روز کے بعد اس نے اپنی ماں کو کبھی سکندر کا نام لے کر اپنے باپ سے منت یا فریاد کرتے نہ دیکھا تھا۔ ان دونوں کی اکیلے میں اس موضوع پر بات ہوئی ہو تو ہوئی ہو‘ اس کے سامنے پھر کبھی نہیں ہوئی تھی۔

وہ ـــــ اگلے ہی روز واپس لاس اینجلس چلا گیا تھا۔ وہی کیمپس تھا‘ وہی وہاں کا ماحول‘ وہی دوست‘ وہی سرگرمیاں مگر پھر بھی اب زین شہریار کے لیے نہ تو

کبھی کیلی فورنیا یونیورسٹی پہلے جیسی ہو سکتی تھی اور نہ ہی لاس اینجلس۔

کیمپس کے ہر گوشے میں ام مریم کی یادیں بکھری تھیں' لاس اینجلس کے چپے چپے پر اس کے ساتھ گزارے لمحوں کے نشان رقم تھے۔ اس کا کتنی بار دل چاہتا تھا' وہ اسے ڈھونڈے' اسے کھوجے مگر پھر اس سے کیا وعدہ یاد آجاتا۔ وہ رک جاتا۔ وہ رات کی تنہائیوں میں بے چین ہو کر اسے یاد کرتا ہوا اٹھ بیٹھتا تھا۔ کیلی فورنیا سے انڈر گریجویٹ اسٹڈیز اس نے مکمل کرلیں تو شہریار خان نے لاء پڑھنے کے لیے اس کا داخلہ ہارورڈ لاء اسکول میں کروانا چاہا۔ جو کبھی اس کی زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا' وہ اب جب اس نے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیے تھے' پورا ہو گیا تھا۔

اس کا داخلہ ہارورڈ لاء اسکول میں ہو گیا تھا۔ اب خوشی کی باتوں پر بھی دل خوشی محسوس نہیں کرپاتا تھا۔ اس لیے وہ خاموشی سے لاس اینجلس سے اپنا سامان سمیٹ کر ہارورڈ لاء اسکول کی طرف گامزن ہو گیا تھا۔ لاس اینجلس میں رہ رہا تھا تو ام مریم کی یادوں کے حصار سے نکلنا بہت مشکل لگا کرتا تھا' جگہ بدلی' کیمپس بدلا' شہر بدلا تو کم از کم اتنا ضرور ہو گیا کہ وہ خود کو وقت کے ساتھ ساتھ زندگی کی طرف واپس لانے میں کامیاب ہو گیا۔

ام مریم کی یاد' اس کی محبت تو اس کے دل سے کبھی نکل ہی نہیں سکتی تھی مگر اب اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ زندگی کو پھر سے جینے لگا تھا۔ زندہ لوگوں کی طرح' اپنے ہم عمر لڑکوں کی طرح۔ پتا نہیں ام مریم کہاں تھی؟ وہ کیسی تھی؟ اس نے اپنی اسٹڈیز پھر سے شروع کی تھیں کہ نہیں؟ اگر وہ آج اس کی زندگی میں ہوتی تو اسے ہارورڈ لاء اسکول میں پڑھتا دیکھ کر کس قدر خوش ہوتی۔ ہارورڈ میں پڑھنے کے دوران وہ ہر چھٹیوں میں گھر آتا تھا۔ ایک عجیب سی ویرانی اور موت کی سی خاموشی رہا کرتی تھی اب اس کے گھر میں۔ اس کے باپ کا حاکمانہ مزاج ویسا ہی تھا جیسا وہ اپنے بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اس کی ماں کی خاموشی ویسی ہی تھی جیسی شروع سے تھی۔ باپ کے سخت اور بے لچک انداز سے اتنا یقین اسے ہو گیا تھا کہ وہ سکندر کو کبھی معاف نہیں کریں گے۔ یہی وہ چاہتا تھا۔ اس سے ام مریم کو چھیننے والے اس بدکردار شخص کو جو بھائی کے نام پر ایک بدنما داغ تھا' کبھی بھی معافی نہیں ملنی چاہیے تھی۔

☆ ☆ ☆

وہاں اندھیرا بہت تھا۔ ہیبت ناک سناٹا بہت تھا۔ اسے اس اندھیرے سے ڈر لگ رہا تھا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اسے سانس لینے میں مشکل ہو رہی تھی۔ وہ اندھیری جگہ بڑی ہیبت ناک تھی جیسے کوئی غار' کوئی سرنگ' وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔ مگر اس سے ہاتھ پاؤں ہلائے نہیں جا رہے تھے۔ وہ مدد کے لیے چلانے لگا تھا۔ وہ رو رہا تھا۔ کوئی تو آجائے اس کی مدد کے لیے۔ کہیں سے کوئی تو آجائے۔ اچانک ہی اس کے رونے اور چلانے کی آوازوں میں کسی کے قہقہوں کی آوازیں شامل ہو گئی تھیں۔ اس پر قہقہے لگا کر ہنستا وہ شخص اس کے سامنے آگیا تھا۔ اس کی شکل بہت ڈراؤنی تھی۔ خوف کے مارے اس کی چیخیں نکل گئی تھیں۔ وہ شخص اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتا اس پر قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔

"بچاؤ' بچاؤ۔ ہیلپ' ہیلپ۔ کوئی مجھے بچاؤ پلیز۔"

وہ روتے ہوئے چلا چلا کر کسی کو مدد کے لیے پکارنے لگا تھا۔ مگر اس کی مدد کے لیے کوئی بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ خوفناک شکل والا شخص اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس جیسی خوف ناک شکلوں والے تین آدمی اور بھی تھے۔

"پاپا! مجھے بچالیں۔ پاپا! مجھے ان لوگوں سے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ پلیز پاپا! مجھے آکر بچالیں۔" وہ روتے ہوئے باپ کو آوازیں دے رہا تھا۔

"ایک rapist میرا بیٹا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ میرے گھر میں تم جیسے بدکردار اور بدفطرت انسان کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ تم میرے لیے مرچکے ہو۔"

اسے اس غار میں بہت دور اپنے پاپا نظر آئے تھے۔ نفرت بھری نگاہ اس پر ڈال کر انہوں نے اس سے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اسے اس اندھیرے غار میں وہاں تنہا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ خوف کے مارے اس کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ وہ چلا چلا کر رو رہا تھا۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کرتا خود اپنے آپ کو ان خوفناک درندوں کے شکنجے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکدم ان میں سے ایک نے اس کے منہ پر مضبوطی سے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ وہ زور زور سے قہقہے لگا کر ہنس رہا تھا۔ اس کی بے بسی کا تماشا دیکھتے اس کے باقی ساتھی بھی زور زور سے ہنس رہے تھے۔ اس کی سانس گھٹ رہی تھی' اس کا دم گھٹ رہا تھا' اب نہ وہ چلا سکتا تھا' نہ کسی کو مدد کے لیے پکار سکتا تھا۔ وہ مر رہا تھا۔ وہ اپنے جسم سے خون بہتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کا سارا خون بہہ جائے گا۔ وہ مر جائے گا' وہ مر جائے گا۔

وہ پسینے میں شرابور تھا' وہ سوتے میں بچاؤ' بچاؤ چلا رہا تھا' اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکل رہی تھیں جیسے اس کا گلا گھونٹا جا رہا ہو اور وہ سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ یک دم ہی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود وہ سر سے پاؤں تک پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ کئی سیکنڈ وہ آنکھیں کھولے بیڈ پر یوں لیٹا رہا جیسے اسے ابھی بھی یہ پتا نہ چلا ہو کہ وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے جسم پر لرزش طاری تھی۔ اسے جیسے اپنے کمرے کے اندھیرے سے شدید وحشت ہوئی تھی' اس نے لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر لیمپ روشن کیا۔ لیمپ روشن کرتے اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپ رہے تھے۔ وہ کھینچ کھینچ کر سانس لے رہا تھا۔ گھٹن اور اندھیرے سے گھبرا کر وہ فوراً" بیڈ سے اٹھا تھا۔

اس نے اپنے کمرے کی تمام لائٹس آن کر دی تھیں۔ پردے ہٹا کر تمام کھڑکیاں کھول دی تھیں۔ اسے یاد آگیا تھا کہ وہ اس وقت امریکہ کی کسی سڑک پر تھا نہ ہی کسی کے گھر سے نکالا جا رہا تھا۔ وہ روما میں واقع اپنے فلیٹ میں تھا۔ کھینچ کھینچ کر سانس لیتے اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔

اس نے خود کو اوپر سے نیچے تک دیکھا تھا۔ اس کے نہ کہیں سے خون بہہ رہا تھا نہ کہیں چوٹ لگی تھی۔ پھر بھی اسے اپنے پورے جسم میں درد کی ٹیسیں اٹھتی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ نڈھال سے انداز میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کا حلق بالکل خشک ہو رہا تھا۔ اپنے قدموں کو گھسیٹتا وہ کمرے سے نکلا تھا۔ وہ کچن میں آیا تھا۔ بغیر رکے اس نے چار گلاس پانی کے پیے تھے۔ اس کا واپس اپنے کمرے میں جانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہاں جانے سے اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ وہ اپنے لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بہت تیز آواز میں ٹی وی آن کرلیا تھا۔

جس روز سے اٹلی سے آیا تھا' ایک رات بھی سو نہیں پایا تھا۔ اتنی راتوں تک نیند نہ آنے نے اسے بہت مضمحل کر دیا تھا' وہ اپنے دفتری کاموں کی انجام دہی میں مشکل محسوس کر رہا تھا۔ تنگ آکر کل رات اس نے نیند لانے کے لیے ڈاکٹر کی تجویز کردہ گولیاں لے لی تھیں۔ وہ گولیاں نیند لائی تھیں مگر ہمیشہ کی طرح اس کے ڈراؤنے خواب بھی ساتھ لائی تھیں۔ اسے یہ گولیاں لیے اور یہ ڈراؤنا خواب دیکھے اتنے دن گزر گئے تھے کہ ایک خوش فہمی سی دل میں پیدا ہوئی تھی کہ شاید اس کے ان ڈراؤنے خوابوں نے آخر کار اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔

آخری بار اس نے یہ خواب روم میں تب دیکھا تھا جب خود کو خوش ہونے اور ہنسنے پر سزا دینے کے لیے اس نے از خود یہ خواب دیکھنا چاہا تھا۔ کلوزیم سے واپس آنے کے بعد اپنے ہوٹل روم میں جاتے ہی اس نے یہی گولیاں لی تھیں اور خود کو سزا دینے کے لیے سونے لیٹ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ روم میں جب جب سویا قدرتی نیند سویا تھا اور یہ خواب تو یوں آنکھوں سے دور ہوا تھا جیسے اسے بارہ سالوں سے ڈرا ہی نہیں رہا تھا۔ پھر آج کیوں؟ پھر آج کیوں؟ ٹی وی کی تیز آواز بھی اس کے اندر کے سناٹوں کو توڑ نہیں پا رہی تھی۔

"کیا ہوا' تم سوئے نہیں؟" بہت فکر مند یہ آواز

اس کے عقب میں گونجی تھی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا۔

"تم چاہو تو میں تھوڑی دیر تمہارے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر سکتی ہوں۔"

وہاں پر کوئی بھی نہیں تھا، پھر بھی اس کے بالکل نزدیک یہ دل نشیں آوازیوں گونج رہی تھی جیسے وہ یہیں بالکل پاس ہی بیٹھی تھی۔

"زندگی بہت خوب صورت ہے۔ خوشی کو، رنگوں کو اور زندگی کو اپنے اندر محسوس تو کر کے دیکھو۔" صوفے پر وہ اس کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ وہ نرم لہجے میں بول رہی تھی۔

"خوش ہونے کے لیے وجہ ڈھونڈو گے تو کبھی خوش نہیں ہو سکو گے۔ میری زندگی میں بھی ایسا بہت کچھ ہے جسے اگر میں ہر وقت سوچنا شروع کر دوں تو ایک لمحے کے لیے بھی خوش نہیں رہ سکتی، مگر تم دیکھتے ہو میں کتنا خوش رہتی ہوں۔"

اس کا نرم لہجہ اتنا دل نشیں تھا کہ بے ساختہ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ریموٹ سے ٹی وی آف کر کے وہ صوفے پر لیٹ گیا تھا۔ اسے وہ تصور میں فلور کشن اپنے صوفے کے پاس لا کر رکھتی نظر آ رہی تھی۔

"زندگی بہت خوب صورت ہے سکندر!" وہ صوفے پر لیٹا تھا اور اسے کارپٹ پر وہ اپنے صوفے سے بالکل نزدیک بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ اس کا نرمی، خلوص اور محبت لیا لہجہ اس کی تکلیف کو کم کر رہا تھا، کچھ دیر پہلے جس طرح وہ سانس گھٹتی محسوس کر رہا تھا۔ اب محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے کانوں میں خود اس کی اپنی آواز گونجی تھی۔

"آج میں سینوریٹا لیزا محمود اور ان کی پینٹنگز کو سوچتے ہوئے سوؤں گا۔" اسے اپنے ہاتھ کے اوپر اس کا لمس محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس کے ہاتھ پر مرہم لگا رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"اتنی خوب صورت چیزیں سوچو گے تب تو نیند بھی خوب پر سکون آئے گی اور خواب بھی بڑے حسین نظر آئیں گے۔"

وہ آنکھیں بند کیے کیے مسکرایا تھا۔ اسے نیند ابھی بھی نہیں آئی تھی مگر اس کی بے سکونی اور اضطراب تھم گیا تھا۔ رات کا وہ خواب اپنے اثرات چھوڑتا، اس کے لیے پھر cervical pain لے کر آیا تھا۔

صبح وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو اس کی گردن کے پچھلے حصے میں وہی مخصوص درد ہو رہا تھا۔ گردن سے اٹھتا بازوؤں تک پھیل جایا کرتا تھا۔ سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے وہ ہر وہ تحقیر بھری نظریں خود میں ڈال پایا تھا جو پچھلے بارہ سالوں سے ڈالتا آیا تھا۔

"تم مجھے بہت ہینڈسم لگتے ہو۔ اوپر سے تمہارا یہ غرور اور خود پسندی بھی تم پر بہت جچتی ہے۔ مجھے تمہارا چہرہ خاص طور پر تمہاری آنکھیں بہت پر کشش لگتی ہیں۔"

وہ اپنے چہرے کی نقوش کو آئینے میں بغور دیکھنے لگا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے سینور سکندر! تم بہت ہینڈسم ہو۔ پتا نہیں مگر ہر بار تمہیں دیکھ کر ڈاوڈ کا خیال دل میں آتا ہے۔"

اپنے چہرے کے نقوش شیشے میں دیکھتا اسے آئینے میں وہ نظر آنے لگی تھی۔ ہونٹوں پر شرارت بھری مسکان لیے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

"bella۔" بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک مدھم سی مسکان آئی تھی۔ وہ آئینے میں اپنے مسکراتے ہوئے چہرے کو تعجب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ کمرے سے نکل کر باہر آگیا تھا۔ وہ عادتاً بغیر ناشتے کے گھر سے نکل رہا تھا۔ خود کو نظر انداز کرنے اور سزا دینے کی اپنی عادت کے پیش نظر۔

"دل نہیں چاہ رہا، پھر بھی تھوڑا سا کھالو۔" کچن کے پاس سے آتی اس آواز پر اس کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"منع مت کرنا۔ تم نے کھانا بہت کم کھایا تھا۔ یہ چیز

ضرور کھاؤ۔ میں نے خاص طور پر تمہارے لیے بنایا ہے۔"

تکلیف کی وجہ سے اس سے گردن نہیں گھمائی جا رہی تھی۔ وہ پورا کا پورا مڑا تھا۔ اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ اس کے کچن میں کھڑی ہے۔ وہ وہاں نہیں تھی مگر وہ اسے وہاں محسوس ہو رہی تھی۔ فکر سے اسے دیکھتی، اس کی خاطر اپنا سکون اور آرام قربان کرتی ہوئی۔

"تمہاری زندگی اتنی بے وقعت اور بے مول نہیں ہے سکندر! کسی اور کو فرق پڑے نہ پڑے لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔"

وہ جیسے کسی طاقت کے زیر اثر کھنچتا کچن میں آیا تھا۔ اس نے فریج سے دودھ نکالا تھا۔ کارن فلیکس کا ڈبہ اٹھایا تھا۔ پیالہ اور چمچ اپنے سامنے رکھا تھا۔ وہ اب گھر سے ناشتہ کر کے آفس جانا چاہتا تھا۔

وہ اپنے آفس میں تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح کاموں میں گم۔ رات کا خواب اور اعصابی درد اس پر پھر حاوی ہو رہے تھے۔ اس نے اس سب سے پیچھا چھڑانے کے لیے خود کو کاموں میں غرق کر رکھا تھا۔ لنچ ٹائم کب کا گزر چکا تھا اور اسے بھوک کا احساس تک نہ ہوا تھا۔

"تمہاری طبیعت کیسی ہے؟ تم نے لنچ کیا؟" وہ اسے اپنی میز کے سامنے رکھی خالی کرسی پر بیٹھی نظر آنے لگی تھی۔ وہ یک دم ہی شرمندہ سا ہوا تھا۔

"دگر وہ ضروری کام سکندر شہریار کی صحت اور اس کی زندگی سے زیادہ اہم نہیں ہو سکتے۔"

اس نے دیکھا وہ رنجیدہ نظر آ رہی تھی اس بات پر کہ وہ خود کو نظر انداز کیوں کیا کرتا ہے، اس بات پر کہ وہ اپنا خیال کیوں نہیں رکھتا۔ وہ مسکراتی ہوئی اچھی لگا کرتی تھی، وہ زندگی سے بھرپور انداز میں کھلکھلاتی اچھی لگا کرتی تھی، یہ اداسی اور رنج اس کے چہرے پر سج نہیں رہا تھا۔ محض اس کے چہرے پر مسکان دیکھنے کے لیے اس نے انٹر کام پر اپنی سیکریٹری کو اپنے لیے لنچ منگوانے کو کہا۔

اب تو وہ خوش تھی ناں، اب تو وہ اپنا خیال رکھ رہا ہے، اب تو وہ خوش ہے؟ اپنی ہنسی کی ایک جھلک اسے دکھلا کر وہ اس کے سامنے والی کرسی پر سے غائب ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام میں جب وہ دفتر سے اٹھا تو اس کے درد کی شدت برقرار تھی۔ اسے اندازہ تھا کہ اس درد سے نجات کے لیے اسے گھر جا کر ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا لینی پڑے گی۔ درد تو دوا سے چلا جائے گا مگر ساتھ نیند بھی لائے گا اور نیند اپنے ساتھ خواب۔ اب وہ لیزا کے روما میں نہیں تھا جہاں نظر آتے آتے اچانک ہی یہ خواب نظر آنا بند ہو گئے تھے۔ اتنے دنوں تک روما میں اس کی غیر موجودگی کے سبب اس کے کچن اور فریج میں بہت سی اشیائے خورد و نوش ختم ہو گئی تھیں۔ جب سے اٹلی سے واپس آیا تھا گروسری کے لیے نہیں گیا تھا سوائے دودھ وغیرہ جیسی انتہائی ضروری چیزوں کے باقی یونہی کام چلا رہا تھا۔

آج دفتر سے اٹھنے کے بعد فلیٹ جانے سے قبل اس نے راستے میں گاڑی ایک گروسری اسٹور پر روکی۔ وہ اپنی ضرورت کے مطابق ٹرالی میں مختلف اشیا ڈالتا جا رہا تھا۔ فروٹ اور سبزیوں والے سیکشن کے پاس وہ آیا۔ وہ چند سبزیاں لینا چاہتا تھا۔ وہ اکیلا رہتا تھا۔ ناشتا اور لنچ اس کا اکثر و بیشتر نہیں ہوا کرتا تھا مگر خود کو زندہ اور چلتا پھرتا رکھنے کے لیے وہ رات کا کھانا اکثر کھا لیا کرتا تھا سوائے ان دنوں کے جب اس پر بدترین قنوطیت اور خود سے نفرت طاری ہوتی تھی۔ کبھی وہ ڈنر باہر کرتے ہوئے فلیٹ واپس آتا تھا اور کبھی فلیٹ آکر خود اپنے لیے کھانا پکاتا تھا۔ برس ہا برس سے تنہا رہنے کے سبب وہ باآسانی اپنے لیے کھانا بنا لیا کرتا تھا۔

اسے کچن میں مہارت سے کام کرتا دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس نے اپنا بچپن اور نوعمری کا دور ایسے گھر میں گزارا تھا جہاں اس کی ایک آواز پر کئی کئی نوکر دوڑے دوڑے چلے آتے تھے۔ اسے اٹھ کر پانی تک خود نہیں پینا پڑتا تھا۔ دیکھنے والے اسے ایک سیلف

میڈ انسان سمجھا کرتے تھے۔ ایک سیلف میڈ انسان جو اپنی محنت اور قابلیت کے بل پر یہاں تک پہنچ پایا تھا۔

سبزیوں کی طرف جاتے جاتے اس کی پھلوں کی طرف نظر پڑی تھی۔ وہاں دیگر کئی تازہ پھلوں کے ساتھ ناشپاتیاں بھی رکھی تھیں۔ اس کا پھل لینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر اب وہ اپنی ٹرالی میں سبزیوں سے بھی پہلے ناشپاتیاں رکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے لیے بہت ساری ناشپاتیاں خریدی تھیں۔ اس کے ڈنر کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ وہ ناشپاتیوں کو ٹرالی میں رکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔

اس کے چھوٹے سے نفیس سے ڈائننگ ٹیبل کچن ہی میں موجود تھی۔ واپس آکر نہانے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد وہ کچن میں آگیا تھا۔ اس نے پلیٹ بھر کر ناشپاتیاں اپنے لیے کاٹی تھیں۔ ان کے چوکور چوکور ٹکڑے پلیٹ میں فورک لگا کر وہ میز پر بیٹھ گیا تھا۔

اسے کبھی پتا ہی نہیں چلا تھا یہ پھل اتنے مزے کا ہوتا ہے۔ بچپن سے اسے اس پھل سے کوئی خاص رغبت نہیں رہی تھی' آج وہ اسے اتنے مزے کا لگ رہا تھا۔ اس نے ناشپاتیوں کو انجوائے کرتے ہوئے سوچا کہ کل وہ دفتر جا کر اپنی سیکریٹری سے کہے گا کہ جس طرح اس نے یہ یاد کر لیا ہے کہ اس کا باس بلیک کافی پسند کرتا ہے' اسی طرح اب لنچ میں روز ناشپاتیاں کھانا پسند کرے گا' یہ بھی یاد کر لے۔

وہ دوا لیتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ اپنے لیے کافی بنا کر وہ لیونگ روم میں آکر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ٹی وی آن کر لیا تھا۔ غیر دلچسپی سے چینل تبدیل کرتے اس کے ہاتھ یک دم ہی ایک چینل پر آکر رکے تھے۔ روما کے اوپر ڈاکومینٹری آرہی تھی۔ وہاں کے تاریخی مقامات' ان کی تاریخی اہمیت۔ اس کی غیر دلچسپی فوراً ہی دلچسپی میں تبدیل ہوئی تھی۔ وہ ٹکٹکی باندھے کلوزیم فوریم ویٹی کن سٹی' اسپینش اسٹیپس کو دیکھ رہا تھا۔ ارے اب Trevi فاؤنٹین دکھا رہے ہیں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ الرٹ ہو کر بیٹھا۔ سیاحوں سے گھرا Trevi فاؤنٹین' سیاحوں کو وہاں پانی میں سکے اچھالتے دکھایا جا رہا تھا۔ ساتھ ٹی وی دیکھنے والے ناظرین کو ان سکے اچھالنے کا پس منظر بھی بتایا جا رہا تھا۔

Legend has it you will
return to Rome if you
throw a coin into
the water

(کہا جاتا ہے آپ روم دوبارہ آنا چاہتے ہیں تو یہاں پانی میں سکے اچھالیں۔)

ٹی وی پر سے ابھرتی یہ آواز سن کر اس کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہوئی۔

وہ یہاں میں سکہ کیوں اچھال کر نہیں آیا تھا؟ وہ یقین کرتا تھا یا نہیں مگر اسے پانی میں سکہ اچھال دینا چاہیے تھا۔

I didn't toss a coin
into the fountaion but
i still want to go
back to Rome

(میں نے وہاں فوارے میں سکہ نہیں اچھالا لیکن میں روم واپس جانا چاہتا ہوں)

وہ خود کلامی کرتے ہوئے نجانے کس سے مخاطب تھا۔ وہ خود سے روم کبھی نہیں جائے گا' وہ وہاں نہیں جانا چاہتا مگر کچھ ایسا ہو تو سکتا ہے ناں کہ اسے پھر کسی دفتری کام سے وہاں بھیجا جائے۔ تب تو اسے خود سے لڑنا بھی نہیں پڑے گا کہ وہ روم میں اپنی زندگی سے خوش ہوتا کے دھوکا دینے کی کوشش کر رہا ہے خود کو یا پھر اس لڑکی کو؟ وہ جس جگہ سے سب چھوڑ چھاڑ "آنا فانا" بھاگ آیا تھا' وہ وہاں پھر جانا چاہتا تھا۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ اس کے آفس والے اسے پھر سے روما بھیج دیں۔ وہ La citta eterna پھر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ خود سے وہ وہاں نہیں جا سکتا۔ خود سے اگر گیا تو اس کے اندر سے ابھرتی آوازیں اس سے پھر لڑیں گی۔ اسی طرح جیسے Tivoli سے آنے کے بعد اس کے وجود بہت تلخ اور زندگی سے نفرت میں مبتلا شخص سے لڑا تھا۔

اس نے اس سے سوال کیا تھا کہ آخر کس حق سے اپنی زندگی کی تاریکیوں' سیاہیوں اور ذلتوں میں اس لڑکی کو شامل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جو سراپا محبت ہے' جو سراپا خوشی ہے' جو سراپا ہنسی ہے' جو سراپا زندگی ہے۔ یہ ہنسی' یہ خوشی اور یہ زندگی لیزا محمود کے پاس سدا رہنی چاہیے تھی۔ اپنے اندر سے ابھرتی ان آوازوں ہی کے سبب وہ اٹلی سے "آنا فانا" واپس آگیا تھا' اس لڑکی کی زندگی سے ایک دم ہی باہر نکل آیا تھا۔ اگر وہ خوشیاں بانٹنے والی اس بہت پیاری لڑکی کو کوئی خوشی نہیں دے سکتا تو اسے یہ حق بھی حاصل نہیں کہ وہ اسے اپنی زندگی کی بدنمائیوں اور تاریکیوں میں حصہ دار بنائے۔

ایک بچکانہ سی دعا تھی جو وہ کر رہا تھا۔ اس کے آفس والے اسے زبردستی روم بھیج دیں۔ وہ منع بھی کرتا رہے تب بھی کسی بھی اہم کام کا کہہ کر اسے وہاں پر زبردستی بھیجا جائے۔ اس کی مرضی کے خلاف جبراً حکم دے کر۔ تب تو اس کے اندر کوئی اس سے لڑ بھی نہیں سکے گا۔

وہ خود کو بے بس اور مجبور ظاہر کرتا کہے گا کہ یہ اس کی نوکری کی مجبوری ہے جو وہ اٹلی دوبارہ جا رہا ہے۔

اس نے وہ ڈاکومنٹری پوری دیکھی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں چلا تھا' وہ اس شہر سے محبت میں مبتلا ہو گیا تھا' اسے روم سے محبت ہو گئی تھی' وہ اس شہر میں پھر جانا چاہتا تھا۔ جو جگہیں تب نہیں دیکھ پایا' اب دیکھنا چاہتا تھا۔ اکیلے نہیں کسی کے ساتھ۔ وہ ان تمام تاریخی جگہوں کی بہت ساری تصاویر کھینچنا چاہتا تھا۔ اکیلے نہیں کسی کے ساتھ' کسی اور کو بھی ہونا چاہیے تھا ان تصاویر میں اس کے ساتھ اسے ٹی وی پر steps spannesh پر دیکھتے ہوئے وہاں وہ اور لیزا بیٹھے نظر آرہے تھے۔

"نہیں' نہیں گھنٹی کوئی نہیں بجی تھی۔" حلفیہ انداز میں بول کر ہمیں بیٹھ کر اسے یقین دلایا گیا تھا۔ وہ بے اختیار کھل کر ہنسا تھا' وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہوئی ہے۔" اس لڑکی کی یاد ہی اتنی خوب صورت تھی کہ اسے اپنے اعصابی درد کا احساس تک نہیں رہا تھا۔ ڈاکومینٹری ختم ہوئی تو ٹی وی بند کر کے اس نے لیپ ٹاپ اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔

نیند اسے ابھی آئی نہیں تھی۔ دوا لینے سے وہ کترا رہا تھا اور ویسے بھی درد اس وقت قابل برداشت محسوس ہو رہا تھا۔ اپنے شوق اور دلچسپی سے کوئی مووی دیکھے اسے برسوں بیت چلے تھے۔ مگر اس وقت وہ اپنے لیپ ٹاپ پر Roman Holidays ڈاؤن لوڈ کر رہا تھا۔

یہ مووی اس نے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔ آج دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ لیپ ٹاپ لے کر اپنے کمرے میں آگیا تھا۔ وہ مووی دیکھ رہا تھا' لیٹا ہوا۔ مووی میں روم کی مختلف جگہوں کو دیکھتے اسے ان جگہوں پر مووی کے مرکزی کردار نہیں بلکہ وہ خود اور لیزا چلتے پھرتے نظر آنے لگے تھے۔

"خیر۔ خوب صورت تو میں ہوں۔"

ہاں۔ خوب صورت تو وہ بہت ہے۔ وہ واقعی بہت خوب صورت ہے۔

"میں زیادہ تو نہیں بولتی۔ لگتا ہے تم نے کبھی کوئی باتونی لڑکی دیکھی نہیں ہے۔"

وہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر مووی میں ان اداکاروں کو نہیں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے روم میں رات کے دو بج چلے تھے مووی دیکھتے دیکھتے کس وقت اس کی آنکھ لگی اسے پتا نہیں چلا تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی۔ وہ سو گیا' بغیر کسی دوا کے ۔۔۔ اس نے کوئی خواب بھی نہیں دیکھا۔ یہ اعجاز اس لڑکی کا تھا جو اپنی موجودگی سے تو اس کے پاس سے ان خوفناک خوابوں کو دور ہٹا ہی گئی تھی۔ کل رات اپنے تصور سے بھی ان خوابوں کو اس کے پاس پھٹکنے تک نہ دیا۔

شاید اس لیے کہ کل رات اس نے وہ کوشش نہ کی

تھی جو اٹلی سے آنے کے بعد جان بوجھ کر، پوری شعوری کوشش کر کے کر رہا تھا۔ لیزا محمود کو بھول جانے کی کوشش۔ اسے بالکل بھی یاد نہ کرنے کی کوشش، اسے ذرا بھی نہ سوچنے کی کوشش۔ کل رات اس نے بڑے اہتمام سے، بڑے دل سے، بڑی محبت سے اسے یاد کیا تھا۔ وہ یاد واپس آنے کے بعد پہلی بار۔

گو یہ ایک بے اختیاری کیفیت میں ہوا تھا مگر اس پل جب وہ خود کو بہت تروتازہ محسوس کرتا بیڈ سے اٹھ رہا تھا، تب اس نے خود سے کہا تھا اس میں کیا حرج ہے۔ اگر وہ لیزا محمود کو یاد کر لے، اس میں کیا حرج ہے اگر وہ اسے سوچ لے۔ اس سے کسی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچ رہا۔ اس لڑکی کو تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ اسے یاد کیا کرتا ہے۔ وہ اس کی یادوں میں اپنے لیے سکون تلاش کرتا ہے، وہ اسے تصور میں لا کر اپنے اندر کی تلخیوں کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ آ تو گیا ہے اس کی زندگی سے دور۔ وہ اب اس سے زندگی میں کبھی نہیں ملے گا۔ وہ لیزا کی زندگی اور اس کی خوشیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا رہا۔ وہ صرف اس کی یادوں اور اس کے تصور سے زندگی کو اپنے لیے آسان بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کوئی قابل گرفت گناہ تو نہیں۔

اس نے اپنا موبائل اٹھا کر اس میں Trevi فاؤنٹین کی وہ تصویر کھولی تھی جس میں لیزا بھی موجود تھی۔ تب وہاں Trevi فاؤنٹین کی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچتے اس نے بظاہر یہ تصویر یوں کھینچی تھی جیسے اس جگہ کو کسی خاص انداز سے تصویر میں لانا چاہتا تھا۔ لیزا کو اس نے بتایا بھی نہیں تھا کہ وہ اس کی تصویر کھینچ رہا ہے۔

وہ تصویر تب اس نے خود سے بھی جھوٹ بولتے یوں کھینچی تھی جیسے لیزا کا سائڈ پوز اتفاقاً" اس تصویر میں آ گیا تھا اور حقیقت تو وہ اس جگہ کی تصویر لینا چاہتا تھا۔ مگر آج وہ جانتا تھا اور خود سے اعتراف بھی کر رہا تھا کہ یہ تصویر اس نے جان کر کھینچی تھی کہ وہ جانتا تھا اگلے روز اس نے روم سے واپس چلے جانا تھا، پھر اس نے لیزا محمود سے زندگی بھر نہیں ملنا تھا۔ یہ [illegible] کر چکا تھا تو کیا واپس جانے سے پہلے اس کی کوئی بھی یاد اپنے ساتھ لے کر نہیں جائے گا؟ اس میں وہ اداس تھی۔ وہ اس طرح مسکرا نہیں رہی جیسے ہر وقت مسکرایا کرتی تھی، اس طرح خوش نہیں آ رہی تھی جیسے ہمیشہ خوش رہا کرتی تھی۔ اس اداسی کا سبب وہ جانتا تھا۔ یہ اداسیاں اسے دی ہی اس نے تھیں۔ مگر وہ ٹوٹا، بکھرا، ناکام انسان اسے اپنے ساتھ کی کوئی خوشی بھی تو نہیں دے سکتا تھا تو یہ ذرا سی اداسی دے دینا زیادہ بہتر لگا تھا اسے۔

وہ اتنی اچھی ہے، اتنی پیاری ہے اسے اس کے شایان شان کوئی بہت کامیاب، بہت باوقار اور اس سے بہت محبت کرنے والا شخص ملے گا، وہ اس سے اتنی محبت کرے گا کہ وہ اپنے روم میں چند دنوں کے لیے آئے اس ناکام انسان کو بھول ہی جائے گی۔ اس کی دعا تھی، بہت سچے دل سے مانگی دعا کہ لیزا اسے بھول جائے۔ اسے کسی اور سے محبت ہو جائے، کسی ایسے شخص سے جو اس بہت پیاری لڑکی کی بہت قدر کرے، اس سے بہت محبت کرے، سکندر شہریار کبھی اس کے خوابوں اور خیالوں تک میں نہ آئے ایسی محبت ہو جائے اسے۔

"تم میرے لیے نہیں ہو، جانتا ہوں۔ مگر جسے تم ملو گی وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت آدمی ہو گا۔"

وہ اس کی تصویر سے [illegible] اس سے رخصت ہوتے پل کی اس کی ان بھیگی، اداس آنکھوں کو یاد نہیں رکھنا چاہتا تھا جن میں بہت شکوے تھے، بہت شکایتیں تھیں۔ وہ رو دینے کو تھی وہ جانتا تھا۔ تب ہی تو وہ "آنا فانا" وہاں سے بھاگا تھا۔ وہ کسی ایسے جذباتی لمحے کی زد میں آنے سے ڈرا تھا جس میں وہ اس لڑکی کے آنسوؤں یا اس کی محبتوں کے سبب کمزور پڑ جائے۔ اس کی وہ لمحاتی کمزوری اس لڑکی کی زندگی کو کانٹوں پر گھسیٹ کر لے جائے گی۔

"لیزا کو ہمیشہ بہت خوش رہنا چاہیے۔" اس نے Tivoli سے آنے کے بعد اس رات سوچا تھا اور اس

کے ہمیشہ خوش رہنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ بدنما اور داغ دار وجود جلد از جلد اس سے بہت دور چلا جائے۔ کہیں اس کی زندگی کی بدنمائیاں اور ذلتیں لڑکی کی زندگی سے بھی خوشیوں کو ختم نہ کر دیں۔

محبت کس لمحہ ہوئی، وہ نہیں جانتا تھا، دن، وقت، تاریخ اسے پتا نہیں تھا۔ وہ تو بس لیزا کے روم میں ہی اس کے ساتھ مل کر رنگوں اور زندگی کو پھر سے محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ زندگی سے بھرپور، دل کھول کر ہنسنے اور بے تحاشا بولنے والی لڑکی اپنی باتوں سے اسے ہنسایا کرتی تو ہنستے ہنستے وہ حیرت سے چپ سا ہو جاتا تھا۔ وہ لیزا کے ساتھ اس کے روم میں جیسے نئے سرے سے پیدا ہوا تھا، جیسے وہ نئے سرے سے زندہ ہوا تھا۔ وہ کھلکھلا کر ہنستی اور وہ مبہوت اس کے چہرے کو دیکھا کرتا، وہ اٹالین لہجے میں اس کے ساتھ اردو میں باتیں کرتی تو اس کا دل چاہتا، وہ بولتی رہے اور وہ اسے تاحیات سنتا رہے۔ اس کے نرم ہاتھوں کا لمس اسے ابھی بھی اپنے ہاتھوں اور لبوں پر یوں محسوس ہو رہا تھا گویا ابھی ابھی وہ اس کے زخموں پر مرہم لگا کر گئی ہو۔

وہ کس طرح اس کی فکر کرتی تھی، وہ کس قدر اس کا خیال رکھتی تھی۔ Tivoli میں پہلی بار اس کے دل نے ضدی انداز میں مچل مچل کر کہنا تھا وہ چاہتا ہے یہ لڑکی ساری زندگی یونہی اس کی فکر کرے، یونہی اس کا خیال رکھے، وہ چاہے اسے مایوس کرے، چاہے اسے ناراض کرے مگر وہ لڑکی یونہی اپنی محبت اس پر نچھاور کرتی رہے۔

وہ اپنے اندر کی ان آوازوں، اس شور سے گھبرایا تھا۔ تیوولی میں اس نے کیوں لیزا کے آنسو صاف کیے تھے۔ اس کا اس پل یہ دل کیوں چاہا تھا کہ وہ اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لے۔ اس سے کہے کہ میرے ہوتے ہوئے تم کیوں رو رہی ہو۔ میں کبھی تمہیں کوئی تکلیف، کوئی نقصان نہیں پہنچنے دوں گا۔ میں اپنی جان دے کر بھی تمہیں ہر نقصان سے بچا لوں گا۔ اپنے اندر سے ابھرتے اس شور نے اسے اتنا ڈرا دیا تھا کہ اس رات ہوٹل جاتے ہی اس نے اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرا لی تھی۔

وہ اگلے روز صبح ساڑھے چھ بجے آفس پہنچ گیا تھا۔ اس نے طے کر لیا تھا وہ آج اور کل کا پورا دن لگا کر اپنا باقی بچا تمام دفتری کام مکمل کر لے گا۔ اس نے قصداً" سارا دن لیزا کو فون نہیں کیا تھا۔ وہ اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنا وقت ادھر ادھر کہیں بھی گزارنے کے لیے وہ شام میں دفتر سے نکلا تھا جب لیزا کی کال آئی تھی۔ یک دم ہی اس کا دل چاہا تھا وہ روم کی گلیوں میں آخری بار اس کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلے۔

اس نے اسی وقت کھڑے کھڑے Trevi فاؤنٹین جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ آج اس سے آخری بار مل رہا تھا۔ خود کو بہت خوش، بہت لاپروا ظاہر کر کے اس نے اسے اپنی واپسی کا بتایا تھا۔ اس کی اداسی، اس کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر اس کا دل بہت دکھا تھا۔ مگر یہ دکھ اس دکھ سے بہت کم تھا جو لیزا کو اس کے اقرار محبت کے بعد اس سے ملتا۔ وہ اسے دے کیا سکتا ہے۔ ناکامیاں، مایوسیاں، تلخیاں، رسوائیاں، ذلتیں وہ ایک زندہ لاش سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ اسے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔ وہ اسے اصرار کر کے اپنے گھر بلا رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اسے انکار نہیں کر پایا تھا۔

وہ جانے سے پہلے ایک بار اور اس سے ملنا چاہتا تھا۔ ایک آخری بار پھر اس کے بعد تو صرف خوابوں اور خیالوں میں ملنا تھا۔ وہ اس آخری دن بھی صبح سے شام تک آفس میں اپنے بقایا کام نمٹاتا رہا تھا۔ لیزا سے صرف ایک میٹنگ ہے کہہ کر اس نے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دینا چاہتا تھا کہ واپسی کا یہ فیصلہ اس نے ایک دم اچانک اور آنا"فانا" کیا ہے۔ وہ پاگل لڑکی اس سے اظہار محبت سننا چاہتی تھی۔ اس سے، سکندر شہریار سے جس کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ بھی تو نہ تھا۔ وہ اسے کیا دے سکتا تھا؟ اس کا وجود زخم زخم تھا، اس کی روح مر چکی تھی، ایک بے جان لاش کے ساتھ اس لڑکی کو کیا مل سکتا تھا؟ وہ خود اپنے آپ سے آخری لمحوں تک بہت ڈرتا رہا تھا۔

اس کی طرف جس طرح اس کا دل کھنچتا تھا۔ اسے بہت خوف آیا تھا اس لمحے سے کہ جس میں لیزا کے آنسوؤں سے یا اپنے دل کے ہاتھوں کمزور پڑتا وہ اس سے کچھ کہہ نہ بیٹھے۔ اظہار محبت نہیں بھی تو کوئی ایسی میٹھی دل نشین بات جو وہ اس سے سننا چاہتی تھی۔ جس میں کوئی وعدہ کوئی امید پنہاں نہ بھی ہو تب بھی وہ بات اس کا لیزا کی جانب التفات اور جھکاؤ ظاہر کرتی ہو' وہ اسے کبھی بھی نہیں بھول پائے گا یہ بتاتی ہو۔ اس کی زندگی کی سچائیاں اتنی کڑوی' اتنی بدصورت تھیں کہ ان میں وہ کسی اور کو حصے دار نہیں بنانا چاہتا تھا تو لیزا محمود کو کیسے بنا لیتا؟ لیزا محمود جس نے اسے زندگی کو پھر سے محسوس کرنا سکھایا تھا' لیزا محمود جس کے روبرو وہ اس کے ساتھ پھر سے خوش ہونا سیکھ کر آیا تھا' جس سے وہ پھر سے ہنسنا سیکھ کر آیا تھا۔

آج اس کی یادوں کے ساتھ سو کر جب وہ بیدار ہوا تھا تو اسے محسوس ہو رہا تھا اس کے اندر زندگی کے لیے وہ نفرت نہیں جیسی وہ زندگی سے بارہ سالوں سے کرتا آیا ہے۔ جیسے اس کے پاس سوچنے کے لیے کچھ ایسا ہے جیسے سوچ کر چند لمحوں ہی کے لیے سہی مگر وہ خوش ہو سکتا ہے' مسکرا سکتا ہے۔

وہ اپنی سیکرٹری کو ایک کانٹریکٹ ٹائپ کرنے کے لیے دے رہا تھا۔ اس کی زیادہ تر صبح بہت جلدی ہو جایا کرتی تھی۔ وہ روزانہ صبح سات اور ساڑھے 7 کے درمیان آفس میں موجود ہوتا تھا۔ اس کی سیکرٹری بھی اس کے اس معمول کے ساتھ خود کو ایڈجسٹ کر چکی تھی۔ وہ بھی صبح جلدی۔ آنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔

اس کے موبائل پر کال آرہی تھی۔ سیکرٹری کو ہدایات دینے کے دوران اس نے موبائل کو دیکھا' یہ اس کے امریکن کولیگ نکولس کی کال تھی۔ دوبارہ آنے سے قبل امریکہ میں جس لاء فرم میں وہ جاب کرتا تھا نکولس وہاں اس کے ساتھ تھا۔ وہ اس سے سینئر وکیل تھا۔ جس وقت زمانے کی ٹھوکریں کھانے کے بعد آخر کار وہ لاء کا امتحان پاس کر لینے میں کامیاب ہو گیا تھا

تب نکولس ایک کامیاب وکیل کے طور پر خود کو منوا چکا تھا۔ اپنا کیریر بنا چکا تھا۔ وہ اس کا ہم عمر ہی تھا۔

وہ برے دنوں کا ایک اچھا ساتھی تھا۔ جس سے دوستی تو نہ تھی مگر ایک اپنائیت بھرا تعلق ضرور تھا۔

اس نے کال ریسیو کی۔

"ہیلو نکولس۔"

"سکندر' کیسے ہو؟"

"فرسٹ کلاس۔ تم سناؤ؟"

زیادہ ٹھیک نہیں ہوں۔ ایک کیس کے سلسلے میں دوبارہ آیا ہوں۔ یہاں سے آج مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے ابوظہبی جانا تھا۔ ایئرپورٹ پہنچنے میں مجھے دیر ہو گئی۔ میری فلائٹ مس ہو گئی۔ میٹنگ شام سات بجے ہے۔ فلائٹس پر انتا رش ہے۔ اب اگلی جس فلائٹ میں مجھے سیٹ مل رہی ہے وہ ہے ہی شام چھ بجے۔ اب میں کیا کروں؟"

نکولس بے چارہ اپنی پریشانی بتا رہا تھا مگر وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگائی تھی۔

"کیا تم بھی میری طرح سو گئے تھے؟" وہ ہنس کر بولا تھا۔ نکولس اتنی پریشانی میں تھا کہ "میری طرح" اور "بھی" کے لفظوں پر دھیان دیے بغیر سنجیدگی سے بولا تھا۔

"نہیں سکندر! بس وہ یہاں کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ ختم ہونے میں دیر لگ گئی۔ میں ایئرپورٹ کے لیے دیر سے نکلا۔ اب ایئرپورٹ پہنچا ہوں تو لیٹ ہو چکا ہوں۔ تم مجھے مشورہ دو میں اب کیا کروں؟"

"بائے روڈ۔ تمہیں بائے روڈ جانا چاہیے اور اگر ڈرائیور مجھ جیسا ہوا تمہیں ستر میل فی گھنٹہ کی اسپیڈ سے گاڑی دوڑا کر لے کر گیا تو تم اپنے مطلوبہ وقت سے پہلے ابوظہبی پہنچ جاؤ گے۔" وہ ہنس کر لیزا کا جملہ' اسی کا انداز اپنا کر بولا تھا۔

"تم وہیں ایئرپورٹ پر ہی رک کر میرا انتظار کرو۔ میں اپنے آفس سے نکل رہا ہوں۔"

فون بند کر کے وہ جلدی جلدی سیکریٹری کو اپنے جانے کا بتانے کے بعد دن بھر میں کیا کیا کام نمٹانے ہیں اس سے متعلق ہدایات دینے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ نکولس کو اس کی میٹنگ کے لیے وقت پر پہنچانے اپنی گاڑی میں لے کر جا رہا تھا۔

"تمہارا بہت شکریہ سکندر! میں دوہا فرسٹ ٹائم آیا ہوں' اگر تم مدد نہ کرتے تو سچ میں میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کروں۔" وہ ہائی وے پر ڈرائیو کرتے ہوئے مسکرایا تھا۔ ہائی وے کے ——— دونوں طرف [illegible] کہیں کہیں خانہ بدوش اور ان کے اونٹوں اور بکریوں کے ریوڑ کے ساتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلا نہیں اڑا رہا تھا۔ بالکل لیزا کی طرح۔

"تم بہت زیادہ تیز نہیں چلا رہے گاڑی؟" نکولس کو جیسے کسی ایکسیڈنٹ کا ڈر لاحق ہوا تھا' وہ قدرے خائف سے انداز میں بولا تھا۔ اسے خوفزدہ دیکھ کر وہ ہنسا تھا۔

"میری یہ ڈرائیونگ ہی تمہیں ٹھیک وقت پر تمہاری منزل پر پہنچائے گی سینور نکولس۔" [illegible] کا جملہ اس کے انداز میں بولنے میں اسے بہت مزا آیا تھا۔ گاڑی ہوا کے دوش پر اڑ رہی تھی۔

"سینور۔" نکولس نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"حیران مت ہو۔ میں ابھی پندرہ دن پہلے اٹلی سے آیا ہوں۔ وہاں کے اثرات ہیں۔" وہ ہنس پڑا تھا۔

نکولس گردن ہلا کر مسکرایا تھا۔ اب جو [illegible] وہ اسے وقت پر پہنچانے خود جا رہا تھا۔ اس لیے نکولس قدرے مطمئن اور پرسکون تھا۔ اس نے سکندر کو بغور دیکھا تھا۔

"میں تمہیں آج پہلی بار ہنستے دیکھ رہا ہوں۔ جب ہم ساتھ کام کیا کرتے تھے تب میں اکثر سوچا کرتا تھا تم اتنے سنجیدہ کیوں رہتے ہو؟ اتنی چھوٹی عمر میں تم نے خود پر اتنی سنجیدگی کیوں طاری کر رکھی ہے۔ تم ہنستے' مسکراتے کیوں نہیں ہو۔ مگر تم خود کو سب سے دور اتنا رکھتے تھے کہ میری ہمت نہیں ہوتی تھی تم سے اس بے تحاشا سنجیدگی کی وجہ پوچھ سکوں۔"

"ہاں بس شاید دوہا کی آب و ہوا مجھے راس آ گئی ہے۔" اسے دوہا کی نہیں کہیں اور کی آب و ہوا راس آئی تھی' اسے خوش رہنا دوہا نے نہیں روما کی لیزا نے سکھایا تھا۔ اس کے پاس سے ایک گاڑی اسے بہت غلط اور خطرناک طریقے سے اوور ٹیک کرتے ہوئے گئی تھی۔ بے اختیار اس کے لبوں سے اس گاڑی کے ڈرائیور کے لیے گالی نکلی تھی۔

"الو کا پٹھا!" بولنے کے ساتھ ہی وہ خود اپنے آپ پر حیران ہوا تھا' پھر بے ساختہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ نکولس حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"کس بات پر ہنس رہے ہو' مجھے بھی بتاؤ؟" ظاہر ہے وہ کیا بولا تھا' نکولس سمجھ نہیں پایا تھا۔

"اپنی زبان میں گالی دینے کا مزا الگ ہوتا ہے نکولس! میں نے اس گاڑی والے کو اپنی زبان میں گالی دی تھی اور پہلی بار مجھے پتا چلا ہے کہ انگریزی میں گالی دینے میں وہ مزا نہیں آتا' جو [illegible] اور تشفی نہیں ہوتی جو کسی کو اپنی زبان میں گالی دے کر ہوتی ہے۔" نکولس بھی اس کے ساتھ ہنس پڑا تھا۔ وہ نکولس کے ساتھ مل کر قہقہہ لگا کر ہنس رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کبھی اصلی اٹالین پزا کھایا ہے؟"

نکولس نے صحیح وقت پر پہنچ کر اپنی میٹنگ اٹینڈ کر لی تب اس کے بعد وہ دونوں ابوظہبی ہی میں ایک بڑا آؤٹ لیٹ پر رات کا کھانا کھانے آ گئے۔ پزا کھاتے ہوئے اس نے نکولس سے پوچھا تھا۔

"ہاں' بہت بار۔"

"نہیں۔ میرا مطلب کسی اٹالین کے ہاتھ کا بنا پزا جو تم نے روما کے کسی Pizzeria میں بیٹھ کر کھایا ہو۔" اس نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

"نہیں۔ وہ تو نہیں کھایا۔ اب تک کبھی اٹلی جانے کا موقع نہیں ملا۔" نکولس نے چھری کانٹے کی مدد سے پزا کھاتے ہوئے کہا۔

"پھر میرا مشورہ ہے تم زندگی میں ایک بار روما ضرور جاؤ۔ وہاں کا فوڈ' مائی گاڈ ——— اور وہاں کی ہسٹری اور آرکیٹکچر ——— جادو ہے اس شہر میں۔ تمہیں خود بخود ہی روما سے محبت ہو جائے گی۔ تمہارا دل چاہے گا' تم یہاں بار بار آؤ۔"

وہ ایک گہری سوچ میں گم ہو کر بولا تھا۔ یوں جیسے وہ اس وقت یہاں تھا ہی نہیں' وہ لیزا کے روما میں تھا' وہ وہاں کی کسی گلی میں پھر رہا تھا' اس کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے۔

"سب خیر تو ہے نا سکندر! تم روم کی کچھ زیادہ ہی تعریفیں کر رہے ہو۔ کہیں تمہیں کسی رومن لڑکی سے محبت تو نہیں ہو گئی تمہیں؟" نکولس نے مسکرا کر کہتے اسے اس کے خیالوں سے نکالا تھا۔ وہ زور سے ہنسا تھا۔

"نہیں بھئی۔ میں نے سنا ہے جب کسی سے محبت ہوتی ہے دل میں بہت زور زور سے گھنٹیاں بجنے لگتی ہیں۔ میرے دل میں تو اب تک کوئی گھنٹی نہیں بجی ہے۔"

نکولس اس کے پرمزاح انداز میں بولے جملوں پر اس کے ساتھ مل کر ہنس پڑا تھا۔ یوں ہنستے ہوئے اس کا دل یک لخت ہی رنجیدہ ہونے لگا تھا۔ اس کا دل اداس ہونے لگا تھا۔

"جسے کھو دیا اسے یاد کر کے بھی کوئی مسکرا سکتا ہے؟"

اس کے دل نے اس سے شکوہ کیا۔

"ہاں کسی کی یاد اتنی خوب صورت ہو سکتی ہے کہ اس کی یاد کے سہارے بھی مسکرایا جا سکتا ہے' خوش ہوا جا سکتا ہے۔ وہ کیوں نہ خوش ہو کر اسے یاد کرے' وہ کیوں نہ اس کی باتیں دہراتا ہوا مسکرائے۔ لیزا محمود اس کی زندگی کی سب سے خوب صورت' سب سے قیمتی یاد ہے۔ وہ یاد جسے وہ زندگی کے آخری لمحوں تک اپنے ساتھ ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ اس سے زندگی میں کبھی ملنا نہیں چاہتا مگر اس سے بھی بڑا سچ یہ ہے کہ وہ اسے کبھی بھولنا بھی نہیں چاہتا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے' آخری پل' آخری سانس تک اسے یاد رکھنا چاہتا ہے۔ اس کی یہ یادیں بہت قیمتی ہیں' بہت انمول ہیں۔ وہ ان یادوں کو اپنی سب سے قیمتی متاع جان کر ساری عمر یونہی اس کی باتیں دہراتے ہوئے گزار دے گا۔

☼ ☼ ☼

محمود خالد لاؤنج میں داخل ہوئے تو وہاں عائشہ صوفے پر بیٹھی تھیں۔ [illegible] ابھی کچھ ہی دیر ہوئی اپنے دفتر سے گھر لوٹے تھے۔

"پلیز وہ [illegible] چائے بنوا دوں؟"

"بالکل پلا دیجیے۔ اگر خود بنا دو تو کیا ہی بات ہے۔ میں تب تک کلثوم کو فون کر لوں۔"

وہ عائشہ کے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔

پہلی شادی کی ناکامی کے بعد انہوں نے دوسری شادی ماں کے اصرار پر مجبور ہو کر بہت ڈرتے ڈرتے کی تھی۔ مگر عائشہ کے ساتھ زندگی کا سفر شروع کرنے کے بعد انہیں فوراً" ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ خود اپنے لیے ایک اچھی بیوی اور اپنی بچیوں کے لیے اچھی ماں نہ چن پائے تھے مگر ان کی ماں نے ایک بہت سلجھی ہوئی' نرم مزاج اور وفا شعار عورت ان کی زندگی کی ساتھی بنا دی ہے۔ عائشہ کے ساتھ نے ان کی الجھی بکھری زندگی کو سنبھال لیا تھا۔ عائشہ ان سے بہت محبت کرتی تھیں اور ان سے محبت کے سبب ان کی دونوں بیٹیوں کو بھی بہت عزیز رکھتی تھیں۔

مریم یہاں آتی تو عائشہ اس کی اور ہاشم کی تواضع میں کوئی کمی نہ چھوڑا کرتی تھیں۔ عید' تہوار اور دوسرے موقعوں پر وہ مریم کو بیش قیمت تحائف اس طرح بھجوایا کرتی تھیں جیسے مائیں بیٹیوں کے سسرال بھیجا کرتی ہیں۔ وہ کلثوم سے بھی نزدیک ہونے کی کوشش کرتی تھیں مگر وہ باپ کو اپنے نزدیک نہ آنے دیتی تھی تو سوتیلی ماں کو کیا آنے دیتی؟

"آج کلثوم کی سالگرہ ہے۔" عائشہ کی سوالیہ

نگاہوں پر انہوں نے مسکرا کر بتایا۔
"پھر تو آپ اسے جلدی سے فون کریں۔ میری طرف سے بھی اسے برتھ ڈے وش کیجیے گا۔"
کلثوم کے سرد اور فاصلہ لیے انداز سے محتاط ہو کر عائشہ نے خود اس سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس نے کبھی عائشہ کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی' بالکل اسی طرح جیسے اس نے کبھی ان کے ساتھ بدتمیزی نہیں کی تھی۔ مگر اس کا سرد اور بے تاثر انداز ان کی طرح عائشہ کو بھی یہ باور کرا دیا کرتا تھا کہ وہ ان دونوں سے بات چیت نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لیے عائشہ اس سے گفتگو میں ہمیشہ محتاط رہی تھیں۔
"میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"
وہ نمبر ملانے لگے تھے۔ عائشہ ان کے پاس سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی تھیں۔ انہوں نے کلثوم کا موبائل نمبر ملایا تھا۔ کال مل گئی تھی۔ کال ریسیو بھی کر لی گئی تھی۔
"السلام علیکم پاپا۔" سپاٹ سے انداز میں اس نے انہیں سلام کیا تھا۔ وہ عادی ہو چلے تھے اس انداز کے' سو گرم جوشی اور مسکراتے ہوئے لہجے میں بولے۔
"وعلیکم السلام۔ کیسی ہے میری آرٹسٹ بیٹی؟"
"میں ٹھیک ہوں پاپا۔ آپ کیسے ہیں؟"
اس کے یہ چند مخصوص جملے جو وہ ان سے فون پر گفتگو کے دوران بولا کرتی تھی انہیں رٹ گئے تھے۔
کبھی تو اس سے ہٹ کر بھی کچھ بول دو [illegible] پاپا۔ مجھ سے جو شکایتیں ہیں تمہارے دل میں' انہیں زبان پر لاؤ۔ میں تم سے معافی مانگ لوں گا۔ زیادتی کی ہے ناں' میں نے تمہارے ساتھ۔ زیادتی نہیں زیادتیاں۔" اس باپ نے خود ہی اپنی تصحیح کی تھی۔
"میں بہت خوش ہوں۔ آج میری بیٹی کی سالگرہ جو ہے۔" انہوں نے مسکراتے لہجے میں کہا۔ "کلثوم! میری دعا ہے بیٹا اللہ تمہاری زندگی کو خوشیوں سے بھر دے۔ خوشیوں اور محبتوں سے بھری ایک بہت طویل عمر میری بیٹی کا نصیب ہو۔"

ان کے لہجے میں ایک باپ کے جذبات کی شدت اور تڑپ موجود تھی مگر یہ شدت اور یہ تڑپ ان کی بیٹی تک پہنچ نہیں پا رہی تھی۔
"تھینکس پاپا! آپ کو یاد رہی میری سالگرہ۔"
اس کا جواب پھر وہی غیر جذباتی اور سپاٹ تھا جس میں احترام تو ہمیشہ شامل ہوا کرتا تھا مگر محبت کبھی بھی نہیں ہوتی تھی۔ اس نے ان کے لیے اپنے جذبات کو برسوں ہوئے سرد کر لیا تھا۔ اس کا یہ سرد اور یہ سپاٹ انداز وہ زندگی کے پچھلے کئی برسوں سے سہ رہے تھے۔
وہ غلط نہیں تھی۔ کل جب وہ چھوٹی تھی اسے ان کی ضرورت تھی تب انہوں نے اس کو نظر انداز کیا تھا۔ ماں تو اپنی بیٹیوں کے لیے بری بنی ہی تھی باپ بھی اچھے نہ بن سکے تھے۔ پھر آج جب وہ بوڑھے ہو چکے ہیں' انہیں اس کی یاد ستاتی ہے تب وہ ان کے پاس کیوں آئے؟ جو کل انہوں نے اسے دیا تھا' وہ آج وہی تو انہیں لوٹا رہی ہے۔ وہ پانچ سالوں سے اس سے نہیں ملے تھے' اس لیے کہ وہ ان سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔
وہ بڑی ہو گئی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی۔ جیسے چاہے اپنی زندگی گزارتی۔ وہ ان کے پاس مستقل رہنے کے لیے تو کیا ملنے کے لیے بھی پاکستان آنے کو کبھی تیار نہ ہوئی تھی۔ وہ اس سے ملنے لندن جا سکتے تھے مگر نہیں جاتے تھے کیونکہ ان کی بیٹی نہیں چاہتی تھی وہ اس سے ملنے آئیں۔
ریٹائرمنٹ کے بعد جب وہ پاکستان واپس آ رہے تھے' تب انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا تھا کہ وہ بھی ان کے ساتھ پاکستان چلے مگر اس نے اس سرد اور سپاٹ سے انداز میں انہیں صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ اب اپنے وطن' اپنی مٹی سے مزید دور رہنا نہیں چاہتے تھے سو بیوی کو لے کر پاکستان چلے آئے تھے۔ دل میں یہ شدید خواہش اور یہ امید رکھتے کہ ایک نہ ایک دن کلثوم بھی ان کے پاس پاکستان آ جائے گی۔
وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ وہ اپنی بہت اچھی جاب' اپنا شان دار کیریئر ان کی خاطر چھوڑ دے مگر ان کی یہ خواہش ضرور تھی کہ کلثوم ان کے اس گھر کو بھی

اپنا گھر مان لے۔ وہ یہاں مستقل نہ رہے مگر چھٹیوں میں تو یہاں آ جایا کرے بالکل اسی طرح جیسے لوگ چھٹیوں میں اپنے گھر جایا کرتے ہیں۔
ان کی یہ بیٹی بہت حساس' بہت نازک تھی۔ وہ ان سے بہت خفا تھی۔ اتنی خفا کہ انہیں یہ حق دینے کو بھی تیار نہ تھی کہ وہ اسے منا سکیں' اس کی سب شکایتیں دور کر سکیں' اسے گلے سے لگا کر پیار کر سکیں' اس سے معافی مانگ سکیں اپنی سب زیادتیوں کی۔ اسے یہ بتا سکیں کہ وہ اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اس کی زندگی کے تیرہ سالوں تک انہوں نے اسے اس طرح نظر انداز کیا تھا کہ آج خواہش رکھنے پر بھی ان تیرہ سالوں کے فاصلوں کو مٹا نہیں سکتے تھے۔
وٹوریا سے لڑائی جھگڑوں نے انہیں اتنا تلخ اور اپنے گھر سے اتنا دور کر دیا تھا کہ انہیں یہ تک یاد نہ رہا تھا کہ وہ صرف گھر اور بیوی کو نہیں اپنی بیٹیوں کو بھی نظر انداز کر رہے ہیں۔ خاص طور پر کلثوم کو۔ جو زیادتیاں انہوں نے اپنی اس بچی کے ساتھ اس کے بچپن میں کی تھیں' وہ آج انہیں رلاتی تھیں۔ وہ ان کا ازالہ کرنا چاہتے تھے مگر کس طرح؟ وہ انہیں اپنے قریب آنے ہی نہیں دیتی۔
اس کی نسبت مریم کے ساتھ بچپن میں انہوں نے کوئی زیادتی نہ کی تھی۔ ایک تو انہیں خود ہی مریم سے پیار زیادہ تھا' وہ دکھتی جو انہیں کی طرح تھی جبکہ کلثوم کے نقوش چونکہ اپنی اطالوی ماں جیسے تھے تو انہیں خود بخود ہی اس میں وٹوریا نظر آنے لگتی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر دیا کرتے تھے دوسرے مریم کو ان کی توجہ اور پیار حاصل کرنا آتا تھا' وہ دفتر سے گھر آتے تو مریم ان کے گھر آتے ہی ان کے کمرے میں گھس آتی' ان کے کندھے پر لٹک جاتی' ضدیں اور فرمائشیں کرتی۔ اپنی ذہانت اور خود اعتمادی سے ان کا دل موہ لیا کرتی جبکہ ان کی وہ کم بولنے والی اور بہت جھجکنے والی چھوٹی بیٹی دور دور سے انہیں دیکھتی رہتی۔
وہ مریم کی طرح اعتماد سے ان کے کندھے پر جھول نہ پاتی تھی' ضدیں نہ کر پاتی تھی۔ اسے مریم کی طرح

اپنی موجودگی کا احساس دلانا نہیں آتا تھا اور وہ اتنے بے حس باپ تھے کہ خود سے اس کی موجودگی کا انہوں نے کبھی احساس ہی نہ کیا تھا۔
"عائشہ بھی تمہیں سالگرہ کی بہت مبارک باد دے رہی ہے بیٹا۔" ایک گہری سانس لے کر وہ بولے تھے۔
"انہیں میرا شکریہ کہہ دیں پاپا۔" وہ خود سے نہ ان کی بات کاٹ کر یہ کہتی تھی کہ اسے کہیں کام سے جانا ہے نہ فون بند کرنے کے لیے کوئی اور جواز تلاش کرتی تھی مگر اس کا گفتگو کا سپاٹ انداز اتنا ٹو دا پوائنٹ ہوتا تھا کہ چند منٹوں بعد ہی وہ ہار مان جایا کرتے تھے۔ جو وہ پوچھ رہے ہیں' بس مختصر جواب دے رہی ہے اور پھر چپ ہو جاتی ہے۔ گویا وہ اس گفتگو کے ختم ہو جانے کا تہذیب اور اخلاق کے ساتھ انتظار کر رہی ہے۔
"تمہاری ایگزیبیشن میں کم دن رہ گئے ہوں گے اب؟"
"جی پاپا۔ تھرسڈے کو شو کا پہلا دن ہے۔ میں ٹیوزڈے کو فلورنس چلی جاؤں گی۔"
"اللہ تمہیں کامیاب کرے بیٹا! میری تمام دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میری بیٹی کامیاب ہو گی تو میں سمجھوں گا میں کامیاب ہو گیا اور تمہارے ساتھ میں بھی کامیاب ہو تو رہا ہوتا ہوں۔ جہاں جہاں لیزا ہوتی ہے وہاں وہاں اس کے ساتھ محمود بھی تو ہوتا ہے۔ جب بھی کہیں کسی میگزین میں یا انٹرنیٹ پر تمہارا نام دیکھتا ہوں تو ایک سرخوشی سی طاری ہوتی ہے لیزا محمود پڑھ کر۔"
اس نے ان کے رکھے نام کو ترک کر کے اپنی ماں کا اپنے لیے رکھا نام اپنے لیے تیرہ سال کی عمر میں لندن جا کر اختیار کر لیا تھا۔ بغیر ان سے اجازت لیے۔ وہ بہت برہم ہوئے تھے' بہت خفا ہوئے تھے مگر وہ اسے روک نہیں پائے تھے کہ اس آزاد معاشرے اور مغربی سرزمین کو جہاں اولاد خود مختار ہوتی ہے۔ ان کی بیٹیوں نے اپنے لیے منتخب نہیں کیا تھا' انہوں نے ان کے لیے اس جگہ کا انتخاب کیا تھا۔
آج اس کی سالگرہ کے دن محض اسے خوش کرنے

کے لیے وہ اسے یہ بتا رہے تھے کہ اس کے عبرانی نام سے جو اس نے ان کی ضد میں اختیار کر رکھا ہے' انہیں پیار ہے اور سچ بھی یہی تھا۔ وہ لیزا تھی یا کلثوم' وہ انہیں بہت پیاری تھی' ساری دنیا میں سب سے پیاری۔ انہوں نے اسے دعائیں دیتے ہوئے فون بند کیا تھا۔ وہ اب چپ چپ اور بہت اداس بیٹھے تھے۔

"کوئی بات؟" عائشہ چائے بنا کر لے آئی تھیں۔

"ہاں۔" انہوں نے دکھ سے بھری ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا ہوا محمود۔ سب خیریت تو ہے ناں؟"

"ہاں سب خیریت ہے۔" عائشہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے وہ دکھ بھرے انداز میں مسکرائے۔

"کیا کوئی بات ہو گئی لیزا کے ساتھ؟ کچھ کہہ رہی تھی کیا وہ؟" وہ خود کو جس نام سے بلایا جانا پسند کیا کرتی تھی' عائشہ نے بھی اسے شروع سے اسی نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔ وہ بلاوجہ مسائل کھڑے کرنے والی عورت نہ تھیں۔

وہ لندن میں جب بھی اس بات پر دکھی ہوتے تھے کہ ان کی بیٹی نے ان کے رکھے نام کو ترک کر کے ماں کے رکھے نام کو اختیار کر لیا ہے تب عائشہ انہیں سمجھایا کرتی تھیں کہ وہ خود کو جس نام سے کہلوایا جانا پسند کرتی ہے اسے حق حاصل ہے اس نام سے خود کو کہلوانے کا اور ویسے بھی لیزا نام مسلمانوں میں بھی ہوتا ہے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ لیزا کا یہ نام اس کی اطالوی اور کرسچن ماں نے رکھا تھا۔

"وہ کچھ کہتی ہی تو نہیں ہے عائشہ! سارا دکھ ہی اس بات کا ہے۔ وہ کچھ کہتی نہیں ہے۔" وہ اداسی سے بولے تھے۔ "وہ خود کو مجھ سے اتنا دور لے گئی ہے کہ اب میں لاکھ چاہوں اسے اپنے نزدیک نہیں کر پاتا۔ وہ مجھ سے ایک بار جھگڑا ہی کر لے' میری زیادتیاں ہی مجھے گنوا دے۔ اس کا یہ سرد اور غیر جذباتی انداز دل کو بہت تکلیف دیتا ہے عائشہ!"

وہ دکھ سے بھرے لہجے میں بے بسی سے بول رہے تھے۔

"کبھی نہ کبھی اسے آپ کی محبت کا یقین ضرور آئے گا محمود۔ لیزا دل کی بہت اچھی ہے' بہت سادہ اور شفاف دل ہے اس کا۔ وہ ہمیشہ آپ سے ناراض نہیں رہ سکے گی۔" عائشہ نے نرم لہجے میں انہیں یقین دلایا تھا' آہستگی سے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جیسے ان کے دل کا درد بانٹنا چاہا تھا۔

"ہاں۔ بہت سادہ اور شفاف دل ہے میری اس بچی کا۔ اسی لیے ڈرتا ہوں عائشہ! اسی لیے بہت ڈرتا ہوں۔"

انہوں نے کرب سے لب بھینچے تھے۔ جو وہ اس پل سوچ رہے تھے وہ بیوی سے شیئر نہیں کر سکتے تھے' وہ وہ بات کسی سے بھی شیئر نہیں کر سکتے تھے۔ مگر وہ بات انہیں ڈراتی بہت تھی۔ کاش ان کے سب ڈر غلط ثابت ہو جائیں' ان کی اس پیاری بیٹی کی زندگی میں سب کچھ بہت اچھا ہو جائے۔ ان کی ضد میں وہ خود کو مزید کوئی نقصان نہ پہنچائے۔

☆ ☆ ☆

ہاشم ٹیرس پر کھڑا تھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ مریم ابھی تک گھر نہیں آئی تھی۔ وہ کئی بار اسے کال کر چکا تھا۔ وہ اس کا فون پک نہیں کر رہی تھی۔ کراچی کے حالات اکیلی لڑکی کے لیے اتنے بھی اچھے نہ تھے کہ رات گئے تک گھر سے باہر وقت گزارا جائے۔ اس نے چوکیدار کو گیٹ کھولتے دیکھا تو اس کی جان میں جان آئی۔

مریم کو گاڑی اندر لاتے دیکھ کر جہاں اس نے سکون کا سانس لیا وہیں اتنی رات گئے تک اس کی گھر سے غیر موجودگی پر اس کا غصہ بھی پھر عود آیا۔ کافی دیر سے مریم کی فکر اور پریشانی میں وہ اپنے غصے کو بھول گیا تھا۔ اب جب وہ بحفاظت گھر پہنچ گئی تھی تب اس کا موڈ خراب ہوا۔

وہ ٹیرس سے اپنے کمرے میں آیا۔ چند ہی سیکنڈز میں کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ مریم اندر داخل ہوئی

تھی۔ اس کی بے تحاشا حسین اور کم عمر بیوی جس سے اسے عشق تھا۔ جس کے عشق میں' جسے اپنا بنانے کی چاہ میں اس نے اپنے بیوی بچوں تک کی پروا نہ کی تھی۔

"اب تک جاگے ہوئے ہو؟ سوئے نہیں؟" حیرت سے اسے دیکھتی وہ اپنا پرس صوفے پر اچھالتی بیڈ پر بیٹھ کر سینڈلز اتارنے لگی تھی۔

"تم کہاں تھیں مریم؟ یہ وقت ہے تمہارے گھر آنے کا؟" اس نے خفگی و ناراضی سے اسے دیکھا۔

"واٹ ڈو یو مین کہاں تھی؟ میں نے صبح ہی تمہیں بتایا تھا۔ آج مجھے ایک چیریٹی شو میں جانا ہے۔"

مریم نے سینڈلز اتارتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"رات کے دو بجے تک؟" ہاشم برہمی سے بولا۔

"ہاں تو شو دیر سے شروع ہوا' میں کیا کرتی۔ کوئی تفریح نہیں کر رہی تھی میں۔ اس کنسرٹ کا سارا پیسہ کینسر کے مرض میں مبتلا غریب بچوں کو ڈونیٹ کیا جائے گا۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تمہاری بیوی ایک سوشل ورکر ہے۔ سوسائٹی کے جو depeived اور پس ماندہ لوگ ہیں ان کی ویلفیئر کے لیے کام کر رہی ہے۔"

مریم اس سے زیادہ تیز لہجے میں بولی تھی' وہ اسے ناراضی سے دیکھ رہی تھی۔

"تمہیں ایٹ لیسٹ مجھے انفارم تو کرنا چاہیے تھا کہ دیر ہو جائے گی۔ اوپر سے میرا فون بھی ریسیو نہیں کر رہی تھیں۔ میں پریشان ہو رہا تھا مریم تمہارے لیے۔ اتنی دیر ہونی ہوتی ہے تو کم از کم ڈرائیور کے ساتھ جایا کرو۔ اکیلی لڑکی کے لیے اتنی رات کو ڈرائیو کرنا بالکل بھی محفوظ نہیں ہے۔"

مریم کی ٹون بدلتے دیکھ کر اس نے فوراً" ہی مدافعانہ انداز میں کہا تھا۔ وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"اس وقت میں کچھ لوگوں کے ساتھ ضروری بات چیت کر رہی تھی' اس کے بعد جب تمہاری کال آئی تو ڈنر چل رہا تھا' نیکسٹ ٹائم محتاط رہوں گی کہ چاہے جس بھی سچویشن میں ہوں اور جس سے بھی بات کر رہی ہوں تمہاری کال فوراً" ریسیو کروں۔ مجھے dominate کرنے کے شوق میں مبتلا میرے شوہر صاحب کو اس سے تسکین ملتی ہے کہ میں خود پر ان کی dominance کو قبول کروں۔"

مریم نے سینڈلز ناگواری والے فرش پر زور سے پٹخے تھے۔ وہ غصے میں وہاں سے فوراً" ہی اٹھی تھی۔

"میرا یہ مطلب تو نہیں تھا مریم! بس میں تمہارے لیے فکر مند ہو رہا تھا۔" اسے خفا ہوتا دیکھ کر وہ فوراً" وضاحتی انداز میں بولا تھا مگر مریم اس کی بات ان سنی کر کے لباس تبدیل کرنے ڈریسنگ روم میں چلی گئی تھی۔

وہ چپ چاپ سا ہو کر بیڈ پر آ کر لیٹ گیا تھا۔ وہ ضدی تھی' وہ غصے کی تیز تھی مگر وہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ اسے ناراض کرنے کا وہ تصور تک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس سے چھوٹی بھی تو بہت ہے۔ کیا اس کی عمر میں وہ ضدی اور غصے کا تیز نہیں تھا؟

مریم کی بدتمیزی پر تھوڑی دیر کے لیے ہی کبیدہ خاطر ہوا ہو گا کہ اس کے دل نے اس سے پوچھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ ضدی اور غصے کا تیز تھا۔ اس نے خود کو فوراً" ہی پندرہ سال پیچھے لے جا کر سوچا تھا۔ اس نے شریک حیات بنانے کے لیے ایک شہزادی کا انتخاب کیا تھا۔ ایک غیر معمولی لڑکی کا انتخاب کیا تھا تو اس کے شایان شان اس کے ناز نخرے بھی تو اٹھانے تھے۔

ام مریم ہاشم کوئی عام سی لڑکی تو نہیں تھی یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی تھی' وہ اس کی زندگی میں شامل تھی۔ باوجود اس کے کہ وہ اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا' تین بچوں کا باپ تھا۔ وہ اس کی سب ضدیں پوری کرتا تھا' وہ اس کی کوئی فرمائش رد نہیں کرتا تھا۔ اللہ نے اسے بہت کچھ دے رکھا تھا' وہ ایک کامیاب بزنس مین تھا' پیسے کی اس کے پاس فراوانی تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ مریم کے منہ سے نکلی ہر خواہش پوری کرے اور وہ پوری کرتا بھی تھا۔ نہ محبت میں اور نہ ہی پیسے میں' وہ اس کے

لیے کسی بھی چیز میں کوئی کمی نہیں رکھتا تھا۔
اس کی شدید خواہش تھی کہ مریم اس کے بچے کی ماں بنے۔ وہ بیٹا ہو یا بیٹی اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا' بس وہ مریم کے جیسا ہو۔ اس کی اور مریم کی اولاد اسے سوچ کر ہی اتنی خوشی ملتی تھی اس بات کو۔ مگر مریم ابھی اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ کہتی تھی ابھی وہ اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتی۔ بچے کے بعد اس کا فگر خراب ہو جائے گا۔ اس کی لائف ڈسٹرب ہو جائے گی۔

جب وہ زیادہ اصرار کرتا تو وہ کہتی اسے کس بات کی فکر ہے۔ اس کے پاس تو پہلے ہی تین تین بچے ہیں' جن کا وہ باقاعدگی سے خرچا بھی ان کی ماں کو بھیجا کرتا ہے۔ آخر ایک اور بچے کی اسے ضرورت کیا ہے؟ وہ اس ضدی لڑکی کو کیسے سمجھاتا' وہ بچہ ان کا ہوگا۔ اس کا اور مریم کا ہوگا۔ اس بچے کی بات ہی الگ ہوگی۔
آخری بار ان کی بچے کے موضوع پر بات ہوئی تو مریم نے کہا تھا' وہ تین سال بعد سوچے گی اس بارے میں۔ ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ کوئی اس کی عمر نہیں گزری جا رہی جو آنا" فانا" وہ ماں بننے کا فیصلہ کر لے یہ سوچ کر کہ اس کے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ چلو تین سالوں ہی کی تو بات ہے' اس نے خود کو مزید تین سال انتظار کرنے پر آمادہ کر لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کی توقع کے مطابق صبح مریم اس سے خفا تھی۔ وہ ناشتے کی میز پر اس کے ساتھ موجود ضرور تھی مگر اس سے بات بالکل بھی نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کیے جوس کے گھونٹ لیتی ہوئی اخبار کی ہیڈلائنز دیکھ رہی تھی۔
"اب یہ ڈائٹنگ بس بھی کر دو مریم کچھ نہیں ہوا ہے تمہارے فگر کو۔ اتنی حسین اور اسمارٹ میری بیوی کو کسی ڈائٹنگ وائٹنگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"
"یار! اب غصہ ختم بھی کر دو۔ اوکے میری غلطی تھی' مجھے پتا ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح کے پروگرامز میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔" وہ اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے منانے والے انداز میں بولا۔
"فون دیکھی تھی تم نے اپنی؟" مریم نے ناراضی سے اسے دیکھا۔
"اچھا ناں یار! آئم سوری۔ معافی مانگ تو رہا ہوں۔ غلطی ہو گئی مجھ سے۔"
"ساری زندگی مجھ سے اس طرح کسی نے تیز آواز میں بات نہیں کی ہے ہاشم! مجھے اونچی آواز میں بات سننے کی عادت نہیں ہے۔ تمہارے کل کے بی ہیویر سے میں بہت ہرٹ ہوئی ہوں۔"
"آئم سوری یار۔ پلیز غصہ ختم کرو۔ چلو ویک اینڈ کا کوئی پروگرام رکھ لیتے ہیں۔"
وہ بڑے دل سے اسے منا رہا تھا۔ یہ ناز' یہ نخرے اس پر سجتے تھے اور وہ اس کے ناز' نخرے اٹھانے میں بہت خوشی محسوس کرتا تھا۔
"کیسا پروگرام؟" شکر تھا' بڑی دیر کے بعد وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔
"دبئی چلتے ہیں۔ میں اس ویک اینڈ پر اپنی چہیتی مسز کو دبئی میں دل بھر کر شاپنگ کرانا چاہتا ہوں۔"
"بس دو دن کے لیے جائیں گے ہاشم! منڈے کو میری بہت امپورٹنٹ میٹنگ ہے۔ ایک نیا اسکول کھول رہے ہیں ہم لوگ کراچی کی ایک کچی آبادی میں۔ اس سلسلے میں سب ڈیٹیلز طے کی جانی ہیں۔"
وہ جانے کے لیے بھی تھوڑا نخرا دکھا کر ہی تیار ہوئی تھی۔ وہ مسکرا کر سر اثبات میں ہلا رہا تھا۔ اس کا ارادہ تھا' وہ دبئی میں مریم کو اتنی مہنگی شاپنگ کرائے گا کہ اس کا دل خوش ہو جائے گا۔ جس چیز پر وہ ہاتھ رکھے گی وہ اسے دلائے گا۔

☆ ☆ ☆

"دادی جان یہ کون ہیں؟"
علی اپنی میٹھی اور توتلی زبان میں امو جان سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کے ماں' باپ کو دادی جان اور دادا جان

بڑے میٹھے لہجے میں بولا کرتا تھا، موڈ اچھا نہ بھی ہو تو بھی خود بخود ہی مسکراہٹ لبوں پر آجائے۔ مگر اس پل وہ البم میں جس تصویر کے اوپر ہاتھ رکھ کر یہ بات پوچھ رہا تھا، اسے دیکھ کر وہ بیٹے کی میٹھی آواز سن کر بھی مسکرا نہ سکا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ تمام افراد لاؤنج میں ساتھ بیٹھے تھے۔

نورہ سب کے لیے کافی بنا کر لے آئی تھی۔ ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ شہریار خان ہلکی آواز میں کرنٹ افیرز کا کوئی پروگرام دیکھ رہے تھے۔ بے تحاشا شرارتی اور ادھر ادھر مختلف چیزوں میں گھسنے کا شوقین علی نجانے کہاں سے ایک پرانا البم اٹھا لایا تھا۔

"دادا جان! آپ بھی دیکھیں۔" علی نے ٹی وی دیکھتے دادا کو متوجہ کیا۔ اپنے وقت کے بڑے رعب و دبدبے والے اس کے پاپا بھی علی کی کوئی بات نہیں ٹالا کرتے تھے۔

وہ زین شہریار جو باپ سے کبھی اپنی کوئی ضد نہ منوا سکا تھا، اپنے بیٹے کو منواتا دیکھ کر مسکرا دیا کرتا تھا۔

"دکھاؤ بھئی علی کون سی پکچرز ہیں۔" وہ فوراً متوجہ ہوگئے۔

"یہ والی۔" علی نے تصویروں پر انگلی رکھ کر بتایا۔ شہریار خان مسکرا دیے تھے۔ اموجان علی کے سوالوں کے جواب دے رہی تھیں۔ وہ پوچھتا جا رہا تھا، یہ کون ہے اور وہ کون ہے۔

"یہ تمہارے دادا جان ہیں، یہ میں ہوں، یہ تمہارے پاپا ہیں اور یہ۔"

وہ تصویر میں موجود اگلے فرد کا تعارف نہیں کرا پائی تھیں۔ یہ اس کے بچپن کے دنوں کی ایک گروپ فوٹو تھی۔ اس نے نگاہیں اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ ان کی آواز رندھ گئی تھی۔ وہ ایک دم ہی بالکل چپ ہوگئی تھیں۔

اس نے ماں پر سے فوراً ہی نظریں ہٹا لی تھیں۔ ماں، ماں ہوتی، وہ اس کی بھی ماں تھی اور اس شخص کی بھی۔ جس طرح اس شخص کے لیے کبھی وہ اپنا دل نہیں بدل سکتا، اسے معاف نہیں کر سکتا، ایسے ہی اس کی ماں بھی اپنا دل نہیں بدل سکتی۔ جب سے ماں اس شخص کی یاد میں بیمار پڑی تھی، وہ ماں کے جذبات بہت سمجھنے لگا تھا۔ ماں اس سے فون پر رابطے میں رہتی ہے، وہ جانتا تھا۔ اگرچہ یہ فون کالز بڑی خاموشی اور تنہائی میں کی جاتی تھیں مگر اس کے اور شہریار خان کے علم میں تھیں۔

اس کی بیمار ماں اگر اس شخص سے ملنے کی خواہش کا اظہار کرتی تب بھی وہ ماں کی ممتا کو حق بجانب سمجھتا۔ جب سے وہ بیمار پڑی تھیں شہریار خان نے اپنے سخت اور بے لچک انداز کو تھوڑا سا تبدیل کر لیا تھا۔ رہ گیا وہ۔۔۔ وہ تو اس شخص سے زندگی کے آخری لمحے تک نفرت کرتا رہے گا۔ وہ دعا کرے گا کبھی اس کی شکل دیکھنے کی نوبت نہ آئے مگر اس کی ماں اگر اس شخص سے بات کرنا اور ملنا چاہتی تھی تو یہ اس کا حق تھا۔

"دادی جان! یہ کون ہیں؟" اس کا ذہین بیٹا تصویر میں موجود چوتھے فرد کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ اس نے نظریں علی، اموجان اور اپنے باپ سے ہٹا کر ٹی وی کی جانب کر لی تھیں یوں جیسے نہ تو اس نے کچھ سنا تھا اور نہ کچھ دیکھا تھا۔

"یہ تمہارے پاپا کے بھائی ہیں علی!"

اموجان نے آہستگی سے کہا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھینچ گئی تھیں بھائی کے لفظ پر۔ وہ بیمار ماں اور اپنے بہت معصوم اور چھوٹے سے بیٹے کا خیال کر کے چپ تھا۔

"پاپا کے بھائی۔۔۔ دادی جان ان کا نام؟" اس نے ٹی وی کی آواز تیز کر دی تھی۔ وہ خود کو مکمل طور پر ٹی وی میں مگن ظاہر کر رہا تھا۔

"ان کا نام سکندر ہے۔" اس کے کانوں میں ماں کی بھرائی ہوئی آواز آئی۔ انہوں نے البم کا صفحہ جلدی سے یوں پلٹا تھا جیسے علی کے مزید کسی بھی بچکانہ سوال کی متحمل نہیں ہو سکتی تھیں۔

"علی! چلو، تمہارے سونے کا ٹائم ہو رہا ہے۔"

نورہ بڑی سمجھ دار لڑکی تھی۔ علی کی سوئی البم میں اٹکی دیکھ کر اس نے اسے وہاں سے اٹھانا چاہا تھا۔

"ماما! ابھی نہیں ناں۔" علی نے منہ بسور کر کہا۔

"بچے دیر تک نہیں جاگتے علی! چلو شاباش ابھی ہمیں بہت اچھی اسٹوری بھی تو سننی ہے۔"

وہ علی کو گود میں اٹھا کر اس سے سونے سے پہلے اور سو کر اٹھنے کے بعد کیا کیا کریں گے والے اس کی پسند کے وعدے کرتی اسے وہاں سے لے جا رہی تھی۔ ماں کے خیال سے وہ ضبط کر رہا تھا مگر نورہ نے اس کی فیلنگز کو سمجھ لیا تھا اور وہ علی کو ہی وہاں سے لے گئی تھی۔

اس نے قصداً نظریں ٹی وی پر رکھیں۔ نہ ماں کی طرف دیکھا نہ باپ کی طرف۔ وہ وہاں مزید چند منٹ بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ اس کے ایک دم اٹھ جانے پر ماں کا دل رنجیدہ نہ ہو۔ اس شخص سے نفرت اپنی جگہ مگر بیمار ماں کا دل دکھایا جانا ضروری تو نہ تھا۔ بغیر ماں باپ کی طرف دیکھے بھی وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی ماں اپنے آنسو پی رہی ہوگی اور شہریار خان کا چہرہ ہمیشہ کی طرح بے تاثر ہو گیا، ایسا کہ ان کے اندر کی کوئی ایک بھی سوچ پڑھی نہ جا سکے۔

یہاں اس کے گھر میں صرف شہریار خان ہی ایسے نہ تھے جو اپنی سوچیں اور اپنے جذبات اپنے ہی تک رکھتے تھے بلکہ آمنہ شہریار خان اور وہ خود بھی تو ایسا ہی کرتے تھے۔ اس شخص کے ان کی زندگیوں سے نکلنے کے بعد سے ان باقی بچے تین افراد کے مابین بھی ایک دیوار اور ایک کبھی نہ مٹنے والی خلیج پیدا ہو گئی تھی۔

وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنی اپنی الگ دنیاؤں میں رہ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے دل کا حال چھپائے ہوئے، ایک دوسرے سے اپنے غم چھپائے ہوئے۔

☼ ☼ ☼

وہ بیڈ پر لیٹا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نورہ بیڈ پر اس کے برابر آ کر لیٹی تھی۔

"علی سو گیا؟"

"ہاں۔" وہ جواباً مسکرائی تھی۔

"ضد کر رہا تھا آج دادی جان کے پاس سوؤں گا۔ اموجان کے پاس لٹا کر آئی ہوں۔ نیند گہری ہو جائے تو یہاں لے آؤں گی۔"

اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کس چیز سے ڈسٹرب ہوا ہے، اس لیے اس کی غیر معمولی خاموشی کی وجہ سے نہیں پوچھ رہی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ اٹھا کر اس کے ہاتھوں کی انگلیوں کو بغور دیکھنے لگی۔

"آپ کے ہاتھ کتنے خوب صورت ہیں زین؟"

"اچھا۔" وہ بے ساختہ مسکرایا تھا۔ "تمہیں تو میں پورا کا پورا ہی بہت خوب صورت لگتا ہوں۔" وہ محظوظ ہونے والے انداز میں بولا تھا۔

نورہ ساڑھے تین سال قبل اس کی زندگی میں آئی تھی۔ وہ شہریار خان کے ایک دوست کی بیٹی تھی مگر اس کا انتخاب اموجان نے کیا تھا اور اس کی شادی کے لیے اصرار اموجان اور شہریار خان دونوں ہی نے کیا تھا۔ ان دونوں کی خواہش تھی کہ اس کی شادی ہو جائے تاکہ ان کے گھر کا سناٹا دور ہو سکے۔

شادی کبھی نہ کبھی تو کرنی ہی تھی تو ماں کی خواہش پر کیوں نہیں، ماں کی پسند سے کیوں نہیں؟ اس نے اپنے لیے لڑکی کا انتخاب اموجان پر چھوڑ دیا تھا۔

نورہ اموجان کی پسند تھی اور انہوں نے حقیقتاً اس کے لیے ایک بہت ہی اچھی لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔ وہ محبتوں سے گندھی، نرم خو اور سب کی پروا کرنے والی لڑکی تھی۔ نورہ اور پھر علی کے آجانے کے بعد ان کے گھر کا سناٹا ٹوٹ گیا تھا، یہاں پھر سے رونق آگئی تھی۔

نورہ اس کے لیے بہت اچھی بیوی ثابت ہوئی تھی، اس کے والدین کے لیے بہت اچھی بہو اور اس کے بیٹے کی بہت اچھی ماں۔ بارہ سال قبل اس گھرانے میں کیا طوفان آیا تھا، ایسی کون سی آندھی آئی تھی جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔ نورہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے کبھی پوچھا نہیں تھا۔ اور اس نے کبھی بتایا نہیں تھا۔

وہ بس اتنا جانتی تھی کہ اس گھر میں سکندر شہریار کا

نام نہیں لیا جاتا' اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ سو ایک اچھی بیوی اور بہو ہونے کے ناتے وہ اس پابندی کا احترام کرتی تھی۔

بہت حسین' محبت کرنے والی' وفا شعار بیوی' پیارا سا بیٹا' کامیاب کیریر اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو ایک کامیاب اور زندگی سے خوش شخص کے پاس ہونا چاہیے۔ بطور لائر اس کا کیریر شاندار تھا۔ اس کی لاء فرم اپنی بہت اچھی ریپوٹیشن بنا چکی تھی اور پاکستان کی نمایاں فرمز میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ اس کی فرم کے کراچی کے ساتھ ساتھ اسلام آباد' لاہور اور کوئٹہ میں بھی دفاتر تھے۔ یو کے اور جاپان میں بھی اس کی فرم کئی نمایاں فرمز کے ساتھ مل کر کئی اہم کیسز پر کام کر رہی تھی۔ شہریار خان ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے خاندانی بزنس کو سنبھال رہے تھے۔ اس نے ان کے ساتھ کاروبار میں شامل ہونے کے بجائے اپنی لاء فرم اسٹیبلش کی تھی۔ شہریار خان اور امو جان اس سے پہلے ہی امریکہ سے پاکستان واپس آگئے تھے۔ وہ اپنی لاء کی ڈگری مکمل کرتے ہی ان کے پاس پاکستان چلا آیا تھا۔ جہاں اس کے ماں' باپ رہنا چاہتے تھے وہ بھی وہیں رہنا چاہتا تھا۔

ساری زندگی امریکہ میں گزارنے کے باوجود امریکہ اس کے لیے اہم نہیں تھا۔ اس کے لیے اہم وہ جگہ تھی جہاں اس کے ماں باپ رہنا چاہتے تھے۔ وہ ایک کامیاب انسان تھا' اسے زندگی سے خوش ہونا چاہیے تھا مگر نجانے وہ پورے دل سے خوش کیوں نہیں ہو پاتا تھا۔

"آپ کو بھی میں خوب صورت لگتی ہوں یا نہیں لگتی؟" نوریہ اسے خیالوں سے کھینچ کر لائی۔ اس کا ہاتھ ابھی بھی نوریہ کے ہاتھ میں تھا۔

"تم مجھے بہت خوب صورت لگتی ہو۔ لگتی کیا ہو تم ہو ہی بہت خوب صورت۔"

"بہت دنوں کے بعد میری تعریف کر رہے ہیں تو یہ بھی کہہ دیں کہ آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ کافی عرصہ ہو گیا آپ کو یہ بات کہے ہوئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ نے آخری بار آئی لو یو نوریہ! علی کی پیدائش کے دن بولا تھا۔"

وہ شرارتی سے انداز میں بولی۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"ڈھائی سال گزر گئے' یہ تو بہت بڑی زیادتی ہو گئی میری طرف سے۔ اوکے تو مسز نوریہ زین شہریار! میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔ آئی لو یو۔"

وہ اس کی طرف جھک کر بولا وہ اس کے لیے بہت اہم تھی' اس کے بیٹے کی ماں تھی۔ وہ اس کی بہت پروا کرتا تھا۔ وہ پورا کا پورا نوریہ کا تھا' سو فیصد اس کے ساتھ مخلص' وفادار مگر اپنے دل پر اس کی گرفت نہ تھی۔ اس کے دل کے کسی گوشے میں آج بھی وہی لڑکی بسی تھی۔ جس نے اسے محبت کرنا سکھایا تھا۔ جس نے اسے محبت کیا ہوتی ہے بتایا تھا۔

وہ ام مریم پتا نہیں آج کہاں ہو گی۔ کیسی ہو گی۔ اس نے شادی کی ہو گی یا نہیں' وہ خوش ہو گی اپنی زندگی میں کہ نہیں؟ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ اسے یاد بھی نہیں کرتا تھا' وہ کسی سے اس کا ذکر بھی نہیں کرتا تھا مگر بارہ سال بعد بھی وہ اسے بھلا نہیں سکا تھا۔ سچی محبت تو زندگی میں ایک بار ہوتی ہے' صرف ایک بار۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی' جیسی بھی زندگی گزار رہی تھی' اسے یقین تھا' اسے بھول نہیں پائی ہو گی' وہ اسے یاد کرتی ہو گی۔ جس طرح اس کے دل سے اس کی محبت نہیں نکل سکی' اسی طرح اس کے دل سے بھی اس کی محبت [illegible] نہیں سکی ہو گی۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک کلائنٹ کے ساتھ لنچ کر کے باہر نکلا تھا۔ آفیشل نوعیت کے اس لنچ میں پروفیشنل گفتگو ہی رہی تھی۔ کلائنٹ سے خوش اخلاقی سے مصافحہ کر کے وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کئی طرح کے دفتری کاموں میں اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ابھی آفس پہنچتے ہی اسے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی تھی۔ پھر اپنی سیکریٹری سے ایک اہم کانٹریکٹ ٹائپ کروانا تھا۔ ایک دوسری

کمپنی کے ان کی کمپنی کے ساتھ Merger کا معاہدہ تھا جسے وہ ڈرافٹ کر کے اپنی میز پر چھوڑ آیا تھا۔ ان تمام آفیشل باتوں کو سوچتے ہوئے وہ گاڑی کا دروازہ کھول رہا تھا جب اس کے نزدیک سے سرخی مائل براؤن بالوں والی ایک لڑکی گزری۔

"لیزا۔" بے اختیار اس کے لبوں سے مدھم آواز میں نکلا تھا۔ لڑکی اس کے نزدیک سے بہت تیزی سے گزرتی ہوئی گئی تھی وہ ٹھیک سے اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔ مگر وہ لیزا ہی تھی۔ وہ جانتا تھا وہ لیزا تھی۔ اس کے بال سرخی مائل براؤن تھے' سلکی تھے' وہ لیزا [illegible] وہ یہاں میں کیا کر رہی ہے؟ یہ وہ [illegible] میں اس سے پہلے پہلے اس سے مل لے۔

"لیزا!" اس نے اسے پکارا مگر تب تک وہ لڑکی بہت تیزی میں سامنے نظر آتے شاپنگ مال میں داخل ہو چکی تھی' اس نے اس کی پکار نہیں سنی تھی۔

وہ بے ساختہ اس کے پیچھے آیا تھا۔ وہ شاپنگ مال کے اندر داخل ہوا تو بلیک کلر کیپری پینٹ' ریڈ کلر کے اسٹائلش ٹاپ کے ساتھ پہنے وہ اسے ایسکیلیٹر پر اوپر جاتی نظر آئی۔ اتنی دور سے چلا کر آواز دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ تقریباً" بھاگتا ہوا ایسکیلیٹر پر چڑھا تھا۔ وہ مال کی پہلی منزل پر اترا تو وہ اسے سامنے ایک زنانہ ملبوسات کی شاپ میں داخل ہوتی نظر آئی۔ اس نے اپنے قدموں کی رفتار انتہائی تیز کر دی تھی۔

"ہائے لیزا!" وہ نیل پالش سے سجے اپنے خوب صورت ہاتھوں سے ہینگر میں ٹنگے مختلف ملبوسات کو آگے پیچھے کر کے دیکھ رہی تھی جب اس کے قریب پہنچ کر وہ بولا۔ لڑکی نے حیرت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟" وہ انگریزی میں بولی۔

اس پر شدید ترین مایوسی اور پھر شرمندگی کا حملہ ہوا۔ وہ تو کوئی اور تھی۔

"آئم سوری۔ میں آپ کو کوئی اور سمجھا تھا۔ آئم ایکسٹریملی سوری۔"

"اٹس اوکے۔" اخلاقاً" ہلکا سا مسکرائی تھی جیسے اس کی غلط فہمی سمجھ گئی ہو۔

وہ اسے دیکھتا اس کے پاس سے ہٹ گیا تھا۔ وہ یورپین تھی' شاید اسپینش یا پھر اٹالین' بہت اسٹائلش انداز میں تیار تھی' اس کے شانوں تک آتے سلکی بال سرخی مائل براؤن کلر کے ہی تھے۔ وہ سرخی مائل براؤن بالوں کو دیکھ کر اس کے پیچھے چلا آیا تھا' کیا ہر یورپین لڑکی جس کے سلکی بال شانوں تک آتے ہوں گے' سرخی مائل براؤن کلر کے ہوں گے وہ اس کے پیچھے یونہی دیوانہ وار بھاگے گا؟

اپنی حماقت پر اسے غصہ آیا تھا۔ یہ ایک انتہائی احمقانہ اور بچکانہ حرکت تھی۔ وہ شاپنگ مال سے واپس نکل آیا تھا۔ "وہ لیزا کیوں نہیں تھی۔" وہ گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔

"چاؤ سینور سکندر۔" اس کے نزدیک سے آواز آئی۔ وہ اختیار گھوما۔

"لیزا!" وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ پچھلے کافی سارے دنوں سے اس کی باتوں اور اس کی یادوں کے ساتھ بہت خوش تھا مگر آج اس سرخی مائل براؤن بالوں والی یورپین لڑکی کو دیکھ کر وہ بہت بے چین اور بے قرار ہو گیا تھا۔

وہ لڑکی لیزا کیوں نہیں تھی؟ وہ کوئی اور کیوں تھی؟ وہ لیزا بھی تو ہو سکتی تھی۔

جب لیزا محمود روم' لندن' فلورنس ہر جگہ گھوم پھر سکتی تھی۔ تو وہ یہاں بھی تو آ سکتی تھی۔

وہ لیزا کیوں نہیں تھی؟ لیزا محمود وہاں کیوں نہیں آئی تھی؟

باقی آئندہ شمارے میں

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں گمن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ اپنا توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

یاسمین اور شہباز درانی کی نامناسب گفتگو سن کر اریبہ غصے میں بائیک لے کر نکل جاتی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ شمشیر علی بروقت اسپتال پہنچا کر اس کی جان بچالیتا ہے۔ اسی اسپتال میں تاجور بھی داخل ہے۔ اسپتال میں اریبہ کے پاس ساجدہ بیگم ٹھہری ہوئی ہیں۔ اریبہ ہوش میں آنے کے بعد اپنے رویے اور سوچ پر نادم ہے۔ شمشیر علی، توصیف احمد کے آفس میں کام کرتا ہے۔ توصیف احمد نے اسے سیف سے ایک ضروری فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دینے کے لیے کہا۔ بعد میں انہیں پتا چلا ہے کہ سیف میں سے فائل کے ساتھ ستر لاکھ روپے بھی غائب ہیں۔

۸

آٹھویں قسط

"ستر لاکھ مسٹر شمشیر.....!" توصیف احمد نے دہرایا' پھر کہنے لگے۔ "تم جانتے ہو' جس روز میری بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوا اس کے بعد میں آج آفس آیا ہوں' اس دوران اگر کوئی میرے کمرے میں آیا بھی تو میری ٹیبل تک کو نہیں چھوا' ہر شے جوں کی توں موجود ہے۔ جبکہ سیف کی چابی میں نے خود تمہیں دی تھی' صرف ایک فائل کے لیے۔"

"جی اور میں نے صرف فائل ہی نکالی تھی۔" وہ تھوک نگل کر بولا تھا۔

"دیکھو شمشیر علی! یہ تو طے ہے کہ سیف تمہارے علاوہ کسی نے نہیں کھولا تو پھر رقم کوئی دوسرا کیسے لے سکتا ہے۔ تم آرام سے نہ صرف اعتراف کرو بلکہ میری رقم بھی مجھے لوٹا دو تو یہ معاملہ یہیں ختم ہو جائے گا۔"

توصیف احمد اتنے یقین سے بات کر رہے تھے کہ وہ چکرا گیا۔

"سر! میں کیسے اعتراف کر لوں۔ جب میں نے فائل کے علاوہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور رقم تو میں نے دیکھی بھی نہیں تھی۔" وہ اپنی ساری توانائیاں صرف کر کے بولا تھا۔

"تو پھر کہاں گئی رقم؟" توصیف احمد اچانک دھاڑے تھے۔ "ستر ہزار کی بات نہیں ہے' جو میں نظر انداز کر دوں ستر لاکھ تھے۔"

"ستر کروڑ بھی ہوتے تو بھی میرے لیے حرام تھے۔" اس نے جی کڑا کیا۔

"شٹ اپ!" توصیف احمد اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ غالباً "غصے پر قابو پا رہے تھے" پھر بولے تو آواز نارمل تھی۔

"تم نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے شمشیر علی! اس لیے میں تمہارے خلاف کارروائی نہیں کرنا چاہتا اور چاہتا ہوں یہ معاملہ یہیں دب جائے' اس کمرے سے باہر بھی نہ جائے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تم سچ کہو۔"

"اس سے بڑی سچائی اور کیا ہو گی سر! کہ میں آپ کے سامنے موجود ہوں۔" اس نے کہا تو توصیف احمد رک کر اسے دیکھنے لگے۔

"ستر لاکھ میرے لیے بہت بڑی رقم ہے اور میں بہت چھوٹا آدمی ہوں۔ اتنی بڑی رقم ہاتھ آنے پر یہی سوچتا کہ یہ میری پوری زندگی کے لیے کافی ہو گی اور کہیں روپوش ہو جاتا۔ آپ کے سامنے موجود نہ ہوتا۔"

اس کی بات میں وزن تھا۔ توصیف احمد کچھ نہیں بولے تو قدرے توقف سے وہ کہنے لگا۔

"یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ آپ کو فوراً "میرا خیال آیا۔ کیونکہ سیف میں نے ہی کھولا تھا لیکن آپ کے کہنے پر' آپ کو پہلے پوری انکوائری کرنی یا کروانی چاہیے۔"

"انکوائری میں بھی سب سے پہلے تمہارا نام آئے گا اور تفتیش میں بھی۔" توصیف احمد نے کہا تو اس نے ایک لحظہ کو ہونٹ بھینچے تھے' پھر اسی اعتماد سے بولا۔

"میں جانتا ہوں سر! اور مجھے اس کا کوئی خوف نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے' اب تم جا سکتے ہو۔ آئی مین' اپنی سیٹ پر۔"

توصیف احمد نے کہا تو وہ ان کے کمرے سے نکل آیا۔ گو کہ اس کا ضمیر مطمئن تھا لیکن یہ اس کے خلاف سازش بھی ہو سکتی تھی' اس خیال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ سارا معاملہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ آیا' اس کے خلاف سازش ہے یا واقعی کسی نے رقم چرائی ہے اور چور کون ہو سکتا ہے۔ آفس ہی کا کوئی آدمی یا باہر سے کوئی آیا تھا؟ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ایک ایک شخص کو بغور دیکھا۔ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اچانک اس کا دل ڈوبنے لگا۔ شاید چھٹی حس نے کسی ناگہانی کا اشارہ دیا تھا۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اسے تاجور کا خیال آیا۔ خدانخواستہ وہ کسی مصیبت میں گھر گیا تو تاجور کا کیا ہو گا۔ اس کے بعد وہ کچھ اور سوچ ہی نہیں سکا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

تیز تیز بولنے کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے غور کیا تو یاسمین' ساجدہ بیگم کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔

"اس مکار عورت نے میری بیٹی کو میرے خلاف ورغلا دیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں اریبہ کو میں بات کرتی ہوں تو ادھر ادھر دیکھنے لگتی ہے۔ جیسے میں اس سے نہیں' کسی اور سے مخاطب ہوں۔"

"مما پلیز' آپ ٹینشن نہ لیں۔" یہ سارہ کی آواز تھی۔

"کیسے ٹینشن نہ لوں۔ میری دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اب دیکھنا' وہ مجھے اس گھر سے نکال کر ہی دم لے گی۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا اور اریبہ کوئی چھوٹی بچی نہیں ہے' جو کسی کے بہکاوے میں آ جائے گی۔ آپ چلیں اپنے کمرے میں۔"

سارہ زچ ہو رہی تھی اور شاید زبردستی یاسمین کو اس کے کمرے سے لے جا رہی تھی۔ اس کے بعد وہ جانتی تھی' سارہ یہیں آئے گی' اس لیے وہ اٹھ گئی۔ ہاتھ منہ دھویا اور بالوں میں برش کر کے خود کو فریش ظاہر کرنے لگی۔ ابھی بھی اب وہ ہر طرف سے دھیان ہٹا کر اپنی پڑھائی پر توجہ دینا چاہتی تھی۔ پہلے ہی کافی نقصان ہو گیا تھا۔ اسے یاد تھا جس روز اس کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا' اس دن ڈاکٹر نے اسے پی پی ہشنٹ کی کیس ہسٹری تیار کرنے کو کہا تھا اور اسے پی پی ہشنٹ مل بھی گئی تھی۔

"کیا بھلا سا نام تھا اس کا؟" وہ سوچنے لگی تھی کہ سارہ کے آنے پر بلا ارادہ اس سے مخاطب ہو گئی۔

"کیا ہوا' مما کس پر ناراض ہو رہی تھیں؟"

"کسی پر نہیں۔" سارہ کا چڑا ہوا انداز بتا رہا تھا کہ اس سے ماحول میں کشیدگی برداشت نہیں ہو رہی۔ یا ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو' وہ بہرحال یہی سمجھی تھی' جب ہی خاموش ہو گئی۔

"ڈیڈی نے بھی حد کر دی۔" سارہ خود ہی کہنے لگی۔ "ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا انہیں۔ تائی امی کو اتنی اہمیت اور مما کو کچھ سمجھا ہی نہیں' مزید تم بھی۔ ویسے تمہیں کیا ہوا ہے' تم کیوں مما سے بات نہیں کر رہیں؟"

"تمہارا کیا خیال ہے مجھے تائی امی نے بہکایا ہے؟" اس کے انداز میں' لہجے میں یہ کیسا ٹھہراؤ آ گیا تھا' سارہ الجھ کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے کسی نے نہیں بہکایا۔ مما غلط سمجھ رہی ہیں اور تم بھی۔ ڈیڈی نے صرف اس لیے مما کو میرے پاس نہیں رکنے دیا تھا کہ یہاں تم اکیلی ہو جاتیں۔ تائی امی کو بھی تمہارا خیال تھا۔ مما ناحق ناراض ہو رہی ہیں۔ تم انہیں سمجھا دو۔"

"وہ نہیں سمجھیں گی۔ جب تک تم ان سے بات نہیں کرو گی۔ آخر تم ان کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟"

سارہ نے تنگ پڑ کر کہا تو وہ سوچ کر بولی تھی۔

"کیونکہ اس حادثے نے مجھے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ میرا ذہن بہت ڈسٹرب ہے۔ اس لیے میں ابھی مما کی باتیں نہیں سن سکتی۔ میں تمہاری طرح نہیں ہوں سارہ! تم بہت اچھی ہو' تم نے مما کی باتیں صرف سنیں' کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ نہ ان کے کہنے پر کسی کے خلاف کچھ بولیں اور میں... میں نے تو باقاعدہ محاذ بنا لیا تھا۔ ہر ایک سے لڑ بیٹھی اپنے بچکانہ جذباتی پن کے باعث سب کو ناراض کر بیٹھی۔"

"تو تمہیں احساس ہو رہا ہے۔" سارہ آزردگی میں گھر گئی تو وہ ٹھٹک کر پوچھنے لگی۔

"تمہیں دکھ ہو رہا ہے؟"

"نہیں۔" سارہ چونک کر سٹپٹائی تھی۔ "دکھ کیوں ہو گا' یہ تو خوشی کی بات ہے۔" "ہاں! لیکن میں تلافی کیسے کروں گی۔ کیسے مناؤں گی سب کو' خصوصا" رازی کو۔ اسے تو میں نے بہت ہرٹ کیا ہے۔ کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟"

وہ کھو گئی تھی۔ غالبا" رازی کے ساتھ اپنا رویہ سوچنے لگی تھی۔ سارہ جز بز ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بس جانے دو۔ جو ہو گیا سو ہو گیا۔ تم نے تائی امی سے معافی مانگ لی ناں' مزید کسی کے سامنے جھکنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ٹھیک تو کہہ رہی ہوں۔" وہ ہنوز کھوئی ہوئی تھی' پھر ایک دم چونک کر پوچھنے لگی۔ "سنو تم نے تائی امی کو فون کیا تھا!"

"ہاں! تمہاری طبیعت بھی پوچھ رہی تھیں۔" سارہ نے کہا تو اس نے کسی خیال سے پوچھا۔

"رازی سے بات ہوئی؟"

"نہیں۔" سارہ مختصر تھی۔

"تم فون کرو ناں رازی کو' دیکھو میرے بارے میں کیا کہتا ہے ناراض ہے یا۔۔۔"

"سوری۔۔۔!" سارہ نے اس کی پوری بات سنی ہی نہیں۔ "مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔ اب جس جس سے کہنا سننا ہو خود کہو۔"

"وہ تو میں ہی کہوں گی۔ بس ذرا رازی کا موڈ معلوم کرنا چاہ رہی تھی۔" اس نے کہا تو سارہ چڑ گئی۔

"کوئی ضرورت نہیں انہیں اتنی اہمیت دینے کی۔"

"ہیں!" وہ حیران ہوئی۔ "یہ تم کہہ رہی ہو؟"

"ہاں! میں کہہ رہی ہوں۔ مجھے تمہارا یہ انداز بالکل اچھا نہیں لگ رہا۔ خود کو اتنا مت گراؤ کہ دوسرا ساتویں آسمان پہ جا پہنچے۔ جو کرنا ہے دھڑلے سے کرو' یہ تمہارا حق ہے کوئی تمہارے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔" سارہ چیخ کر بول رہی تھی وہ پریشان ہو گئی۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ خوامخواہ خود کو ہلکان مت کرو۔ پہلے اپنی پڑھائی پر توجہ دو' یہ زیادہ ضروری ہے۔ باقی باتیں بعد میں سوچنا بلکہ سوچنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

سارہ کے لیکچر پر وہ بے ساختہ مسکرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

تقریبا" نو بجے وہ گھر آیا تھا۔ ساجدہ بیگم اس کے انتظار میں بیٹھی تھیں اور وہ جانتا تھا انہوں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا اور صرف ان کی خاطر بھوک نہ ہونے کے باوجود وہ کھانا لگوانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا اور بہت عجلت میں کپڑے تبدیل کر کے ڈائننگ روم میں آیا تو ثنا کھانا رکھنے کے ساتھ بلال سے کسی بات پر الجھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر خاموش ہو گئی تو اس نے ٹوکا بھی نہیں۔ ساجدہ بیگم کے لیے کرسی کھینچی' پھر خود بھی بیٹھ گیا۔

"کہاں رہ گئے تھے؟" ساجدہ بیگم نے اس کی پلیٹ میں سالن ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"چچا جان کے ساتھ تھا۔" اس کا جواب واضح نہیں تھا۔

"کہاں توصیف والا؟"

"نہیں' آفس میں۔ اصل میں ان کے آفس میں ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔" وہ تفصیل سے بتانے لگا۔ پہلے

پولیس کے ساتھ جا کر ایف آئی آر درج کرائی' پھر اسی وقت پولیس جائے وقوع کا معائنہ کرنے آگئی تو وہیں دیر ہو گئی۔

"اللہ رحم کرے۔ زیادہ نقصان تو نہیں ہوا۔" ساجدہ بیگم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"نقصان تو بڑا ہے۔ ستر لاکھ گئے ہیں۔" اس نے کہا تو بلال آنکھیں پھاڑ کر بولا۔

"ستر لاکھ؟"

"بے چارے چچا جان کا دیوالیہ نکل گیا۔" بے چارے کہنے سے ثنا کی بچت ہو گئی تھی۔

"یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔" ساجدہ بیگم فکر مندی سے بولیں' پھر پوچھنے لگیں۔

"کب پڑا ڈاکا؟"

"وہ ڈاکا نہیں امی! یہ آفس ہی کے کسی بندے کا کام ہے۔ جب چچا جان اریبہ کے پاس ہاسپٹل میں تھے۔ تب کسی نے ان کے سیف کا صفایا کر دیا۔" اس نے بتایا تو بلال تعجب سے بولا۔

"اتنی بڑی رقم چچا جان نے سیف میں کیسے چھوڑ دی؟"

"بس اسی دن لوگوں نے پے منٹ کی تھی۔ ان کے ولاز والے پروجیکٹ کی تب بکنگ آف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ اریبہ کی وجہ سے بھول گئے۔"

"اریبہ اب کیسی ہے؟" غالبا" اریبہ کے نام پر ہی بلال نے پوچھا تھا۔

"پتا نہیں' میرا جانا نہیں ہوا۔" وہ کہہ کر فورا" ثنا سے مخاطب ہو گیا۔ "ثنا! چائے بنا دو اچھی سی۔"

"امی! آپ بھی پئیں گی؟" ثنا نے برتن سمیٹتے ہوئے ساجدہ بیگم سے پوچھا۔

"دے دینا آدھا کپ۔"

"میں پورا کپ پیوں گا۔" بلال نے ثنا کے پیچھے ہانک لگائی تھی۔

"توصیف تو پریشان ہو گا؟" ساجدہ بیگم کا دھیان مسلسل اسی طرف تھا۔

"ظاہر ہے پریشانی کی بات تو ہے لیکن امید ہے' مل جائیں گے۔ پولیس کل سے باقاعدہ تفتیش شروع کرے گی۔" اس نے کہتے ہوئے ساجدہ بیگم کی حد درجہ فکر مندی محسوس کی تو پھر موضوع بدلنے کی خاطر بلال سے مخاطب ہو گیا۔

"ہاں بلال! تمہارے ویزے میں کوئی پرابلم تو نہیں ہے۔ میرا خیال ہے' انہی دنوں تمہیں اسلام آباد سے کال آجائے گی۔"

"میں بھی بھائی! اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔" بلال نے کہا تو ثنا سنتی ہوئی آگئی۔

"کس کا انتظار کر رہے ہو؟"

"ویزے کا۔ بس اب میں جلدی فلائی کرنے والا ہوں۔ زیادہ خوشی اس بات کی ہے کہ تم سے جان چھوٹ جائے گی۔" بلال نے ثنا کو چڑایا تھا لیکن ساجدہ بیگم نے فورا" سرزنش کی۔

"بلال۔۔۔؟"

"سوری امی! مذاق کر رہا تھا۔"

"لیکن میں مذاق نہیں کر رہی۔ میں واقعی تمہارے جانے کے دن گن رہی ہوں۔" ثنا نے نہ صرف ساجدہ بیگم کی سرزنش نظر انداز کی تھی بلکہ ان کے گھورنے پر بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے نکل بھی گئی۔

"اس لڑکی کا مزاج پتا نہیں کس پر گیا ہے۔ میں تو اس کی طرف سے بہت فکر مند رہتی ہوں۔"

"ٹھیک ہو جائے گی امی! آپ ہر بات کی ٹینشن نہ لیا کریں۔" رازی کہہ کر اٹھنے لگا تھا کہ ساجدہ بیگم اسے روک کر پوچھنے لگیں۔

"تم اریبہ کے پاس کیوں نہیں گئے؟"

"بس وقت ہی نہیں ملا۔ آج سوچا تھا تو چچا جان نے بلا لیا۔" اس نے سنبھل کر جواب دیا تھا۔

"بری بات ہے بیٹا! لڑکی کو احساس ہو گیا ہے تو اب تمہیں خیال کرنا چاہیے۔" ساجدہ بیگم نے ٹوک کر کہا تو بلال ان کی تائید کرتے ہوئے بولا۔

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی! بہت چینج ہو گئی ہے اریبہ بلکہ پہلے کی طرح ہو گئی ہے۔ میں تو اس حادثے کو مبارک کہوں گا۔"

"شٹ اپ!" وہ قصداً مسکرایا پھر کہنے لگا۔ "یہ صحیح ہے کبھی کبھی حادثے زندگی میں خوشگوار تبدیلی لاتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔ بہرحال یہ اچھی بات ہے کہ اریبہ بروقت سنبھل گئی ہے۔"

"ہاں اللہ کا شکر ہے ورنہ میں تو بہت پریشان تھی۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو بلال فوراً بولا۔

"بس امی! اب آپ دیر نہ کریں فوراً بھائی کی شادی کر دیں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ بلا ارادہ بلال کو ٹوک گیا۔

"یہ فضول بات نہیں ہے۔ میں بھی ایسا ہی سوچ رہی ہوں۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ پریشان ہو گیا۔

"بس کریں امی! مجھے نہیں کرنی شادی۔ میرا مطلب ہے اتنی جلدی۔"

اس کے ساتھ ہی وہ وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ پھر اپنے کمرے میں آ کر اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کر گیا ہے لیکن پھر خود کو بے اختیار محسوس کرتے ہوئے اس نے سر جھٹک دیا اور سگریٹ سلگا کر بالکونی میں آ کھڑا ہوا۔

کراچی میں سردی کسی وضع دار مہمان کی طرح آتی ہے اور اپنے مخلص میزبانوں کو تشنہ چھوڑ جاتی ہے۔ بارش کے بعد چند دن فضا میں خنکی رہی تھی پھر وہی حبس اور گھٹن یا شاید اس کا اپنا دل بوجھل تھا جب ہی اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ اندھیرے میں کھڑا وہ جانے کیا کچھ سوچتا رہا پھر کمرے میں آ کر موبائل اٹھایا اور توصیف ولا کا نمبر ملا کر کان سے لگا لیا۔ دوسری طرف بیل جا رہی تھی پھر سارہ کی آواز ابھری۔

"ہیلو.....!"

"رازی بات کر رہا ہوں۔" اس نے کہا تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ تب اسے خود ہی کہنا پڑا۔

"سنو!" میں اریبہ کو دیکھنے آنا چاہتا ہوں۔"

"بتا رہے ہیں یا اجازت طلب کر رہے ہیں؟" سارہ کے نروٹھے انداز سے وہ جز بز ہوا تھا۔

"دونوں باتیں ہیں۔"

"تو پھر آپ اریبہ سے پوچھ لیں۔ اس کا سیل فون تو ہو گا آپ کے پاس۔" سارہ نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

وہ کچھ دیر کشمکش و پیچ میں کھڑا رہا کہ اریبہ کو فون کرے، نہ کرے پھر اگلے دن جانے کا سوچ کر اس نے اپنا سیل فون ایک طرف رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ جب اٹھی، دس بج رہے تھے۔ اسے افسوس ہوا کیونکہ رات وہ سوچ کر سوئی تھی کہ آج سے باقاعدہ کلاسز جوائن کرے گی لیکن اس کی آنکھ ہی نہیں کھلی اور کسی نے اٹھایا بھی نہیں تھا۔ وہ منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی تو بی بی اسے دیکھ کر کھل اٹھیں۔

"ماشاءاللہ! آج تو میری بیٹی کے چہرے پر رونق نظر آ رہی ہے۔"

"آپ کی دعائیں ہیں بی بی!" وہ مسکرا کر بی بی کے گلے لگ گئی۔

"خوش رہو۔ اللہ لمبی عمر دے۔" فرط جذبات سے بی بی کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کی بلائیں لیں، پیشانی چومی پھر ناشتے کا پوچھا تو وہ وہیں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں بی بی! سلائس کے ساتھ ہاف فرائی انڈا اور چائے بھی۔"

"بس ابھی بن جاتا ہے۔" بی بی نے کہنے کے ساتھ چائے کی کیتلی اٹھالی۔

"سارہ اور حماد....." اس نے ابھی نام لیے تھے کہ بی بی بول پڑیں۔

"کالج گئے ہیں دونوں اور یاسمین تو ابھی سو رہی ہے۔ اٹھ جاتی تو وہ بھی تمہارے ساتھ ناشتا کر لیتی۔" وہ کچھ نہیں بولی بلکہ ان سنی کر کے ادھر ادھر دیکھنے لگی تھی۔

پھر ناشتے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب اس کے ذہن پر ایک ہی بات سوار تھی کہ اس کی پڑھائی کا جو نقصان ہوا ہے وہ جلد سے جلد اسے پورا کر لے۔ اس کے لیے اسے عروبہ، مال اور مہک کی مدد کی ضرورت تھی اور ان کے ساتھ وہ کوئی ایسا وقت سیٹ کرنا چاہتی تھی کہ ان کی اسٹڈی کا بھی حرج نہ ہو۔ اس وقت وہ اسی نہج پر سوچ رہی تھی کہ بی بی نے آ کر اطلاع دی۔

"اریبہ بیٹا! رازی آیا ہے۔"

"رازی!" خوشگوار احساس کے ساتھ وہ کچھ متعجب ہوئی کہ وہ باہر کیوں رک گیا ہے۔ پہلے کی طرح اس کے کمرے میں کیوں نہیں چلا آیا۔

"میں نے تو کہا اس سے کہ اریبہ اٹھ گئی ہے ابھی ناشتا کر کے کمرے میں گئی ہے وہیں چلے جاؤ لیکن وہ ادھر ہی بیٹھ گیا۔" بی بی کو بھی شاید رازی کی غیریت کھلی تھی۔

"اچھا چلیں میں آ رہی ہوں۔" اس نے بی بی کو بھیج کر آئینے میں اپنا حلیہ دیکھنے کے ساتھ بے ترتیب دھڑکنوں پر قابو پایا پھر کمرے سے نکل کر سٹنگ روم میں آئی تو جلال رازی اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب کیسی ہو تم؟"

"جیسی تم دیکھنا چاہتے ہو۔" وہ بے اختیار کہہ گئی۔

"گڈ!" وہ مسکرا کر رہ گیا۔

"پلیز رازی! اب کچھ جتانا مت میں پہلے ہی گلٹی فیل کر رہی ہوں۔" وہ ہار گئی تھی سو بے اختیار اعتراف کر گئی۔ "محبتوں سے منہ موڑ کر میں خود بھی خوش نہیں تھی۔ بس پتا نہیں کیا ہو گیا تھا مجھے میں بہت بری ہوں۔"

"نہیں تم بہت اچھی ہو۔" وہ فوراً بولا لہجہ سنجیدہ اور ٹھہرا ہوا تھا۔ "برا تو میں ہوں۔ مجھے تمہارے احساسات سمجھنے چاہیے تھے لیکن میں فیل ہو گیا۔"

"نہیں رازی! تم....."

"بس کچھ مت کہو، ہمارے کل اور آج کے درمیان جو وقت گزرا اسے بھول جاؤ۔ میں بھی بھول جانا چاہتا ہوں سب کچھ۔ نئی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم سب کچھ بھلا دیں۔ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں، جبکہ میں کٹہرے میں کھڑا ہوں۔" وہ جانے کہاں کھویا ہوا تھا۔

"کٹہرے میں؟" وہ متعجب ہوئی۔

"ہاں میں اپنا مجرم ہوں۔ میں نے خود اپنے آپ کو قتل کیا ہے اور قتل کی سزا تو تم جانتی ہو۔ منصف نے اگر سچ مچ انصاف کی ٹھان لی تو سولی تو چڑھنا پڑے گا۔" وہ ناقابل فہم ہو گیا تھا۔

"رازی! یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔" وہ پریشان ہو گئی تھی۔

"ہوں.....!" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"قتل، کنٹرا، سولی... یہ سب کیا ہے؟" اس نے الجھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں، اپنا خیال رکھنا۔" وہ کہہ کر تیز قدموں سے باہر نکل گیا تھا۔ وہ کچھ نہیں سمجھ پائی۔ الجھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف بڑھی تھی کہ یاسمین کی آواز پر بلا ارادہ نہ صرف رکی بلکہ اس کی طرف پلٹ بھی گئی۔
"باتوں کی آواز آرہی تھی۔ کون آیا تھا؟" یاسمین نے پوچھا۔
"رازی تھا۔" اس نے بتایا تو یاسمین کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔
"رازی... اس وقت کیا کرنے آیا تھا؟"
"مجھ سے ملنے، کیوں آپ کو اعتراض ہے کیا؟" وہ اچانک جم کر کھڑی ہو گئی تھی۔ یاسمین جھنجلا گئی۔
"میں نے کبھی تمہاری کسی بات، کسی کام پر اعتراض نہیں کیا۔"
"حالانکہ آپ کو کرنا چاہیے تھا۔ ہر اس کام سے روکنا چاہیے تھا، جو کسی بھی لڑکی کو زیب نہیں دیتے۔ لیکن آپ نے نہیں روکا۔ الٹا شہہ دیتی رہیں۔ کیوں؟" اس کے جارحانہ انداز پر یاسمین ایک لحظہ کو ٹھٹکی تھی، پھر فوراً" پینترا بدل گئی۔ جس میں اسے کمال حاصل تھا۔
"تمہاری محبت میں بیٹا! لیکن تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ تم نے ایسا تو کوئی کام نہیں کیا، جس پر کسی کو انگلیاں اٹھانے کا موقع ملے۔ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟"
"کاش! کوئی کچھ کہہ دیتا تو میں یوں تماشا تو نہ بنتی۔" وہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ یاسمین اس کے پیچھے بھاگی آئی تھی۔
"ارے بیٹا! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں مجھ سے اتنی بدگمان ہو رہی ہو؟ میں نے تمہارے لیے کیا نہیں کیا؟"
"میرے لیے نہیں، اپنے لیے۔ مجھے تو آپ نے مہرے کے طور پر استعمال کیا۔ کیسی ماں ہیں آپ؟ مجھے آپ کو ماں کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔" اس کے غصے پر دکھ غالب آگیا تھا۔
"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں جانتی ہوں یہ سب ساجدہ بیگم..."
"نام مت لیں ان کا۔" اس نے تیزی سے ٹوکا تھا۔ "انہوں نے کبھی اشارتاً" بھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مجھے آپ کی اصلیت کا پتا چلتا۔"
"اصلیت! کیا ہے میری اصلیت؟" یاسمین یکدم آپے سے باہر ہو گئی۔ اس کا بازو کھینچ کر چیخی۔ "بتاؤ کیا ہے میری اصلیت؟"
"چلائیے مت مما! سارا زمانہ جانتا ہے اور میں بھی اب بے خبر نہیں ہوں۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی ہوں آپ کو شہباز درانی کے ساتھ۔"
"تم...!" یاسمین نہ سٹپٹائی نہ پریشان ہوئی۔ الٹا پھنکاری تھی۔ "تم مجھ پر شک کر رہی ہو۔ بہتان لگا رہی ہو مجھ پر؟"
"یہ بہتان نہیں، حقیقت ہے۔ جس روز میرا ایکسیڈنٹ ہوا، آپ کہاں تھیں؟ شہباز درانی کی بانہوں میں۔ میں نے آپ کو ان ہی کے گھر پر دیکھا تھا۔ اس کے بعد میری دنیا تاریک ہو گئی۔ لوگ مجھ پر نہیں ہنسے۔ میرا اپنا آپ مجھ پر ہنس رہا تھا کہ میں ایک ایسی عورت کو سپورٹ کرتی رہی جو نہ بیوی ہے نہ ماں۔ صرف اپنی ناجائز خواہشات کی غلام ہے۔" وہ بالآخر پھٹ پڑی تھی۔
"تم پاگل ہو گئی ہو۔" یاسمین اب ٹھہر نہیں سکی کمرے سے جانے لگی تھی کہ وہ تیزی سے سامنے آگئی۔
"میری بات سنتی جائیں۔ اگر آپ نے اپنی روش نہیں بدلی تو میں ڈیڈی سے کہوں گی۔ آپ کو طلاق دے دیں۔"

"تم اپنی ماں کو..." یاسمین غیر یقینی کی انتہا پر تھی۔
"نہیں ہیں آپ میری ماں۔ آپ کسی کی ماں نہیں ہیں۔ ڈیڈی آپ کو صرف ہماری وجہ سے برداشت کر رہے ہیں اور اب ہم آپ کی ڈھال نہیں بنیں گے۔ سوچ لیں آپ۔"
اس نے حتمی انداز میں کہہ کر کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ گویا کہہ رہی ہو کہ آپ جا سکتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

اسے زندگی میں اکثر مشکلات کا سامنا رہا تھا۔ اسی حساب سے آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑا۔ لیکن وہ ہمیشہ ثابت قدم رہا تھا۔ کیونکہ اس کا یقین تقدیر پر تھا۔ تقدیر لکھنے والے پر تھا۔ وہ تقدیر سے نہیں لڑ سکتا تھا۔ اپنی اب تک کی زندگی میں اس نے تقدیر کے ہر فیصلے کو قبول کیا تھا۔ لیکن اب وہ جس مشکل میں پھنسا تھا، اس میں اس کی تقدیر کو کتنا دخل تھا، یہ اس نے سوچا ہی نہیں اور پہلے مقام پر ہی اس کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ توصیف احمد کے سامنے گڑگڑایا تھا۔
"میں چور نہیں ہوں سر! میں نے چوری نہیں کی۔ خدا کے لیے میرا یقین کریں۔"
لیکن اس کا یقین نہیں کیا گیا تھا۔ کیونکہ جائے وقوعہ کے مکمل معائنے اور تفتیشی کارروائی کے بعد وہی مجرم قرار پایا تھا۔ پولیس اسے آفس سے ہی تمام اسٹاف کے سامنے گرفتار کر کے لے گئی تھی۔ اسے اس وقت عزت و ناموس جانے کا خیال نہیں تھا، صرف اپنی معصوم بہن تاجور کا خیال تھا، جس کا اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس شہر میں تو کوئی نہیں تھا۔ اسی کی خاطر وہ گڑگڑایا تھا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔
پھر ابھی وہ یہ طے نہیں کر پایا تھا کہ وہ تاجور کی ذمہ داری کسے سونپے جو اسے ابا کے پاس چھوڑ آئے کہ اسے ریمانڈ پر بھیج دیا گیا ہے۔ جہاں خود پر ہونے والے تشدد نے اسے سب بھلا دیا تھا، تاجور بھی۔ اس کی زبان پر صرف ایک ہی بات تھی۔
"میں چور نہیں ہوں۔ میں چور نہیں ہوں۔"
پورا ایک ہفتہ اس پر ہر طرح کا تشدد ہوا لیکن اس نے چوری کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی۔ پھر اسے جیل بھیجا گیا تو اس کے مفلوج حواسوں میں صرف ایک احساس باقی تھا کہ وہ زندگی کی بساط پر اپنا سب کچھ ہار گیا ہے۔ خودداری، ایمان داری، ثابت قدمی اور شاید اپنی بہن بھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کالج سے نکلی تو سمیر کو اپنا منتظر دیکھ کر خاصی جز بز ہوئی اور چونکہ اس سے نظریں چار ہو گئی تھیں، اس لیے کہیں ادھر ادھر نہیں ہو سکی اور اس کے قریب پہنچ کر ناگواری بھی نہیں چھپا سکی۔
"کیوں آئے ہو؟"
"چپ چاپ بیٹھ جاؤ ورنہ۔" وہ غصے سے کہہ کر بائیک اسٹارٹ کرنے لگا۔
"ورنہ کیا کر لو گے؟" وہ اطراف کا خیال کر کے دبے لہجے میں چیخی۔
"گھما کے ایک چماٹ ماروں گا یہیں پر، تمہاری ساری فیلوز دیکھیں گی۔" وہ غضب ناک ہی نہیں، خطرناک بھی لگ رہا تھا۔ وہ سچ مچ ڈر گئی۔
"تم گھر چلو، بتاتی ہوں۔" وہ دانت پیستے ہوئے جیسے ہی بیٹھی سمیر نے زن سے بائیک بھگا دی۔
تمام راستہ وہ خود پر بہت جبر کیے بیٹھی رہی تھی اور جب سمیر نے اپنے گھر کے آگے بائیک روکی تو اس نے ایک سیکنڈ نہیں لگایا۔ اتر کر بھاگتی ہوئی اندر آئی اور امینہ پھپھو سے لپٹ کر رونے لگی تھی۔

"الٰہی خیر!" امینہ پھپھو گھبرا گئیں۔ "سارہ! کیا ہوا' میری بچی! رو کیوں رہی ہو؟"
"ڈراما کر رہی ہے۔" سمیر کمرے میں قدم رکھتے ہی بولا۔
"تم ہو ڈراما باز۔" وہ غصے سے اس سے کہہ کر امینہ سے مخاطب ہوگئی۔ "پھوپھو! پوچھیں اس سے' میرے کالج کیوں آیا تھا اور زبردستی مجھے لے کر آیا ہے۔ مما کو پتا بھی نہیں ہے۔ کتنی پریشان ہوں گی وہ۔"
"سمیر! یہ کیا طریقہ ہے۔" امینہ نے تنبیہی انداز میں سمیر کو ٹوکا تو وہ اپنے آپ میں جھنجلا گیا۔
"مجھے نہیں پتا' اسی سے پوچھیں۔"
"اس سے کیا پوچھوں۔ اسے تو تم زبردستی لے کر آئے ہو۔" امینہ نے سمیر کو گھورا' پھر اس سے بولیں۔ "بیٹا! تم رو مت۔ چلو پہلے یاسمین کو فون کرو۔ بتاؤ اسے کہ تم یہاں ہو۔"
"جی!" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے لابی میں آگئی اور یاسمین کو فون کر کے واپس پلٹی تو سمیر نے سامنے آکر راستہ روک لیا۔
"میں تم سے بات نہیں کرنا چاہتی۔" وہ نظریں جھکائے روٹھے انداز میں بولی تھی۔
"یہی تو جاننا چاہتا ہوں کیوں؟ کیوں مجھ سے بات نہیں کرنا چاہتیں۔ ایسا کیا کیا ہے میں نے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ہمارا کوئی جھگڑا' کوئی لڑائی نہیں ہوئی' پھر کس بات کا غصہ ہے' ہیں؟" وہ آہستہ آواز میں مگر زور دے کر بول رہا تھا۔
"کسی بات کا نہیں بس وہ مما نہیں چاہتیں۔" اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا اور یاسمین کا نام لے کر پچھتائی بھی۔
"میں جانتا ہوں۔ یاسمین آنٹی مجھے تو کیا' کسی کو بھی پسند نہیں کرتیں اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ جبکہ تمہارا بدلتا رویہ نیا ہے۔ کیا اب باقاعدہ انہوں نے تمہیں وارن کیا ہے کہ مجھ سے کوئی واسطہ یا تعلق مت رکھنا؟" وہ اس پر یوں جرح کر رہا تھا جیسے سچ اگلوا کر دم لے گا۔
"نہیں' ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ [illegible] پڑ رہی تھی۔
"پھر کیسا ہے۔ دیکھو سارہ! میں سیدھا سادہ بندہ ہوں۔ جب میرے دل نے تمہیں اپنا مانا تو میں نے تم سے محبت کا اعتراف کرلیا' پھر تم سے بھی میں نے یہی چاہا۔ اگر تمہارے دل میں میرے لیے محبت کا احساس نہیں جاگتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ تم مجھے دھتکارنا شروع کر دو۔ آخر ہم کزن ہونے کے ساتھ دوست بھی تو رہے ہیں۔ کیا تم دوستی بھی ختم کرنا چاہتی ہو؟" نرمی سے بولتے ہوئے سمیر کے لہجے میں درد بھی سمٹ آیا تھا۔
سارہ سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تو وہ بے چین ہوگیا۔
"کیوں رو رہی ہو؟"
"پتا نہیں۔" اس کے ہونٹوں سے بمشکل نکلا تھا۔
"کیسی لڑکی ہو۔ اپنے احساسات نہیں سمجھتیں یا پھر ڈرتی ہو؟ بتاؤ کیا ڈر ہے' کس کا خوف ہے تمہیں؟" وہ چاہنے کے باوجود اس کا ہاتھ نہیں تھام سکا' کہیں وہ اس دن کی طرح بپھر نہ جائے۔
"مجھے نہیں پتا بس تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔" وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی تو وہ عاجز ہو گیا۔
"نہیں' جب تک تم مجھے بتاؤ گی نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہے۔ کیوں تم ایسی ہو گئی ہو۔ روٹھی روٹھی' تب تک میں تمہیں یہاں سے ہلنے بھی نہیں دوں گا۔"
"کوئی معاملہ نہیں ہے میرے ساتھ۔ خواہ مخواہ تم ایسی باتیں مت کرو میں انسان ہوں ہمیشہ ایک ہی موڈ میں تو

نہیں رہ سکتی۔" وہ نہ صرف بگڑی بلکہ اسے دھکیل کر امینہ پھوپھو کے پاس آگئی تھی۔
"بتا دیا یاسمین کو؟" امینہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔
"جی۔"
"چلو' طیبہ نے کھانا لگا دیا ہے' پہلے کھانا کھالو۔" اس کا بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس ڈر سے کہ کہیں سمیر پھر نہ اسے گھیر لے' امینہ کے ساتھ ڈائننگ روم میں آگئی۔
"اریبہ آپی کیسی ہیں؟" طیبہ نے اس کے سامنے سالن کی ڈش رکھتے ہوئے پوچھا۔
"ٹھیک ہے۔"
"آئیں نہیں' حالانکہ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔"
"دراصل ان دنوں جو اس کی کلاسز مس ہوئی ہیں' وہ انہیں کور کر رہی ہے۔ ویسے اسے اپنا وعدہ یاد ہے' کہتی ہے پھوپھو کے ہاں جانا ہے۔" وہ طیبہ کو جواب دے کر امینہ سے پوچھنے لگی۔
"پھوپھو! میں گھر کیسے جاؤں گی؟"
"جانے کی بات [illegible] سمیر چھوڑ آئے گا۔" امینہ نے [illegible] وہ خاموش ہو گئی' بادل [illegible] لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنی پہلے والی روٹین پر آگئی تھی۔ البتہ اکیڈمی کو اس نے خیرباد کہہ دیا تھا صرف یاسمین کی وجہ سے۔ تاکہ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے۔ اس لیے کالج اور اسپتال کے بعد باقی سارا وقت وہ گھر پر ہی رہتی تھی۔ اس سے یاسمین تلملائی ہوئی تھی لیکن اسے پروا نہیں تھی۔ اس کے لیے یہ بھی غنیمت تھا کہ یاسمین اس سے خائف ہوگئی تھی۔ ورنہ اگر وہ مزید ڈھٹائی پر اتر آتی تو وہ کیا کر سکتی تھی۔ اسے دھکے دے کر گھر سے نکال تو نہیں سکتی تھی کہ بہرحال اس کی ماں تھی۔ گو کہ ماں کے لیے اس کے جذبات منفی ہو چکے تھے۔ پھر بھی وہ اسے من مانی نہیں کرنے دینا چاہتی تھی اس لیے اسے گھر پہنچنے کی جلدی ہوتی تھی۔
اس وقت بھی اسپتال سے نکلتے ہی اس نے بہت عجلت میں مہک اور عروسہ کو اللہ حافظ کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھی تھی کہ اچانک ٹھٹک کر رک گئی۔ اسپتال کی بیرونی دیوار کے ساتھ لگے سنگی بینچ پر بیٹھی ایک لڑکی زاروقطار رو رہی تھی۔ اس نے غور کیا تو لڑکی کچھ دیکھی بھالی لگ رہی تھی۔ تب فوراً" ہی اسے یاد آگیا' وہ ٹی بی کی پیشنٹ تھی۔
"یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔" ایک لمحہ کو وہ الجھی' پھر اس کے پاس چلی آئی۔
"کیا نام ہے تمہارا؟" لڑکی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ اس سے بولا ہی نہیں گیا۔
"کیوں رو رہی ہو؟" اس نے پھر پوچھا' پھر جیسے اپنا سوال بے معنی لگا' سر جھٹک کر بولی۔ "میرا مطلب ہے رو مت۔ رونے سے تمہاری طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ اٹھو اندر چلو۔"
لڑکی زور زور سے نفی میں سر ہلانے لگی۔
"کیوں؟ کیا ہوا؟ ٹھہرو! میں پانی لاتی ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے اندر گئی اور منرل واٹر کی بوتل لے آئی' پھر پہلے اس کے آنسو صاف کیے' پھر پانی پلا کر کچھ دیر اس کی ہمت بندھاتی رہی اور جب اسے بولنے پر آمادہ دیکھا' تب پوچھا۔
"اب بتاؤ! کیا بات ہے؟"
"مجھے اسپتال سے چھٹی دے دی ہے۔ کہتے ہیں' گھر جاؤ۔" وہ بہت بے چارگی سے بولی تھی۔

"پھر؟"

"گھر تو نہیں ہے۔ بھائی پتا نہیں کہاں چلا گیا۔" وہ پھر رونے لگی۔ اریبہ کچھ سمجھی یا نہیں سمجھی مگر اس کا دل ضرور بھر آیا تھا۔ ساکت بیٹھی اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے شفاف موتی دیکھے گئی۔ کبھی کبھی آنسو زبان بن جاتے ہیں۔

"تاجور...!" اچانک ذہن کے کسی گوشے سے یہ نام نکل کر اریبہ کے ہونٹوں پر آیا تھا، پھر نرمی سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"روو مت۔ آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں...؟" تاجور آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"گھر۔ گھر چلتے ہیں، وہاں آرام سے بات کریں گے۔" وہ کہنے کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ تاجور شش و پنج میں بیٹھی رہی۔

"دیکھو! یہاں کب تک بیٹھو گی۔ ابھی شام ہو جائے گی پھر رات۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہوں گی۔ چلو آؤ۔" اس نے ہاتھ بڑھایا تو رات کے تصور سے سہمی ہوئی تاجور فوراً اس کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تمہارا گھر کہاں ہے؟" پارکنگ سے گاڑی نکالنے کے بعد اس نے بظاہر سرسری انداز میں پوچھا۔

"پتا نہیں! بھائی کو پتا ہے۔" تاجور اب خود کو محفوظ محسوس کر کے بولنے لگی تھی۔ "میں ابا کے پاس تھی چک میں۔ پھر بھائی مجھے اپنے ساتھ لے آئے اور یہاں اسپتال میں داخل کر دیا۔"

"اور خود کہاں چلے گئے؟" وہ بلا ارادہ اور بے ساختہ بول گئی تھی۔

"پتا نہیں۔" وہ گہری سانس کھینچ کر خاموش ہو گئی۔ یعنی تاجور سے کچھ پوچھنا بے کار تھا، البتہ خود کو اس کے بارے میں سوچنے اور قیاس کرنے سے باز نہیں رکھ سکی۔ اور جب گھر آئی تو پہلے مقام پر ہی یاسمین سے سامنا ہو گیا۔

"یہ کون ہے؟" یاسمین نے تاجور کو دیکھتے ہی پوچھا۔

"میری پیشنٹ ہے۔" وہ زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتی تھی، اس لیے سرسری جواب دے کر تاجور کو لیے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر کھانے کے بعد اس نے پہلے تاجور کے لیے کمرا سیٹ کیا کیونکہ ٹی بی کی مریض تھی اور بحیثیت ڈاکٹر وہ جانتی تھی کہ کس طرح یہ مرض ایک سے دوسرے میں منتقل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ محتاط بھی تھی اور تاجور کے لیے بہت زیادہ حساس۔ جانے کون تھی یہ لڑکی۔ اس کے اپنے کہاں تھے اور جانے کوئی اپنا تھا بھی یا نہیں۔

وہ تاجور کو سلا کر اپنے کمرے میں آئی تو یہی سوچ رہی تھی کہ اس کے گھر والوں کو کہاں تلاش کرے کہ سارہ نے اندر آ کر بے دھیانی میں اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا! ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" سارہ کے ٹوکنے پر وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"تم کہاں تھیں؟"

"میں کالج سے پھوپھو کی طرف چلی گئی تھی۔ تمہیں مما نے نہیں بتایا؟"

"نہیں! میری مما سے بات نہیں ہوئی۔ اصل میں میں آتے ہی مصروف ہو گئی۔ ابھی آ کر بیٹھی ہوں۔" اس نے بتایا تو سارہ کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑا کر بولی۔

"تمہاری مصروفیت نظر تو نہیں آ رہی۔"

"کیا مطلب؟ تم جھاڑ پونچھ سمجھ رہی ہو۔ پاگل ہو بالکل۔ کالج سے آ کر میں اس کام میں کیوں لگوں گی۔" اس نے کہا تو سارہ بے ساختہ ہنس کر بولی۔

"مذاق تو سمجھ لیا کرو۔"

"بھونڈا مذاق تھا۔ خیر! میری مصروفیت ایک لڑکی ہے، جسے میں اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ اس کے لیے کمرا سیٹ کیا پھر۔"

"ایک منٹ۔" سارہ ٹوک کر پوچھنے لگی۔ "لڑکی کون ہے؟"

"پتا نہیں یار! میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس کے گھر والے اسے اسپتال میں ایڈمٹ کر کے بھول گئے۔ ظاہر ہے ہسپتال کی فیس وغیرہ نہیں دی گئی ہو گی تو اسے چھٹی دے دی گئی۔"

"اور تم اسے اپنے ساتھ لے آئیں؟" سارہ نے فوراً کہا۔

"کیا کرتی؟ چھوڑ دیتی اسے اس کے حال پر، پھر کوئی بھی لے جاتا اسے۔ اس شہر میں وہ بالکل انجان ہے۔" اسے غصہ آ گیا۔

"اوہو! میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے اس کے گھر والے اسے اسپتال میں نہیں دیکھیں گے تو پریشان نہیں ہوں گے۔" سارہ نے اپنی بات کی وضاحت کی تو وہ سر جھٹک کر بولی۔

"یہ سب بعد کی باتیں ہیں، ابھی تو وہ اکیلی تھی اور بے چاری بہت رو رہی تھی۔ مجھے اس پر بہت ترس آیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن مما اور ڈیڈی سے کیا کہو گی۔ میرا خیال ہے وہ تو اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ تم کسی بے سہارا لڑکی کو اٹھا کر گھر لے آؤ۔ نجانے کون ہے۔" سارہ ابھی اور بھی بہت کچھ کہتی کہ وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"یہ ساری باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ پہلے وہ سنبھل تو جائے، پھر اس سے سب معلوم ہو جائے گا۔ اور ہاں! مما سے میں نے کہا ہے کہ یہ میری پیشنٹ ہے۔ ڈیڈی سے بھی یہی کہوں گی، پھر میرا خیال ہے، وہ اعتراض نہیں کریں گے۔" اس کی ساری بات سن کر سارہ جیسے اکتا کر بولی۔

"پتا نہیں! مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

"سب سمجھ جاؤ گی۔ جب تم اس سے ملو گی، بات کرو گی تو سب سمجھ جاؤ گی۔ چلو! اب مجھے ایک گھنٹہ سو لینے دو۔" وہ کہہ کر لیٹ بھی گئی۔ لیکن پھر گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"یہ گاڑی کون لے جا رہا ہے؟"

"کون لے جائے گا۔ مما جا رہی ہیں۔" سارہ وارڈ روب کھول چکی تھی اس لیے اس کی کیفیت سمجھ نہیں پائی اور آرام سے بولی تھی۔

"کہاں کہاں جا رہی ہیں مما!" اس کے اندر اُبال اٹھنے لگا۔

"شاپنگ پر، مجھ سے بھی چلنے کو کہہ رہی تھیں، لیکن ابھی تو میرا بالکل موڈ نہیں ہے۔" سارہ الماری میں سر دیے بول رہی تھی۔

"موڈ کی کیا بات ہے۔ تمہیں جانا چاہیے تھا۔" وہ یکدم بگڑ گئی تو سارہ الماری میں سے سر نکال کر اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں ہوا۔ تم فون کرو مما کو۔ واپس بلاؤ انہیں۔ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ سارہ کو کیسے سمجھائے۔

"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے پہلی بار اکیلی نکلی ہوں۔" سارہ نے کہہ کر سر جھٹکا پھر جو سوٹ ہاتھ آیا، لے کر واش روم میں بند ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ ذہنی انتشار کا شکار ہوگئی تھی۔ کیونکہ کوئی ایک سوچ نہیں تھی' لگتا تھا بیک وقت اس کے سامنے کئی محاذ کھل گئے ہیں اور وہ کسی ایک محاذ پر بھی جم کر کھڑی نہیں ہو پارہی تھی۔ ایک یاسمین کا معاملہ' دوسرے رازی کا ناقابل فہم رویہ۔ کہاں تو اس کے پیچھے بھاگتا اور زبردستی اپنا حق جتاتا تھا اور اب جب وہ اس کا حق تسلیم کر رہی تھی تو وہ انجان اجنبی بن رہا تھا۔ مزید سارہ بھی اسے سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ صرف دس دن وہ اسپتال میں رہی تھی اور اتنے سے دنوں میں جیسے ساری دنیا بدل گئی تھی۔ پہلے تو وہ یہی سمجھتی رہی کہ جیسے سب اس بات سے خائف ہیں کہ کہیں اسے کوئی بات بری نہ لگ جائے۔ اس لیے سب اپنی اپنی جگہ محتاط ہو رہے تھے' لیکن اب وہ نہ صرف کھٹکنے لگی تھی بلکہ پریشان بھی ہوگئی تھی۔

اس وقت وہ صبح ہونے والے ٹیسٹ کی تیاری کرنے بیٹھی تھی' لیکن ذہن یکسو ہو کے نہیں دے رہا تھا۔ مسلسل ادھر ادھر بھٹک رہا تھا۔ آخر اکتا کر وہ اٹھنے لگی تھی کہ سارہ کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

سارہ اپنے بیڈ پر نیم دراز کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

وہ چند لمحے سارہ کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر کھوجنے کی کوشش کرتی رہی جس سے اس کی سوچ تک رسائی حاصل کر سکے' لیکن اسے کامیابی نہیں ہوئی تو پکار لیا۔

"سارہ!"

"سارہ!" دوسری پکار پر سارہ چونکی تھی۔

"ہاں! کیا ہوا؟"

"تم بتاؤ! کیا سوچ رہی تھیں؟" اس کے لہجے کی گمبھیرتا سے سارہ سمجھ گئی کہ وہ دیر سے اسے نوٹس کر رہی ہے جب ہی "کچھ نہیں" کہنے سے گریز کیا اور اپنے پیچھے تکیہ اونچا کر کے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"وہ... میں تاجور کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

"کیا...؟"

"یہی کہ اس بے چاری کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔" سارہ نے یہ دوسری بات بھی سوچ کر کہی تھی۔ اس کے بعد وہ مشکل سے نکل آئی تھی۔

"پتا ہے' آج کالج سے آنے کے بعد میں سارا وقت تاجور کے ساتھ رہی۔ اس سے بہت باتیں کیں' بیٹھی زیادہ اس کی سنی۔ وہ رحیم یار خان سے آگے کسی چک میں رہتی تھی۔ وہاں اس کی سوتیلی ماں اس پر بہت ظلم کرتی تھی۔ پھر اس کا بھائی جو یہاں کراچی میں جاب کرتا تھا' اسے اپنے ساتھ لے آیا اور اسپتال میں ایڈمٹ کر دیا۔" سارہ سانس لینے کو رکی تھی کہ وہ بول پڑی۔

"پھر...؟ میرا مطلب ہے' اس کا بھائی خود کہاں چلا گیا؟"

"یہ تو اسے بھی نہیں پتا۔ بتا رہی تھی اس کا بھائی اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ روزانہ آفس کے بعد اس کے پاس اسپتال آتا تھا۔ چاہے رات ہی کیوں نہ ہو جاتی۔ پھر اچانک وہ پتا نہیں کہاں چلا گیا۔"

"کہاں جا سکتا ہے؟" وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"نہیں اریبہ! جس طرح وہ اپنے بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی' اس سے تو نہیں لگتا کہ وہ خود سے کہیں گیا ہوگا۔" سارہ نے کہا تو وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے تو لگتا ہے' اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ تم خود سوچو! کوئی کیسے اپنی کم سن بہن کو بے یار و مددگار

چھوڑ کر جا سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا تھا تو اسے گاؤں سے لاتا ہی کیوں؟" سارہ کی باتیں سراسر مفروضہ قرار نہیں دی جا سکتی تھیں' جب ہی وہ پریشان ہوگئی۔

"سنو! تم نے تاجور کے سامنے تو حادثے کا ذکر نہیں کر دیا؟"

"خیر! اب میں اتنی پاگل بھی نہیں ہوں۔ اسے تو میں یہی تسلی دیتی رہی کہ ہم اس کے بھائی کو تلاش کریں گے۔"

"ہم کہاں تلاش کریں گے؟" وہ اچھلی۔

"کوشش تو کی جا سکتی ہے' بلکہ کرنی پڑے گی یا اس کا علاج کرنے کے بعد تم بھی بابا اسپتال کی طرح اسے چھٹی دے دو گی؟ جاؤ! اب جہاں دل چاہے۔" سارہ نے اپنی بات پر زور دے کر کہا تو وہ اسے گھورنے لگی۔

"ایسے مت دیکھو! یہ لڑکی اب تمہاری ذمہ داری بن چکی ہے۔"

"میں جانتی ہوں اور میرے پیش نظر پہلے اس کا علاج' اس کی صحت ہے۔ باقی باتیں میں قصداً" نظر انداز کر رہی ہوں' کیونکہ ایک وقت میں ہمیں اتنی پرابلمز افورڈ نہیں کر پا رہی۔" اس کے لہجے میں اچانک بے چارگی سمٹ آئی تھی۔

"اتنی پرابلمز؟ اور کیا پرابلم ہے؟" سارہ نے فوراً" ٹوکا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔

"تم نہیں سمجھو گی۔"

"کیوں نہیں سمجھوں گی' تم بتاؤ تو۔" سارہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ تھی۔ تب وہ اپنے ناخن دیکھتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں سارہ! میں خود نہیں سمجھ پا رہی۔ مجھے سب کچھ بدلا ہوا لگ رہا ہے۔ میرا مطلب ہے سب لوگ یہاں تک کہ تم بھی۔"

"میں...؟" سارہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں! تم بھی... تم ایسی تو نہیں تھیں۔ تم تو میری دادی بننے کی کوشش کرتی تھیں۔ مجھے روکتی ٹوکتی سمجھاتی تھیں اور اب جب میں سمجھ گئی ہوں تو تم چڑنے لگی ہو... کیوں؟" وہ آخر میں نظریں اٹھا کر سارہ کو دیکھنے لگی۔

"نہیں تو میں کیوں چڑوں گی۔ تمہیں خواہ مخواہ وہم ہو گیا ہے۔" سارہ نے پہلے اسے جھٹلایا' پھر وضاحت کرنے لگی۔

"اصل میں ڈیڈی نے مما کے ساتھ جو سلوک کیا' اس کے بعد میں نہیں چاہتی کہ تم تائی امی یا اس گھر کے کسی بھی فرد کو بہت زیادہ اہمیت دو۔ اس طرح ہماری اپنی پوزیشن آکورڈ ہوتی ہے یار!"

"ہوں...!" اس کا ہوں بے معنی تھا کیونکہ ذہن کچھ اور سوچنے لگا تھا۔

"چلو اب سو جاؤ ورنہ صبح کالج مس ہو جائے گا۔" سارہ کہتے ہوئے لیٹ بھی گئی تو وہ گہری سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور پہلے تاجور کے کمرے میں جا کر اسے چیک کیا' پھر واپس آکر لائٹ آف کر دی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

وصیت

جیون بھر میری سانسوں نے
نام نسب کا بوجھ اُٹھایا
مر جاؤں تو
مجھ پر سے یہ سارا بوجھ مٹا دینا
میرا کتبہ لکھنا تو
اس کے اوپر
میرا نام محبت لکھنا
اور وفا کو شجر لکھنا
پیشہ لکھنا قلم کی محنت
عمرِ رواں کے آگے لکھنا
لاحاصل خوابوں کی گنتی
یہ سب گر لکھ نہ پاؤ تو بے شک
میری تُربت کو گمنام ہی رکھنا

فرحت نواز

اک نیا آفتاب اُبھرنے کو ہے
یہ اندھیرا بھی اب بکھرنے کو ہے

تُو بھی اوروں کی طرح اصل نہیں
تیرا نشہ بھی اب اُترنے کو ہے

گرنے والے بھی تو کہتے ہیں
یہ جگہ صرف پاؤں دھرنے کو ہے

اب وہ سردار ہے قبیلے کا
اب وہ ہر بات سے مکرنے کو ہے

وہ جو زندہ ہے گفتگو میں کہیں
اب تو وہ آدمی بھی مرنے کو ہے

دشمنِ جاں تجھے خبر ہی نہیں
وہ جو اک زخم تھا وہ بھرنے کو ہے

اس کو تسخیر کر کے دیکھتے ہیں
ورنہ یہ وقت بھی گزرنے کو ہے

سلیم کوثر

میں خود تاریخ خود ہی فیصلہ ہوں
سو اپنے آپ کو دہرا رہا ہوں

ذرا اس کرب کا اندازہ کیجیے
میں اپنے آپ کو پہچانتا ہوں

یقیناً اب وہ آیا چاہتا ہے
پرندوں کی صدائیں سُن رہا ہوں

بھلا کب تک کسی کی راہ دیکھوں
خود اپنے گھر پہ دستک دے رہا ہوں

سرِ شام آ رہی ہے نیند مجھ کو
میں شاید آج اسے یاد آ رہا ہوں

جمال احسانی

دل میں ہم رنج سموتے جاتے
یوں ہنسے ہوتے کہ روتے جاتے

تم نے تعبیر بتا دی ہم کو
ورنہ ہم خواب ہی ڈھوتے جاتے

اب کسی پیڑ کی مانند ہوتے
ہم اگر خاک میں بوتے جاتے

دسترس میں کہاں تھے ہم اپنی
اور اگر ہوتے تو کھوتے جاتے

دیکھتا خواب کوئی اور یہاں
اور ہم چین سے سوتے جاتے

رمزی آثم

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت عبدالرحمن بن غنم اور حضرت اسماء بنت یزید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"بندگان خدا میں سب سے بدتر وہ لوگ ہیں جو چغلیاں کھاتے ہیں اور دوستوں میں جدائی ڈلوا دیتے ہیں۔"
(احمد و بیہقی)

دوست پر خرچ کرنا

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔
"میرے نزدیک اپنے دوست پر بیس درہم خرچ کرنا سو درہم فقیروں میں تقسیم کرنے سے بہتر ہے۔
مسز معراج۔ ٹنڈو محمد خان

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا

- واضح اور روشن ترین راستہ حق اور صداقت کا راستہ ہے۔
- سب سے بڑی خیانت قوم سے غداری ہے۔
- دین خزانہ ہے اور علم خزانے کا راستہ ہے۔
- معافی نہایت اچھا بدلہ ہے۔
- غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

تنزیل زہرہ۔ شہداد پور

موتی مالا

- اگر لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانا چھوڑ دیں تو انسان کی اسّی فیصد پریشانیاں خود بخود ختم ہو سکتی ہیں۔
- ہر انسان سب سے اونچے اور بلند مقام تک پہنچنا چاہتا ہے اور جب یہ ممکن نہیں ہوتا تو اس کی خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے بھی اونچے مقام تک نہ پہنچیں۔
- میں نے دو طرح کے لوگوں سے دھوکا کھایا ہے۔ ایک وہ جو میرے اپنے نہیں تھے اور ایک وہ جو میرے بہت اپنے تھے۔
- اعتبار عمل میں ہوتا ہے، لفظوں میں نہیں۔
- جس دل میں قوت برداشت ہو، وہ کبھی شکست نہیں کھاتا۔
- لوگوں کو ہماری ضرورت نہیں ہوتی بلکہ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہم ان کے لیے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں۔

ملیحہ طاہر۔ جھمرا

خودکش حملہ

ایک سردار جی داس کے کمانڈر نے بم باندھ کر خودکش حملے کے لیے روانہ کیا۔ سردار جی نے جانے سے پہلے احتیاطاً پوچھا۔
"سر! یہ خودکش حملہ ہوتا کیا ہے؟"
کمانڈر نے کہا "اس حملے میں اپنے آپ کو ہلاک کرنا ہوتا ہے۔"
سردار جی نے اطمینان سے سر ہلایا اور حملے کے لیے روانہ ہوئے۔ دو گھنٹے بعد سردار جی نے کمانڈر کو فون کر کے کہا۔
"سر! میں ایک ایسی جگہ موجود ہوں جہاں دس بندے کھڑے ہیں۔ کیا یہاں خودکش حملہ کر دوں؟"
کمانڈر نے جواب دیا "نہیں، اس سے زیادہ رش والی جگہ تلاش کرو۔"
آدھے گھنٹے بعد سردار جی کا دوبارہ فون آیا "اب میں ایسی جگہ پر موجود ہوں جہاں پچاس آدمی ہیں۔"
کمانڈر نے فوراً جواب دیا "یہ جگہ بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں خودکش حملہ کرو۔"
سردار جی یہ سنتے ہی بھاگ کر پچاس آدمیوں کے درمیان گئے "واہ گرو جی" کا نعرہ لگایا اور جیب سے چاقو نکال کر اپنے پیٹ میں گھونپ لیا۔
ثمرہ اقرا۔ کراچی

وزن

ایک پل سے ایک ہاتھی اور چیونٹی گزرنے لگے۔ پل وزن سے لرزنے لگا۔ چیونٹی فخریہ ہاتھی سے مخاطب ہوئی۔
"دیکھو! ہم دونوں کے وزن سے پل لرز رہا ہے۔"
فرخ فاطمہ۔ حویلی لکھا

باتیں زندگی کی

- یہ دنیا مکافات عمل کا نام ہے۔ پس تم اگر کسی کی راہ میں پتھر ہو گئے تو آنے والا تمہاری راہ میں پہاڑ بن جائے گا۔
- کسی بھی حالت میں اپنے حوصلے کو مت گراؤ کیونکہ لوگ گرے ہوئے مکان کی اینٹیں تک اٹھا کے لے جاتے ہیں۔
- ہر چیز انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی، انسان زندہ ہونے کے باوجود زندگی کو نہیں سمجھ سکا۔ پھر مرے بغیر موت کو کیسے سمجھ سکتا ہے۔
- رشتے جب اذیت کے سوا کچھ نہ دیں تو ان سے کنارہ کشی ہی بہتر ہے خواہ وقتی ہی سہی۔
- دوستوں کے ساتھ پر رقص کرتی فضاؤں میں سفر کرتے ہوئے جی چاہتا ہے کہ چلیں اور چلتے ہی جائیں اور یوں ہی راستوں میں کہیں کھو جائیں۔
- منزل کے تعین کے بغیر سفر شروع کر دیا جائے تو ہر اٹھتا قدم تھکن بڑھانے اور حوصلے پست کرنے لگتا ہے۔
- زندگی کی شاہراہ پر ٹکرانے والے کچھ مسافر ہماری سوچوں کا کچھ حصہ چپکے سے اپنے نام الاٹ کروا جاتے ہیں اور ہمیں پتا بھی نہیں چلتا پھر یوں ہوتا ہے کہ گزرتے وقت میں کسی کے لہجے کا خلوص، گفتگو کی مٹھاس، یادیں اور آنکھوں کی چمک ماضی کی اوٹ سے جھانکتی ہے اور ہمیں چونکا جاتی ہے اور اپنے ہونے کا یوں احساس دلاتی ہے کہ ہم اپنی خود فراموشی پر سوائے انگشت بدنداں ہونے کے کچھ بھی تو نہیں کر سکتے۔
- خواہشیں سرد زندگی میں حرارت کا سا کام دیتی ہیں۔ خواہشوں کا وجود اگر بالکل ہی مٹ جائے تو زندگی بے جان، بے رنگ اور پھیکی ہو جاتی ہے۔ ایسے میں پھر کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

تحریم۔ گوجرہ

مختصر مختصر

- بعض لوگ غضب کے سکون پسند ہوتے ہیں۔ کامیابی بھی ان کے دروازے پر دستک دے تو جھلا اٹھتے ہیں یہ کون کمبخت شور کر رہا ہے۔
- جس شخص کو خود کچھ نہ کرنا ہو، اس کے لیے کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہوتا۔
- بعض مقررین کی تقریروں میں گہرائی کم اور لمبائی زیادہ ہوتی ہے۔
- پاگل پن کا علاج ممکن ہے لیکن کج فہمی کی اصلاح ممکن نہیں۔
- بدقسمتی کے مقابلے میں خوش قسمتی کو برداشت کرنے کے لیے عظیم تر خوبیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔
- عقل مند آدمی جنگ جیتنے سے زیادہ جنگ میں شریک نہ ہونے کو مفید سمجھتا ہے۔

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

آدم،

آدمی بھی عجیب چیز ہے
جو نہیں ہے، اُسے ڈھونڈتا ہے
مگر جس کو پاتا ہے
اُس کو جب تک کہیں کھو نہ دے
کتنا بے چین رہتا ہے
حاضر کو غائب ہیں
غائب کو حاضر ہیں
یوں کھو جاتا ہے
کہ جیسے وہ خود کہیں کھو گیا ہے

(احمد ندیم قاسمی)
امبرگل۔ جڈو (سندھ)

فیصلہ،

ہوا کا سامنا کرنا پڑے گا
دیے کو حوصلہ کرنا پڑے گا
مرا نقصان بھی ممکن ہے لیکن
مجھے اب فیصلہ کرنا پڑے گا

عائشہ۔ گوجرہ

بڑھاپا،

- آدمی زندگی گزارنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ زندگی میں دلچسپی نہ لینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
- گزرتے ہوئے سال ہم سب کو بوڑھا بنا دیتے ہیں لیکن دانش مند کسی کسی کو بناتے ہیں۔
- بوڑھا ہونے میں یوں مزا نہیں کہ اس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔
- زندگی میں بس ایک بڑھاپا ہی ایسی کمال کی چیز ہے جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے خود بخود آ جاتا ہے۔

(اشفاق احمد)
سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

سیل،

ایک میڈیکل اسٹور والے نے پیک شدہ سینڈوچز بھی فروخت کے لیے کاؤنٹر پر رکھنے شروع کر دیے۔ ایک روز پڑوسی دکان دار نے پوچھا۔

"کیسی جا رہی ہے سینڈوچز کی سیل؟"

"ان کی وجہ سے میری ان ڈائریکٹ سیل بہت بڑھ گئی ہے...." میڈیکل اسٹور والے نے بتایا۔

"ان ڈائریکٹ سیل؟ کیا مطلب؟" پڑوسی دکان دار نے وضاحت چاہی۔

"جب سے سینڈوچز رکھنے شروع کیے ہیں۔ ہاضمے کی گولیوں کی فروخت بہت بڑھ گئی ہے۔" میڈیکل اسٹور والے نے جواب دیا۔

مسرت الطاف احمد۔ کراچی

سوا سیر،

مائیکل فیراڈے نے اپنے زیر تربیت شاگرد کو ہتھوڑی بنانے کا حکم دیا۔ شاگرد کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ہتھوڑی کس طرح بنائی جاتی ہے۔ اس نے استاد کی نظروں میں سرخرو ہونے کے لیے بازار سے ایک ہتھوڑی خرید کر استاد کی خدمت میں پیش کی۔

"بہت خوب۔" فیراڈے ہتھوڑی دیکھتے ہی سمجھ گیا۔ لہٰذا مسکرا کر بولا۔

"ایسی پچاس ہتھوڑیاں اور تیار کرو۔"

آسیہ جاوید۔ علی پور چٹھہ

جستہ جستہ برجستہ،

اکثر سوالات کے جوابات ایسے بے ساختہ اور لاجواب ہوتے ہیں کہ ان کے بعد کسی دوسرے سوال کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ایسے ہی چند سوال اور ان کے جواب پیش خدمت ہیں۔

- تمہاری مادری زبان کون سی ہے؟
- کوئی نہیں، کیونکہ میری ماں گونگی تھی۔
- ایک قیدی: ۔ تمہارا کوئی رشتے دار کبھی تم سے ملنے جیل نہیں آیا؟

- دوسرا قیدی: ۔ میرے سارے رشتے دار یہیں پر موجود ہیں۔
- "اگربتی" کو جملے میں استعمال کرو۔
- اگر بتی چلی جائے تو موم بتی جلاتے ہیں۔
- تم نے ایک رات میں پانچ گھروں میں چوریاں کر ڈالیں؟
- میں بچپن سے بہت محنتی ہوں۔
- کپڑے کی دکان میں چوری کرتے وقت تم نے اپنے بیوی بچوں کے بارے میں نہیں سوچا؟
- سوچا تھا، مگر دکان میں صرف مردانہ کپڑے تھے۔
- چور مالک مکان سے۔ بتاؤ سونا کہاں ہے؟
- مالک مکان۔ اتنی جگہ پڑی ہے، جہاں دل چاہے سو جاؤ۔
- "معمولی" کو جملے میں استعمال کرو۔
- میری ماں، مولی بہت شوق سے پکاتی ہیں۔
- میرا ایک بال قرضے میں جکڑا ہوا ہے، کیا کروں؟
- فوراً سر منڈوا دو۔
- شرم نہیں آتی، مار کھا کر بھی ہنس رہے ہو؟
- آپ ہی نے تو کہا تھا، مصیبت کا مقابلہ مسکرا کر کرنا چاہیے۔
- دستک کو جملے میں استعمال کرو۔
- مجھے دس تک گنتی آتی ہے۔

مسرت۔ کراچی

انمول موتی،

- ایک لمبی زبان، عزت کو چھوٹا کرتی ہے۔
- بارش کا قطرہ سیپ اور سانپ دونوں کے منہ میں گرتا ہے۔ سیپ اسے موتی جبکہ سانپ اس سے زہر بنا دیتا ہے۔
- موتی اگر کیچڑ میں گر جائے تو تب بھی قیمتی ہے۔
- لوگوں کے آگے جھکنے سے ان سے مایوس ہونا اچھا ہے۔
- دوست ہی نہیں اگر دشمن بھی اچھا کام کرے تو اس کی تعریف کرو۔
- دنیا یہ نہیں دیکھتی کہ تم کل کیا تھے۔ دنیا یہ دیکھتی ہے کہ تم آج کیا ہو۔
- علم کے بغیر انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔

عائلہ تقی۔ میرپور آزاد کشمیر

اس سادگی پہ،

مریض (رضا) نے ڈاکٹر حسن سے شکایت کی۔ "آپ نے مجھے جو طاقت کی گولیاں دی تھیں۔ وہ سب کی سب میں بہت باقاعدگی سے کھا رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں بہت کمزوری محسوس کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر حسن بولے۔ "ہو سکتا ہے تمہاری خوراک ٹھیک نہ ہو۔ آج کل کون کون سی غذا کھا رہے ہو؟"

مریض حیران ہو کر بولا۔ "اچھا ڈاکٹر حسن... تو ان گولیوں کے علاوہ مجھے کھانا بھی کھانا تھا؟"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

ایک نظر ادھر،

- اضطراب بے سبب نہیں ہوتا بلکہ یہ بھولا ہوا سبق، چھوڑی ہوئی منزل اور نظر انداز کیے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے۔
- رنگین خواب دیکھنے سے بہتر ہے کہ انسان ڈٹ کر زندگی کی بلیک اینڈ وائٹ حقیقتوں کا سامنا کرے۔
- اپنی زندگی میں ہم جتنے دل راضی کریں، اتنے ہی ہماری قبر میں چراغ ہوں گے۔
- ہماری نیکیاں ہمارے مزار روشن کرتی ہیں۔ سخی کی سخاوت اس کی اپنی قبر کا دیا ہے۔
- دولت کے بھوکے کو کبھی حقیقی راحت نہیں ہو سکتی۔

مقدس رباب۔ چکوال

سمی ملک کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر امجد اسلام امجد کی یہ غزل سب قارئین بہنوں کی نذر۔

شہرت، عروج، حسن کی دولت کسی سے بھی
کرتا نہیں یہ وقت رعایت کسی سے بھی

دل ہے کُھلی کتاب کی صورت رکھا ہوا
کرتے نہیں ہم تو سیاست کسی سے بھی

سُود و زیاں کا جوڑتے ہیں جو حساب
کرتے نہیں وہ لوگ محبت کسی سے بھی

جو بھی ہوا، وہ ایسے ہی ہونا تھا، ہو گیا
یعنی نہیں ہے ہم کو شکایت کسی سے بھی

امجد تماش بین ہیں سارے یہ غمگسار
کیجیے مت اپنے غم کی وضاحت کسی سے بھی

ریحانہ کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر فرحت عباس شاہ کی یہ نظم قارئین کی نذر۔

واپسی

کوئی رات یاد نہیں رہی
کوئی شام پاس نہیں رہی
کوئی دن اداس نہیں رہا
تیرے عشق میں
میرے دل کی ساری ریاضتیں
کسی بحری دُھند میں کھو گئیں
مجھے میرے دُکھ میں ڈبو گئیں

نمرہ، اقراء کی ڈائری سے

شاعری احساسات کی ترجمانی کا بہت ہی آسان طریقہ ہے۔ انسان کی زندگی کتنے نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ اس غزل میں دیکھیے۔

قریب رہتے ہوئے فاصلوں میں کاٹی ہے
تمام عمر تری چاہتوں میں کاٹی ہے

غمِ فراق، غمِ جاں، غمِ رقیب
یہ زیست ہم نے کئی مرحلوں میں کاٹی ہے

تمام رات بس تمہارا انتظار رہا
تمام رات فقط کروٹوں میں کاٹی ہے

کچھ اتنی سہل نہیں تھی یہ زندگی ہم نے
بڑے ہنر سے بڑے مسئلوں میں کاٹی ہے

فائزہ محمود کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

عجب راستے ہیں میرے کہ چلنا بھی نہیں ممکن
ذرا ٹھوکر جو لگ جائے سنبھلنا بھی نہیں ممکن

تیرا چہرہ میری نظروں میں دُھندلا سا نہ ہو جائے
کہ اب بھیگی ہوئی پلکوں کو ملنا بھی نہیں ممکن

ملے ہیں بعد مدت کے، بلا کے سرد ہیں لہجے
کہ جلنا ہی نہیں ممکن، پگھلنا بھی نہیں ممکن

تعلق ٹوٹ جانے سے امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں
دلوں میں حسرتیں لے کر بہلنا بھی نہیں ممکن

بہت ناکامیاں لے کر ہوا ہوں خاک کا تبدیل
چلو اب آج سے گھر سے نکلنا بھی نہیں ممکن

اسے اتنا نہ سوچا کر تیری عادت ہی نہ بن جائے
پھر ایسی عادتیں محسن بدلنا بھی نہیں ممکن

امبر گل کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ارشد ملک کی یہ نظم آپ سب بہنوں کے نام۔

تم نہیں ہو تو،

تم نہیں ہو تو ایسا لگتا ہے
جیسے ویران ہو رہگزارِ حیات
جیسے خوابوں کے رنگ پھیکے ہوں
جیسے لفظوں سے موت برستی ہو
تم نہیں ہو تو ایسا لگتا ہے
جیسے خوشبو نہیں ہو کلیوں میں
جیسے سُونا پڑا ہو شہرِ دل
جیسے کچھ بھی نہیں ہو گلیوں میں
جیسے خوشبو سے دُشمنی ہو جائے
جیسے جذبوں سے آشنائی نہ ہو
جیسے اک عمر کی مسافت پر بات کچھ بھی سمجھ نہ آئی ہو
تم نہیں ہو تو ایسا لگتا ہے
جیسے چپ چاپ ہوں آرزو کے شجر
جیسے رُک رُک کر سانس چلتی ہو
جیسے بے نام ہو دُعا کا سفر
جیسے قسطوں میں عمر کٹتی ہو
تم نہیں ہو تو ایسا لگتا ہے
جیسے [illegible] ہیں، کوئی آواز دے کے
چپ ہو جائے
جیسے ہنستے ہوئے اچانک ہی غم کی پُروا سے آنکھ
بھر آئے
تم نہیں ہو تو ایسا لگتا ہے ...

خدیجہ رحمان کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر محسن نقوی کی یہ غزل مجھے بہت پسند ہے۔ اس کا ہر شعر ہی زبردست موضوع ہے۔ آپ سب قارئین کی نذر۔

تمام شب جہاں جلتا ہے اک اُداس دیا
ہوا کی راہ میں اک ایسا گھر بھی آتا ہے

وہ مجھ کو ٹوٹ کر چاہے گا، چھوڑ جائے گا
مجھے خبر تھی اُسے یہ ہنر بھی آتا ہے

وفا کی کون سی منزل پہ اُس نے چھوڑا تھا
کہ وہ تو یاد ہمیں بھول کر بھی آتا ہے

چلے جو ذکر فرشتوں کی پارسائی کا
تو زیرِ بحث مقامِ بشر بھی آتا ہے

کبھی کبھی مجھے ملنے بلندیوں سے کوئی
شعاعِ صبح کی صورت اُتر بھی آتا ہے

جہاں لہو کے سمندر کی حد ٹھہرتی ہے
وہیں جزیرۂ لعل و گہر بھی آتا ہے

خالدہ جیلانی

سدرہ اکرم ____ سخی حسن

زندگی کا نصاب ہو جیسے
تیرا چہرہ کتاب ہو جیسے

عینی عابد ____ ناظم آباد

شہر تم سے مانگنے گر علاج تیرگی
صاحب اختیار آگ لگا دیا کرو

فرخ فاطمہ ____ حویلی لکھا ضلع اوکاڑہ

اک بار تجھے عقل نے چاہا تھا بھلانا
سو بار جنوں نے تیری تصویر دکھا دی
وہ چین سے بیٹھے ہیں میرے دل کو مٹا کر
یہ بھی نہیں احساس کہ کیا چیز مٹا دی

ندا، فضہ ____ کراچی

رات باقی تھی جب وہ بچھڑا تھا
عمر گزری ہے رات باقی ہے

اقصیٰ ناصر ____ کراچی

اکیلا کچھ نہ کر تیرا مری شام تم تنہا
نہ تم آئے نہ تنہائی سے چین پایا نہ تو آئی

منا عائشہ ____ ناظم آباد

نہ جانے کتنی مدت سے یہ دل میں یہ عمل جاری
ذرا سی ٹھیس لگتی ہے بہت مانوس جاتا ہوں

آمنہ تجمل ____ کراچی

فہم و ادراک سے بالا ہے یہ انداز وفا
تم کو اندیشہ رسوائی بھی ہے اور محبت بھی

ثنا اسمٰعیل ____ آدم ٹاؤن

سن کر اس کی سب باتیں فقط تنہا ہی کہتا ہوں
کہاں آپ، کہاں وفا، رہنے دیجیے بس کیجیے

صباحت ارشاد باجوہ ____ گوجرانوالہ

غم زندگی کا ہنر سہی غم آگہی کی نظر سہی
نہیں تیرے وصل کی سرخوشی ترے ہجر سے تو نباہ ہے

فرحانہ عبدالقادر ____ کراچی

وہ بات بات پہ اپنی مثال دیتا ہے
کچھ اپنے آپ پہ کم اعتبار ہے شاید
لبادہ پاس ہی ہے پہلے کبھی نہیں دیکھا
کسی کے سوگ میں ہی اب کے بہار ہے شاید

صائمہ دل آویز ____

ضرورت تک بس آس اور ... کی دیواریں
یہی وہ لوگ ہیں جن کو گھروں سے ڈر نہیں لگتا
یہ ممکن ہے وہ ان کو موت کی سرحد سے چھائیں
پرندوں کو مگر اپنے پروں سے ڈر نہیں لگتا

مقدس رباب ____ چکوال

اتنی دیر میں اُجڑے دل پر، کتنے محشر بیت گئے
جتنی دیر میں تجھ کو پا کر کھونے کا امکان ہوا
یہ دل، یہ آسیب کی نگری، مسکن سوچوں وہموں کا
سوچ رہا ہوں اس نگری میں تو کب سے مہمان ہوا

انعم قاسم ____ بہاولپور

تم سے طلب صلہ کیا، تم سے کوئی گلہ کیا؟
دیدۂ تر کا ذکر کیا، یونہی چھلک گیا کہیں
وہ جو سبک خرام تھے، منزل عشق پا گئے
راہ وفا کے پیچوں بیچ کوئی اٹک گیا کہیں

آمنہ اجالا ____ ڈہرکی

بہم ہوئے بھی مگر دل کی وحشتیں بھی گئیں
وصال میں بھی دلوں کا غبار کب نکلا
ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کسی کا دست کرم
کہ سارا شہر لیے کاسۂ طلب نکلا

مہناز اشفاق ____ کراچی

روداد قفس یاد نہ انداز فغاں یاد
جو بیت گئی، بیت گئی، اب وہ کہاں یاد
تم بھول گئے ہم کو تو کیا اس میں تعجب
اس دور میں کرتا ہے کسے، کون، کہاں یاد

دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات واحساسات سے خالی نہیں۔ نرم ونازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رہ جاتا ہے' اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو' اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کرپاتی جو فقط ایک شعر کہہ دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "ارے یہ ہی تو میرے دل میں تھا۔"

زندگی کی طویل دھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں' بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر' کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی یادوں میں ہمیں بھی شریک کیجئے' مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہوسکتا ہے' نظم بھی اور غزل بھی۔

سوالات یہ ہیں:

1 وہ شعر جو اکثر آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟

2 وہ شعر' نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟

3 کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟

4 وہ غزل جو آپ نے ٹی وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟

5 کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سارے

صالحہ دل آویز

1 : شاعری دلوں کا گداز اور روح کا ترنم ہے۔ کبھی تبسم' کبھی تکلم' کبھی مسکان اور کبھی سوزِ غم' غرض کہ آپ کے ہر جذبے اور ہر احساس کو بیان کرنے کا شاعری سے بہتر کوئی صنف سخن ہو ہی نہیں سکتا۔ میں جب بھی کبھی اکیلی ہوتی ہوں یا گھر کے کام کاج کرنے کے دوران فیض کا یہ گیت اکثر ہی گنگناتی ہوں۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ

اور اس کا یہ شعر تو بار بار دہرانے کا دل کرتا ہے۔

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

میرے ساتھ صورت حال ہے بھی کچھ ایسی ہی ہے میرے "ان" کی آنکھیں ماشاء اللہ بہت ہی خوب صورت ہیں۔ جھیل کی مانند گہری اور پرسکون۔ اگر میری ان سے کبھی ناراضی ہو جائے تو یہ شعر گنگناتی ہوں۔

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

اور جب میکے جانا ہو تو سلام کے بعد لازماً "منہ سے یہ نکلتا ہے۔

لے آئی پھر کہاں پہ قسمت ہمیں کہاں سے
یہ تو وہی جگہ ہے گزرے تھے ہم جہاں سے

2 : آج سے دو سال پہلے کی بات ہے "نظریہ پاکستان فاؤنڈیشن" میں تحت اللفظ پڑھنے کا مقابلہ تھا۔ مجھے اقبال کا "شکوہ" پڑھنے کو ملی اور یقین کریں کہ اس کو سمجھنے کے بعد میں ایسے اقبال سے ملی جس کی شاعری مجموعہ قرآن ہے۔ ترجمہ قرآن ہے۔ فرسٹ پرائز ملا۔ وہ تو الگ' مگر مجھے وہ اقبال ملا جس نے خودی کا تصور ایسے واضح کیا کہ گویا اپنی ذات کا نشان مل گیا۔

کیوں زیاں کار بنوں سود فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں محو غم دوش رہوں

نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں

جرأت آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

ہے بجا شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصہ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم

ساز خاموش ہیں فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو معذور ہیں ہم

اے خدا! شکوہ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہم نشیں! مسلم ہوں میں' توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے
میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

3 : یہ ذکر ماڈل ٹاؤن کالج لاہور برائے خواتین کا ہے۔ میں کلیتہ البنات ڈگری کالج میں زیر تعلیم تھی۔ غیر نصابی ہم نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی۔ بقول اپنے اساتذہ کرام میں ابھرتی ہوئی مقررہ تھی۔ ماڈل ٹاؤن کالج لاہور میں تقریری مقابلہ بہ عنوان "وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ" منعقد تھا۔ سارے مقررین نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خوب داد وصول کی۔ حیران تو میں اس وقت ہوئی جب جج صاحبان میں سے ایک منصف نے یہ کہتے ہوئے میرا نام اول انعام کے لیے پکارا۔

دیکھ تو دلفریبی انداز نقش پا
موج خرام یار بھی کیا گل کر گئی

4 : مجھے غالب کی یہ غزل گائیکی کی وجہ سے بے حد پسند ہے۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

پھر گرم نالہ ہائے شرر بار ہے نفس
مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کیے ہوئے

اور [illegible] کا یہ گیت تو از حد پسند ہے۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے
تو اب سے پہلے ستاروں میں بس رہی تھی کہیں
تجھے زمین پہ بلایا گیا ہے میرے لیے
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ یہ بدن یہ نگاہیں میری امانت ہیں
یہ گیسوؤں کی گھنی چھاؤں ہے مری خاطر
یہ ہونٹ اور یہ باہیں مری امانت ہیں
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

5 : کلاسیکی ادب میں میرا انتخاب اقبال کے یہ اشعار

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ
یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لا الہ الا اللہ

یہ مال و دولت دنیا' یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں لا الہ الا اللہ
یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ
اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکم اذاں لا الہ الا اللہ

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

لاہوری پائے

اجزا :

بکرے کے پائے	8 عدد
مغز	1 عدد
پیاز	3 عدد
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	2 چائے کے چمچے
پسا گرم مسالا	1 چائے کا چمچہ
دہی	1 کپ
ہری مرچ	2 عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	ڈیڑھ کپ
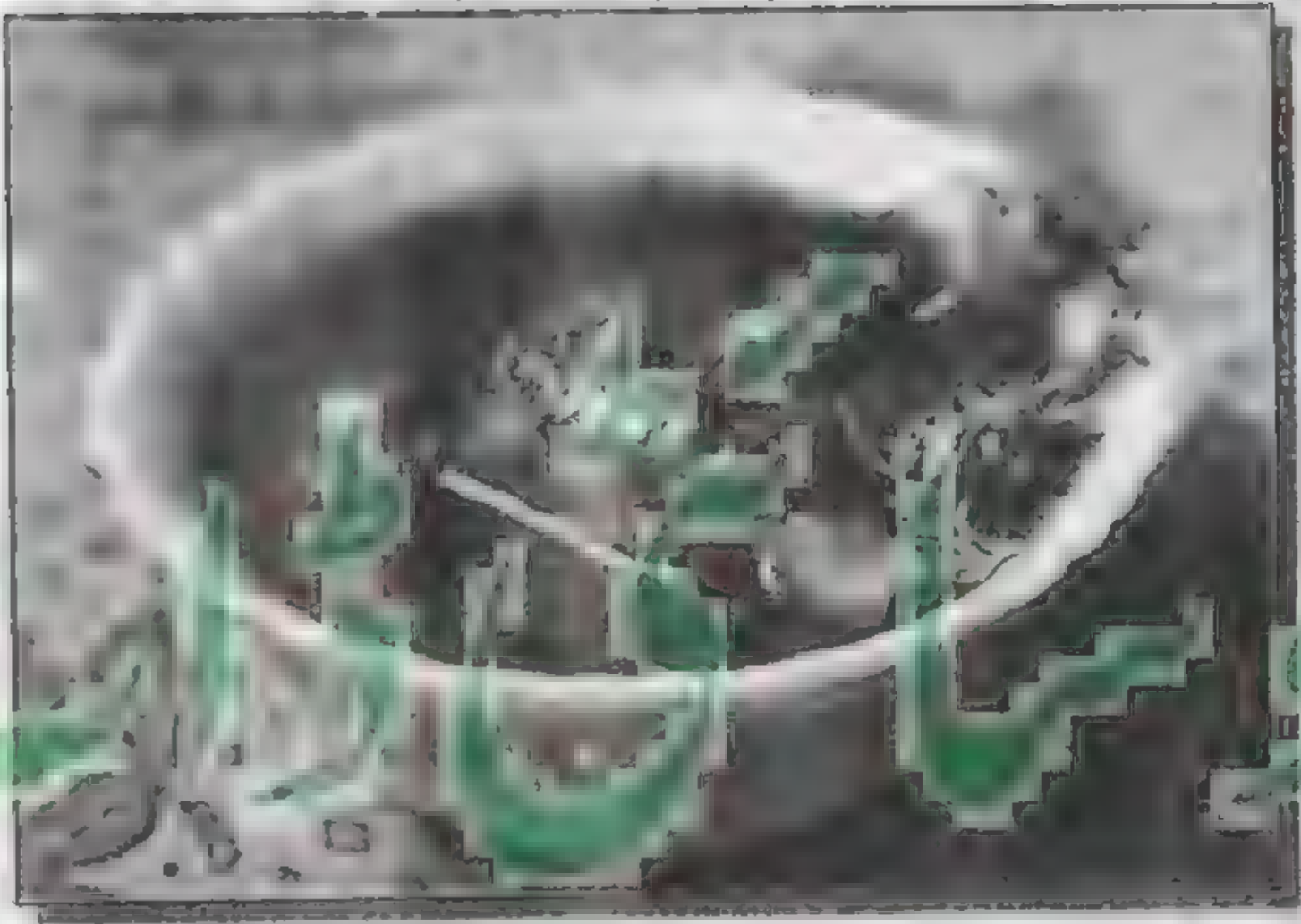
ترکیب :

مغز کو نمک اور ہلدی ملے پانی میں ابال لیں۔ اچھی طرح صاف کرکے ٹکڑے کرلیں۔ پائے اچھی طرح دھو کر نمک ڈال کر گلا لیں۔ یہاں تک کہ گودا نکل آئے۔ اب تیل گرم کرکے پیاز براؤن کرلیں پھر چورا کرکے لہسن میں ملالیں۔ اب اس تیل میں پسی مرچ گرم مسالا، دہی اور چورا کی ہوئی پیاز ڈال کر بھونیں۔ جب مسالا یکجان ہو کر تیل چھوڑنے لگے تو پائے (شوربے سمیت) شامل کردیں۔

آدھا گھنٹہ ہلکی آنچ پر پکانے کے بعد مغز بھی ڈال دیں۔ حسب مرضی شوربا رہ جائے تو چولہا بند کردیں۔ کتری ہوئی ادرک، مرچ اور دھنیے سے سجاوٹ کرکے گرم گرم نان کے ساتھ پیش کریں۔

دم پخت بریانی

اجزا :

گوشت	1کلو
چاول	آدھا کلو
دہی	آدھا کلو
ادرک	1 ٹکڑا
کالی مرچ	چند دانے
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	1پاؤ
لونگ	8عدد
زعفران	1چٹکی
الائچی	9عدد
عرق گلاب	2چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1پاؤ

ترکیب :

پیاز اور ادرک پیس لیں تھوڑا سا زعفران اور نمک گوشت کی بوٹیوں پر مل کر دو گھنٹے تک رکھ دیں۔ پھر آدھے دہی میں زیرہ اور الائچی پیس کر پھینٹ لیں۔ اس مرکب کو بھی گوشت کے ٹکڑوں پر مل لیں تھوڑا سا تیل گرم کرکے اس میں لونگ کڑکڑائیں اور گوشت ڈال کر بھونیں' پھر بقایا دہی اور سیاہ مرچ بھی ڈال دیں' دیگچی کا ڈھکن بند کرکے اوپر وزن رکھ دیں تاکہ بھاپ باہر نہ نکل سکے۔ آنچ بھی دھیمی رکھیں' تھوڑی دیر میں دہی کا پانی خشک ہو جائے تو آنچ مزید دھیمی کر دیں اور بقایا تیل ڈال دیں تقریباً" آدھے گھنٹے بعد اتار لیں۔ چاولوں کو حسب ذائقہ نمک ڈال کر ابال لیں' جب ایک کنی چاول کچے رہ جائیں تو گوشت کے ساتھ تہہ لگا دیں' تھوڑا سا عرق گلاب ڈالیں اور دوبارہ دیگچی ڈھکن بند کرکے اوپر وزن رکھ دیں۔ دس منٹ بعد اتار لیں۔ خوشبودار دم پخت بریانی تیار ہے۔

قیمہ اسپیگھٹی

اجزا :

قیمہ	1پاؤ
پیاز	1عدد
لہسن پیسٹ	1چائے کا چمچہ
ٹماٹر پیسٹ	2کھانے کے چمچے
پسی لال مرچ	1چائے کا چمچہ
ہری مرچ	2عدد
اسپیگھٹی	آدھا پیکٹ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	3کھانے کے چمچے

اسپیگھٹی کو ابال کر رکھ لیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کرکے پیاز ڈال کر ہلکا سا فرائی کریں اور قیمہ' لہسن ڈال کر بھونیں۔

قیمہ کا پانی خشک ہو جائے تو نمک اور لال مرچ ڈال کر بھونیں' پھر ٹماٹر پیسٹ اور ہری مرچ ڈال کر بھونیں۔ تیل الگ ہو جائے تو اسپیگھٹی مکس کرکے دو منٹ پکائیں اور ڈش میں نکال لیں۔ گرم گرم پیش کریں۔

ربڑی شیک

اجزا :

دودھ	4کپ
ربڑی	1کپ
فالودہ	1کپ (تیار کیا ہوا)
تخم ملنگا	2کھانے کے چمچے
چینی	حسب ذائقہ
آئس کیوب	حسب ضرورت

ترکیب :

1کپ دودھ میں ربڑی ڈال کر بلینڈ کرلیں۔ اس میں بقیہ دودھ' تخم ملنگا' چینی اور آئس کیوب شامل کرکے دوبارہ بلینڈ کریں۔ اس کے بعد اس میں فالودہ شامل کرلیں۔ جلد تیار ہونے والا مشروب حاضر ہے۔ ٹھنڈا کرکے پیش کریں۔

آپ کا باورچی خانہ

سلیقہ ابوبکر

سب سے پہلے تو اپنا تعارف کروا دوں میرا نام سلیقہ ابوبکر ہے ماشاءاللہ تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔

(1) کھانا پکاتے وقت میرے خیال میں گھر والوں کی پسند' غذائیت اور صحت سب کا خیال رکھنا چاہیے جو کہ میں رکھتی ہوں۔

(2) ہمارے ہاں تو مہمان اکثر اچانک ہی آتے ہیں اور میرے بچے بہت خوش ہوتے ہیں۔ بہت خوشی سے میزبانی سرانجام دیتے ہیں۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ہم میٹھا بہت شوق سے کھاتے ہیں اس لیے پہلے تو مہمان کو میٹھا ہی کھلایا جاتا ہے جس کے لیے مزیدار اور میٹھی سی دو ترکیبیں پیش ہیں۔

بیسن اور دودھ انڈوں والا حلوہ

اجزا :

بیسن	آدھا پاؤ
دودھ	ایک گلاس
انڈے	پانچ عدد
الائچی	چار عدد
چینی	ایک پیالی
کشمش بادام	حسب مرضی (باریک کاٹ لیں)
گھی	ایک کپ

ترکیب :

ایک دیگچی میں گھی اور الائچی ملا کر چڑھا دیں۔ گھی گرم ہونے پر بیسن ڈال دیں چمچہ برابر چلاتی رہیں۔ انڈوں کو پھینٹ لیں اور سب چیزیں اس میں ملا دیں۔ چمچہ چلانا نہ بھولیں۔ اب سب چیزوں کو دیگچی میں ڈال دیں مگر چمچہ مسلسل چلاتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب حلوہ گھی چھوڑنے لگے تو اتار لیں اور گرما گرم پیش کریں اور مجھے داد دیں۔

دوسری مزے دار ڈش ہے۔

دودھ والی کھجوریں

اجزا :

کھجور	آدھا کلو
الائچی	چار عدد
دودھ	ایک کلو (زیادہ بھی لے سکتی ہیں)

ترکیب :

کھجوریں پانی میں بھگو دیں' اور ان کی گٹھلیاں نکال دیں۔ ایک دیگچی میں پانی اور کھجوریں ڈال دیں۔ الائچی بھی ڈال دیں۔ دودھ بھی ابال لیں۔ کھجوریں گل جائیں تو دودھ ڈال دیں۔ کچھ دیر پکائیں۔ پھر ڈش میں نکال لیں۔ مزیدار ڈش تیار ہے۔

4 : ناشتا ہمارے ہاں نارمل ہی ہوتا ہے چائے اور توس۔

5 : موسم کے بغیر کھانے کا مزا میرے خیال میں ہے بھی اور نہیں بھی کیونکہ بارش کے موسم میں پوریاں' پکوڑے' چپس کا اپنا مزا ہے۔

6 : اچھا کھانا کھانے کے لیے میرے خیال میں تو وقت' محنت اور محبت تینوں ہی درکار ہیں۔

7 : ہمارے ہاں باہر جانا ناممکن ہے۔

باتیں افراز علی نازش سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"محمد خالد ارشد اور افراز علی نازش میرا قلمی نام ہے۔"

2 "پیار کا نام؟"
"نازش..... لیکن قریبی لوگ افراز کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"20 جون 1974ء / ملتان اور اسٹار Gemini (جوزا) ہے۔"

4 "تعلیمی قابلیت / قد؟"
"گریجویٹ ہوں / 5 فٹ 11 ہے۔"

5 "بہن بھائیوں کی تعداد / آپ کا نمبر؟"
"ایک بھائی ایک بہن / میں بڑا ہوں۔"

6 "شادی؟"
"آئیڈیل کا انتظار ہے۔"

7 "ایف ایم۔95 کب جوائن کیا؟"
"2008ء میں اور دو ماہ بعد پی ایم کے عہدے پر ترقی ہو گئی۔"

8 "پہلا پروگرام؟"
"سلام سحر جو کہ اردو زبان کا پروگرام تھا۔"

9 "پہلی کمائی / کیا کیا تھا؟"
"ریڈیو کی پہلی کمائی 500 تھی پاکستان میں اور دبئی میں 1 ہزار درہم ملے تھے۔"

10 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"اپنی نازش کو دیکھنے کو دل چاہتا ہے۔ مگر وہ ہوتی نہیں ہے۔ نازش شریک سفر کے لیے میرا آئیڈیل ہے۔"

11 "صبح کا آغاز کب ہوتا ہے؟"
"صبح کا آغاز فجر کے وقت ہوتا ہے مگر نماز پڑھ کر سو جاتا ہوں۔ اسے میں اپنی بری عادت کہتا ہوں۔"

12 "تنہائی میں کس سے ہمکلام ہوتے ہیں؟ خدا سے یا اپنے آپ سے؟"
"تنہائی ملتی نہیں ہے۔ ہاں! جب صبح نماز کے لیے اٹھتا ہوں تو چڑیوں سے ہمکلام ہوتا ہوں۔ ان سے گپ شپ لگاتا ہوں اور پھر سو جاتا ہوں۔"

13 "اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا اچھا ہے؟"
"آنکھیں اور پورا چہرہ ہی اچھا لگتا ہے۔"

14 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"

15 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"صبر کی کیونکہ میں کھانے کے لیے زندہ نہیں رہتا بلکہ زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہوں۔"

16 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتے ہیں؟"
"صرف اپنے ساتھ۔ کیونکہ دنیا خوش رہنے والوں کے ساتھ خوش رہتی ہے۔"

17 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"بہت برا لگتا ہے..... کیونکہ جب میں کسی کو نہیں اٹھاتا تو کوئی مجھے بھی نہ اٹھائے۔"

18 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتے ہیں؟"
"اس کا لب و لہجہ اس کے چہرے پہ میری نگاہیں ہوتی ہیں۔"

19 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"اپنے آپ کو دیکھ کر رب کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

20 "اپنی شخصیت میں کیا کمی محسوس کرتے ہیں؟"
"کچھ بھی نہیں۔ اللہ نے مجھے ایک مکمل انسان بنایا ہے۔"

21 "کیا آپ اپنی مرضی سے زندگی گزار رہے ہیں؟"
"جی بالکل اپنی مرضی سے ہی زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے پابندی میں رہنا پسند نہیں ہے۔"

22 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتے ہیں؟"
"صرف ایک شے کی تلاش میں..... باقی تو اللہ نے ساری خواہشات پوری کر دی ہیں۔"

23 "آپ کے لیے کون جان قربان کر سکتا ہے؟"
"اگر میرے والد زندہ ہوتے تو وہ ہی قربان ہو سکتے تھے مجھ پر اور کوئی نہیں۔"

24 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"دوسروں کے لیے۔"

25 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کس کو مانگتے؟"
"اپنے آئیڈیل نازش کو۔"

26 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی کو بدل دیا ہو؟"
"ہاں! میری ایک دوست تھی جب میں ملتان سے لاہور آیا تھا تو اس نے تو میرا پورا لائف اسٹائل بدل دیا تھا۔"

27 "جب پہلی مرتبہ نیا پین استعمال کرتے ہیں تو کیا لکھتے ہیں؟"
"سب سے پہلے "نازش" لکھتا ہوں۔"

28 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر پشیمانی محسوس کرتے ہوں؟"
"میری دوست جس کا میں نے ابھی ذکر کیا اس نے مجھے پرپوز کیا اور میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ دوستی کا مطلب شادی نہیں ہوتا۔"

29 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"ہاں جی! بالکل ایسا ہوا ہے۔"

30 "کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"ماں کے ہاتھ کا مگر اب تو وہ بھی حیات نہیں ہیں۔"

31 "پسندیدہ ناشتا / کھانا؟"
"نان چنے / قیمہ بھنا ہوا۔"

32 "موڈ خراب ہوتا ہے؟"
"موڈ بہت ہی کم خراب ہوتا ہے کیونکہ میں ایک زندہ دل ہنس مکھ انسان ہوں۔ نہ بور ہوتا ہوں نہ موڈ خراب کرتا ہوں۔"

33 "ڈیپریشن میں کیا کرتے ہیں؟"
"اپنے آپ کو گیمز میں یا دوسرے کاموں میں مصروف کر لیتا ہوں۔ کمپیوٹر سے دل بہلاتا ہوں یا کتابوں سے۔"

34 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے؟ لڑکے یا لڑکیاں؟"
"لڑکیاں میں انہی پہ بھروسا کرتا ہوں۔"

35 "کیا دعا سے قسمت بدل سکتی ہے؟"
"بالکل..... میرا یقین ہے۔"

36 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"
"عینک لگی ہوئی ہے اس سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔"

37 "اللہ سے کوئی شکوہ؟"
"کبھی نہیں کیا اور نہ ہی کروں گا۔"

38 "قسمت پر کتنا یقین ہے؟"
"100 فیصد۔ جو کچھ ملتا ہے قسمت سے ہی ملتا ہے۔"

قسمت اللہ تعالیٰ لکھتا ہے۔ اسی کا عمل دخل ہے۔"

39 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"

"بہت زیادہ۔ لوگوں سے میرا قریب ہونا یا دور ہونا چھٹی حس کی وجہ سے ہی ہے۔ خاصی اسٹرونگ ہے میری چھٹی حس۔"

40 "گھر آکر پہلی خواہش کیا ہوتی ہے؟"

"باتھ روم میں جا کر فریش ہونا۔"

41 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"

"کبھی نہیں، یہ برحق ہے۔"

42 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"

"میں بہت سوشل بندہ ہوں۔ ہر تقریب میں جاتا ہوں۔"

43 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"

"[illegible] ہیں اور میں سب سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔"

44 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"جھوٹ مجھے بولنا پڑتا ہے کیونکہ میں مارکیٹنگ کرتا ہوں۔ میرا جو سرکل ہے وہ سچ پر یقین ہی نہیں کرتا۔"

45 "موبائل فون کے لیے آپ کے تاثرات؟"

"یہ ایک بہترین ایجاد ہے اور یہ اب ہر ایک کے لیے بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

46 "تہوار شوق سے مناتے ہیں کیا؟"

"بہت شوق سے مناتا ہوں اور 14 اگست کے دن بہت ایکسائٹڈ ہوتا ہوں اور چاند رات کو۔"

47 "آپ کی فیلڈ کی بڑی برائی؟"

"ہم جھوٹ کو فروغ دے رہے ہیں۔"

48 "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں؟"

"سو کر۔ کیونکہ ایک ہی دن ملتا ہے سونے کا۔ تین چار بجے تک ضرور سوتا ہوں۔"

49 "شہرت کے بارے میں آپ کے تاثرات؟"

"ایک ایسا زہر جو جب آپ کی رگوں میں دوڑتا ہے تو آپ کو انسانیت کے رتبے سے گرا دیتا ہے۔"

50 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"

"جب میرے قریبی دوست مجھے دھوکا دیتے ہیں۔"

51 "انٹرویو کے دوران کون سا سوال برا لگتا ہے؟"

"کہ تمہیں ابھی تک نازش کیوں نہیں ملی۔"

52 "کوئی لڑکی اگر مسلسل گھورے تو؟"

"تو میں جا کر کہتا ہوں 'آپی! کیا کوئی مسئلہ ہے؟'"

53 "سارا دن میں آپ کا پسندیدہ وقت؟"

"شام کا اور صبح کا۔"

54 "کس لمحے نے زندگی بدل دی؟"

"پتا ہی نہیں چلا کہ کب زندگی بدل گئی۔"

55 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"کہ تم صبح جلدی اٹھا کرو۔"

56 "غصہ کب آتا ہے / ردعمل؟"

"جب لوگ منافقت کر رہے ہوں۔ / کچھ نہیں، خاموش ہو جاتا ہوں۔"

57 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"

"کم سے کم دس روپے۔"

58 "کن باتوں پہ کنٹرول نہیں؟"

"بولنے پر۔"

59 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"

"جی میں لیتا ہی مانگ کر ہوں۔ میرے لیے وہ تحفہ بہت اہم ہو جاتا ہے جو میں اپنی پسند سے لیتا ہوں۔"

60 "پسندیدہ [illegible]؟"

"اس وقت میرے حساب سے کوئی بھی نہیں۔"

61 "کیا اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"

"ہاں اور بہت جلدی۔"

62 "اپنا موبائل نمبر کتنی مرتبہ تبدیل کر چکے ہیں؟"

"زندگی میں ایک ہی بار۔"

64 "سفر کس پہ کرتے ہیں 'بس پہ' کار پہ یا رکشے میں؟"

"میں نے تو پیدل سفر بھی انجوائے کیا ہے۔ لیکن آج کل اپنی کار میں سفر کرتا ہوں۔"

65 "آپ کی ایک انوکھی خواہش؟"

"کہ خانہ کعبہ میں میرا نکاح ہو۔"

66 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہو جاتا ہے؟"

"اب تو میری ماں حیات نہیں ہیں۔ لیکن جب وہ زندہ تھیں تو ہر وقت ایک ہی بات کہتی تھیں کہ میری بھولے [illegible]۔"

6[illegible] "کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتے ہیں؟"

"اپنی ڈریسنگ پہ۔"

[illegible] "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں؟"

"لوگوں کو اور خاص طور پر غریبوں کو دیکھ کر رب کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

[illegible] "کس کے بغیر نہیں رہ سکتے؟"

"اپنے ابا نازش کے خوابوں کے [illegible]"

[illegible] "کس شخصیت سے خوفزدہ رہتے ہیں؟"

"کوئی نہیں ہے ایسا میری زندگی میں۔"

71 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"بری یہ کہ سچ بولتا ہوں، جس کی سمجھ لوگوں کو کچھ عرصے بعد آتی ہے۔ یہی اچھی بھی ہے کہ جب سچ سمجھ میں آجاتا ہے تو لوگ مجھے اچھا کہتے ہیں۔"

72 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتے ہیں؟"

"صبح کے وقت، جب میں نماز کے لیے اٹھتا ہوں۔"

73 "آدھی رات کو آنکھ کھل جائے تو کیا کرتے ہیں؟"

"پانی پی کر پھر سے سونے کی کوشش کرتا ہوں۔"

74 "[illegible] میں کون سی تبدیلی بہت ضروری ہے؟"

"قوانین پر عمل درآمد کرانے کی ضرورت ہے اور جب قوانین پر عمل درآمد ہو گا تو یہ ایک بہت بڑی تبدیلی ہو گی۔"

75 "کوئی شام جو آپ اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتے ہیں؟"

"میری ہونے والی نازش۔"

76 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"آسٹریلیا۔"

77 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ جملہ؟"

"پریشان ہو جاتا ہوں اور 'او گاڈ' منہ سے نکلتا ہے۔"

78 "بستر پر لیٹتے ہی سو جاتے ہیں یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"

"مجھے نیند بہت اچھی آتی ہے اور جس دن مجھے نیند نہیں آتی، مجھے لگتا ہے کہ شاید مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہے۔"

79 "انسان کا بہترین روپ مرد / عورت؟"

"عورت۔"

80 "کمانے کے لیے بہترین جگہ پنڈی یا ڈائننگ [illegible]؟"

"[illegible]۔"

81 "آپ کا ذریعہ معاش؟"

"مارکیٹنگ جاب اور میرا اپنا بزنس۔"

82 "کون سے الفاظ یا محاورے زیادہ استعمال کرتے ہیں؟"

"بھائی صاحب 'یار۔۔۔ چاہے لڑکیاں ہوں یا لڑکے۔"

83 "خواتین کب بری لگتی ہیں؟"

"تب جب وہ کچھ ہوتی نہیں، لیکن اپنے آپ کو بنا رہی ہوتی ہیں۔"

84 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتے ہیں؟"

"پیسہ جمع کرنے کی عادت مجھ میں ہے ہی نہیں۔"

85 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟"

"اپنے غصے کو۔"

86 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتے ہیں؟"

"میری پسندیدہ کتابیں۔ ڈائجسٹ وغیرہ۔"

87 "ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"

"کہ میں ان کو بہت کم وقت دیتا ہوں۔"

88 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"مجھے پرفیومز اور گھڑیاں بہت پسند ہیں۔ کتنی بھی قیمتی ہوں، خرید لیتا ہوں۔"

"اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"تب بھی اسی کا شکر ادا کروں گا اور اپنی غلطیوں کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔"

خبریں وبریں

تبصیر نشاط

ڈرامے پہ ڈراما

شہرت اور مقبولیت کی کشش اکثر لوگوں کو شوبز کی نگری میں کھینچ لاتی ہے۔ تاہم یہاں آکر بھی جب انہیں وہ شہرت نہیں مل پاتی کہ جس کے انہوں نے خواب دیکھ رکھے تھے تو پھر وہ ان کی تعبیر پانے کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔

اسٹیج ڈراموں کی اداکارہ ندا چوہدری اپنے ایک ڈرامے کی ریہرسل میں مصروف تھیں۔ وہ اسٹیج پر ڈانس کی پریکٹس کر رہی تھیں کہ اچانک وہاں ایک سانپ آگیا۔ (ڈانس دیکھنے آیا ہو گا ناں!) وہاں موجود لوگ گھبرا گئے' تاہم ندا چوہدری نے اپنے حواس بحال رکھے اور چشم زدن میں سانپ کی گردن دبوچ لی۔ تاہم وہ سانپ کو مارنے کے بجائے اس سے کھیلنے لگیں۔ (بے چارہ سانپ)

بعد میں پتا چلا کہ کوئی شخص مٹھائی کے ڈبے میں سانپ چھپا کر لایا تھا۔ ریہرسل کے دوران اس نے سانپ کو اسٹیج پر چھوڑ دیا۔ (اسے یہی ہدایت ملی ہوگی نا)

تاحال یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ کوئی سازش تھی یا پھر ڈرامے کے اندر کوئی ڈراما ہوا ہے۔ (ممکن ہے ندا بھی ہوں کہ بہادری کے اس جلوے پر کل کو کوئی فنکار ان کے لیے ایک عدد گانا ہی گا ڈالے کہ "انوکھی لاڈلی کھیلن کو مانگے سانپ۔")

تینوں سمجھاواں کی

گانا "میں تینوں سمجھاواں کی" ہر خاص و عام کی زبان پر ہے' تاہم بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہیں کہ اس گانے میں راحت فتح علی کے ساتھ نسوانی آواز پاکستان کی نوجوان گلوکارہ فرح انور کی ہے۔ اکثر لوگ اسے بھارتی گلوکارہ شریا گھوشل کی آواز سمجھتے ہیں۔

اس گانے میں فرح کی آواز شامل ہونے کا قصہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔

جب پاکستانی فنکاروں سے بھارتی فلموں کے لیے گانے گوائے جاتے ہیں تو انہیں پہلے ہی بتا دیا جاتا ہے کہ اگر آپ کی آواز اور گائیکی مناسب نہیں لگی تو پھر یہی گانا کسی بھارتی فنکار سے گوایا جائے گا۔ تاہم فرح کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ جب فرح سے گانا "میں تینوں سمجھاواں کی" گانے کو کہا گیا تو انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ انہیں یہ گانا صرف گانا تیار کرنے کے لیے ہی گانا ہے۔ اگر یہ بھارتی فلم کے لیے منتخب ہوا تو پھر یہ گانا راحت فتح علی کے ساتھ شریا گھوشل گائیں گی۔ تاہم جب بھارتی فلم ساز نے یہ گانا سنا تو انہیں فرح کی آواز اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اس گانے کو فلم میں "جوں کا توں" شامل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ یوں فرح کی آواز بھارتی فلم میں شامل ہو گئی۔

فرح انور کہتی ہیں کہ گانا مقبول ہونے کے باوجود بھی انہیں بھارت سے گانے کی مزید آفرز نہیں آئیں' کیونکہ وہاں بھی اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ یہ گانا شریا گھوشل نے گایا ہے۔ جبکہ فرح وضاحتیں کر کے تھک چکی ہیں۔

(فرح جی! اتنی وضاحتیں کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے بھلا کہ آپ تو پہلے ہی کہہ چکی ہیں "میں تینوں سمجھاواں کی۔")

نزاکت

صدیوں سے سنتے آئے ہیں کہ خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ مگر جناب! بعض اوقات یہ نزاکت حسین چہرے یا دلکش سراپے میں نہیں' بلکہ مزاج میں جھلکتی ہے۔

حسین و دلکش عتیقہ اوڈھو دیکھنے میں نازک نہ سہی' مگر مزاج۔

"نازکی ان کے "مزاج" کی کیا کہیے" (اُف!)

چند سال پہلے ایک نجی پروڈکشن کے تحت ایک ڈراما سیریل بن رہی تھی۔ پروڈیوسر ایک کردار کے لیے عتیقہ اوڈھو کو کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔ پروڈیوسر نے انہیں فون کیا مگر عتیقہ ان دنوں شاید کچھ زیادہ ہی مصروف تھیں' سو فون ریسیو نہ کر سکیں۔ کچھ دن کوشش کرنے کے بعد پروڈیوسر نے "روایتی دیسی طریقہ" اختیار کیا یعنی کسی سے سفارش کروائی اور پھر عتیقہ کو فون کیا۔ اس مرتبہ فون ریسیو کر لیا گیا۔ مدعا جاننے کے بعد کوئی جواب دینے کے بجائے عتیقہ نے پروڈیوسر کا تفصیلی انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ پہلے پروجیکٹ کی تمام تفصیلات معلوم کیں' پھر سیریل کے مصنف' ہدایت کار' کیمرہ مین اور میک اپ آرٹسٹ تک کے نام معلوم کیے (پتے کیوں چھوڑ دیے؟) اس کے بعد کہانی اور کرداروں کی باری آئی۔ یہ سب جاننے کے بعد عتیقہ نے لوکیشن کا پوچھا۔ پروڈیوسر اس وقت تک جواب دیتے دیتے نڈھال ہو چکا تھا۔ تاہم اس نے ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ خود کو تسلی دی کہ چلو! یہ تو آخری سوال ہو گا' اس کا بھی بتا ہی دو۔ کہانی چونکہ ایک غریب گھرانے کے گرد گھومتی تھی' اس

لیے پروڈیوسر نے شوٹنگ کے لیے ریلوے کالونی کی کچی آبادی کا انتخاب کیا تھا۔ لوکیشن کا سنتے ہی عتیقہ شان بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولیں۔

"سوری! میں ایسے علاقوں میں شوٹ نہیں کراتی۔ اردگرد سے لوگ جمع ہو جاتے ہیں اور مکھیوں کی طرح بھنبھنانے لگتے ہیں۔ اٹھنے بیٹھنے کی کوئی مناسب جگہ نہیں ہوتی اور پھر اتنی شدید گرمی میں اے سی کے بغیر کیسے کام کروں گی؟"

یہ کہتے ہی عتیقہ نے فون کھٹ سے بند کر دیا۔

مورا پیا.....

بقول شخصے "عشق تو زندگی میں صرف ایک بار ہی ہوتا ہے ـــ بار بار ہونے والا عشق نہیں بخار ہوتا ہے۔" اور جناب! بخار کا کیا ہے کہ یہ تو کبھی بھی اور کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔ معروف اداکار جاوید شیخ کو بھی یہ بخار کئی مرتبہ ہوا اور ہر مرتبہ بہت زوروں کا ہی ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں خود اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"میں نے بے شمار عشق کیے۔ ان میں فرانس کی ایک کیرولین نامی لڑکی بھی شامل ہے (مگر اُسے ان سے نہیں ہوا ہو گا) وہ میری پہلی محبت تھی (جاوید صاحب! آپ کو ابھی تک یاد ہے؟ ہم نے تو سنا تھا کہ عورت اپنا پہلا پیار کبھی نہیں بھولتی) میں اس کی خاطر فرانس بھی چلا گیا تھا مگر پھر وطن کی یاد ستائی تو میں نے اپنی محبت کو قربان کر دیا (یہ کیوں نہیں کہتے کہ انگور کھٹے نکلے تھے) پھر زینت منگھی سے دھواں دھار عشق ہوا اور پھر زینت سے شادی بھی ہو گئی۔ (یاد رہے کہ زینت کا تعلق ایک زمیندار گھرانے سے تھا اور جاوید سے شادی کرنے کی وجہ سے زینت کے گھر والوں نے انہیں چھوڑ دیا تھا۔)

شادی کے بعد بھی جاوید کی رومان پسند فطرت میں ٹھہراؤ نہیں آیا۔ جاوید کو سلمیٰ آغا سے محبت ہو گئی۔ میڈیا پر خبریں آئیں تو شوبز کی روایات کے مطابق دونوں نے تردید کر دی مگر پھر جلد ہی دونوں نے شادی کر لی۔ جاوید شیخ زینت منگھی سے الگ ہو گئے مگر وفا کی ماری زینت نے ان سے طلاق نہ لی۔ سلمیٰ آغا بھی جاوید کی ہم فطرت نکلیں۔ جلد ہی دونوں میں طلاق ہو گئی۔ اب ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ جاوید اپنی پہلی بیوی کی طرف لوٹ جاتے مگر جناب! جاوید کا عشق ابھی تھکا نہیں تھا۔ ان دنوں جاوید شیخ خوبرو اداکارہ نیلی کے ساتھ کئی فلموں میں جلوہ گر ہو رہے تھے سو اس مرتبہ عشق کا سفر انہوں نے نیلی کے سنگ طے کرنے کی ٹھانی۔ تاہم جلد ہی یہ سفر ایک ناخوش گوار موڑ پا کر ختم ہو گیا۔ نیلی نے تو اس کے بعد گوشۂ گمنامی میں پناہ لی مگر جاوید کا نام اداکارہ میرا کے ساتھ جڑ گیا۔ حسب روایت دونوں جانب سے تردیدی بیانات جاری ہوئے اور نہایت خاموشی سے علیحدگی بھی ہو گئی۔ اس کے بعد اداکارہ "شنا" جاوید کا نگاہ انتخاب ٹھہریں، مگر انہوں نے جلد ہی کسی اور سے شادی کر لی۔ اس دوران زینت منگھی سے جاوید کی اپنی بیٹی ڈاکٹر بن چکی تھی، سو ڈھلتی عمر کا احساس انہیں ایک طویل عرصے کے بعد زینت کی چوکھٹ پر واپس لے آیا ہے (مگر صبح کا یہ بھولا شام کو نہیں بلکہ "رات گئے" گھر آیا ہے) اور زینت کا ظرف دیکھیے! کہ انہوں نے انہیں کھلے دل سے خوش آمدید کہا۔ (مورا پیا گھر آیا) ❁

ارادہ اور توجہ

کچھ لوگ نارمل ہوتے ہوئے بھی عام ذہنی سطح سے انحراف کرکے ابنارمل رہنا چاہتے ہیں اور وہ شعوری طور پر ایسی حرکات کرتے ہیں کہ لوگ انہیں ابنارمل سمجھتے ہوئے معاف کردیں یا ان کی طرف زیادہ توجہ دیں۔ یہ غیر معمولی پن 'ابنارمل رہنا اپنے اوپر طاری کرنے کے بعد انسان کا درست رہنا ممکن نہیں حالانکہ وہ چاہیں تو خود کو درست رکھ سکتے ہیں۔ درست رکھنا ان کے اپنے ہاتھ میں ہے مگر وہ اس کی کوشش نہیں کرتے اور نہ دوسروں کی بات پر کان دھرتے ہیں۔ ماہر نفسیات لکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کے دو اہم قوئ قوت ارادی اور توجہ (attention) جن کا کام خواہشات و جذبات پر کنٹرول رکھنا ہے' معطل اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان سے ایسی حرکات سرزد ہونے لگتی ہیں جن کی عقل سلیم اجازت نہیں دیتی اور انسان نامعقول' وہمی اور طفلانہ حرکات کرنے لگتا ہے یا ایسی باتیں سوچنے لگتا ہے جو وہ سوچنا نہیں چاہتا۔

"یہ درست ہے کہ نفسیاتی مریضوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے' لیکن جتنا زیادہ اضافہ نظر آرہا ہے حقیقتاً" اتنا اضافہ نہیں ہوا۔ نفسیاتی بیماریاں پہلے بھی ہوا کرتی تھیں۔ لیکن ان کی تشخیص نہیں ہوتی تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے ہاں مشترکہ خاندانی نظام رائج تھا۔ مشترکہ خاندان میں اگر کوئی ایک فرد نفسیاتی یا ذہنی بیماری کا شکار بھی ہو جاتا تھا تو اس کا پتا نہیں چل پاتا تھا اور اتنے بڑے خاندان میں اس کی دیکھ بھال ہو جایا کرتی تھی۔ آج کل انفرادی' خاندانی نظام میں ایسا ممکن نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ دولت' حیثیت اور شہرت کی دوڑ کی وجہ سے ذہنی دباؤ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ غریبوں اور امیروں میں ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کی شرح برابر ہے۔ غریب عوام عام طور پر یا تو ڈاکٹروں کے چکر میں نہیں پڑتے۔ ڈاکٹری علاج کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جب کہ امیر لوگ ڈاکٹروں کے پاس زیادہ آتے ہیں اور نیورا اسس قسم کی بیماریاں امیروں کو ہوتی ہیں غریبوں کو نہیں (نیوراسس ایک اعصابی مرض ہے۔ جس میں مختلف اعصاب اور پٹھوں پر اثر پڑتا ہے اور مریض خفیف ذہنی عارضہ میں مبتلا ہو جاتا ہے اس اعصابی مرض کی مختلف قسمیں ہیں۔

(۱) ضعف اعصاب' (۲) ضعف نفس' (۳) ہسٹریا

ذہنی بیماریاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو ذہن ٹھیک طور پر کام نہیں کرتا لیکن دماغ میں کوئی بیماری نہیں ہوتی یا دماغ میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ ذہن دراصل کوئی چیز نہیں بلکہ دماغ کا نام ہے۔ مثال کے طور پر آدمی کا رویہ نارمل نہیں رہتا۔ یا وہ ڈپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ تو یہ نفسیاتی اور ذہنی بیماری ہے اور دوسری یہ کہ دماغ میں کوئی خرابی ہو جائے۔

ذہنی بیماریوں کو ہم دو خانوں میں تقسیم کریں گے۔ ایک شدید قسم کی بیماریاں جن میں انسان حقیقت سے تعلق کھو بیٹھتا ہے۔ ایسی بیماریاں علاج کے بغیر ٹھیک نہیں ہوتیں۔ البتہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ عرصے بعد مریض خود بخود ٹھیک ہو جاتا ہے۔ جب کہ معمولی بیماریاں جیسے ڈپریشن' خوف اور گھبراہٹ وغیرہ پر انسان اپنی قوت ارادی سے بھی قابو پا سکتا ہے۔

ایک بہن..... پشاور

آج سے تقریباً" بارہ سال پہلے مجھے ایک لڑکے سے محبت ہو گئی۔ خطوط کا تبادلہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔ اسی اثناء میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو شادی شدہ ہے اور ایک بچی بھی ہے۔ میں اس سے ناراض ہو گئی۔ مگر آخر اس نے مجھے منالیا اور یہی کہا کہ میری پسند کی شادی نہیں ہے۔ ماں باپ کی زبردستی سے ہوئی اور مجھے بیوی اچھی نہیں لگتی وغیرہ وغیرہ۔ ملنے کے نتیجے میں یہ ہوا کہ حد پھلانگ گئے۔ بعد میں میں بہت پشیمان ہوئی مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ وہ میرے والدین سے ملا۔ مجھے خط لکھے 'ان کا ایک ہی انکار رہا۔ انکار کی وجہ صرف اور صرف یہ تھی کہ وہ ہم سے ذرا کم حیثیت کا تھا۔ ہم بھی کوئی بہت امیر نہ تھے۔ مگر وہ جو والدین کے خواب ہوتے ہیں کہ ان کی بیٹی اپنے سے ذرا امیر گھر میں جائے تو میرے والدین کے بھی یہی خواب تھے۔ میں نے بھی فرمانبردار بیٹیوں کی طرح سر جھکا دیا اور اسے لکھ دیا کہ میری منگنی پکی ہو گئی ہے۔ اس تحریر کو میری آخری تحریر سمجھنا۔ اب الجھن یہ تھی کہ میرے کئی خط اس کے پاس تھے۔ مجھے رات دن یہی فکر کھاتی رہی کہ کہیں وہ خط اور فوٹو میرے سسرال والوں کو نہ دکھا دے۔ خیر اسی فکر میں نو ماہ گزر گئے اور میری شادی ہو گئی۔ میرے سسرال والے بہت اچھے ہیں۔ اور میاں تو بہت ہی اچھے ہیں۔ مگر باہر سے جب آتے اگر ذرا موڈ آف ہوتا تو میرا دل دہل جاتا کہ آج تو انہیں پتا چل گیا ہے اس لیے موڈ آف ہے۔ خیر عدنان بھائی اسی طرح ماہ و سال گزرتے رہے۔ میرے تین بچے ہوئے۔ مگر اس کی یاد میرے دل سے نہ نکل سکی۔ جب بازار جاتی نظریں اسے ہی ڈھونڈتی ہیں۔ کبھی کبھی تو دل بہت بے قرار ہو جاتا کہ سب کچھ چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ اب ایک ہی فکر رہتی ہے کہ کہیں میرے میاں کو پتہ نہ چل جائے۔ مجھے بتائیں عدنان بھائی! کہ میں کیا کروں کہاں جاؤں میرے خط میرے ذہن پہ ہر وقت بھوت بن کے سوار رہتے ہیں۔ اس واقعے کو سترہ سال ہو گئے ہیں۔ مگر وہ ظالم ایک منٹ کے لیے نہیں بھولتا۔ وہ ماں باپ کا ایک بیٹا ہے اور میں ایک بیٹی۔ میرے بھائی کو خدا رکھے۔ بس اب تو کہتی ہوں کہ اگر میں مر گئی اور وہ خط کہیں میرے بچوں کو مل گئے تو کیا ہو گا۔ میں اس سے مل کر اپنے خط مانگنا چاہتی ہوں۔

ج : اگر کوئی بہن مجھ سے کہے کہ عدنان بھائی میں آگ میں چھلانگ لگا رہی ہوں تو میں سوچوں گا کہ ہو سکتا ہے کہ آگ میں کود کر بچ جائے لیکن جو کچھ آپ کرنے کا ارادہ رکھتی ہیں' وہ ایسی بھیانک غلطی ہو گی کہ اس کا نتیجہ آپ بھی بھگتیں گی اور آپ کے بچے بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی یکسانیت سے آپ اکتا گئی ہیں اور زندگی میں تھوڑی سی رنگینی پیدا کرنے کے لیے آپ اس سے ملنا چاہتی ہیں۔ اس کے لیے آپ کے ذہن نے خط حاصل کرنے کا بہانہ سوچا ہے ورنہ یہ تو ظاہری بات ہے کہ جس شخص نے تیرہ سال تک آپ کے خطوں کو نہیں دکھایا اسے اب کیا ضرورت ہو گی کہ وہ خط آپ کے شوہر کو دکھا دے گا اور اس نے اتنے سالوں تک محفوظ رکھے ہوں گے اور ایک طرح سے اس کی حیثیت چور اور مجرم کی ہے اور مجرم خود بزدل ہوتا ہے۔ وہ یہ ہمت کیسے کر سکتا ہے۔ آپ اپنے ارادے سے باز آجائیں اور اس سے دوبارہ ملنے کی کوشش نہ کریں۔ اللہ کا شکر ادا کریں کہ اس نے آپ کی غلطی پر آپ کو کوئی سزا نہ دی اور آپ کو پھول سے پیارے بچے دیے۔ اپنے شوہر کی قدر کریں اور جتنی کریں کم ہے اور یہ خیال ذہن سے خارج کردیں کہ وہ خط کسی کو دکھائے گا۔ سترہ سال ایک طویل عرصہ ہوتا ہے۔ وہ آپ کو بھول چکا ہو گا۔ اس کو ماضی یاد دلانے کی کوشش نہ کریں' اس سے ملنا شوہر سے غداری بھی ہے اور بے وفائی بھی۔ یہ راستہ پر خطر بھی ہے اور خاردار بھی' اس میں نہ صرف پاؤں زخمی ہو سکتے ہیں بلکہ جسم بھی چھلنی ہو سکتا ہے۔

ص۔ ا۔ لاہور

اچھی بہن! سب سے اچھی بات یہی ہے کہ آپ نے اللہ پر بھروسا کر لیا ہے اور پڑھائی شروع کر دی ہے۔ اللہ تعالیٰ پر کامل یقین اور بھروسا کیا جائے تو وہ اپنے بندوں کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ آپ تعلیم جاری رکھیں۔ کوئی مناسب رشتہ ہو تو شادی کرلیں اور باقی ساری باتیں بھول جائیں۔ جب اللہ پر سب چھوڑ دیا تو پھر سوچ و فکر کیوں؟ آپ کے بھائی کی دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

مرتبہ: عصمت المقصود

بیوٹی بکس

فاطمہ......لاہور

س : میری عمر 16 سال ہے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میرا قد پانچ فٹ اور چار انچ ہے۔ میں اپنا قد ایک فٹ بڑھانا چاہتی ہوں۔ مہربانی کرکے اس کا کوئی حل بتایئے اور جو اخبار میں ہر روز آتا ہے کہ چھوٹے قد والے یہ دوائی کھائیں۔ ان کا قد بڑھ جائے گا۔ ایسی دوائیں کھانے سے کوئی نقصان تو نہیں ہوتا۔

دوسرا مسئلہ میرا یہ ہے کہ میری گردن بہت جلد گندی ہو جاتی ہے۔ گردن اور پاؤں صاف کرنے کا کوئی طریقہ بتایئے۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرا وزن چالیس کلو کے قریب ہے۔ میں اپنا وزن تھوڑا کم کرنا چاہتی ہوں اور کولہے میرے بہت بڑھ گئے ہیں انہیں چھوٹا کرنے کی کوئی ورزش بتائیں۔

ج فاطمہ بہن! شاید آپ غلطی سے چار فٹ کے بجائے پانچ فٹ لکھ گئی ہیں۔ بہرحال اگر آپ کا قد چھوٹا بھی ہے تو اشتہاری دوائیاں ہرگز استعمال نہ کریں۔ ان کے نقصان دہ اثرات ہو سکتے ہیں کیونکہ ابھی تک قد بڑھانے کی کوئی بھی دوا ایجاد نہیں ہوئی ہے۔

آپ کا وزن بہت زیادہ نہیں ہے لیکن آپ وزن کم کرنا چاہتی ہیں تو اس کے لیے بہترین ورزش یہ ہے کہ اگر آپ کے گھر میں سیڑھیاں ہیں تو روزانہ بارہ مرتبہ سیڑھیاں چڑھیں اور اتریں۔ وزن کم ہو جائے گا۔ پاؤں اور گردن پر ابٹن کی مالش کریں۔ اور جب بھی منہ دھوئیں گردن ساتھ دھوئیں۔

ہما مقصود......لاہور

س : میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے چہرے پر بالکل تازگی نہیں ہے چہرے کا رنگ بھی بہت خراب ہو گیا ہے عموماً" سردیوں میں میرے ہاتھ' بازو اور پاؤں کی جلد کھردری اور بے رونق ہو جاتی ہے۔ کوئی ایسا حل بتائیں کہ چہرے پر تازگی' چمک اور شفاف پن پیدا ہو جائے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے سلکی بال بہت پسند ہیں لیکن کچھ عرصے سے بال نیچے سے خشک' پھیلے ہوئے اور اڑے اڑے ہو گئے ہیں۔ کوئی ایسا حل بتائیں کہ بال بھاری ہو جائیں' ان میں مخصوص چمک پیدا ہو اور بال نرم ہو جائیں۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری ناک اوپر سے بالکل ٹھیک ہے یعنی اوپر سے نارمل ہے لیکن نیچے سے بہت موٹی اور اوپر کو اٹھی ہے کوئی ایسا حل تجویز کریں کہ ناک پتلی ہو جائے۔

ج ہما بہن! ناک پتلی کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سوائے پلاسٹک سرجری کے' آپ کی ناک ٹھیک ہو سکتی ہے۔

سردیوں میں اکثر چہرہ بے رنگ ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے آٹے کی بھوسی میں چھاچھ ملا کر دس منٹ تک چہرے اور گردن پر اس کا لیپ کریں۔ پھر صاف پانی سے چہرہ دھو ڈالیں۔

انڈے کی زردی پھینٹ کر اس میں چند قطرے زیتون کا تیل ملا لیں اور چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ تک لگا رہنے دیں۔ سردیوں میں چہرے کے لیے یہ بہت مفید ہے۔ ان ترکیبوں پر عمل کرنے سے آپ کے چہرے پر چمک اور تازگی پیدا ہو جائے گی۔